

GHĀLIB AND A STUDY OF GHĀLIB

Dr. EBADAT BRELVI *M.A., Ph. D. ; F.R.A.S. ;*

**Professor of Urdu, and Head of the Department of Urdu
UNIVERSITY OF THE PUNJAB, LAHORE.**

WRITER'S ACADEMY

9 - Cooper Road, LAHORE.



PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081



فہرست

پیش لفظ

- حیات غالب پر چند خیالات ۱
 غالب کے حالات زندگی اور شخصیت ۱۷
 غالب کا ماحول ۶۸
 غالب کی تصانیف ۱۴۹
 غالب کی شاعرانہ عظمت ۱۹۹
 غالب کی شاعری کا آفاقی پہلو ۲۱۵
 غالب کی شاعری کے نئے زاویے ۲۳۱
 غالب کی شاعری میں شوخی اور شگفتگی کے عناصر ۲۴۳
 غالب کی شاعری میں اجتماعی شعور ۲۵۵
 غالب کی شاعری میں غم دوران ۲۶۷
 غالب کی عشقیہ شاعری ۲۹۱
 غالب کی شاعری کا جہالتی پہلو ۳۳۳
 غالب کی تصویر کاری ۳۱۵
 غالب کے فنی اضافے ۳۶۳
 غالب اور ان کے خطوط ۳۷۵
 غالب کے خطوط کی ادبی اہمیت ۳۹۷
 غالب کا ایک اہم خط — ناب مہاشب ۴۰۷
 غالب کے اہم نقاد ۴۲
 مہاشب غالب کے سوا سال ۴۵۱
 کتابیات غالب ۴۸۶
 اشاریہ

پیش لفظ

غالب ایک عظیم شاعر ہیں اور ان کی اس شاعرانہ عظمت کو اردو شعروں، تذکرہ نگاروں، ادبی مؤرخوں اور قدیم و جدید نقادوں، سب تسلیم کیا ہے۔ گذشتہ سو سال میں ان کی اس عظمت کے مختلف پہلوؤں ★ باعث ان بے شمار کتابوں اور مقالوں میں ہوتی رہی ہے، جو وقتاً فوقتاً ✱ کر شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت اور کامیابی پر اچھا خاصا تحقیقی اور تنقیدی مواد جمع ہو گیا ہے۔ لیکن ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں کچھ ایسی پہلو دار کیفیت ہے کہ ہر مہم میں اس کے مختلف پہلوؤں پر کچھ نئی باتیں کہنے اور نئے خیالات کو کرنے کی گنجائش ہمیشہ باقی رہے گی۔

یہ کتاب ’غالب اور مطالعہ‘ غالب‘ بھی اسی صورت حال کی پیداوار ہے۔ اس کی تیاری میں غالب کے متعلق تقریباً تمام تحقیقی اور تنقیدی مواد پیش نظر رکھا گیا ہے اور اس سے حسب ضرورت استفادہ کر کے غالب شخصیت اور شاعری کے بعض نئے گوشوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کا لکھنے والا گذشتہ تیس سال سے غالب کی شخصیت اور ادبی کے تحقیقی اور تنقیدی مطالعے میں مصروف رہا ہے۔ اس مطالعے کے نتائج نکلے ہیں، وہ سب اس کتاب میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ چونکہ مطالعے کا سلسلہ ابھی جاری ہے، اس لیے ان نتائج کو حرف آخر نہیں کہا جاسکتا۔ آئندہ جو نتائج سامنے آئیں گے، ان کو یا تو اس کتاب کے آئندہ ایڈیشنوں میں پیش کر دیا جائے گا یا ایک نئی کتاب مرتب کر کے کر دی جائے گی۔

یہ کتاب اردو شاعروں کے تحقیقی اور تنقیدی مطالعے کے ایک باقاعدہ، بڑے منصوبے کے سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اس سلسلے کی کوشش اور کاوش ’سومن اور مطالعہ‘ سومن‘ کے نام سے ۱۹۶۱ء میں ہو چکی ہے۔ اس منصوبے کے مطابق غالب کے اس مطالعے کو سن ۱۹۶۲ء کی اشاعت کے دو تین سال بعد شائع ہو جانا ہے تھا۔ لیکن ۱۹۶۲ء میں راقم انگلستان چلا گیا اور پانچ سال تک

لندن یونیورسٹی میں تدریس کے ساتھ مطالعے اور ادبی تحقیق میں مصروف رہا ۔
اس لیے اس کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی ۔

لیکن حسن اتفاق ہے اس تاخیر کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ اب یہ کتاب غالب کے جن صد سالہ کے موقع پر شائع ہو رہی ہے ۔ شاید اس کی اشاعت میں یہ تاخیر اسی وجہ سے ہوئی تھی کہ اس عظیم شاعر کے جن صد سالہ کے موقع پر یہ بھی اس خراج عقیدت میں شریک ہو ، جو اس سال اُس کو دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں پیش کیا جا رہا ہے ۔

شفیق مکرم مصطور مشرق عبدالرحمن چغتائی صاحب نے اس کتاب کا نہایت ہی حسین و دلآویز سرورق بنایا ہے ، عزیز گرامی ڈاکٹر نافر حسن زیدی صاحب نے بڑی محنت سے اس کا اشاریہ تیار کیا ہے اور سید ظفر الحسن رضوی صاحب نے اس کو بڑے ذوق و شوق سے چھاپا ہے ۔

ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے راقم کے پاس الفاظ نہیں ہیں ۔

اورینٹل کالج لاہور

۲۵ جنوری ۱۹۶۹ع

عبادت

حیات غالب
پر
چند خیالات

غالب کی زندگی بڑی ہی پہلدار تھی۔ وہ شروع سے آخر تک ہمہ نظر آتی ہے۔ اس میں بے شمار نشیب و فراز دکھائی دیتے ہیں۔ وہ تو ایک حسین اور دل آویز پہاڑی سلسلے کی طرح حسین اور دل آویز، برشکوہ اور شان دار ہے۔ جلال و جلال دونوں اس میں گلے ملنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رومان و حقیقت کا اس میں ایک نہایت ہی دل کشی اور دل موہ لینے والا امتزاج ملتا ہے۔ وہ سیدھی، سادا اور سبٹ نہیں ہے۔ اس میں تو ایک متد و جزر کی سی کیفیت ہے۔ وہ حادثات سے بھرپور ہے۔ وہ جہد مسلسل کی ایک داستان ہے۔ وہ ایک بے چین روح کی کہانی ہے۔ اس میں تو ایک ڈرامائی شان ہے، اور یہ ڈرامائی شان غالب کی زندگی کے ہر واقعے اور ہر لمحے میں اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ اس میں چونکانے کا بڑا سامان ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ قدم قدم پر انسان کو اس طرح چونکتی ہے کہ وہ ایک عالم تحریر میں پہنچ کر اپنے آپ کو اس میں گم کر دیتا ہے اور اس پر ایک خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

مرزا غالب کا خاندانی سلسلہ آل سلجوق تک پہنچا ہے۔ یہ لوگ ترک تھے اور انہوں نے صدیوں تک وسط ایشیا میں حکمرانی کی تھی۔ غالب نے اسی نسبت سے، اپنے آپ کو ”ترک سلجوق“ کہا ہے۔ آل سلجوق تقریباً تین سو سال تک حکمران رہے لیکن بالآخر غورازیوں نے ان کی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بیا دی اور وہ اسے منتشر ہوئے کہ بھر کبھی بھی اپنی طاقت کو سمیٹ کر یک جا نہ کر سکے۔ ان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ جب حکومت ہاتھ سے نکل گئی تو زمانے نے انہیں

ادھر ادھر بھٹکنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ ان میں سے بعضوں نے تو راہزنی کو اپنا شعار بنایا اور بعضوں نے سپہ گری اختیار، کی غالب نے اپنے آپ کو اجداد کی اس سپہ گری پر فخر کیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ شاعری ان کے لیے ذریعہ عزت نہیں ہے :

سو پشت سے ہے پیشہ' آپا سپہ گری

کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

آل سلجوق کے اس پکھڑے ہوئے قافلے میں ایک بزرگ ترسم خان تھے۔ جو سلجوقیوں کے انتشار کے بعد سمرقند میں آباد ہوئے۔ یہ ترسم خان غالب کے بردادا تھے۔ انھوں نے سپہ گری کا پیشہ اختیار کیا اور ان کی اولاد سمرقند ہی میں بھلی بھولی۔ لیکن بالآخر ان کے بیٹوں میں غالب کے دادا مرزا قوقان بیگ خان نے اپنے والد ترسم خان سے ناراض ہو کر ترک وطن کیا اور ہندوستان آکر اقامت اختیار کی۔ پہلے کچھ عرصے ان کا قیام لاہور میں رہا۔ یہاں وہ نواب معین الملک میر متوی سرکار میں ملازم ہوئے۔ لیکن جب ان کے انتقال کے بعد پنجاب میں بھی انتشار کا دور دورہ ہوا تو دلی چلے گئے۔ یہ شاہ عالم کا زمانہ تھا۔ شاہ عالم کے بادشاہ ہونے کے بعد جب ذوالفقار الدولہ نجف خان نے حکومت میں اپنا اثر قائم کر لیا تو غالب کے دادا کو ان کے توسط سے معقول ملازمت مل گئی اور وہ دلی میں آباد ہو گئے۔ یہاں سو کا پرگنہ انھیں جاگیر میں ملا اور اس طرح وہ اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے۔

مرزا قوقان بیگ خان کے ایک بیٹے مرزا عبداللہ بیگ خان تھے۔ عبداللہ بیگ خان دہلی میں پیدا ہوئے اور اسی سر زمین پر انھوں نے ہوش منبھالا۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد انھوں نے بھی سپہ گری کا پیشہ اختیار کیا۔ چلے لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کی سرکار میں ملازمت کی۔ پھر حیدرآباد میں نظام علی خان کی سرکار میں کئی سال ملازم رہے۔ جب بقول غالب ان کی نوکری ایک خاندانہ جگہ کے پکھڑے میں جانی رہی تو انھوں نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راجا بختاور سنگھ کے نوکر ہوئے لیکن وہاں کسی لڑائی میں مارے گئے۔ الور جانے سے قبل وہ آکرے میں آ گئے تھے اور وہاں ان کی شادی خواجہ غلام حسین خان کمیدان کی صاحبزادی عزت النساء بیگم سے ہو گئی تھی۔ غالب انھیں عبداللہ بیگ خان اور

عزت النساء بیگم کے فرزند ارجمند تھے ۔

غالب کی ولادت ۸ رجب المرجب یعنی ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرے میں ہوئی ۔ غالب تین بھائی بن گئے ۔ بن جھوٹی خاتم غالب سے بڑی تھیں اور بھائی مرزا یوسف ان سے چھوٹے تھے ، غالب کی عمر ابھی پانچ برس ہی کی تھی کہ ان کے والد عبداللہ بیگ خاں کا انتقال ہو گیا ۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی پرورش عبداللہ بیگ خاں کے چھوٹے بھائی یعنی غالب کے چچا مرزا نصراللہ بیگ خاں نے اپنے ذمے لے لی ۔ یہ مریشوں کے سلازم تھے اور اکبر آباد کی صوبہ داری کا منصب ان کے سپرد تھا ۔ لیکن وہ بھی زیادہ عرصے نہ جیے ۔ غالب مشکل سے آٹھ سال چند ماہ کے ہوں گے کہ ان کا بھی انتقال ہو گیا ۔

اب ان کے سر پر کوئی ایسا بزرگ نہ رہا جو ان کی پرورش کرتا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں بچپن سے عنفوان شباب تک کا زمانہ اپنی تنہالی میں گزارنا پڑا ۔ یہاں ان کے سر پر کسی ایسے بزرگ کا سایہ نہ تھا جو ان کی دیکھ بھال کرتا اور جس کی نگرانی میں ان کی پرورش ہوتی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے راہ روی کے راستے پر چل نکلے اور بالکل لا آہالی ہو گئے ۔ اس زمانے میں وہ ہتک اڑانے ، شطرنج کھیلتے اور دوستوں کے ساتھ مل کر طرح طرح کے ہنگامے برپا کرتے۔ والد اور چچا کے انتقال کے بعد دس ہزار روپے کی رقم ان کے خاندان کی کفالت کے لیے مقرر ہو چکی تھی ۔ اس میں سے ثواب احمد بھٹی خاں نے صرف تین ہزار روپے سالانہ کی رقم مقرر کی۔ اس رقم میں سے غالب کا حصہ صرف ساڑھے سات سو روپے تھا اس زمانے کے حساب سے یہ رقم ایک بچے کے اخراجات کے لیے خاصی تھی ۔ اس کے علاوہ ان کی تنہالی کے لوگ بھی کھانے پینے تھے۔ اس لیے مالی اعتبار سے غالب کو اس وقت اطمینان تھا ۔ اس صورت حال نے ان کی بے راہ روی اور لا آہالی پن کو کچھ اور بھی ہوا دی ۔

غالب کی تعلیم کے بارے میں تفصیل نہیں ملتی ۔ لیکن جن حالات میں ان کا بچپن گزرا ہے، اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کی تعلیم میں وہ باقاعدگی نہیں ہوگی جو عام حالات میں ایک ایسے بچے کو نصیب ہوتی ہے جس کے سر پر والدین کا سایہ ہوتا ہے ۔ پھر بھی یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کی تنہالی کے لوگوں نے ان کی ابتدائی تعلیم کا

ضرور کوئی انتظام کیا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ شاعری، ادب، نجوم اور ہنر وغیرہ کے ایسے علوم سے دلچسپی نہ لے سکتے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ انہوں نے نقایہ اکثر آبادی کے مکتب میں بھی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ لیکن وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ واقعی نظیر کے مکتب میں پڑھنے کے لیے گئے۔ کیونکہ اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ اس بات پر سب متفق ہیں کہ انہوں نے ابتدائی زمانے میں فارسی زبان کی تعلیم مولوی محمد معظم سے حاصل کی۔ اس کے بعد ملا عبدالصمد کے سامنے ڈالوئے ادب تہہ کیا۔ ملا عبدالصمد ہارسی تھے اور ان کا نام ہرسزد تھا۔ لیکن وہ سلطان ہو گئے تھے اور ان کا اسلامی نام عبدالصمد رکھا گیا تھا۔ وہ سیر و سیاحت کی غرض سے ہندوستان آئے اور چند سال آگرے میں قیام کیا۔ غالب کی عمر اس وقت چودہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فارسی زبان سے انہیں اس وقت تک اتنی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی کہ اس کے قواعد کو سمجھنے کے لیے انہوں نے ملا عبدالصمد کی موجودگی کو نعمت غیر مترقبہ تصور کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ملا عبدالصمد غالب کے یہاں ٹھہرے۔ اور غالب نے ان سے استفادہ کیا۔ عبدالصمد سے استفادے کا یہ نتیجہ ہوا کہ فارسی زبان کے اسرار و رموز ان کے سامنے بے نقاب ہو گئے اور قدیم ایرانی تہذیب کے مزاج ذاتی بھی ان کے مزاج میں داخل ہو گئی۔

غالب کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ گیارہ سال کی عمر میں شاعری شروع کی۔ شروع شروع اردو میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ اس زمانے میں ان پر ہیدل، اسیر اور شوکت وغیرہ کا اثر تھا۔ اور وہ انہیں کے انداز کے شعر کہتے تھے۔ اس زمانے میں لہو و لعب ان کا شعار تھا۔ زندگی کے اس انداز نے شاعری سے ان کی دلچسپی کو بڑھایا اور شعر گوئی کی آتش شوق کو بھڑکایا۔ چنانچہ وقت کے ساتھ ساتھ شاعری کے ذوق و شوق میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی۔

ابھی غالب تیرہ سال کے تھے کہ ۱۲۲۵ھ میں الٹمی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ان کی شادی ہو گئی۔ اس نسبت سے وہ آگرے سے دلی منتقل ہو گئے اور انہوں نے اس شہر میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔ دلی اس زمانے میں بقول حالی عہد اکبری اور

عہد شاہجہانی کی یاد تازہ کرتی تھی۔ علم و ادب کے بڑے بڑے ماہر اس سر زمین پر جمع تھے۔ اس ماحول کا اثر غالب پر بہت گہرا ہوا۔ دلی میں ان کی ملاقات مولانا فضل حق خیر آبادی سے ہوئی جو اس زمانے کے بہت بڑے عالم تھے اور شعر و شاعری کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ان کے اثر سے علمی معاملات میں بھی انہوں نے دلچسپی لی۔ دلی کے قیام نے ان کی زندگی کے اس انداز کو بڑی حد تک بدلا جس میں بے راہ روی اور لا ابالی پن کے پہلو نمایاں تھے۔ اب ان کے مزاج میں بڑی حد تک ٹھہراؤ پیدا ہوا اور زندگی کے عام انداز میں اعتدال کی کیفیت رونما ہوئی۔ اس صورت حال نے نہ صرف زندگی کو بسر کرنے میں صحت مندی پیدا کی بلکہ اُس کے بنیادی معاملات و مسائل کو سمجھنے کا شعور بھی ان کے اندر پیدا کیا۔ اچھی صحبتوں کے اثر سے انہوں نے علم و ادب دونوں کی طرف باقاعدگی سے توجہ کی اور شاعری میں تو وہ رنگ روپ نکالا کہ تمام رنگ اس کے سامنے ماند پڑ گئے۔

دلی کے قیام کے زمانے میں غالب کو مالی مشکلات کا سامنا یقیناً کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی اعتبار سے اس وقت دلی کی حالت اچھی نہیں تھی۔ شاہی خاندان تک کا حال دگرگوں تھا۔ غالب بھی ان حالات سے متاثر ہوئے۔ آگرے میں جو فراغت انہیں نصیب تھی وہ اب خواب و خیال ہو گئی۔ وہ پنشن جو انہیں ملتی تھی اس کو حاصل کرنے میں طرح طرح کی الجھنیں پیش آنے لگیں۔ اور ۱۸۳۱ء میں تو یہ پنشن بالکل ہی بند ہو گئی۔ ان حالات میں گزر بسر کے لیے انہیں قرض کا سہارا لینا پڑا۔ قرض خواہوں کے تقاضے بھی انہیں پریشان کرنے لگے۔ اسی زمانے میں ان کے چھوٹے بھائی یوسف مرزا دیوانے ہو گئے۔ غالب کے لیے یہ بڑی پریشانی اور ابتلا کا زمانہ تھا۔ انہوں نے خود اس کا اظہار اس طرح کیا ہے :

ہے اب اس معمورے میں فقط غم الفت اسد

ہم نے یہ مالا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

اسی پریشانی کے عالم میں غالب نے حالات کی ناساز گاری سے تنگ آکر پنشن کی بحالی کے لیے کلکتے کا سفر کیا۔ چنانچہ ۱۸۳۶ء میں دلی سے نکلے۔ کان پور ہوئے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ تقریباً ڈیڑھ سال ان کا قیام

کلکتے میں رہا۔ حکم اچھی طرح پیش آئے۔ شہر کے سبزہ زار ہائے مطرا اور لازہیں بتان خود آرا نے بھی ان کا دل لیا ہوا۔ لیکن پنشن کا قضیہ خاطر خواہ ملے نہ ہو سکا۔ مجبوراً وہ ۱۸۲۹ع میں دلی واپس چہچے۔ ۱۸۳۵ع میں نواب شمس الدین احمد خاں کو ولیم فریڈر کے قتل کے الزام میں پھانسی ہو گئی۔ ان کے مرنے کے بعد فیروز پور جھڑک کی ریاست بنی سرکار ضبط کر لی گئی۔ اس لیے غالب کو ساڑھے سات سو روپے سالانہ کی پنشن دہلی کے کلکٹر کی طرف سے ملنے لگی۔ لیکن انہیں اس سے زیادہ کا حق دار نہیں سمجھا گیا۔ انہوں نے اس فیصلے کے خلاف اپیل یس کی لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ پھر بھی وہ چین سے نہیں بیٹھے۔ سولہ سال تک مقدمات کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ اور بات ہے کہ انہیں کامیابی نہ ہو سکی۔

۱۸۳۲ع میں غالب کو دہلی کالج میں فارسی کی مدرسہ پیش کی گئی مسٹر ٹامسن، جو ان دنوں حکومت ہند کے سکرٹری تھے، انہوں نے یہ دیکھ کر کہ فارسی پڑھانے کا خاطر خواہ انتظام کالج میں نہیں ہے، یہ حکم دیا کہ عربی کی طرح فارسی کا ایک مدرس بھی کالج میں ہونا چاہیے۔ مفتی صدرالدین آزرہ نے اس کام کے لیے غالب، مومن اور صہبائی کے نام تجویز کیے۔ ٹامسن نے مرزا غالب کو دعوت دی۔ غالب ان کے پاس پہنچے۔ لیکن چونکہ وہ ملازمت کی غرض سے آئے تھے۔ اس لیے ان کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی۔ غالب کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ اس وقت ان کی مالی حالت اچھی نہیں تھی، انہوں نے ملازمت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد یہ جگہ مومن کو پیش کی گئی۔ انہوں نے بھی اس کو اپنی شان کے خلاف سمجھا۔ چنانچہ صہبائی فارسی کے استاد مقرر کیے گئے۔

غالب کی زندگی کا سب سے الم فاک واقعہ غالباً ان کی اسیری ہے۔ ۱۸۴۷ع میں وہ قاز بازی کے الزام میں گرفتار کیے گئے اور عدالت نے انہیں چھ ماہ قید باسفت کی سزا دے دی۔ حالی نے لکھا ہے ”کوئوال شہر سے غالب کی دشمنی تھی۔ اس لیے جھوٹا مقدمہ ان کے خلاف بنایا۔“

ہوسکتا ہے یہ بات صحیح ہو۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ غالب کو جوسر اور شطرنج کھیلنے کا شوق تھا۔ اور وہ کچھ بازی بدکھل کھیلے تھے۔ اس زمانے میں بہت سے لوگ ان کے مکان پر اسی غرض سے آتے تھے اور اس زمانے سے جوا کھیلنے لگے۔ مرزا خاں کو نوال کے بعد جب فیض الحسن کو نوال ہوئے تو انہوں نے سختی کی اور قر بازی کے اٹوں کو ختم کرنا چاہا، زد غالب پر بھی پڑی۔ ان کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ چھ مہینے کی سزا ہوئی۔ تین مہینے قید رہے۔ لیکن بالآخر ڈاکٹر اس سول جرجن کی سفارش پر ان کو رہا کر دیا گیا۔ اس واقعے سے غالب کے وقار کو بھی ٹھیس لگی اور ان کی طبیعت پر بھی اس کا بہت برا اثر ہوا۔

اس واقعے کے بعد زیست اور بھی مشکل ہو گئی اور پچیس سال سے غالب جن مالی پریشانیوں کے شکار تھے، ان میں کچھ اور بھی اضافہ ہو گیا۔ ان حالات میں مہبور ہو کر انہوں نے قلعے سے تعلق پیدا کیا اور میان کالے خاں صاحب اور حکم احسن اللہ خاں کی سفارش پر ان کی رسانی بہادر شاہ تک پہنچی اور انہوں نے تیسری خاندان کی تاریخ لکھنے کا کام ان کے سپرد کیا۔ اس طرح وہ قلعے میں باقاعدہ ملازم ہو گئے اور حکیم احسن اللہ خاں کی مدد سے انہوں نے 'سہر نیر روز' لکھنے کا کام شروع کر دیا۔ چھاس روپے تنخواہ مقرر ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قلعے میں ذوق کا طوطی بولتا تھا اور وہ بادشاہ کے استاد تھے۔ ۸۵ء ع تک وہ اس منصب پر مامور رہے۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد یہ منصب غالب کے سپرد ہوا اور وہ ۸۵ء ع تک اس خدمت پر مامور رہے۔ اسی سال غدر ہوا۔ مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ انگریزوں کا اقتدار قائم ہوا۔ بہادر شاہ رنکون بھج دے گئے۔ اور غالب کو داغ فران صحبت نسب کی جلی ہوئی شمع کی طرح اجڑی ہوئی دلی میں رہنا پڑا۔

غدر اور اس کے بعد کا زمانہ غالب کے لیے بڑی پریشانی کا زمانہ تھا۔ غالب نے اپنی ذاتی پریشانیوں کے علاوہ اس زمانے میں ایک حکومت، ایک تہذیب، ایک معاشرت اور ایک نظام فکر کو اجڑنے ہوئے دیکھا۔ 'اسنپو' کے علاوہ اپنے خطوط میں بھی انہوں نے ان حالات کا نام کیا ہے۔

اس ہنگامے نے زندگی کے سارے نظام کو دوہم برہم کر دیا تھا۔ چنانچہ غالب کی آمدنی کے تمام ذرائع بند ہو گئے۔ امراؤ یکم کاکچہ وظیفہ

ضیاء الدین احمد خاں نے اپنی کوشش سے منور کروا دیا تھا۔ اسی سے گذر ہمسر ہوتی تھی۔ کچھ رام پور سے مل جاتا تھا۔ غدر کے بعد رام پور کا دربار غالب کا سب سے بڑا سہارا ثابت ہوا۔ نواب یوسف علی خاں نے انہیں بار بار رام پور آنے کی دعوت دی۔ بالآخر وہ جنوری ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے اور وہاں مارچ تک قیام بھی کیا۔ اسی سال ان کی پٹنہ، جو غدر کی وجہ سے بند ہو گئی تھی، بحال ہوئی اور ۱۸۶۳ء میں دربار و خدمت بھی جاری ہو گیا۔

لیکن اب ان کی صحت جواب دے چکی تھی۔ عرصے سے بیمار تھے۔ یربانیوں اور غموں نے اور بھی صحت کو خراب کر دیا۔ عمر بھی خاصی ہو چکی تھی۔ چنانچہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو انتقال کیا۔

حیات غالب کے ان واقعات کی تفصیل، ان کے بارے میں لکھی ہوئی پر کتاب میں مل جاتی ہے۔ حالی کی 'یادگار غالب' پہلی کتاب ہے جس میں نہ صرف ان کی زندگی کے واقعات کو سلینے سے یک جا کیا گیا ہے بلکہ ان کی شخصیت کی بھی زندگی سے بڑی ہی بھر پور تصویر کھینچی گئی ہے۔ حالی کی 'یادگار غالب' کے بعد اگرچہ کچھ اور کتابیں بھی غالب کی حیات اور شخصیت پر لکھی گئی ہیں لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ 'یادگار غالب' ان سب میں منفرد نظر آتی ہے۔ بلکہ شاید یہ کمنا زیادہ صحیح ہے کہ حالی کے بعد جن لکھنے والوں نے غالب کی شخصیت اور شاعری پر قلم اٹھایا ہے، انہوں نے ضرور حالی کی خونہ چینی کی ہے اور اسی چراغ سے اپنا چراغ جلایا ہے۔ یا پھر خود غالب کی تحریروں کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ جہاں تک حالی کی 'یادگار غالب' کے منفرد ہونے کا معاملہ ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ حالی نے غالب کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ وہ ان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ وہ ان کے ہم مشرب نہ تھے لیکن ان کے پرستار ضرور تھے۔ وہ غالب کے ہم نوا نہ تھے لیکن ان کی باتوں سے انہیں دل چسپی ضرور تھی۔ غالب کے ساتھ ان کا زاویہ نظر ہمدردانہ تھا۔ اسی لیے حالی نے اس کتاب میں جو سواد جمع کیا ہے، اس تک دوسروں کی رسائی ناممکن تھی۔ اور جو تفصیلات انہوں نے غالب کی حیات، شخصیت اور شاعری کے بارے میں پیش کی ہیں، ان کو پیش کرنے کا کسی دوسرے

شخص کو خیال بھی نہیں آ سکتا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حالی کی اس کتاب کو غالب کی شخصیت پر حرف آخر کی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ غالب اور حالی کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک رند شاہد باز و بادہ خوار کی باتیں ایک زاہد خشک کی سمجھ میں کس طرح آ سکتی ہیں؟ اور اگر سمجھ میں آ بھی جائیں تو وہ ان کو بیان کس طرح کر سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ حالی نے غالب کی جو تصویر پیش کی ہے وہ مکمل نہیں ہے، ادھوری اور نامکمل ہے۔ غالب کے اندر جو طوفان موجزن تھا حالی کو اس کی خبر نہیں تھی۔ بس یہی کہیں 'یادگار غالب' میں کائنات کی طرح کھٹکتی ہے۔

حالی کے بعد غالب کی حیات پر تین اہم کتابیں شائع ہوئیں۔ ایک تو مولانا غلام رسول سہر کی 'غالب'، دوسری شیخ محمد اکرام کی 'غالب' جو اب 'آثار غالب' کے نام سے بھی شائع ہوئی ہے اور تیسری مالک رام کی 'ذکر غالب'۔ یہ تینوں کتابیں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ سہر صاحب نے بڑی محنت اور سلیقے سے غالب کے خطوط اور دوسری تحریروں کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی کے واقعات کو مرتب کیا ہے۔ اکرام صاحب نے بڑی تحقیق اور تلاش و جستجو کے بعد ان کی زندگی کے واقعات کو بیان کیا ہے۔ لیکن ان میں سے کسی ایک کو بھی غالب کی باقاعدہ سوانح عمری نہیں کہا جا سکتا۔ 'یادگار غالب' بے شک کسی حد تک ان کی سوانح عمری معلوم ہوئی ہے لیکن سوانح عمری کی حیثیت سے اس میں بنیادی خامی یہی ہے کہ حالی بے تکلفی کے ساتھ کھل کر غالب کی حیات اور شخصیت کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہتے تھے، نہیں کہہ سکے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ حالی کے مزاج کی ثقاہت اس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ دوسرے ان کے تعلقات غالب سے برابری کے نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہت سی ایسی باتوں کو نظر انداز کر گئے ہیں جن کے بغیر غالب کی شخصیت کی تصویر مکمل نہیں ہو سکتی۔ پھر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس میں اپنے آپ کو پابند کر لیا ہے اور حد درجہ محتاط رہنے کی کوشش کی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ غالب کی حیات اور شخصیت کے بڑے سے پہلو اس کتاب میں بھی دب کر رہ جاتے ہیں۔

غالب کی زندگی کے واقعات کو مختلف لکھنے والوں نے بیان کر دیا ہے۔

لیکن ابھی ان میں سے بیشتر واقعات پر مزید تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے ۔ تاکہ ان کی تفصیل سامنے آئے۔ اب تک غالب پر جو کام ہوا ہے ، اس کا ساخذ یا تو غالب کے خطوط ہیں یا ان کے بعض معاصرین کے بیانات ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ غالب کے بارے میں ، جہاں جہاں ابھی جو ریکارڈ موجود ہے ، اس کو ایک منصوبے کے تحت کھینکالا جائے اور اس میں سے ضروری مواد نکال کر غالب کی زندگی کے حالات کو ایک مربوط صورت میں مرتب کیا جائے تاکہ ان کی صحیح تصویر سامنے آ سکے ۔ اس وقت تک غالب کی زندگی اور شخصیت پر جو کام ہوا ہے اس میں بیشتر بائیں ایک دوسرے سے لے کر دہرائی گئی ہیں ۔ جتنے جتنے کچھ لوگوں نے بعض نئی باتوں کا سراغ ضرور لکھا ہے لیکن یہ نئی باتیں کسی مربوط صورت میں یک جا نہیں ملتی۔ یہ مواد تو مضامین و مقالات کی صورت میں جگہ جگہ بکھرا ہوا ہے اور موجودہ ناسازگار حالات میں بہت سے افراد کی دسترس سے باہر ہے ۔ اس نئے مواد کو ایک نو یک جا کرنے کی ضرورت ہے ، دوسرے یہ ابھی ضروری ہے کہ اس کو سامنے رکھ کر حیات غالب کے مختلف واقعات کو ایک لڑی میں پرویا جائے اور ان کی بنیاد پر ان کی زندگی کے بارے میں ایک ایسے مربوط کتاب مرتب کی جائے جس میں حیات غالب کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ہو ۔

حیات غالب کے جن معاملات و مسائل پر تحقیق کی ضرورت ہے ان میں سب سے پہلے تو ان کے حسب نسب اور خاندان کا مسئلہ ہے ۔ اب تک اس موضوع پر جن لوگوں نے لکھا ہے ، انہوں نے اس سلسلے میں غالب کی کہی ہوئی باتوں کو تسلیم کر لیا ہے ۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ غالب ایک طرح کے احساس برتری میں مبتلا تھے ۔ یہ احساس برتری اس انحطاط و زوال کی پیداوار تھا ، جس میں سے ہو کر غالب کی زندگی کا قافلہ گزرا تھا ۔ وہ سیاسی اعتبار سے ایک زوال آبادہ معاشرے کی پیداوار تھے ۔ ایک ایسے معاشرے میں افراد کا اس احساس برتری کا شکو ہونا ضروری ہے ۔ خاص طور پر ایسے افراد کا جن کی نسلی وجاہت اور خاندانی شرافت ناسازگار معاشی حالات کے باعث آندھیوں کی زد پر ہو ۔ اسی صورت حال نے غالب کو نرگسیت کا شکار کر دیا ۔ اس لیے انہوں نے جو کچھ اپنی نسل اور خاندان کے بارے میں کہا ہے

اس کو تسلیم کر لیتا علمی اور تحقیقی اعتبار سے کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ وسط ایشیا میں ترکوں کی تاریخ اور ان کے خلاف خاندانوں کے مابعد کو سامنے رکھا جائے اور اس نسل کے جو لوگ ہندوستان آنے کی تحصیل کا سراغ لگایا جائے تو اس سلسلے میں بعض بڑی ہی دلچسپ اور قابل قدر معلومات کا سرمایہ فراہم ہو سکتا ہے اور غالب کی نسل اور خاندان کے بارے میں بعض اہم پہلو سامنے آسکتے ہیں۔

غالب کے دادا فوقان بیگ خاں ہندوستان آئے لیکن اس معاملے میں اختلاف ہے کہ وہ شاہ عالم کے عہد میں اس سرزمین پر پہنچے یا چہ شاہ کے زمانے میں۔ پھر ان کی زندگی کے حالات کی تفصیل بھی کہیں نہیں ملتی۔ صرف اتنی معلومات فراہم ہوتی ہے کہ وہ پہلے پنجاب میں ٹھہرے۔ یہاں معلول ملازمت ملی۔ پھر دلی چلے گئے۔ لیکن دلی میں ان کے دن کیسے گزرے؟ انہوں نے شادی کہاں کی؟ ان کی ازدواجی زندگی کیسی تھی؟ ان باتوں کے متعلق پوری طرح علم نہیں ہوتا۔ ان کی ملازمتوں کے بارے میں تو تھوڑا بہت علم ہو جاتا ہے لیکن ان کی خاندانی اور نجی زندگی کے بارے میں ابھی بہت کچھ بردہ" خفا میں ہے۔ غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے حالات بھی صرف چند سطروں میں ملتے ہیں۔ ان کے بارے میں بھی تفصیلات کا علم نہیں ہوتا۔ یہی حال غالب کے نانا غلام حسین خاں کھیدان اور دوسرے عزیزوں کا ہے۔ ان کے متعلق بھی بہاری معلومات بہت محدود ہے۔ غالب کی زندگی میں ان فرزگوں کی جو اہمیت ہے وہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی جائے۔ کیونکہ غالب کی زندگی اور شخصیت پر ان سب کے اثرات بہت گہرے ہیں۔

غالب نے بچپن کا جو زمانہ اکبر آباد میں گزارا ہے وہ ان کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے لیکن اس زمانے کے بارے میں جو معلومات اب تک لکھنے والوں نے فراہم کی ہے وہ ناکافی ہے۔ اس زمانے میں وہ یتیم اڑائے، چوسر اور شطرنج کھیلتے اور نوجوان دوستوں کے ساتھ اچھا وقت گزارتے تھے۔ یہ لوگ کون تھے؟ غالب پر اس زمانے میں کن لوگوں کے اثرات گہرے ہوئے؟ ان کی تعلیم کہاں کہاں اور کسی طرح ہوئی؟ وہ واقعی نظیر اکبر آبادی کے مکتب میں تعلیم حاصل کرتے

کے لیے گئے؟ مولوی معظم، جن کے سامنے انہوں نے زانوئے ادب تہ کیا، وہ کون بزرگ تھے؟ اور ان کی علمی استعداد کیا تھی؟ برآمد ہوا عبدالصمد کون تھا؟ کہاں گیا؟ اور اس کی زندگی کس طرح گزری؟ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں ہم ابھی زیادہ نہیں جانتے۔ جو حالات ہم تک پہنچے ہیں ظاہر ہے، کہ ہمیں ان کے مقابلے میں زیادہ تفصیل کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ جس زمانے میں غالب نے اکبر آباد کی سر زمین پر ہوش سنبھالا اور ان کا ذہنی نشو و نما ہوا اس وقت وہاں کا علمی اور ادبی ماحول کیسا تھا۔ تفسیر اکبر آبادی تو وہاں موجود تھے لیکن ان کے علاوہ اور کون کون سے شاعر تھے جن سے غالب نے اثر قبول کیا؟ وہ کس کے شاگرد ہوئے؟ اور اگر شاگرد نہیں ہوئے تو کیوں نہیں ہوئے؟ ان تمام چٹوٹوں پر بھی اچھا تحقیقی کام ہونا چاہیے۔ پھر شاعری کے علاوہ اکبر آباد میں اس آسان اور سادہ نثر نگاری کی بھی ایک روایت موجود تھی۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۰۲ء میں اکبر آباد کے ایک لکھنے والے حکیم انیس بھٹی شرق اکبر آبادی نے ایک داستان 'السانہ' عشق کے نام سے لکھی اور اس میں دل و من کے قصے کو آسان، سادہ اور پامناورہ اردو میں بیان کیا۔ اس داستان کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن کے کتب خانے میں موجود ہے۔

غالب کی زندگی کے حالات سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ مالی پریشانیوں میں گزرا ہے اور وہ ہمیشہ غم دوراں کا شکار رہے ہیں۔ ان حالات کے سامنے میں انہوں نے کس طرح زندگی گزاری ہے اور اس کے کیا اثرات ان پر ہوئے ہیں؟ فرض انہوں نے کس کس طرح کن لوگوں سے لیا ہے؟ اور اس فرض کی اذالہ کی کس طرح کی ہے؟ یہ بھی تحقیقی کا ایک اہم موضوع ہے۔ ابھی تک اس موضوع پر بھی کوئی خاص کام نہیں ہوا۔

اس کے علاوہ پشٹن کا معاملہ بہ ذات خود بھی تحقیقی کا ایک اہم مسئلہ ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے کلکتہ کا جو سفر کیا ہے، اس کے بارے میں ابھی ابھی تک مکمل معلومات فراہم نہیں ہو سکی ہے۔ یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دلی سے کان پور ہوئے ہوئے لکھنؤ گئے تھے، وہاں

ان کی آویہکت ہوتی تھی لیکن آغا میر سے ان کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لکھنؤ میں ناسخ اور آتش کا طوطی بولتا تھا۔ ناممکن ہے کہ غالب سے لکھنؤ میں ان کی ملاقات نہ ہوئی ہو۔ لیکن غالب کے متعلق ہر لکھنے والے نے اس موضوع پر کوئی ایسی بات نہیں کہی جس کی بنیاد تحقیق پر استوار ہو۔ پھر بنارس میں غالب کا وقت کس طرح گزرا؟ کنگدہ میں انہوں نے کس طرح دن گزارے؟۔ ان کی مخالفت کیوں ہوئی؟ اور نتائج کیا نکلے؟۔ یہ تمام باتیں بھی مزید تحقیق کا تقاضا کرتی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ غالب کی ذہنی کی زندگی کے بارے میں لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن اس زمانے کی سیاسی اور مذہبی ہنگامہ آرائیوں میں ان کا کیا حصہ تھا؟۔ مولانا سید احمد بریلوی کی تحریک کی مخالفت اور مولانا فضل حق خیر آبادی کی حمایت میں انہوں نے کیا کیا کچھ کیا؟ ذوق، مومن، شیفہ اور بہادر شاہ سے ان کے جو روابط تھے اس کے بارے میں بھی بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے۔

پھر ان کے قید ہونے کا واقعہ، ان کا مقدمہ، قلعے میں ان کی باریابی قدر کے بعد ان کا زندگی اور اس کے معاملات و مسائل یہ تمام پہلو غالب کی زندگی میں خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے بارے میں بھی اب تک جو معلومات فراہم کی گئی ہے، اس کو دیکھ کر بھی خاصی تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

غرض غالب کی زندگی کے سب شار پہلو ابھی ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک تحقیق کا ایک ایسا موضوع بن سکتا ہے۔ جب تک ان موضوعات پر تحقیق کے بعد تفصیلی معلومات فراہم نہیں ہوتی، غالب کی زندگی کا مطالعہ نامکمل رہے گا اور ان کی صحیح تصویر ہمارے سامنے نہیں آ سکی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب پر اب تک جو کام ہوا ہے وہ اتنی جگہ اہم ہے اور غالب اس لحاظ سے غرض قصمت ہیں کہ ان پر اس وقت تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اس میں تحقیقی وزن بہت کم ہے اور اس کا بیشتر حصہ غیر مربوط، نشہ اور نامکمل ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ غالب پر ابھی تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جس کو ان کی مکمل اور مستند سوانح حیات کہا جائے۔ بات یہ ہے کہ مکمل اور مستند سوانح حیات حالات و واقعات کی تحقیق کے

بغیر نہیں لکھی جا سکتی ۔ لیکن ظاہر ہے کہ صرف حالات اور واقعات کا جمع کر دینا ہی سوانح حیات نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے ۔ غالب کا مطالعہ آج ایک ایسی ہی سوانح حیات کے لیے چشمِ براہ ہے جس میں ان کی زندگی کے حالات و واقعات کی تحقیق اور تفصیل کے علاوہ بھی بہت کچھ ہو !

غالب کے
حالات زندگی
اور شخصیت

غالب ایک ترک تھے اور انہوں نے اپنے ایک ترک ہونے پر فخر کیا ہے۔ کلیات فارسی میں ان کے کئی قطعات ایسے ملتے ہیں، جن میں انہوں نے اپنے ترک ہونے کی وضاحت کی ہے اور اپنی نسل اور خاندان کے بیان میں جو بخیر، لہجہ اختیار کیا ہے اس سے ان کے مزاج اور اتحاد ملیح پر روشنی پڑتی ہے۔

کہتے ہیں :

غالب از خاک پاک تورانم	لاجرم در نسب لڑہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی	بسترگان قوم ہیوندیم
ایکیم از جامعہ التراک	در تمامی زمانہ دہ چندیم
من آہائے ما کشاورزی ست	سروخان زادہ سمرقندیم
ور زمین سخن گزار دہ	خود چہ گویم تا چہ و چندیم
فیض حق را کمینہ شاگردیم	عقل کل را بیہنہ فروزدیم
ہم بہ تابش برق ہم نقسیم	ہم بہ بخشش ہاہر مانندیم
ہم تلاشے گدہ ہست نیروزم	ہم معاشے گدہ نیست غرضدیم
ہم بر خویشی ہمی گریم	ہم ہر روزگار می خشدیم

ساقی جو من ہشتی و افراسیابم
دانی کہ اہل گوہرم از دودہ جم ست
میراث جم کہ می بود اینک بہ من میار
زای بس رسد ہشت کہ میراث آدم ست

اس کے علاوہ غالب نے اپنے خودنوشت حالات جو ریٹیکن کے ”تذکرہ“ مظهر العجائب کے لیے لکھے تھے ، اس میں بھی اپنی نسل اور خاندان کی تفصیل اس طرح پیش کی ہے :

”اسد اللہ خان عرف مرزا نوشہ ، غالب تخلص ، قوم کا ترک سلجوق سلطان برکیارق سلجوق کے اولاد میں ہے ۔ اس کا دادا قوقان بیگ خان شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دلی میں آیا۔ پچاس گھوڑے اور تقارہ و نشان سے بادشاہ کا نوکر ہوا ۔ پھانسیو کا برگہ جو اب سمرقند کی ایک گورنر کے سرکار سے ملا تھا وہ اس کی جاداد میں مقرر تھا ۔ باپ اسد اللہ خان مذکور کا دلی کی ریاست چھوڑ کر اکبر آباد میں جا رہا ۔ اسد اللہ خان اکبر آباد میں پیدا ہوا ۔ عہد اللہ بیگ خان الوری میں راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا اور وہاں ایک لڑائی میں بڑی بہادری سے مارا گیا ۔ جس حال میں کہ اسد اللہ خان مذکور کو پانچ سو برس کا تھا اس کا حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خان مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا ۔ ۸۰۳ ع میں جب جرنیل لیک صاحب اکبر آباد میں آئے تو نصر اللہ بیگ خان نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی ۔ جرنیل صاحب نے چار سو سوار کا بریگیڈیر کیا ، اور ایک ہزار سات سو کی قتلخواہ مقرر کی ۔ پھر جب اس نے اپنے زور بازو سے سوئٹک سونسا دو ہر گئے بھرت ہو کر کے قریب ہولنگر کے سواروں سے چھین لیے تو جرنیل صاحب نے وہ دونوں ہر گئے بہادر موصوف کو یہ طریق استعراو عطا فرمائے ۔ مگر خان موصوف جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے کے بعد بہ مرگ ناگاہ پاتھی پر سے گر کے مر گیا ۔ جاگیر سرکاری بھی بازیافت ہوئی اور اس کے عوض نقدی مقرر ہو گئی ۔ اور شرکا کو دے دلا کر ساڑھے سات سو روپیہ سال اس شخص کی ذات کو اسی زومعانی سے ملتے ہیں۔“

خواجہ قمر الدین راقم نے غالب کے نسب اور خاندان کی جو تفصیل بیان کی ہے ۔ وہ بھی ہر اعتبار سے نہایت دلچسپ ہے ۔ لکھتے ہیں :

”واضح ہو کہ بہاری اور غالب کی اصل نژاد سلاطین توران میں ہے۔ جس زمانے میں تورانی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا، بیخ بیاد بھی نہ رہی تو ہمارے خاندان کے لوگ اس طوائف الملوک میں جا بجا منتشر ہو گئے اور جس نے جہاں امن پائی جا بسا۔ چنانچہ کوئی سو پچاس پشت کے بعد اس خاندان میں دو برادران حقیقی جن کا نام رافع کو یاد نہیں ان کی اولاد میں دو فرزند تولد ہوئے۔ بڑے بھائی کا بیٹا ترسم خاں اور چھوٹے بھائی کا بیٹا رستم خاں۔ بنوڑ یہ دونوں بھائی عمر شباب کو نہ پہنچے تھے کہ ان کے والدین فوت ہو گئے۔ یہ دونوں کسی حالت میں اضلاع سمرقند میں آکر آباد ہوئے۔ پھر ایک مدت کے بعد بدخشاں میں آکر رہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ سر زمین ترکستان میں نور اسلام مثل یزوتو خورشید منور ہو رہا ہے۔ یہ دونوں بھائی بھی شرف اسلام سے ایضاً ہائے ہوئے اور ترسم خاں نے بدخشاں کے کسی شریف خاندان میں اپنا نکاح بیاہ کر لیا۔ ترسم خاں کی اولاد میں تین دختر اور دو فرزند پیدا ہوئے۔ یعنی ایک فرزند کا نام نصر اللہ بیگ خاں دوسرے کا عبداللہ بیگ خاں تھا۔ پھر ایک عرصے کے بعد ترسم خاں نے وفات پائی۔ ان کی اولاد مدت تک بدخشاں میں رہی۔ مگر رستم خاں بھائی کے رنج میں بدخشاں میں نہ رہے۔ بخارا میں آ گئے۔ جہاں آکر تھوڑے عرصے کے بعد رستم خاں بھی ایک دولت مند گھر خواجگان جشت میں، جو خواجہ عیبد اللہ امراری کی نسل میں تھے، بیاہ گئے۔ ان کے ہاں قطب الدین خاں فرزند پیدا ہوئے۔ بنوڑ قطب الدین خاں سن بلوغ کو نہ پہنچے تھے کہ ان کے والدین گزر گئے۔ اب قطب الدین خاں لفظ خواجگی سے ممتاز ہوئے۔ جہاں سلسلہ ذات بہارا اور غالب کا جدا ہو گیا۔ رستم خاں کے بعد خواجہ قطب الدین کا اسی خاندان میں عقد ہوا۔ ان کے ہاں ایک فرزند خواجہ حاجی خاں تولد ہوئے۔ ان کی عمر قریب بلوغ کے پہنچی تھی کہ والدین کا انتقال ہو گیا۔ یہ خبر سن کر نصر اللہ بیگ خاں اور عبداللہ بیگ خاں مع اپنی بہنوں کے پہنچے کے پاس بخارا میں آئے۔ کچھ

دن بھٹجے کے شریک حال رہے۔ بھر بھٹجے سے راز دل بیان کیا اور مشورہ لیا کہ ہمارا قصد ہے کہ ہم ہندوستان جائیں اور سرکار شاہی میں ملازمت کریں۔ تم کیا صلاح دیتے ہو؟ خواجہ حاجی خاں جو کہ نوجوان شاہی پیشہ تھے، ہندوستان کے شوق میں چچا کی رائے کے شریک ہو گئے کہ اچھا میں آپ کے ہمراہ چلوں گا۔ غرض یہ کہ چچا بھٹجے سے متعلقین، کسی قدر جمعیت ذاتی ہمراہ لے کر، بخارا سے روانہ ہوئے۔ اول سمرقند میں آئے۔ وہاں ایک امیر زادے شریف قوم مرزا جیون بیگ خاں چلتا ہے ملاقات ہوئی۔ اثنائے گفتگو میں سفر کا ذکر آ گیا۔ مرزا جیون بیگ خاں بھی چلتے کو تیار ہو گئے اور مع انہی زوجہ امیر النساء کے ہمراہ ہو گئے۔ غرض یہ ولایتی قافلہ زن و مرد ہندوستان میں آیا اور شہر شاہجہان آباد میں مقیم ہوا۔ یہ زمانہ شاہ عالم بادشاہ کا تھا اور ملک کی حالت ابتر تھی۔ ”سنگالہ کا ملک انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ اور اودھ کا ملک صوبہ دار اودھ نے دیا لیا تھا۔ ادھر قوم مرہٹہ ہر طرف ملک کو تاراج کر رہی تھی۔ نواب نجف خاں ذوالفقار الدولہ وزیر سلطنت تھے۔ مگر یہ لفظی راج نہ ہوئی تھی۔ یہ تازہ وارد قافلہ وزیر اعظم سے ملا۔ وزیر ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اور ان سب کو نوکر رکھ لیا۔ اور ان کی بسر اوقات کے لیے ایک پرگنہ بھانسو، جو علی گڑھ کے ضلع میں ہے، جاگیر میں دیا۔ اور کسی قدر شاہی فوج بھی مقرر کر دی کہ مرہٹوں کی روک تھام بھی کرتے رہو۔ کئی برس یہ قافلہ شاہی ملازم رہا۔ ہنوز کوئی کار نمایاں ان سے ظہور میں نہ آیا تھا کہ نواب نجف خاں کا وزیر اعظم سے کسی بات پر بکڑ ہو گیا۔ یہ سب مغل زادے نوکری چھوڑ کر اکبر آباد چلے آئے، وہاں رہنے لگے۔ اتفاق سے بھاؤ راؤ سندھیا نے ان کا حال سن کر اپنے پاس بلا لیا اور نوکر رکھ لیا۔ نصر اللہ بیگ خاں کو پورے کمپو کا امیر مقرر کیا اور خواجہ حاجی خاں کو ایک رسالہ کا رسالدار کیا اور ایک پوری ہاٹن کی کمیدانی مرزا جیون بیگ خاں

کو ملی۔ نصر اللہ بیگ خان نے اپنے چھوٹے بھائی مرزا عہد اللہ بیگ خان کو گھر پر چھوڑا تھا کہ متعلقوں کی نگرانی کریں۔ دوسرے مرزا عبداللہ بیگ خان نہایت متقی عبادت گزار تھے۔ خود بھی گھر پر رہ گئے۔۔۔۔۔ ان مغلوں نے اکبر آباد میں سکونت اختیار کی تھی۔ ایک عرصے کے بعد نصر اللہ بیگ خان نے دہلی میں آکر اپنا عقد نواب احمد بخش خان کی بہن سے کیا۔ اور پھر اکبر آباد میں آ گئے۔ مگر ان کی زوجہ تھوڑی مدت میں مر گئیں۔ پھر نصر اللہ بیگ خان نے اپنے چھوٹے بھائی کا عقد مرزا غلام حسین بیگ اکبر آبادی کی بیٹی سے کیا۔ اس کے شکم سے دو فرزند ایک اسد اللہ خان دوسرے یوسف بیگ خان پیدا ہوئے۔ یہ دونوں اس وقت اپنے نانا کے گھر میں پرورش پائے تھے۔ اس اثنا میں مرزا عبداللہ بیگ پر ایک ناگہانی واقعہ گزرا اور وہ فوت ہو گئے۔“

ان اقتباسات سے غالب کی نسل، اُن کے خاندان اور آپا و اجداد کے متعلق اچھی خاصی معلومات فراہم ہو جاتی ہے۔ لیکن اُن میں سے ہر بیان مزید تحقیق کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ جو تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس کی بنیاد تاریخی حقائق پر استوار نہیں ہے۔ بقول مولانا غلام رسول مہر :

”ان بیانات کی تاریخی حیثیت کے متعلق وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس لیے کہ محققین کے نزدیک تو یہ بھی ثابت شدہ بات نہیں کہ سلجوق انھی تورانیوں کی نسل سے تھے جن کی عظمت و برتری کا افسانہ ’شاہ نامہ‘ نے ستایا ہے۔ یہ نسب نامہ غالباً اس وقت بنایا گیا جب منجر نے خلیفہ بغداد کی لڑکی سے نکاح کی خواہش کی تھی اور مقصد یہ تھا کہ سلجوقیوں کے خاندان کو قدیم و باجبروت پادشاہوں کا خاندان دکھلایا جائے بہر حال

۱۔ خواجہ قمر الدین راقم : مرزا غالب کا نسب نامہ۔ احوال غالب :

غالب کے یہ دعاوی پر لحاظ سے درست ہوں یا نہ ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ اونچے درجے کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کے آبا و اجداد کا محبوب ترین مشغلہ تیغ زن و سپہ گری تھا۔^{۱۱}

غالب نے اپنی نسل، خاندان اور آبا و اجداد پر جو فخر کیا ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ان کا تعلق ایک اونچے درجے کے خاندان سے تھا، اور ان کے آبا و اجداد اہم شخصیتوں کے مالک تھے۔ ان کے پردادا قوکان بیگ خان جب اس سر زمین پر آئے تو انہیں اس وقت حکمرانوں نے معقول ملازمت دی اور بلند منصب عطا کیا۔ پھر ان کے والد عبداللہ بیگ خان بھی ہمیشہ اچھے عہدوں پر فائز رہے اور انہیں بھی مختلف حکمرانوں کی طرف سے اعلیٰ منصب ملا اور جاگیریں بھی دی گئیں۔ اگرچہ حوادث زمانہ نے ان چراغوں کو جلد ہی بجھا دیا لیکن ان کی یاد ہمیشہ غالب کے دل میں روشنی اور گرمی پیدا کرتی رہی۔ پھر ان کے دادا، والد اور چچا کی شادیاں جن خاندانوں میں ہوئیں، وہ بھی اونچے درجے کے تھیں۔ اس لیے غالب کے یہاں خاندانی عظمت اور ریاست و امارت کا احساس کچھ اور بھی شدید ہوا۔ لیکن اس احساس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ غالب نے جس زمانے میں آنکھ کھولی، وہ سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی اعتبار سے ایک انحطاط و زوال کا زمانہ تھا۔ اس انحطاط و زوال کی وجہ سے خاندانی عظمتوں کے چراغ آندھیوں کی زد پر تھے اور ریاست اور امارت کی شمعیں بھی جھلملا رہی تھیں۔

اس صورت حال نے افراد میں نسلی برتری اور خاندانی عظمت کے احساس کو بڑھایا اور ریاست و امارت کے خیال میں اضافہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے ان تمام باتوں پر فخر کرنے کو اپنا شعار بنا لیا۔ انحطاط و زوال کے زمانے میں افراد کی انفرادی اور اجتماعی نفسیات یہی صورت اختیار کرتی ہے۔

غالب کے یہاں نسلی برتری اور خاندانی عظمت کا احساس بھی اسی صورت حال کا مظہر ہے !

غالب ۸ رجب ۱۲۱۲ھ یعنی ۲ دسمبر ۱۷۹۷ء کو اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام، مرزا عبداللہ بیگ خاں تھا، اور اُن کی والدہ کا نام عزت النساء بیگم تھا۔ غالب نے انہیں کے سائے میں پرورش پائی لیکن ابھی وہ پانچ سال ہی کے تھے کہ اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ وہ ایک لڑائی میں مارے گئے۔ والد کی وفات کے بعد غالب کی پرورش اُن کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں نے کی۔ وہ اس زمانے میں مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد میں صوبہ دار تھے۔ پھر اُن کے خسر نواب احمد بخش خاں کی سفارش پر لارڈ لیک نے انگریزی فوج میں رسالہ داری کے عہدے پر اُن کا تقرر کرا دیا۔ لیکن وہ بھی ۱۸۰۶ء میں ایک لڑائی میں مارے گئے۔ غالب کی عمر اس وقت صرف نو سال تھی۔ اس طرح غالب نے اس جھوٹی سی عمر میں دو گہرے حدسے اٹھائے۔ ایک نو پانچ سال کی عمر میں اپنے والد عبداللہ بیگ خاں کی وفات پر یتیمی کا صدمہ اور پھر اپنے چچا نصر اللہ بیگ خاں کی وفات پر لوہال کی عمر میں ایک دوسرا صدمہ جو یتیمی کے حدسے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ کیونکہ چچا کی حیثیت بھی اس وقت اُن کے لیے باپ ہی کی تھی۔ غالب کی شخصیت پر ان واقعات کا زندگی بھر گہرا اثر رہا ہے۔ چنانچہ اپنی تحریروں میں جگہ جگہ ان واقعات کو حسرت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ باپ اور چچا کے انتقال کے بعد انہیں والی الوری کی طرف سے پشن ملتی تھی۔ چنانچہ راجہ شیو دھیان سنگھ والی الوری کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔ اس میں یتیمی کے واقعات کا ذکر اس طرح کیا ہے :

ژان پس کہ گشت کوہر من در جہاں ہم
ژان پس کہ کشتہ شد پدر بن بہ کارزار
در پنج سالگی شدہ ام چاکر حضور
رتگیں سخن طرازم و دہریں وظیفہ خواہ
دارم بہ گوش حلقہ زنجیاد و پشت سال
اکتوں کہ عمر شصت و سہ سال است در نہار
باید شنید راز زاعیان بارگاہ
باید شفت قصد زہیران آن دیار
کافی بود مشاہدہ، شاید ضرور نیست
در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار

چند خطوں میں یہی ان واقعات کا ذکر نہایت حسرت آمیز لہجے میں ملتا ہے۔ لکھتے ہیں :

”باپ میرا عبد اللہ بیگ خان لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کو نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خان کا نوکر ہوا۔ تین سو سواروں کی جمعیت سے ملازم تھا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خالہ جنکی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بنناور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کی لڑائی میں مارا گیا۔

نصر اللہ بیگ خان میرا حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبے دار تھا۔ اس نے مجھے بالاً۔ ۸۰۶ء میں چرنیل لیک کا غل ہوا صوبہ داوری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر لیک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو چرنیل لیک نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سوار کا پرکیشہ مقرر ہوا۔ ایک ہزار روپیہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر حین حیات۔ علاوہ مرزبان کے نہیں کہ بہ مرگ ناکہ مر گیا۔ رسالہ برطرف ہو گیا۔ ملک کے عوض نقدی ہو گئی وہ اب تک پاتا ہوں۔“

(خط بہ نام منشی حبیب اللہ ذکا)

”میں باج برس کا تھا کہ باپ مرا۔ نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکاہ حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خان مرحوم دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے۔ انہوں نے نہ دے مگر تین ہزار روپے سال۔ (خط بہ نام چودھری عبدالغفور خان سرور)

”پنج سال از عمر من گزشت کہ پدر از حرم سایہ پر گرفت۔ ہم من نصر اللہ بیگ خان چوں خواست کہ مرا بہ ناز پرورد، کہ مرگش فراز آمد۔ کیا بیش پنج سال بعد گزشتن برادر منیں بے بردار برداشت و مرا دریں خرابہ تنہا گذاشت و این حادثہ کہ مرا نشان جان گدازی و گردوں را کہینہ بازی بود در سال ہزار و ہشت و شش عیسوی ۱۸۰۶ بہ ہنگام صد و شش لشکر آمدنی و کشور کشانی

صمصام الدولہ جرنیل لارڈ لیک صاحب بہادر یروے کار آمد۔ جون عم مرحوم از دولتیان دولت اہل فرنگ بود و با انبویہ چہار صد سوار بہ وکاب صمصام الدولہ (لارڈ لیک) و با سرکشان سرگرم جنگ و ہم از بخشش ہائے سرکار انگریزی دو ہرگاہ سیر حاصل از مضامین اکبر آباد در جاگیر دانست۔ سرکار انگلیشیہ بہ خون ہائے آفتاب کلید تار کدایان را چراغ و مائے نوریان را بہ عوض جاگیر بہ مشاہرہ از خار خار چستجوئے وجہ معاش فراغ بخشید و ما امروز کہ شہارۂ نفس شہاری زندگی چہل و چار رسد بران را بہ غرضتیم و بران ما بہ قانع۔“

(خط بہ نام مولوی سراج الدین احمد خان)
”نصر اللہ بیگ خان مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبے دار ہوا۔ ۱۸۰۳ء میں جب جرنیل لیک صاحب اکبر آباد پر آئے تو نصر اللہ بیگ خان نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی۔ جرنیل صاحب نے چار سو سوار کا ہریگیڈیر کیا اور ایک ہزار سات سو تنخواہ مقرر کی۔ پھر جب اُس نے اپنے زور بازو سے سونک سونسا پر گئے بہادر موصوف کو بہ طریق استمرار عطا فرمائے۔ مگر خان موصوف جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے بعد بہ مرگ ناکہ پاتھیں پر سے گر کر مر گیا۔ جاگیر سرکار میں باز یافت ہوئی اور اُس کے عوض نقدی مقرر ہو گئی۔“

غرض غالب نے اپنی ابتدائی زندگی کے خدمات کو جگہ جگہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ جیسا کہ ان بیانات سے ظاہر ہے یہ تفصیلات پوری طرح صحیح نہیں ہیں۔ ان میں تھقیق کی بہت گنجائش ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غالب نے ان واقعات کے گہرے اثرات قبول کیے ہیں۔ زندگی بھر وہ ان خدمات کو فراموش نہ کر سکے اور یہ خدمات مختلف صورتیں اختیار کر کے اُن کی شخصیت میں اپنے آپ کو نمایاں کرتے رہے۔ اُن کے بہت سے تہرات، جذبات و احساسات اور افکار و خیالات کے پچھلے ابتدائی زندگی کے انہیں خدمات کا ہاتھ نظر آتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ والد اور چچا کے انتقال کے بعد غالب کو مالی اعتبار سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ کیونکہ نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک سے سفارش کی اور انہوں نے غالب اور ان کے بھائی بہنوں کے لیے پنشن کا انتظام کر دیا۔ مالک رام صاحب نے اس کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے :

”نواب احمد بخش خاں کو مرزا نصر اللہ بیگ خاں کی جوان مرگی کا سبب افسوس ہوا۔ انہیں ان چھوٹے چھوٹے بچوں پر خاص طور پر رحم آیا جو چچا کی وفات کے بعد بالکل بے کس ہو کر رہ گئے تھے۔ حناغہ انہوں نے لارڈ لیک سے سفارش کی اور وہاں سے پنشن کا انتظام ہو گیا۔ نواب احمد بخش خاں کو اپنی گوناگون خدمات کے لیے سرکار انگریزی کی طرف سے میوات میں فیروز پور جہرکہ اور مضافات ہوٹل (تھیل فیروز پور جہرکہ) میں نگینہ اور ہوتا پانا وغیرہ کی جاگیر بہ طور استعرا عطا ہوئی تھی۔ اور چونکہ وہ ریاست الور کے وکیل تھے۔ اس لیے مہاراجہ بختاور سنگھ والی الور نے اپنی طرف سے انہیں لوہارو کا ہرگہ دے دیا تھا جو اس سے پہلے الور ہی کا ایک حصہ تھا۔ فیروز پور جہرکہ کی استمراری جاگیر سے متعلق یہ طے پایا تھا کہ اس کے لیے نواب احمد بخش خاں سرکار انگریزی کو پچیس ہزار روپیہ سالانہ ادا کرتے رہیں گے۔

مرزا نصر اللہ بیگ خاں کی وفات پر ان کی حین حیات جاگیر سونکھ اور سولہ سرکار انگریزی نے واپس لے لی اور چار سو سواروں کا رسالہ بھیں توڑ دیا۔ البتہ ان میں سے پچاس سواروں کا ایک دستہ نواب احمد بخش خاں بہادر اور نواب نجات علی خاں بہادر والی جہر کو دے دیا گیا کہ وہ اچھے برقرار رکھیں۔ سرکار کو جب ضرورت ہوگی وہ ان سے مدد طلب کرے گی۔ اب اس دستے کے اخراجات اور مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے ہس ماندکان کی پنشن کے لیے ۳ مئی ۱۸۰۶ء کو حکم جاری کیا گیا کہ نواب احمد بخش خاں اپنی جاگیر کے لیے جو پچیس ہزار روپے سالانہ دینے لگیے، وہ اس شرط پر معاف کیے جائے ہیں کہ آئندہ پندرہ ہزار وہ اسی دستے کی غور و پرداخت پر خرچ کریں اور باقی دس ہزار مرزا مرحوم کے خاندان کو

جانتا تھا کہ تم کون ہو۔ جب یہ جانا کہ تم ناظر ہنسی دھر کے
 ہوئے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند دلہند ہو۔ اب تم کو
 مشق و مکرمل لکھوں تو گنہگار۔ تم کو ہمارے خاندان اور
 اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم ہے۔ مجھ سے سنو !
 تمہارے دادا کے والد عہد نجف خان ہمدانی میں میرے نانا صاحب
 مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق کار تھے۔ جب میرے
 نانا نے نوکری ترکہ کی اور گھر بیٹھے تو تمہارے پردادا
 نے بھی کمر کھولی اور بھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں
 میرے ہوش کے پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا
 تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی ہنسی دھر، خاں صاحب کے
 ساتھ ہیں۔ اور انہوں نے کیتھم کلاں اپنی جاگیر کا سرکار میں
 دعویٰ کیا تو منشی ہنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں۔ وکالت
 اور غناری کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہم عمر تھے۔ شاید منشی
 ہنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس
 برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی۔ باہم شطرنج اور
 اختلاط اور صحبت۔ آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی۔ چونکہ گھر
 ان کا بہت دور نہ تھا۔ اس واسطے جب چاہتے تھے چلے
 جاتے تھے۔ بس ان کے اور ہمارے مکان میں مجھیا رنڈی کا گھر
 اور ہمارے دو کمرے درمیان تھے۔ ہماری حویلی وہ ہے جو اب
 سبھ لکھی چند نے مول لی ہے۔ اس کے دروازے کے سنگین
 بارہ دری پر میری نشست تھی۔ اور پاس اس کے ایک کٹھیا
 والی حویلی اور سلیم شاہ کے کتھے کے پاس دوسری حویلی اور
 کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس کے آگے بڑھ کر
 ایک اور کمرہ کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا اور ایک کمرہ
 کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس کمرے سے ایک کوٹھے
 پر میں ہتک اڑاتا تھا۔ اور راجہ بلوان سنگھ سے ہتک لڑا
 کرتے تھے۔ واصل خاں ناسی ایک سپاہی تمہارے دادا کا
 بیٹا دست رہتا تھا۔ وہ کٹروں کا کراہہ آگاہ کر ان کے پاس
 جمع کراتا تھا۔ سنو تو سہی ! تمہارا دادا بہت کچھ پیدا کر گیا ہے۔

علاقے مول لیے تھے اور زمیندارہ اپنا کر آیا تھا۔ دس بارہ ہزار روپے کی سرکاری مال گزاری ادا کرنا تھا۔ وہ سب کارخانے سمھارے ہاتھ آئے یا نہیں؟ اس کا حال از روئے تفصیل جلد بچہ کو لکھو۔“

اس خط سے اُن کے بچپن اور عنفوان شباب کی زندگی کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے نانا غلام حسین خاں کمیدان اپنے زمانے کے ایک اہم اور وضع دار رئیس تھے اور اس زمانے کے امرا و رؤسا سے اُن کے گہرے تعلقات تھے۔ آگرے میں اُن کی خاصی جائداد بھی تھی۔ آمدنی بھی اچھی خاصی تھی۔ غالب کا ابتدائی زمانہ اُن کے ساتھ آرام اور اطمینان سے گذرا۔ اس زمانے میں وہ احباب کی صحبتوں میں اچھا وقت گزارتے۔ اُن کے ساتھ مل کر رات رات بھر شطرنج اور چوسر کھلتے۔ بارہ دری میں احباب کے ساتھ اُن کی نشست رہتی۔ کونٹھوں پر چڑھتے، ہتنگ اڑاتے اور بیسج لڑاتے۔ اُن مشاغل کے ساتھ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں اُن کے ایسے مشاغل بھی رہتے ہوں گے جن کا ذکر کرنا ضروری نہیں ہوتا۔

غالب نے کچھ تو ساحول کے اثر سے بچپن اور عنفوان شباب کے زمانے میں زندگی کے اس انداز کو اختیار کیا۔ کچھ اُس غم کو غلط کرنے کے لیے جو باپ اور چچا کی بے وقت موت سے انہیں اٹھانا پڑا تھا۔ غالب شطرنج کھیل کر اور ہتنگ اڑا کر در حقیقت اُسی غم کو بھلا لانا چاہتے تھے جو اُس زمانے میں اُن پر مسلط تھا۔ اس لیے اُن کی بے راہ رویء زندگی اور اس کے حقائق سے کسی حد تک ایک فراز کی حیثیت بھی دیکھتی ہے۔

اسی صورت حال نے غالب کی شخصیت میں رومانیت کا رنگ بھرا اور یہ رومانیت زندگی بھر سائے کی طرح اُن کے دم کے ساتھ رہی۔ اس رومانیت نے غالب کی شخصیت میں عجب عجب گل کھلائے!

اکرام صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ :

”مرزا کا عنفوان شباب رنگ رلیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور اُن کی

یاد بھی ایک لحاظ سے نشاط انگیز تھی ۔ لیکن مرزا کو اُن کا
 خمیازہ بڑا سخت اٹھانا پڑا ۔ اور جب وہ ٹھنڈے دل سے اُن
 ایام کی بے حاصلگی اور اوقات عزیز کی تلفی پر غور کرتے تو دل
 میں رنج و کرب اور مایوسی کی لہر دوڑ جاتی ۔ ہم ”مہر نیم روز“
 سے وہ اقتباس درج کر چکے ہیں جس میں انہوں نے اپنی
 بے راہ روی پر اور اُن قیمتی لمحوں کی یاد میں جو بے نتیجہ
 بلکہ مفرد دلچسپیوں میں تلف ہوئے ، آنسو بہائے ہیں ۔ ان
 احساسات کا اظہار اشعار میں بھی کئی جگہ ہے ۔ ایک فارسی مثنوی
 جو مرزا کی باطنی کشمکش کا آئینہ ہے اور جو کسی ایسے
 زمانے میں لکھی گئی جب وہ کوشش اور ہمت سے اپنے
 آپ کو انحطاط اور مایوسی کے گڑھے میں سے نکال رہے تھے اور
 اپنی براگندہ قوتوں کو جمع کر کے اپنے آپ کو ایک بلند تر سطح نظر
 کے قابل بنا رہے تھے ۔ وہ اسی زمانے کی نسبت لکھتے ہیں :

گرمیِ خونت کہ ازیں پیش بود
 صرف بر انداختن خویش بود

آتش ہنگامہ بہ جان داشتی
 داغِ مغان شیوہ پتان داشتی

بود بہ بیج و خم سودائے کار
 کار تو چون زلف پتان قار و مار

بس کہ ہمی تیرہ تر از شام بود
 روز تو داغِ دل ایام بود
 چشم پریشان نظرے داشتی
 جلوہ بہ ہر رہ گذرے داشتی

بس کہ ہلا ہر اثر انداختی
 دینہ ہصد جا سپر انداختی
 زان ہمہ اجزاء زمانی کہ رفت
 وان ہمہ بخون تازہ اشانی کہ رفت

ہر چہ کنوں می رسم در نظر
 شاہد و شعر است و شراب و شکر

چرخ بسا روز بہ گشت این چنین
آہ ز عمرے کہ گشت این چنین

۳

غالب نے اپنی زندگی کا ابتدائی زمانہ جس ماحول میں بسر کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ اُن کی تعلیم و تربیت معقول طریقے پر، باقاعدگی کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کی تعلیم کی طرف اس زمانے میں کسی نے توجہ کی ہی نہیں۔ کیونکہ فہم ہال میں یقیناً اُن کی تعلیم کا خیال رکھا گیا ہو گا اور انہوں نے اس زمانے کے روایتی انداز میں تعلیم حاصل کرنی شروع کی ہو گی۔ یہ اور بات ہے کہ صحیح ماحول نہ ملنے کی وجہ سے تعلیم میں ان کا دل نہ لگا ہوا اور وہ لہو و لعب کی زندگی کی وجہ سے اُس کی طرف پوری طرح توجہ نہ کر سکے ہوں۔

حالی نے اُن کی تعلیم کے بارے میں صرف اتنی معلومات فراہم کی ہے کہ :

”شادی کے بعد تک اُن کی مستقل سکونت آگرے ہی میں رہی اور شیخ معظم جو اُس زمانے میں آگرے کے ناسی معلموں میں سے تھے، اُن سے تعلیم پانے رہے۔ اُس کے بعد ایک شخص ہارسی نژاد جس کا نام آتش پرستی کے زمانے میں ہرمزد تھا اور بعد میں مسلمان ہونے کے بعد الصمد رکھا گیا غالباً آگرے میں سیاحانہ وارد ہوا جو کہ دو برس تک مرزا کے پاس اول آگرے میں اور پھر دلی میں منیم رہا۔ مرزا نے اُس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی۔ اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے، اور عبدالصمد بعض ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ مجھ کو لوگ بے استادا کہتے تھے، اُن کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک

ارضی استاد گوڑ لیا ہے ۔ مگر اس میں شک نہیں کہ عبد الصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا ، اور مرزا نے اُس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی۔ چنانچہ مرزا نے جابجا اُس کے تلمذ پر اپنی تحریروں میں نظر کیا ہے اور اُس کو بہ لفظ تیمسار جو پارسیوں کے ہاں نہایت تعظیم کا لفظ ہے ، یاد کیا ہے ۔ لیکن جیسا کہ مرزا نے اپنی بعض تحریروں میں تصریح کی ہے ، مرزا کی جودہ برس کی عمر تھی جب عبد الصمد اُن کے مکان پر وارد ہوا ہے اور کل دو برس اُس نے وہاں قیام کیا ۔ پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اُس کی صحبت میں آئی اور کس قدر قلیل مدت اُس کی صحبت میں گزری تو عبد الصمد اور اُس کی تعلیم کا عدم وجود برابر ہو جاتا ہے ۔ اس لیے مرزا کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے ۔^۱

مولوی ہد معظم کے بارے میں کوئی خاص معلومات کسی لکھنے والے نے فراہم نہیں کی ۔ حالی نے جو کچھ لکھا ہے ، اُسی کو مختلف لکھنے والوں نے دہرایا ہے ۔ مالک رام نے لکھا ہے :

”اس زمانے میں مولوی ہد معظم کی ذات اگرچہ میں مرجع خاص و عام تھی۔ مرزا غالب نے بھی ابتدائی فارسی تعلیم انہیں سے حاصل کی ۔ مولانا حالی نے ایک دلچسپ واقعہ اُس زمانے کا لکھا ہے کہ مرزا غالب نے ایک فارسی غزل میں ”چہ“ کے معنوں میں ”کہ چہ“ ردیف لکھی اور اپنے استاد کو دکھائی ۔ مولوی معظم نے ردیف کو سہل کہہ دیا ۔ مگر جب تھوڑے دن بعد مرزا نے ظہوری کے کلام سے اُس کی سند پیش کی تو اپنے ہونہار شاگرد کی خدا داد ذہانت اور جدت کے قائل ہو گئے“۔^۲

اگرچہ وثوق سے کوئی بات نہیں کہی جا سکتی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگرے میں اُس وقت کسی مکتب میں مولوی ہد معظم بچوں کو تعلیم دیتے ہوں گے ۔ غالب کو بھی اُن کی تنہال والوں نے اسی مکتب میں

۱۔ حالی : یادگار غالب : صفحہ ۱۲ - ۱۴

۲۔ مالک رام : ذکر غالب : صفحہ ۲۵

ابتدائی تعلیم کے لیے بھیج دیا ہوگا اور انہوں نے ابتدائی تعلیم ان سے حاصل کی ہوگی۔

ہرمزد یا عبدالصمد کے بارے میں یقیناً بعض لکھنے والوں نے اچھی خاصی معلومات فراہم کی ہے۔ مالک رام نے خود غالب کی تحریروں ”لطائف غیبی“، ”درفش کاویانی“ اور ”تبیغ لیز“ وغیرہ کو سامنے رکھ کر عبدالصمد کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ خاصی اہمیت رکھتا ہے وہ لکھتے ہیں: ”اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مرزا غالب کو فارسی زبان سے قدرتی لگاؤ تھا مگر اس ذوق کو جمع کیا عبدالصمد ایرانی ہے۔ جیسا کہ مرزا نے خود لکھا ہے ’ملا عبدالصمد ساسان ہنجم کی نسل سے ایک امیر زادہ جلیل القدر تھے۔ وہ یزد کے رہنے والے اور نسلِ زردشتی تھے۔ اور اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر اسلام پر ایمان لے آئے تھے۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے اُن کا نام ہرمزد تھا۔ وہ ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) میں سیر و سیاحت کرتے ہوئے ہندوستان آئے اور اکبر آباد وارد ہوئے۔“ مرزا غالب کی عمر اس وقت حدوداً برس کی تھی۔ مرزا نے انہیں اپنے ہاں ٹھہرایا اور دو برس تک ان سے تعلیم حاصل کی۔ ملا عبدالصمد کی مادری زبان فارسی تھی۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ زردشتی مذہب کے موید تھے اور زردشتیوں کا تمام مذہبی سرمایہ قدیم فارسی میں ہے۔ اس لیے اُن کا فارسی زبان کا فاضل ہونا چنداں تعجب کا مقام نہیں۔ اس کے علاوہ وہ عربی کے بھی عالم تھے۔ اور انہوں نے مال ہا سال تک علمائے عرب و بغداد سے علوم عربیہ حاصل کیے تھے۔ پس گو یہ سچ ہے کہ مرزا کی فارسی دلی کا سنگ بنیاد مولوی محمد معظم کے ہاتھوں رکھا گیا تھا لیکن اس عہد کی تکمیل ملا عید الصمد کے جابک دست اور ماہر ہاتھوں سے ایسے شاندار طریقے پر ہوئی کہ وہ آسمان سے ہاتھیں کرنے لگی۔ ملا عبدالصمد نے ہندوستان سے واپس چلے جانے کے بعد بھی مرزا غالب سے خط و کتابت جاری رکھی۔“

لیکن قاضی عبدالودود صاحب نے ’ہرمزد‘ نام عبدالصمد کے عنوان

ہے جو مقالہ لکھا ہے اُس میں طویل بحث کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے :

”عبدالصمد غالب کا زائیدہ طبع ہے ۔ بہت سی باتوں میں اپنے آئندہ کار سے مشابہ ہے ۔ غالب الفراسیابی ہیں تو عبدالصمد دارابی ، غالب دہلی کے رئیس زادے ہیں تو وہ یزد کا امیر زادہ ۔ تصوف سے دونوں کو لگاؤ ہے اور توحید و جود کی دونوں قائل ہیں ۔ معلمی کسی کا پیشہ نہیں ۔ لیکن جوہر قابل ملے تو اس کی تربیت کے لیے دونوں آبادہ ہیں ۔ منطق و فلسفہ اور علوم عربیہ میں عبدالصمد کا بھر اُسے غالب سے میسر کرتا ہے ۔ یہ وہ علوم ہیں جن سے اپنی لواقیفیت کا احساس غالب کو بہ شدت تھا ۔ یہ کمی عبدالصمد میں پوری ہوئی ۔ ایک بات میں غالب کو بھی عبدالصمد پر فوقیت ہے ۔ عبدالصمد راز داں تو ہے مگر راز گوئی کا شوق نہیں رکھتا ۔ غالب میں دونوں باتیں جمع ہیں ۔ اس لیے غالب نے ساسان ششم کا لقب اپنے لیے محفوظ رکھا“

مالک رام صاحب کا خیال زیادہ قریب قیاس ہے ۔ لیکن بہر حال اس موضوع پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے ۔

یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ غالب نے نظیر اکبر آبادی کے مکتب میں بھی تعلیم حاصل کی تھی ۔ لیکن اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا ۔ غالباً یہ غلط فہمی اس وجہ سے پیدا ہو گئی کہ قطب الدین باطن نے جو تذکرہ نواب مصطفیٰ خان شیفہ کے جواب میں لکھا تھا ، اس میں غالب کو نظیر کا شاگرد لکھ دیا ۔ لیکن باطن نے جس انداز میں اس شاگردی کا ذکر کیا ہے ، اُس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے اور انہوں نے صرف شیفہ پر وار کرنے کی غرض سے یہ سب کچھ لکھا اور یہ بات بعض حلقوں میں پھیل گئی ۔ مالک رام نے لکھا ہے :

”باطن کے آخری الفاظ ‘اب غواء شاگردی سے انکار کریں یا شاید اقرار کریں‘ خاص طور پر قائل غور ہیں ۔ یہ باطن کے دل کا چور ہے جو چھپ نہ سکا ۔ صاف ظاہر ہے کہ انہیں خود

۱ ۔ قاضی عبدالودود : ہرمزد ثم عبدالصمد : (احوال غالب) :

اپنے کہنے کا یقین نہیں۔ اگر نظیر کی ناگردی مسلم تھی تو غالب انکار کیوں کرنے لگے تھے۔“

غالب کو بحین میں جو استاد ملے انہوں نے ان کے دل میں فارسی زبان سے دلچسپی کی شمع فروزاں کر دی اور انہوں نے اس کی روشنی میں زندگی بھر اس زبان کا مطالعہ کیا اور اس میں پوری طرح سہارت حاصل کی۔ ان کی فارسی تحریریں اس بات کو صحیح ثابت کرتی ہیں بقول مولانا غلام رسول مہر :

”غالب کی مختلف تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں فارسی زبان کے قواعد اور تاریخ پر کمال عبور حاصل تھا۔ اساتذہ کے دواوین نظم و نثر نظر سے گذر چکے تھے۔ حافظہ غیر معمولی تھا۔ جو کتاب ایک مرتبہ دیکھ لیتے اس کے تمام ضروری حصے یاد ہو جاتے۔ سرعت فہم کا یہ عالم تھا کہ مشکل سے مشکل مسائل کو صرف سمری طور پر دیکھ کر حل کر لیتے۔“

غالب نے اپنی تعلیم اور خاص طور پر فارسی زبان کی تعلیم اور اس سے دل چسپی کی وضاحت اپنے بعض خطوط میں کی ہے۔ لکھتے ہیں :

”میں نے اہتمام دبستان نشینی میں ’شرح مائت عامل‘ تک پڑھا۔ بعد اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسی و فجور و عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا۔ فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبعی تھا۔ ناگاہ ایک شخص ساسان پنجم کی نسل میں سے معہذا منطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن موحد صوفی حافی تھا، میرے شہر (آگرہ) میں وارد ہوا۔ اور لطائف فارسی بحث (خالص فارسی بے آمیزش عربی در غولش فارسی آبیختہ بہ عربی) اس سے میرے حالی ہوئے۔ صوفیا کسموئی پر چڑھ گیا۔ ذہن معوج نہ تھا۔ زبان داری سے بے بیوند ازیں اور استاد مبالغہ جامائے عہد بزرگمہر عصر تھا۔

۱۔ مالک رام : ذکر غالب : صفحہ ۲۹

۲۔ مولانا غلام رسول مہر : غالب : صفحہ ۲۹

حلیت اس زبان کی دل نشین و خاطر نشان ہو گئی۔“^۱

”ہند پرور“ سہرہائی نامہ آیا۔ سر پر رکھا۔ آنکھوں سے لکھا۔

فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت طبیعت کی ہے۔

پھر تتبع کلام اہل زبان لیکن نہ اشعار قتیل و واقف و شعرائے

ہندوستان کہ یہ اشعار سوائے اس کے کہ ان کو سوزنی طبع کا

نتیجہ کہے اور کسی تعریف کے شایاں نہیں ہیں۔ نہ ترکیب

فارسی نہ معنی نازک ہاں الفاظ فرسودہ عامیانہ جو اطلاق دہستان

جانتے ہیں۔ جب رودکی، عنصری و خاقانی و رشید و طواط اور

ان کے امثال و نظائر کا کلام بالاستعیاب دیکھا جائے اور ان کی

ترکیبوں سے آشنائی ہم پہنچے اور ذہن اعوجاج کی طرف نہ لے جائے

تب آدمی جانتا ہے کہ ہاں فارسی یہ ہے۔“^۲

ان محرموں سے صاف ظاہر ہے کہ ان کا لکھنے والا نہ صرف یہ کہ

فارسی زبان سے گہری دل چسپی رکھتا ہے بلکہ اس بات کی وضاحت بھی

ہوتی ہے کہ اس کو اس زبان اور اس کے ادب کے معاملات و مسائل پر

پوری قدرت حاصل ہے۔

اگرچہ اس بات کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا کہ غالب نے مختلف

علوم کس طرح حاصل کیے لیکن ان کی محرموں سے اس بات کی وضاحت

ہو جاتی ہے کہ انہیں نجوم اور طب وغیرہ سے دل چسپی تھی اور وہ ان

علوم کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو پیش کرنے پر قدرت رکھتے تھے۔

چودھری عبدالغفور کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

”چودھری صاحب شفیق مکرم کی خدمت میں بعد ارسال سلام مسنون

عرض کرتا ہوں کہ آپ نے ذرہ پروری اور درویش نوازی کی ورنہ

میں سزاوار ستائش نہیں ہوں۔ ایک سپاہی زادہ بیچ مدان اور پھر

دل الفسردہ و روح کاروان فرسودہ۔ ہاں ایک طبع سوزوں فارسی زبان

سے لگاؤ رکھتا ہوں۔۔۔ کیا آپ مجھ کو بے پیری اور بیچ میرزی

میں صاحب کمال نہیں جانتے۔ اور اس عبارت فارسی کو میرا صدیقی

۱۔ انتخاب خطوط لمالب : صفحہ ۴۹۔

۲۔ ایضاً : صفحہ ۳۸۔

یہ خیال رہے کہ بیضہ مرغ و لعم طیور ایک جلسہ میں تناول نہ فرمائے۔ بکری کے گوشت کے ساتھ بیضہ مرغ جائز اور لذیذ اور مرغوب۔ ہودینے کا عرق، چھوٹی الائچی کا عرق ہمیشہ دوا خانے میں موجود رہے۔^{۱۱۱}

غرض اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ غالب کی تعلیم اگرچہ بچپن میں باقاعدگی کے ساتھ نہ ہو سکی لیکن انہیں ایسے استاد ضرور ملے جن کی وجہ سے ان کے دل میں فارسی زبان سے دل چسپی کی شمع فروزاں ہوئی اور انہوں نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے ذوق و شوق کے سہارے اس زبان کے قواعد کو سمجھنے اور اس کے ادبی معاملات و مسائل کو سلجھانے کا شعور پیدا کر لیا۔ اور نہ صرف یہ بلکہ اپنی ادبی تحریروں کو فکری اعتبار سے وسیع اور پسند گیر بنانے کے لیے نجوم اور طب وغیرہ کا علم بھی حاصل کیا۔ اور ساتھ ہی دینی علوم میں بھی خاطر خواہ دل چسپی لی۔ اور تصوف اور فلسفے کے معاملات و مسائل پر غور کرنے کا مذاق بھی پیدا کر لیا۔

یہ تمام باتیں غالب کی شخصیت میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں !

۴

غالب کی عمر ابھی تیرہ سال کی تھی کہ ۱۲۳۵ھ میں ان کی شادی نواب الہی بخش خان معروف کی چھوٹی بیٹی امراؤ بیگم سے ہو گئی۔ امراؤ بیگم کی عمر اس وقت گیارہ سال تھی۔ نواب الہی بخش خان معروف نواب احمد بخش خان والی فیروز پور جھڑکا رئیس لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے۔ معروف اپنے زمانے کے معروف شاعر تھے اور شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ اس رشتے سے غالب کی زندگی میں بڑی حد تک اعتدال پیدا ہوا اور وہ جو کیفیت آکرے میں تھی وہ خاصی حد تک کم ہو گئی۔ کیونکہ شادی کے دو تین سال بعد انہوں نے مستقل طور پر دلی میں قیام کیا۔ چنانچہ اب ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

حمید احمد خاں صاحب نے اپنے ایک مضمون میں غالب کی بیوی اور ان کی ازدواجی زندگی کے بعض پہلوؤں کی بڑی خوبصورت تصویر کھینچی ہے۔ لکھتے ہیں :

”یہ کہانی ۱۹۹ء سے شروع ہوتی ہے، جب دہلی کے ایک شریف با اقبال گھرانے میں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام ”امراؤ بیگم“ رکھا گیا۔ امراؤ بیگم کے باپ مرزا الہی بخش خاں کو شہزادوں کا سا عیش و آرام میسر تھا۔ جوانی میں مرزا الہی بخش خاں کی زندگی کا ڈھنگ ایسا تھا کہ ”وہ شہزادہ کل فام“ کے عرف سے مشہور تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی بیٹی کی پرورش کس ناز و نعمت کے عالم میں ہوئی ہوگی۔ جب امراؤ بیگم گیارہ برس کی ہوئی تو اس زمانے کے دستور کے مطابق اس کا بیاہ ہو گیا۔ اس کا دولہا میرزا اسد اللہ بیگ خاں جو عمر میں اس سے صرف دو برس بڑا تھا، آگرے کا ایک امیر زادہ تھا؛ سفید فام، خوش شکل، خوش گفتار۔ خیال یہ تھا کہ اسد اللہ بیگ جوان ہو کر باپ دادا کی طرح سب گری کی زندگی اختیار کرے گا اور امراؤ بیگم کو سکھ کا امیرانہ ٹھکانہ سسرال میں بھی حاصل رہے گا۔ لیکن یہ امیدیں پوری نہ ہوئیں۔ اسد اللہ بیگ خاں نے زر و مال کمانے کی کوئی سبیل نہ کی اور تمام عمر بیکاری میں، یا بیکار قسم کے شعر لکھنے میں گزار دی۔ چوبیس پچیس برس کی عمر کو پہنچنے کے بعد امراؤ بیگم نے پھر کبھی بے تکری کے دن نہ دیکھے۔ بلکہ حالات بد سے بد تر ہوتے گئے۔ شوہر کی طرف سے کوئی آرام اگر قسمت میں نہ تھا تو اولاد کی خوشی ہی نصیب ہوتی۔ لیکن بچپن کے اچھے دنوں کے بعد تقدیر نے امراؤ بیگم سے نیک سلوک کرنے کی گویا قسم کھائی تھی۔ سات بجے پیدا ہوئے مگر کسی کی عمر برس سوا برس سے زیادہ نہ ہوئی اور سبھی ایک ایک کر کے ماں کے دل کو دائمی جدائی کا داغ دے گئے۔ شوہر جیسا بھی تھا بیاہ تو کیے جا رہا تھا۔ لیکن یہاں بھی آخر عمر میں قسمت نے بے وفائی کی۔ شوہر کے ہاتھوں یہ وہ خاک ہونا امراؤ بیگم کو نصیب نہ ہوا۔ بڑھاپے میں اسے

بیوی کا صدمہ دیکھنا پڑا۔ اور اس کے ساتھ ہی شوہر کی مالی بریتیاں خود اسے ورثے میں مل گئیں۔ اُسراؤ یکم کا شوہر انتقال کے وقت آٹھ سو روپے کا مقروض تھا۔ اب بوڑھی بیوہ حیران تھی کہ یہ قرضہ کس طرح اور کہاں سے ادا کرے گا۔ سرکاروں، درباروں میں استمداد کے لیے عرضیاں بھجوائی گئیں۔ ان عرضیوں کا مضمون بڑھنے والوں کو آج بھی درد ناک معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سرکاروں درباروں میں کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر ۸۷۰ع میں میرزا الہی بخش معروف کی ناز پروردہ بیٹی پریشان روزگار کے اولاد، بے شوہر دنیا سے رخصت ہوئی۔^۱

اس میں شبہ نہیں کہ ناسازگار معاشی حالات کی وجہ سے غالب کی ازدواجی زندگی ناخوش گوار ضرور رہی، پھر اولاد کے زندہ نہ رہنے نے اس کو کچھ اور بھی ناخوش گوار بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شروع سے آخر تک ایک اندوہ ناک داستان نظر آتی ہے۔

غالب کے سات بچے ہوئے لیکن ان میں سے ایک بھی پندرہ مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہا۔ یہ ایسا غم تھا جس کی وجہ سے غالب کی شخصیت میں ساری زندگی ایک سلگنے والی کیفیت رہی۔ ایک خط میں میاں داد خان سیاح کو ان کے بیٹے کی وفات پر خط لکھتے ہیں تو اُس میں بھی اپنے صدمے کا ذکر کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

”تمہارے ہاں لڑکے کا پیدا ہونا اور اُس کا مر جانا معلوم ہو کر مجھ کو بہت غم ہوا۔ بھائی ! اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ میرے برص کی عمر میں ۷ بچے پیدا ہوئے۔ لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی۔ اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی۔ تم ابھی جوان ہو۔ حق تعالیٰ تمہیں صبر اور نعم الہیٰل دے۔“^۲

اس تحریر کے ایک ایک لفظ سے وہ حسرت ٹپکتی ہے جو زندگی بھر غالب کے دم کے ساتھ رہی اور اس غم کا اندازہ ہوتا ہے جو دوسرے

۱۔ پرویسر حمید احمد خان : اُسراؤ یکم : (احوال غالب) : صفحہ

غموں کے ساتھ زندگی بھر سائے کی طرح ان کا پہنچا کرتا رہا ۔
 غالب نے اپنے اس غم کو غلط کرنے کے لیے اپنے بھائی زین العابدین
 خاں عارف کو گود لے لیا اور انہیں پالا لیکن عارف جوانی ہی میں چل
 بسے اور غالب کو ایک ایسا غم دے گئے جس کو وہ ساری زندگی نہ
 بھلا سکے ۔

عارف کے انتقال کے بعد غالب نے ان کے دو بیٹوں حسین علی خاں اور
 باقر علی خاں کو اپنے ساتھ رکھا اور بڑی محبت اور لاڈ پیار سے انہیں پالا ۔
 یہاں تک کہ سفر تک میں انہیں ساتھ لے گئے ۔ اپنے خطوط میں ان کا ذکر
 بڑی محبت سے کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

”میں صاحب ! یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں عارف مرحوم
 میرا فرزند تھا ۔ اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے ہوئے
 ہیں ، میرے ہاں آ رہے ہیں اور دم بہ دم مجھ کو ستاتے ہیں۔ میں
 تحمل کرتا ہوں ۔ خدا گواہ ہے کہ تم کو اپنا فرزند سمجھتا ہوں ۔
 پس تمہارے نتائج طبع میرے معنوی ہوتے ہوئے ۔ جب اس عالم
 کے بولوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے ۔ مجھ کو دوپہر
 کو سونے نہیں دیتے ۔ ننگے ننگے پاؤں ہلکے پر رکھتے ہیں ۔
 کہیں بانی لڑھکاتے ہیں ۔ کہیں خاک اڑاتے ہیں ۔ میں ننگ نہیں
 آتا تو ان معنوی ہواؤں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں ہیں ، کیوں
 کہہ راؤں ؟“

(خط بہ نام منشی ہر گوبال سنگھ)

”اندر باہر سب روزہ دار ہیں ۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں
 بھی ۔ ایک میں اور میرا بیٹا حسین علی خاں روزہ غور ہیں ۔ وہی
 حسین علی خاں جس کا روزمرہ ہے کھلونے سنگا دو ۔ میں بھی
 پیار جاؤں گا ۔“

(خط میر سیدی مجروح کے نام)

”لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں ۔ کبھی میرا دل چلاتے ہیں کبھی
 مجھ کو ستاتے ہیں ۔ بکریاں ، کبوتر ، بٹیریں ، بکلی ، کتکوا ۔ ب
 سامان درست ہے ۔ فروزی کے مہینے میں دو دو روپے دیے ،
 دس دن میں اٹھا ڈالے ۔ پھر برسوں چھوٹے صاحب آئے کہ

دادا جان اکچھ ہم کو قرض حسنه دو ۔ ایک روپیہ دونوں کو
 قرض حسنه دیا گیا ۔ آج ۔ ہے ۔ دیکھو کتنے بار قرض لیں گے۔“

”دونوں برغوردار گھوڑوں پر سوار چل دیے ۔ میں چار گھڑی دن
 رہے ہاتھ کی سرائے میں پہنچا ۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور
 گھوڑوں کو ٹھلنے ہوئے پایا ۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا ۔
 میں نے جیٹانک بھر گھی داغ دیا ۔ دو شامی کباب اس میں
 ڈال دیے ۔ رات ہو گئی تھی ۔ شراب پی لی ۔ کباب کھا لیے ۔
 لڑکوں نے اوپر کی کھچڑی پکوائی ۔ خوب گھی ڈال کر آب بھی
 کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی ۔ بارے آج تک دونوں
 بھائیوں میں موافقت ہے ۔ اس کی صلاح مشورے سے کام کرتے
 ہیں ۔ اتنی بات زائد ہے کہ حسین علی منزل پر آکر کراپڑ اور
 ٹھہانی کے کھلونے خرید لانا ہے۔“

(خط بنام نجف خان)

”آج صبح کو سات بجے باقر علی خان اور حسین علی خان مع چودہ
 سرخ ، چھ بڑے ، آٹھ چھوٹے کے دلی کو روانہ ہوئے ۔ دو آدمی
 میرے ان کے ساتھ تھے۔“ (خط بہ نام علاء الدین احمد خان)
 اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب میں کتنی انسانیت تھی ۔ وہ
 اپنے متعلقین کا کتنا خیال رکھتے تھے اور ان سے کسی درجہ محبت کرتے
 تھے ۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ اولاد کے زندہ نہ رہنے کی
 وجہ سے ان کی زندگی میں ایک خلا تھا ۔ وہ زندگی بھر اس خلا کو پر کرنے
 کی کوشش کرتے رہے ۔ اور انہوں نے اس ٹھہانی کے زیر کو اس طرح زائل
 کرنے کی کوشش کی جو اولاد کے غم کی وجہ سے ان کی شخصیت میں
 بری طرح سرایت کر گیا تھا ۔

شادی کے بعد دلی کا قیام غالب کی زندگی میں کتنی لحاظ سے اہمیت
 رکھتا ہے ۔ اس زمانے میں ان کی زندگی میں اعتدال اور تہسوارا پیدا ہوا ۔
 جذباتِ سودگی نصیب ہوئی ۔ رفاقت اور محبت کا سہارا ملا ۔ ٹھہانی دور

ہوئی۔ خاندان کی زندگی کا تجربہ ہوا۔ اور اس طرح وہ بے راہ روی جو ان کے مزاج کا جزو بن گئی تھی، اس کے اثرات بڑی حد تک چھٹ گئے۔ اگرچہ اس زمانے میں انہیں مختلف طرح کے غموں نے گھیرے رکھا لیکن انہوں نے ان غموں کو جھیلنا اور ان کو زندگی کے لیے گوارا بنانا سیکھا۔ اور ایک بے چین روح ان کے اندر بیدار ہوئی۔ انہوں نے زندگی کو بسر کرنا، اس کو برتنا اور اس کو بسر کرنے اور برتنے کے لیے نا سازگار حالات سے لڑنا اور ایک نئی زندگی کی تعمیر و تشکیل کے لیے جد و جہد کرنا سیکھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ دلی کے دوران قیام میں انہیں اس ماحول میں زندگی بسر کرنے کا موقع ملا جو بہ قول حالی عہد اکبری اور عہد شاہجہانی کی یاد دلاتا تھا۔ اس زمانے میں ایک ایسے طبقے سے ان کا تعلق رہا۔ جو صحیح معنوں میں اس وقت کی تہذیب و ثقافت دین و مہذب، ادب و شعر اور فکر و فلسفہ کا علم بردار تھا۔ یہاں انہوں نے اس ماحول میں وقت گزارا جس کو حکیم احسن اللہ خان، حکیم غلام ہف خان، حکیم محمود خان، نواب مصطفیٰ خان شیفہ، مولانا فضل حق خیر آبادی، مومن، شاہ نصیر، ذوق، نیر رخشاں، ظہیر، مجروح، عارف اور صہبائی وغیرہ کی شخصیتوں نے ہر اعتبار سے وقیع اور ہمہ گیر، رنگین اور برکار بنا دیا تھا۔

غالب کی زندگی اور شخصیت میں ذہنی انقلاب کی ایک لہر بھی اسی ماحول نے پیدا کی اور وہ اسی کی بدولت اس نئے احساس و شعور کے سب سے بڑے علم بردار بن گئے، جس کا ایک طوفان اس زمانے کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں موج زن تھا۔

غالب کی شاعری کا آغاز آگرے ہی میں ہو چکا تھا۔ مالک رام صاحب نے "کلیات نثر غالب" اور "ہادگار غالب" کے حوالے سے لکھا ہے کہ "ابھی وہ مولوی عہد معظم کے مکتب میں پڑھتے تھے، اور ان کی عمر دس گیارہ برس سے زیادہ نہیں تھی کہ انہوں نے شعر کہنا شروع کیا۔ اس زمانے کی ایک فارسی غزل کا بھی پتہ چلتا ہے مگر شروع میں ان کی توجہ زیادہ تر اردو کی طرف رہی اور وہ بھی بیدل، اسیر، شوکت کے رنگ میں۔ پچیس برس کی عمر تک تقریباً دو ہزار شعرا ایک دیوان تیار ہو گیا۔ اگر یہی روش رہتی تو ان کی ادبی موت میں

کیسے شبہ ہو سکتا تھا۔ لیکن غیبت ہے کہ اُن کی خدا داد صلاحیت نے اُن کی رہنمائی کی۔ اُنہوں نے یہ راہ ترک کر دی اور اس دیوان کو بھی نظری کر دیا۔ اس طرح گویا انہوں نے میر تقی میر کی یہ پستین کوئی پوری کر دی کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا۔ ورنہ مہمل بگئے لگے گسیبہ کامل استاد اُن کی طبع سلیم تھی یا بعض خاص سخن شناس دوست، ورنہ شاعری میں وہ صحیح معنوں میں نسیب الرحمن تھے اور کسی کی شاگردی کا احسان اُن کے سر پر نہیں۔“

یہ بات تحقیق طلب ہے کہ میر نے غالب کا کلام دیکھا یا نہیں۔ اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ ہمیں میں غالب نے، ماحول کے اثر سے، شاعری کی طرف توجہ کی اور طرزِ بیدل میں رشتہ لکھنا شروع کیا۔ اگرچہ اس زمانے میں انہوں نے اردو کی طرف خاص طور پر توجہ کی اور فارسی میں شعر نہیں کہے لیکن اُن کے اردو کلام میں اس وقت فارسی اثرات بہت گہرے تھے۔ حالی نے لکھا ہے :

”مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر ملا عبد الصمد کی تعلیم کے سبب، فارسیت کا رنگ ابتدا ہی سے مرزا کی بول چال اور اُن کی قوت متخیلہ پر چڑھ گیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر ذکی الطبع لڑکے ابتدا میں سیدھے سادے اشعار کی نسبت مشکل اور پیچیدہ اشعار کو، جو بغیر غور و فکر کے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے، زیادہ شوق سے دیکھے اور پڑھتے ہیں۔ مرزا نے لڑکپن میں بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا۔ چنانچہ جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختیار کی تھی اُسی روش پر مرزا نے اردو میں چلنا اختیار کیا۔“

یہ باتیں ابھی تحقیق طلب ہیں کہ غالب نے کمر کے اثر سے، کن

۱۔ مالک رام : ذکر غالب : صفحہ ۳۱۔

۲۔ حالی : یادگار غالب : صفحہ ۹۹۔

لوگوں کی صحبتوں میں شاعری شروع کی اور انہوں نے ابتدائی زمانے میں کس سے اصلاح لی؟ اور یہ کہ بیدل کے اثرات اس زمانے کے کلام میں اتنے گہرے کیوں ہوئے؟۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ ہمیں میں لہو و لعب کی زندگی ہی کے زیر اثر انہوں نے شاعری سے دلچسپی لی ہوگی اور خود شعر کہنا بھی شروع کیا ہوگا۔ پھر اُس زمانے میں آگرے کی سر زمین پر جو شعری اور ادبی ماحول تھا، اُس نے بھی انہیں متاثر کیا ہوگا۔ اس وقت آگرے میں شعر و شاعری کا اچھا خاصا ماحول موجود تھا۔ نظیر اکبر آبادی کو اگرچہ اولیٰے طبقے کے افراد دوغور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن ہر صورت آگرے میں ان کا ایک حلقہ موجود تھا، اور اس حلقے نے اپنے محدود دائرے ہی میں سہی، شاعری کی ایک فضا پیدا ضرور کر دی تھی۔ اس کے اثرات براہ راست نہیں تو بالواسطہ طور پر غالب پر ضرور ہوئے ہوں گے۔ جب غالب آگرے کو چھوڑ کر دلی پہنچے تو وہاں کے شعری اور علمی ماحول نے شاعری کی اس آتش شوق کو کچھ اور بھی بھڑکایا۔ دلی میں اُس وقت ذوق، شاہ نصیر، مومن اور شیفتہ وغیرہ نے شاعری کی ایک فضا قائم کر دی تھی۔ اور شاعروں کے علاوہ شعر و شاعری سے دلچسپی رکھنے والے عالم بھی خاصی تعداد میں اس سر زمین پر موجود تھے۔ ان میں حکیم احسن اللہ خاں، حکیم محمود خاں اور مولانا فضل حق غیر آبادی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ غالب نے، ظاہر ہے کہ ان سب سے اثر قبول کیا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی ماحول کے اثر سے دلی میں اُن کی شاعری نے ایک نیا رنگ اختیار کیا اور اُس میں وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ رکتہ رکھاؤ پیدا ہوتا گیا۔ جہاں تک کہ وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے اور اہم شاعر ہو گئے۔ اکرام صاحب نے لکھا ہے :

”قیام دہلی کا جو اثر ان کی شاعری پر ہوا وہ جت واضح اور نمایاں

ہے۔ آگرے میں شعر اور شعر فہم حضرات کی وہ کثرت نہ تھی جہ دہلی میں تھی۔ اور غالب کے عجیب و غریب لشعار پر جب لوگ معترض ہوتے تو وہ انہیں خاطر میں نہ لاتے۔ لیکن جب مرزا دہلی آئے اور مولانا فضل حق اور دوسرے مسلمہ استادوں نے انہیں ان اشعار کے حسن و قبح سے آگاہ کیا تو مرزا کو ان کے علم و فضل کے سامنے سر جھکانا پڑا۔۔۔ مرزا غالب کے مستطاب

دیوان ریختہ کے بارے میں آزاد کا خیال ہے کہ یہ انتخاب مولانا فضل حق اور مرزا خانی کو تو ال دہلی نے کیا ۔ مرزا کے بیانات اور معاصرانہ تذکروں سے خیال ہوتا ہے کہ انتخاب خود غالب نے کیا ۔ غالباً یہ خیال درست ہے ۔ لیکن مرزا کے ابتدائی اور بعد کے طرز شاعری میں اتنا فرق ہے کہ یہ بیان بعد از قیاس معلوم نہیں ہوتا کہ مرزا کی شاعری میں جو عظیم الشان تبدیلی ہوئی اس میں کسی خارجی رہنائی کو بھی دخل تھا اور بقول مرزا انہوں نے اپنا طرز خاص اس لیے ترک کیا کہ اے ہاروں نے چلنے لہ دیا ۔ ” صحیح صورت حال جو کچھ بھی ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ، معمول کے اثر سے ، غالب نے اپنی شاعری میں تبدیلیاں کیں اور اس میں ایک ارتقائی عمل جاری رہا ۔ اس نے زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے دامن میں جگہ دی اور جہالتی اعتبار سے بھی اپنے آپ کو دل نشیں بنایا ۔ اور اس طرح وہ بہت تھوڑے عرصے میں ایک عظیم شاعر تصور کیے جانے لگے ۔

لال قلعہ اس زمانے میں تہذیب و ثقافت اور شعر و ادب کا مرکز تھا ۔ لیکن ایک زمانے تک غالب کو ایک شاعر کی حیثیت سے قلعے میں بازیابی حاصل نہیں ہوئی ۔ کیونکہ اس زمانے میں وہاں ذوق کا طوطی بولتا تھا ، اور وہ جہاد شاہ ظفر کے استاد تھے ۔ کبھی کبھی مشاعروں میں شرکت کے لیے تو غالب قلعے میں بلائے جاتے تھے لیکن اس سے زیادہ ان کی رسائی نہیں تھی ۔ ۱۸۵۰ء تک وہ قلعے سے علیحدہ رہے ۔ اس کے بعد ، ان کی ناسازگار مالی حالت کو دیکھ کر ، شیخ نصیر الدین کالے میاں اور حکیم احسن اللہ خاں نے ان کی سفارش کی اور وہ تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے پر مامور ہوئے ۔ مولانا مہر لکھنے ہیں :

”شاہ دہلی نے شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں اور حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش پر ۱۸۵۰ء میں غالب کو تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے کے لیے مقرر کیا تھا ، اور نجم الدولہ ، دیر الملک ، نظام جنگ کے خطابات کے علاوہ خلعت اور پچاس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر کی تھی ۔ یہ تنخواہ آغاز جولائی ۱۸۵۰ء سے لے کر آخر اپریل

۱۸۵۷ء تک ملتی رہی۔ حکیم احسن اللہ خان جمع و تحقیق حالات بر ماسور تھے۔ جو کچھ لکھ کر دیتے، غالب اس کو بہار آفریں نثر کا جامہ پہنا دیتے۔ ۱۸۵۲ء تک تاریخ کا پہلا حصہ، جو ابتدائے آفرینش سے لے کر ہایوں بادشاہ کی وفات تک کے حالات پر مشتمل تھا، مکمل ہوا۔ اس کا نام 'مہر نیم روز' تھا۔ دوسرے حصے میں اکبر کی تخت نشینی سے لے کر بہادر شاہ ثانی تک کے حالات مدون کرنے کی تجویز تھی۔ اس کا نام غالب نے 'ماہ نیم ماہ' رکھا تھا۔ لیکن یہ حصہ شروع نہ ہوا اور غدر کی آگ بھڑک اٹھی جس نے تیموری خاندان کے رفت و وجود ہی کو راکھ بنا ڈالا۔^{۱۱} ذوق کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر نے غالب سے باقاعدہ اصلاح بھی لی۔ مولانا حالی لکھتے ہیں:

"۱۲۷۱ھ میں جب کہ شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہو گیا بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی مرزا سے متعلق ہو گئی تھی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مرزا اس کام کو بادل نا خواستہ سر انجام کرتے تھے۔ ناظر حسین مرزا مرحوم کہتے تھے کہ ایک روز میں اور مرزا صاحب دیوان عام میں بیٹھے تھے کہ چوب دار آیا اور کہا کہ حضور نے غزلیں مانگی ہیں۔ مرزا نے کہا ذرا ٹھہر جاؤ۔ اور اپنے آدسے سے کہا کہ 'ہالکی میں کچھ کاغذ رومال میں بندھے ہوئے رکھے ہیں، وہ لے آؤ' وہ فوراً لے آیا۔ مرزا نے جو اُسے کھولا تو اُس میں سے آٹھ نو ہرچے جن پر ایک ایک دو دو مصرعے لکھے ہوئے تھے، نکالے۔ اور اسی وقت دوات قلم منگوا کر ان مصرعوں پر غزلیں لکھنی شروع کیں۔ اور وہیں بیٹھے بیٹھے آٹھ یا نو غزلیں تمام و کمال لکھ کر چوب دار کے حوالے کیا۔ ناظر جی مرحوم کہتے تھے کہ ان تمام غزلوں کے لکھنے میں اُن کو اس سے زیادہ دیر نہیں لگی کہ ایک مشتاق استاد چند غزلیں صرف کہیں کہیں اصلاح دے کر درست کر دے۔ جب چوب دار غزلیں لے کر چلا گیا تو مجھ سے کہا کہ حضور کی کبھی کبھی

کی فرمائشوں سے آج مدت کے بعد سبک، دوشی ہوئی ہے۔“
 دلی کی ادبی زندگی میں غالب کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ یہ بات
 صحیح نہیں ہے کہ انہیں اپنے زمانے میں درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔
 اس وقت کے ادبی اور شعری ماحول کے علم بردار اُن کی عزت کرتے تھے
 اور وہ بھی اُن کو عزیز رکھتے تھے۔ ذوق اور مومن کی شاعری کو اس
 زمانے میں بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ اُن کے انتقال پر غالب نے جو کچھ
 لکھا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان کو کتنا عزیز رکھتے تھے
 اور خود اُن کے دلوں میں غالب کی کتنی عزت تھی۔

ذوق کے انتقال پر منشی فیض بخش حیدر کو لکھتے ہیں :
 ”یہاں کا حال تازہ یہ ہے کہ میان ذوق مر گئے۔ حضور والا نے
 ذوق شعر و سخن ترک کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ شخص اپنی وضع
 کا ایک اور اس عصر میں غنیمت تھا۔“

مومن کے انتقال پر اُن فائزات کا اظہار کرتے ہیں :
 ”سنا ہو گا تم نے کہ مومن خاں مر گئے۔ آج اُن کو مرے ہوئے
 دسواں دن ہے۔ دیکھو بھائی! ہمارے بچے مرے جاتے ہیں۔ ہمارے
 ہم عمر مرے جاتے ہیں۔ قافلہ حلا جاتا ہے اور ہم ہا در رکاب
 بیٹھے ہیں۔ مومن خاں میرا ہم عصر تھا، اور ہمار بھی تھا۔
 یہاں سے تینتالیس برس ہوئے، یعنی چودہ چودہ پندرہ پندرہ برس کی
 میری اور اس کی عمر تھی، کہ مجھ میں اور اس میں ربط پیدا ہوا۔
 اس عرصے میں کبھی کسی طرح کا رنج و ملال درمیان نہیں آیا۔
 حضرت! چالیس برس کا دشمن بھی نہیں پیدا ہوتا۔ دوست تو
 کہاں ہاتھ آتا ہے؟ یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا
 تھا۔ طبیعت اُس کی معنی آفریں تھی۔“

غالب کی ادبی زندگی کا سب سے اہم واقعہ ’برہان قاطع‘ اور
 ’قاطع برہان‘ کے ہنگامے کا ہے۔ حالی لکھتے ہیں :

۱۔ حالی : یادگار غالب : صفحہ ۴۲۔

۲۔ انتخاب خطوط غالب : صفحہ ۱۳۱۔

۳۔ ایضاً : صفحہ ۱۲۲۔

”جب مرزا ’دستنبو‘ کو ختم کر چکے ، اور اب بھی تنہائی اور ستائے کا وہی عالم رہا ، اُس وقت سوا اس کے اور کیا چارہ تھا کہ دوات اور قلم کو مونس و رفیق سمجھیں ، اور کچھ لکھ بڑھ کر اپنا غم غلط کریں اور دل چلائیں ۔ مرزا کے پاس اُس وقت سوائے ’برہان قاطع‘ اور ’دساتیر‘ کے کوئی کتاب موجود نہ تھی ۔ ’برہان‘ کو اٹھا کر سرسری نظر سے دیکھنا شروع کیا ۔ چلی ہی نگاہ میں کچھ بے ربطیاں می معلوم ہوئیں ۔ پھر زیادہ غور سے دیکھا تو اکثر لغات کی تعریف غلط پائی ۔ ایک ایک لفظ مختلف صورتوں سے لکھا دیکھا ۔ شعرا نے جو الفاظ بہ طور مجاز و کنایہ کے استعمال کیے ہیں ، اُن کا ذکر بہ طور مستقل لغات کے دیکھا ۔ ’طریقہ‘ بیان اکثر بیوندا ، اور اصول لغات نگاری کے خلاف پایا ۔ بہت سے لغات کی ایسی تفسیر بھی دیکھی جس کے معنی بالکل سمجھ میں نہ آئے ۔ مرزا نے یاد داشت کے طور پر ، جو مقام قابل اعتراض نظر آئے ، اُن کو ضبط کرنا شروع کیا ۔ شدہ شدہ وہ ایک کتاب بن گئی جس کا نام ’قاطع برہان‘ رکھا گیا ۔ اور ۱۲۷۹ھ میں چھپ کر شائع ہوئی ۔ پھر مرزا نے ۱۲۷۷ھ میں بہ اضافہ دیگر مضامین و فوائد اس کو دوسری بار چھپوایا ، اور اُس کا نام ’درفش کاویانی‘ رکھا ۔“

یہ کتاب چھپیں تو غالب کے خلاف ایک ہتکامہ برپا ہو گیا اور لوگوں نے اُن کی مخالفت شروع کر دی ۔ چنانچہ ’ہرق قاطع‘ ، ’قاطع قاطع‘ ، ’سود برہان‘ ، ’قاطع برہان‘ کے نام سے کئی رسالے لکھے گئے ۔ اس مخالفت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ غالب نے اُن غلطیوں کی طرف اشارہ کر کے اپنے نئے مزاج کو ظاہر کیا تھا اور جو لوگ برائی لکیر کے فیر تھے ، وہ اس کو برداشت نہیں کر سکتے تھے ۔ دوسرے ایک بات یہ بھی تھی کہ غالب نے کہیں کہیں ایسا لہجہ اختیار کیا تھا جس میں شوخی کے عناصر نمایاں تھے ۔ اس لہجے کو لوگ برداشت نہ کر سکتے ۔ غالب نے اس ہتکامے کا مقابلہ بڑی ہمت سے کیا ۔ جننے لوگوں نے

ان کی مخالفت میں لکھا ، انھوں نے ان سب کے جواب دیے ، اور ان میں بھی اپنی شوخی اور ظرائف کے لہجے کو باقی رکھا ۔ اس سے ان کے ادبی مزاج ، ظرائف طبع اور احساس مزاح کا اندازہ ہوتا ہے ۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ غالب بنیادی طور پر ایک شاعرانہ اور ادبی مزاج رکھتے تھے ۔ انھوں نے زندگی ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے بسر کی اور اپنی زندگی کا زیادہ زمانہ شعر و ادب کی تحقیق میں صرف کیا ۔ بچپن سے اس کام کا سلسلہ شروع ہوا اور مرتے دم تک جاری رہا ۔ اس کام کو وہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کے بغیر باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے ۔ انھوں نے اپنے زمانے کے ثقافتی ، تہذیبی ، اور شعری و ادبی معاملات و مسائل سے دل جسی لی ۔ اور ان کے بارے میں نہ صرف اظہار خیال کیا ، بلکہ وہ ان سب کو آگے بڑھانے اور پروان چڑھانے میں پیش پیش رہے ۔ اپنے زمانے کی ادبی شخصیتوں سے وہ سائر ہوئے اور انھوں نے خود ان شخصیتوں سے اثر قبول کیا ۔ اس زمانے کے مفکروں ، عالموں ، ادیبوں اور شاعروں سے ان کے گہرے تعلقات رہے اور انھوں نے ان کے ساتھ مل کر ادب و شعر کا صحیح ماحول پیدا کیا ۔

اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنے زمانے میں ادبی ہنگامے بھی برپا کرتے رہے اور ان ہنگامہ آرائیوں نے ان کے زمانے کی ادبی اور شعری زندگی کو جولاہی سے ہم کنار کیا ۔

غالب کی شخصیت اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے اور جو کام انھوں نے اپنے زمانے کی ادبی اور شعری زندگی میں انجام دیا ہے ، اس میں ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا ۔

اس اعتبار سے وہ ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں ۔

۶

غالب کی زندگی مسلسل جد و جہد کی ایک نہایت ہی الم ناک اور خوں چکان ، لیکن دلاویز اور دل نشیں داستان ہے ۔ الم ناک اور خوں چکان اس وجہ سے کہ غالب کے ایسے عظیم شاعر کو فکر دنیا میں سر کھپانا پڑا اور غم روزگار کے ایسے ایسے تھوہڑے کھانے پڑے کہ زندگی کی کشتی

ڈونے لگی اور دل آویز و دل نشیں اس وجہ سے کہ غالب کی قوت ارادی اور جہد مسلسل کے عزم مصمم نے اس کو، خوں چمکنے کے باوجود ایسا رنگین اور ہر وقار بنا دیا کہ وہ آج بھی دیکھنے والوں کے لیے زندگی اور جولانی سے لرہائے ہونے کا سامان فراہم کرتی ہے۔

آگرے کا قیام غالب کے لیے مالی اعتبار سے غالباً ان کی زندگی کا سب سے اچھا زمانہ ہے۔ قیام دلی کا ابتدائی زمانہ بھی اس لحاظ سے برا نہیں ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں انہیں سالے سات سو روپہ نواب احمد بخش خاں کی طرف سے پنشن کے ملنے تھے۔ الور سے بھی کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی والدہ بھی ان کو کچھ نہ کچھ دینی رہتی تھیں۔ لیکن یہ صورت حال زیادہ عرصے تک باقی نہ رہی۔

ہوا یہ کہ ۱۸۲۲ء میں نواب احمد بخش نے اپنی جائداد کا انتظام اس طرح کیا کہ فیروز پور جہر کہ کا علاقہ ان کے بڑے بیٹے نواب شمس الدین احمد خاں کو ملا اور ٹوبارو کی جاگیر ان کے دو چھوٹے بیٹوں امین الدین خاں اور ضیاء الدین خاں کے حصے میں آئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غالب کی پنشن نواب شمس الدین خاں کے پاس چلی گئی۔ غالب کے تعلقات چونکہ امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں سے تھے۔ اس لیے اس کا اثر ان کی پنشن پر پڑا۔ کچھ عرصے تک تو اس کی ادائیگی میں ددواریاں پیدا کی گئیں اور بالآخر ۱۸۳۱ء میں یہ پنشن بند کر دی گئی۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ غالب کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

پھر معتمد ناز یہ ایک اور قازیانہ یہ ہوا کہ ۱۸۲۹ء میں خواجہ حاجی کا انتقال ہو گیا۔ غالب کا خیال یہ تھا کہ خواجہ حاجی کے انتقال کے بعد ان کے حصے کے دو ہزار سالانہ کی رقم ان کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ جب ان کے انتقال کے بعد یہ رقم ان کے بیٹوں شمس الدین خاں عرف خواجہ جان اور بدر الدین عرف خواجہ امان کی طرف منتقل ہوئی تو غالب کو یہ ہلت ناگوار ہوئی اور انہوں نے اس فیصلے کو تبدیل کرانے کے لیے گورنر جنرل کے سامنے عرضداشت پیش کرنے کا ارادہ کیا۔ اور اسی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کلکتے کے سفر کا منصوبہ بنایا۔

مالک رام صاحب کے خیال میں غالب ۱۸۲۶ء میں اور مولانا سہر کے خیال کے مطابق اپریل ۱۸۲۷ء میں دہلی سے کلکتے روانہ ہوئے۔ راستے میں

لکھنؤ میں بھی اُن کا قیام رہا ۔ حالی نے لکھا ہے کہ :

”چونکہ لکھنؤ کے ذی اقتدار لوگ مدت سے جاہلی تھے کہ
مرزا ایک بار لکھنؤ آئیں، اس لیے کان پور پہنچ کر انہیں یہ خیال
آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلے۔“

بہر حال ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ پہنچے ۔ وہاں اُن کا شان دار استقبال کیا
گیا اور بڑی آؤ بھگت ہوئی ۔ آغا میر اس زمانے میں نائب السلطنت تھے ۔
اُن سے ملاقات کی صورت پیدا ہوئی ۔ لیکن جلدی میں قصیدہ نہ لکھ سکے ۔
صنعت تعطیل میں نثر لکھ لی لیکن ملاقات کی نوبت نہیں آئی ۔ کیونکہ
غالب نے دو شرطیں پیش کر دیں ۔ ایک تو یہ کہ آغا میر اُن کی تعظیم کریں
اور دوسری یہ کہ انہیں نذر پیش کرنے کے لیے مجبور نہ کیا جائے ۔ ان
شرائط کو تسلیم نہیں کیا گیا ۔ اس لیے وہ آغا میر سے نہ مل سکے ۔ ناصخ
اور آتش اس زمانے میں لکھنؤ کی سر زمین پر موجود تھے لیکن یہ بات
تحقیق طلب ہے کہ غالب کی ملاقات اُن سے ہوئی یا نہیں ۔ صرف اتنا علم ہوتا
ہے کہ لکھنؤ والوں نے اُن کے اعزاز میں ایک شاعرہ کیا اور اُس میں
غالب نے غزل بھی پڑھی ۔ اور کوئی گیارہ سہجے کے قریب لکھنؤ میں
اُن کا قیام رہا ۔ اس زمانے میں جو غزل انہوں نے کہیں اُس کے چند اشعار
میں قیام لکھنؤ کے متعلق حدت تاثرات کا اظہار اس طرح کیا ہے :“

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی

ہوس میر و کاشا سو وہ کم ہے ہم کو

مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر

عزم میر نجف و طوف حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب

جادو رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

غالب لکھنؤ سے کان پور ہوتے ہوئے باندہ گئے ۔ باندہ سے الہ آباد

اور الہ آباد سے بنارس پہنچے اور وہاں قیام کیا ۔ اس شہر سے وہ بہت متاثر

ہوئے اور انہوں نے اس کی تعریف میں ایک مثنوی ’پیراغ دیر‘ لکھی ۔

اس میں بنارس کی تعریف اس طرح کی ہے :

تھائے اللہ بنارس چشم بد دور
ہشت خرم و فردوس معمور

بنارس را کہے گفتہ کہ چہی است
ہنوز از گنگہ چہنی بر چہی است

ہا اے غافل ! از کیفیت ناز

نگاہے بر ہری زادانی انداز

ہمہ جانہائے بے تن کن نمائیا

لدارد آب و خاک این جلوہ حاشا

نہاد شاں چو بوئے گل گراں نیست

ہمہ جائید جسمے درمیان نیست

ہتانی را پہولا نعلہ طور

سراپا نور ایزد چشم بد دور

میانہ نازک و دلہا توانا

ز نادانی ہم کار خویش دانا

تیسم ہس کہ در لہا طبعی است

دہن با وشک گل ہائے ربعی است

بہ لطف از موج گوہر لرم و تو

بہ ناز از خون عاشق گرم دو تو

بہ سامان دو عالم گلستان رنگ

ز تاب رخ چراغمان لب گنگ

قیامت قامتان مژگان درازان

ز مژگان دو صف دل نیزہ بازان

بنارس سے ہشت ہوتے ہوئے فروری ۱۸۲۸ء میں کلکتے پہنچے ۔ وہاں

ایک مکان کرایہ پر لیا اور اس میں قیام کیا ۔ کلکتے سے بہت متاثر ہوئے

اور اس شہر کے قیام کی یاد ہمیشہ اُن کے دل میں نازہ رہی ۔ جیسا کہ ان

اشعار سے ظاہر ہے :

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشی !

اک ٹبر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

وہ حبزہ زار ہائے مطہرا کہ اُن غضب
وہ لازنیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ اُن غضب
طاقت رہا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے قازہ و شیریں کہ واہ وا
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

کلکتے میں غالب کے دوست سراج الدین احمد موجود تھے۔ اُن کی وجہ سے بھی اس شہر میں اُن کا دل لگا۔

کلکتہ کے دوران قیام میں وہ ادبی ہنگامہ بھی ہوا جس کے بارے میں انہوں نے اپنی مشہور فارسی مثنوی 'ہاد مخالف' لکھی۔ یہ ہنگامہ بقول مولانا غلام رسول مہر غالب کی علمی اور ادبی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے کہونکہ :
"وہ شروع ہی سے قتل ، واقف اور اس لاش کے دوسرے شعراء کو خاطر میں نہیں لائے تھے۔ لیکن کلکتہ میں اس رائے کے اظہار پر جو معرکہ 'تمریضات گرم ہوا' ، اُس نے غالب کے جذبہ 'مخالفت' میں بہت تندی ، تیزی اور تلخی پیدا کر دی۔ یہی جذبہ 'مخالفت' انجام کار 'قاطع ارباب' کی شکل میں ظاہر ہوا جو غالب کی طرف سے فارسی دانان ہند کے درجہ ، استاد و اعتاد کے خلاف ایک بڑا جہاد تھا۔ اُن کے کلام نظم و نثر میں جا بجا قتل ، واقف ، عبدالواسع ، غیاث الدین رام پوری اور اس قبیل کے دوسرے فرومایگان ذوقِ ادب کے خلاف جو تحقیر آمیز کلمات ملتے ہیں ، اُن صب کی تیزی اور تندی کا سر چشمہ بھی کلکتہ والا ہنگامہ تھا۔"

کلکتے میں انہوں نے ہشن کا مقدمہ گورنر جنرل کی کونسل میں پیش کیا لیکن جواب یہ سلا کہ چونکہ یہ مقدمہ دلی میں ریڈیڈنٹ کے سامنے پیش ہو چکا ہے ، اس لیے اس کی رپورٹ پر مناسب کارروائی کی جائے گی۔ اس طرح غالب نے ماہوسی کے عالم میں واپسی کا ارادہ کیا اور فروری ۱۸۲۹ء میں دلی واپس پہنچے۔

غالب کے دلی واپس پہنچنے کے چند سال بعد ۱۸۳۵ء میں دلی کے ریڈیڈنٹ ولیم فریزر کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔ اور تفتیش سے یہ ثابت ہوا کہ اس

قتل میں ثواب شمس الدین احمد خان کا ہاتھ ہے۔ چنانچہ تحقیقات کے بعد فریزر کے قاتل کریم خان اور اس کے ساتھ ہی شمس الدین احمد خان کو بھانسی دے دی گئی اور ان کی رہاست کو بہ حق سرکار ضبط کر لیا گیا۔

اس واقعے کے بعد غالب کو ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ کی پنشن دہلی کے کالج کی طرف سے ملنے لگی لیکن یہ فیصلہ ہوا کہ وہ اس سے زیادہ کے حق دار نہیں ہیں۔ غالب اس مقدمہ کو گورنر جنرل تک لے گئے لیکن انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر ۱۸۴۳ء میں لہک عرض داشت ملکہ وکٹوریا کو بھی بھیجی لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

یہ زمانہ غالب پر مالی اعتبار سے بہت سخت تھا اور وہ بڑی پریشانیوں کے شکار تھے۔ لیکن اس عالم میں بھی ان کا یہ حال تھا کہ جب ۱۸۴۲ء میں انہیں دہلی کالج کی مدرسے لیسر کی گئی تو انہوں نے صرف اسی بنا پر اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ مسٹر ٹامسن نے ان کا خاطر خواہ استقبال نہیں کیا تھا۔ اس سے غالب کے احساس برتری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۸۴۷ء میں غالب کو اپنی زندگی کے سب سے زیادہ افسوسناک واقعے سے دو چار ہونا پڑا یعنی وہ تار بازی کے الزام میں گرفتار کیے گئے ، ان پر مشتبہ چلايا گیا اور انہیں چھ ماہ قید یا مشقت کی سزا دی گئی۔ لیکن صرف تین مہینے قید میں رہنے کے بعد ڈاکٹر راس کی سفارش پر انہیں رہا کر دیا گیا۔ اس واقعے سے ان کی عزت کو ٹھیس لگی اور اس نے زندگی کو ان کے لیے ایک عذاب بنا دیا۔ حالی نے ”یادگار غالب“ میں غالب کے ایک فارسی خط کا ترجمہ درج کیا ہے جس سے اس ذہنی کیفیت کی وضاحت ہوتی ہے جو اس واقعے کے بعد غالب پر طاری ہوئی تھی۔ لکھتے ہیں :

”کو تو ال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف ، قتلہ گہات میں تھا اور ستارہ گردلر میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کو تو ال کا حاکم ہے ، میرے باب میں وہ کو تو ال کا حکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ شش جج باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتنا اور اکثر صحبتوں میں لے نکلفانہ ملتا تھا ، اس نے بھی اٹھار اور تھافل اختیار کیا۔ صدر میں اہل کیا گیا مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا

بہر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی تو
 مسٹرٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور
 وہاں سے حکم رہائی آ گیا۔ اور حکام صدر میں میری رہائی کی رپورٹ
 پہنچنے پر اس کی بہت تعریف کی۔ اور میری خاکساری اور آزاد روی
 سے اس کو مطلع کیا۔ جہاں تک کہ اس نے خود بنود میری رہائی
 کی رپورٹ بھیج دی۔ اگرچہ میں اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا
 کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا۔ جو کچھ
 گزرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے اس پر راضی
 ہوں۔ مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ
 آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں
 نہ رہوں۔ روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے۔ یہ بھی
 جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمتہ للعالمین
 دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھو یہ وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی
 کی قید سے جو اس گھری ہوئی قید سے زیادہ جان فرسا ہے نجات پائے،
 اور بغیر اس کے کوئی منزل مقصود قرار دوں، مگر بصحرا نکل جاؤں،
 یہ ہے جو کچھ کہ مجھ پر گذرا اور یہ ہے جس کا میں آرزو مند
 ہوں۔^{۱۰۰}

غرض یہ کہ غالب کی زندگی کے یہ پچیس تیس سال اُن کے لیے بہت سخت
 تھے۔ اس زمانے میں اُن کی زندگی ایک بے سروسامانی کے عالم میں گزری
 مالی مشکلات نے اُن کا زندہ رہنا مشکل کر دیا۔ بہر اُن کے ہاتھوں میں
 چکر رہا۔ وہ لکھنؤ، بنارس، الہ آباد اور کلکتے میں مارے مارے پورے۔
 لیکن جس مقصد سے انہوں نے یہ سب کچھ کیا تھا، اس کا نتیجہ کچھ
 نہ نکلا اور ناکام دلی واپس آئے۔ بہر وہی سبھی کسر اسیری کے واقعے
 نے پوری کر دی اور اُن کی عزت و آبرو کو خاک میں ملا دیا۔

غالب کی شخصیت کی بڑی اس میں ہے کہ انہوں نے ان تمام ناسازگار
 حالات کا مقابلہ نہایت خندہ پیشانی اور جرأت سے کیا اور کبھی ہمت نہ
 ہاری۔ چہد مسلسل اُن کا شعار رہا اور جینے، زندہ رہنے اور زیست کرے کی

اور یہ اُن کی شخصیت کا شاید سب سے اہم پہلو ہے !



غالب پر زندگی میں جو مصیبتیں پڑیں اور حالات نے ان کے دل پر جو کاری رُخم لگائے ، ان کی تلافی اگرچہ کسی حد تک اس سے ہو گئی تھی کہ ۱۸۵۰ء میں وہ نصیر الدین عرف ، یان کالے صاحب اور حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش پر قلعے کے ساتھ منسلک ہو گئے تھے ۔ بہادر شاہ ظفر نے نجم الدولہ ، دوبر الملک ، نظام جنگ ، کہہ کر انہیں مخاطب کیا تھا اور شاہانِ تیموری کی تاریخ ’سپر نیم روز‘ لکھنے کی خدمت ان کے سپرد کی تھی ۔ پچاس روپے ماہانہ مشاہرہ مقرر کیا تھا ۔ اس کے علاوہ ولی عہد سلطنت میرزا فخر و بھی ان کے شاگرد ہو گئے تھے اور چار سو روپے سالانہ تنخواہ ان کی طرف سے بھی انہیں مل جاتی تھی ۔ پھر نومبر ۱۸۵۴ء میں جب ذوق کا انتقال ہوا تھا تو غالب ، شاہ ظفر کے باقاعدہ استاد ہو گئے تھے ۔ واجد علی شاہ کی طرف سے بھی انہیں باج سو روپے سالانہ کی رقم مل جاتی تھی ۔ لیکن یہ سکون و اطمینان بالکل وقتی اور عارضی تھا ۔ کیونکہ ۱۸۵۶ء میں میرزا فخر و کا انتقال ہو گیا ، اسی سال واجد علی شاہ معزول کر دیے گئے اور انہیں مثلاً برج بھیج دیا گیا ۔ پھر قیامت یہ ہوئی کہ ۱۸۵۷ء میں ہنگامہ ہو گیا جس کو ہندوستان کی تاریخ میں غدر کا نام دیا جاتا ہے لیکن جو درحقیقت سیاسی طاقت کو ایک دفعہ بھر حاصل کرنے کے لیے ، مسلمانوں کی ایک اضطرابی اور غیر منظم کوشش تھی ۔ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے ، الہیں شکست ہوئی اور اس شکست کے نتیجے میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کا سارا نظام دوہم برہم ہو گیا ۔ بہادر شاہ ظفر معزول کر کے رلگون میں جلا وطن کر دیے گئے ۔ سینکڑوں کو پھانسی دے دی گئی ۔ ہزاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ۔ یہ سب کچھ اس وقت کی زندگی کے لیے آشوب قیامت سے کسی طرح کم نہ تھا ۔

یہ تمام مناظر غالب نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور یہ موجِ غم ان کے سر سے بھی گزری ۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلے نہیں ۔ یہ زمانہ غالب پر کچھ اور بھی سخت گزرا ۔ آمدنی کے ذرائع مسدود ہو گئے تھے ۔ ہر گویا ہال تفتہ ، شیوجی رام اور ہال مکتد نے اس زمانے میں ان کی مدد کی

لیکن دلی کے اجڑنے ، مسلمانوں کے تباہ ہونے ، احباب کے بھڑنے ، ایک معاشرے کے بکھرے اور ایک تہذیب کے منتشر ہو جانے کا جو صدمہ انہیں ہوا ، اس کی وجہ سے ان کی حیثیت داغ فراق صحت شب کی جلی ہوئی ایک شمع کی سی ہو گئی ۔

غالب نے اس دستخیز بے جا کے حالات اور اپنے تاثرات 'دستنبو' کے نام سے ایک رسالے میں قلم بند کیے ہیں ۔ اس میں مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر جولائی ۱۸۵۸ء تک کے واقعات ، حالات اور تاثرات کی تفصیل ہے ۔ اس رسالے سے غالب کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے ۔ اس لیے اس کے چند اقتباسات کا اردو ترجمہ یہاں دے دینا نا مناسب نہ ہوگا ۔ لکھتے ہیں :

"اس سال جس کا مادۂ تاریخی بہ رعایت تخریجہ 'دستنبو' ہے ۔ اور اگر صاف صاف پوچھو تو ۱۶ رمضان ۱۲۷۳ء کو پیر کے دن دوپہر کے وقت مطابق ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء اچانک دہلی کے قلعے اور فصیل کی دیواریں لرز اٹھیں ، جس کا اثر چاروں طرف پھیل گیا ۔ میں زلزلے کی بات نہیں کر رہا ہوں ۔ اس دن ، جو بہت منحوس تھا ، میراث کی فوج کے بد نصیب اور شوریدہ سر سپاہی شہر میں آئے ۔ نہایت ظالم و مفسد ، انگریزوں کے خون کے پیاسے ، شہر کے مختلف دروازوں کے محافظ جو ان فسادوں کے ہم پینہ اور بھائی بند تھے ، بلکہ تعجب نہیں کہ چلے ہی ان محافظوں اور فسادوں میں سازش ہو گئی ہو ۔ شہر کی حفاظت کی ذمہ داری اور حق تک ہر چیز کو بھول گئے ۔ ان بن ہلانے یا مدعو کردہ سپہنوں کو خوش آمدید کہا ۔ ان مدہوش سواروں اور اکھڑ پیادوں نے جب دیکھا کہ شہر کے دروازے کھلے ہیں اور محافظ سپاہ نواز ہی دیوانوں کی طرح ادھر ادھر دوڑ پڑے ۔ جلدھر کسی افسر کو پایا اور جہاں ان قابل احترام انگریزوں کے مکانات دیکھے ، جب تک افسروں کو مار نہیں ڈالا اور ان مکانات کو بالکل تباہ نہیں کر دیا ادھر سے رخ نہیں پھیرا ۔ ہر شخص غم گین و ماتم زدہ اپنے گھر میں بیٹھ رہا ۔ انہیں غم زدہ لوگوں میں سے ایک میں بھی ہوں ۔ میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ شور و غوغا سنا ۔ چاہتا تھا کہ معلوم کروں کہ اتنے

میں شور مچ گیا کہ اندرون قلعہ صاحب ایجنٹ بہادر اور قلعہ دار قتل کر دیے گئے۔ ہر طرف سے بیادوں اور سواروں کے دوڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ زمین ہر طرف گل انداموں (یعنی انگریزوں) کے خون سے رنگین ہو گئی۔ باغ کا ہر گوشہ ویرانی اور بربادی کے سبب سے بہادروں کا مدین بن گیا۔^{۱۱}

جب ہنگامہ ختم ہوا اور انگریزوں کی فتح ہوئی تو بے شمار لوگ بھانسی پر چڑھا دیے گئے۔ غالب نے اس کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے :

”اس قید میں قید خانہ شہر سے باہر ہے اور حوالات اندرون شہر۔ ان دونوں میں بے شمار لوگوں کو پھر دبا گیا ہے۔ ان دونوں قید خانوں کے جن قیدیوں کو مختلف دنوں میں بھانسی دے دی گئی ہے، ان کی تعداد فرشتہ موت ہی جانتا ہے۔ شہر میں ایک ہزار سے زیادہ مسلمان نہیں پاؤ گے۔ میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ جو لوگ شہر سے نکل کر چلے گئے ہیں، ان میں سے کچھ لوگ اس قدر دور نکل گئے ہیں گویا وہ اس سر زمین (دہلی) کے باشندے تھے ہی نہیں۔ بہت سے حالی مرتبہ لوگ شہر کے ارد گرد دو دو چار چار کوس پر ٹیلوں، گڑھوں، چھپروں اور کچے مکانوں میں اپنے نصب کی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے پڑے ہیں۔“^{۱۲}

غالب نے ’دستیبو‘ میں اپنی غمی حالات بھی لکھے ہیں اور اس ’بر آشوب زمانے‘ میں جو کچھ پریشانیات انہیں آٹھانی پڑی ہیں ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

”جس دن سے گورے مجھے پکڑ کر لے گئے تھے، اس دن کے علاوہ جو کھٹ پر قدم رکھنا، گھر سے باہر نکلنا، گلی یا بازار میں چلنا یا دور سے چوک کو دیکھ لینا نصیب نہیں ہوا ہے۔“^{۱۳}

اسی زمانے میں ۲۹ صفر ۱۲۷۷ھ کی شب کو غالب کے چھوٹے بھائی یوسف مرزا کا انتقال ہوا۔ مرنے سے قبل وہ کوئی تیس سال تک دیوانگی کی

۱- غالب : دستیبو (ترجمہ) اردو معلول دہلی : صفحہ ۱۸۳

۲- ایضاً : صفحہ ۲۱۹

۳- ایضاً : صفحہ ۲۰۹

زندگی بسر کر چکے تھے۔ غالب نے اُن کے مرنے کا حال اس طرح لکھا ہے :

”۱۹ اکتوبر کو پیر کے دن نے (جس کا نام ہفتے کے رجسٹر سے کاٹ دینا چاہیے) آئٹل فشاں اڑھے کی طرح دنیا کو لٹکال لیا۔ اسی دن صبح کے وقت وہ کم بخت دربان بھائی کے مرنے کی خبر لایا۔ کہتا تھا کہ وہ گرم رفتار راہ فنا (یوسف مرزا) پانچ دن تیز غار میں مبتلا رہا اور آدھی رات کے قریب اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ پانی، رومال، غسل، کورکن، اینٹ چوئے، گاڑے وغیرہ کا ذکر چھوڑو۔ یہ بتاؤ میں کیسے جاؤں اور میت کو کہاں لے جاؤں۔ کس قبرستان میں سپرد خاک کروں۔ بازار میں اچھا برا کسی قسم کا کپڑا نہیں ملتا۔ زمین کھودنے والے مزدور گویا کبھی شہر میں تھے ہی نہیں۔ ہندو اپنے مردوں کو دریا کنارے لے جا کر جلا سکتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی کیا عیال ہے کہ دو تین شخص ساتھ ساتھ رات بھر سے گزریں۔ چہ جائے کہ میت کو شہر سے باہر لے جائیں۔ بڑوسیوں نے میری تنہائی پر رحم کیا اور اس کام کو انجام دینے کے لئے لیاہ ہوئے، پٹیلے کے ایک صہابی کو آگے کیا، میرے دو نوکروں کو ساتھ لیا اور چل دے۔ میت کو غسل دیا، دو تین سلید چادریں جہاں سے گھر لے گئے تھے۔ ان میں لیٹا اور مسجد میں جو مکان کے برابر تھی، زمین کھودی میت کو اس میں رکھ دیا اور اس گڑھے کو پاٹ کر لوٹ آئے۔“

’دستنبو‘ میں غالب نے اس قسم کے بہت سے واقعات کو جمع کر دیا ہے اور اس طرح یہ مختصر سی کتاب ان کی زندگی کے حالات اور اس زمانے کے واقعات کی ایک اچھی دستاویز بن گئی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس میں غالب نے انگریزوں کا ذکر ہمدردی کے ساتھ کیا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اس برعظیم کے حاکم بن چکے تھے۔ لیکن اس سر زمین کے لوگوں پر جو تباہی آئی، اس کا بیان بھی غالب نے بڑی شدت کے ساتھ کیا ہے۔

جب غدر کا ہنگامہ ہوا ہے، اس وقت غالب کی عمر ہاشٹھ سال تھی۔ اس سے قبل بھی وہ اپنی زندگی کا بیشتر زمانہ پریشانیوں میں گزار چکے

تھے۔ اب غدڑ کی وجہ سے جو انتشار پیدا ہوا، اس نے لو ان کی دنیا بالکل ہی اجاڑ دی۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک حکومت کو دم توڑتے ہوئے اور ایک تہذیب کو انتشار کا شکار ہونے ہوئے دیکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی بقیہ زندگی بڑی ہی ذہنی پریشانی اور کوفت کی حالت میں گزری۔ زمانے کے غم نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔

اس ہشکامے کے بعد غالب کا دربار رام پور سے تعلق گھبرا ہو گیا۔ ۸۵۹ع میں انہیں رام پور سے سو روپے سپینہ تنخواہ ملنا شروع ہوئی اور یہ سلسلہ انتقال کے وقت تک جاری رہا۔ ۸۶۰ع میں وہ نواب یوسف علی خان کی دعوت پر رام پور گئے اور وہاں قیام کیا۔ کچھ عرصے بعد دلی واپس آئے۔ ۸۶۵ع میں نواب کاب علی خان کی دعوت پر وہ پھر رام پور گئے اور کچھ عرصہ وہاں قیام کیا۔

۸۷۰ع میں غالب کی ہشش بھی انگریزوں نے جاری کر دی اور دربار و خلعت کا بھی اجرا ہوا۔ اس لیے مالی اعتبار سے یہ زمانہ غالب کے لیے کسی حد تک سازگار ثابت ہوا۔

لیکن اب ان کے فوٹل نے جواب دے دیا تھا۔ عمر بھی خاصی ہو چکی تھی۔ زندگی میں حد سے بھی بہت اٹھائے تھے۔ پریشانی بھی بے شمار دیکھی تھیں۔ ذکاوت بھی بہت جھپٹے تھے۔ جہد مسلسل نے بھی تھکا دیا تھا۔ زمانے کے غم بھی بہت سے تھے۔ بیماریوں نے بھی آگھبرا تھا۔ زندگی کے اس دور کی صحیح تصویر ان کے آخری دور کے خطوط میں ملتی ہے۔ میرزا تقی کو لکھتے ہیں :

”آؤ میرزا تقی ! میرے کلمے لگ جاؤ۔ بیٹھو اور میری حلیف بنو !
 سامعہ مر گیا تھا۔ اب باصرہ بھی ضعیف ہو گیا۔ جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں سب مضاعف ہیں۔ حواس سراسر مختل ہیں۔ حافظہ گویا کبھی نہ تھا۔ شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی۔“

”بہائی ! وہ خط پہلا تم کو پہنچ چکا ہوں کہ بیمار ہو گیا۔ توقع زیست کی نہ رہی۔ قولنج اور پھر کیمسا شدید کہ پانچ پھر مرغ نیم ہسمل کی طرح نڑپا کیا۔ آخر عصارہ“ رولند اور ارنلڈی کا تیل لیا۔ اس

وقت تو بچ گیا۔ قصہ تلخ نہ ہوا۔ مختصر کہنا ہوں میری غذا تم جانتے ہو کہ تفرستی میں کیا ہے۔ دس دن دو بار آدھی آدھی غذا کھائی۔ گویا دس دن میں ایک بار غذا تناول فرمائی۔ کل سے خوف مرگ گیا ہے اور صورت زیست کی نظر آتی ہے۔“^۱

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :

”یوسف مرزا ! میرا خیال سوائے میرے اور میرے خداوند کے کوئی اور نہیں جانتا۔ آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں۔ عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس بجوم غم میں میری قوت متذکرہ میں فرق آ گیا تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا پاور نہ کرنا غضب ہے۔ بوجہ کہ غم کیا ہے۔ غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت، غم مرگ۔۔۔۔۔“^۲

علامہ الدین احمد خان کو لکھتے ہیں :

”۔۔۔۔۔ بربری حقیقت سنو! مہینہ بھر سے زیادہ کا عرصہ ہوا بائیں پاؤں میں ورم کف پا سے پشت یا کو گھیرنا ہوا پٹلی تک آس۔ کھڑا ہوتا ہوں تو پٹلی کی رگیں بھٹنے لگتی ہیں۔ پیر نہ آٹھا۔ روٹی کھانے محل سرا نہ گیا۔ کھانا یہیں سنکا لیا۔ اور حوائج کو کیا کروں۔ یہ سب موقع خیال میں لا کر روح لو کہ کیا گزرتی ہوگی۔۔۔۔۔“

پیری و حد عیب چنی گفتہ اند

اپنا یہ مصرع بار بار جبکہ جبکہ پڑھتا ہوں ع

اے مرگ ناگہان بھے کیا انتظار ہے

مرگ اب ناگہانی کیاں رہی۔ اسباب و آثار سب فراہم ہیں۔ بائے

الہی بخش خان معروف کا کیا مصرع ہے :

آہ جی جاؤں نکل جائے اگر جان کیوں

زائیدہ بے قائدہ۔ مرگ کا طالب غالب جمعہ ۳ جولائی ۱۸۶۳ ع۔

منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں :

”قبلہ ! پیری و حد عیب ساتویں دپاکے مہینے کن رہا ہوں۔ قولیج

۱۔ انتخاب خطوط غالب : صفحہ ۱۷۸

۲۔ ایضاً : صفحہ ۲۸۰

آگے دوری تھا۔ اب دائمی ہو گیا ہے۔ غذا کم معلوم نہ کہہو تو یہ منزلہ مفقود کہو۔ بھرگرمی نے مار ڈالا۔ ایک حرارت غریبہ چکر میں پانا ہوں جس کی شدت سے بھنا جاتا ہوں۔“ (۱۸۶۶ء)
حکیم سید احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں :

”پیر و مرشد! آپ کو میرے حال کی بھی خبر ہے۔ ضعف نہایت کو پہنچ گیا۔ رعشہ پیدا ہو گیا۔ یبانی میں بڑا دنور پڑا۔ حواس مختل ہو گئے۔“
۱۸۶۶ء

میر غلام بابا خان کو لکھتے ہیں :

”اگر میری اوقات شب روزی اور میرے حالات آپ دیکھیں تو تعجب کریں گے کہ یہ شخص جیتا کیوں کر ہے۔ صبح سے شام تک ہلنگ پر پڑا رہتا ہے۔ اور پھر دم بدم پیشاب کو اٹھنا ان مجموع مصائب میں سے اولین مصیبت یہ ہے کہ ۱۸۶۲ء شروع ہوئے۔ ۱۸۶۳ء کی ولادت ہے۔ اب کے رجب کے مہینے سے سترواں سال شروع ہو گا۔ سترہ بہترا ہو گا ابا بچ آدمی ہوں۔“
(۱۸۶۷ء)

امراض جسمانی کا بیان اور اخلاص ہم ذکر کی شرح کے بعد ہجوم عم ہائے نہانی کا ذکر کیا کروں جیسا کہ اہر سیاہ چھا جاتا ہے یا ٹڈی دل آتا ہے۔ بس اللہ ہی اللہ ہے۔“ (۶ اپریل ۱۸۶۸ء)
ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے نا موافق حالات نے غالب کو آخر عمر میں داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی ایک شمع بنا دیا تھا۔ ناسازگار حالات میں آخر یہ کب تک فروزاں رہ سکتی تھی۔ بالآخر یہ شمع، اسی عالم میں ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

۱۔ انتخاب خطوط غالب : صفحہ ۱۸۷

۲۔ ایضاً : صفحہ ۱۸۹

۳۔ ایضاً : صفحہ ۱۹۱

غالب
کا
ماحول

غالب اپنے ماحول کی پیداوار تھے اور اس ماحول کا مخصوص رنگ اُن کی شخصیت میں رچا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے سیاسی، معاشرتی، معاشی، اقتصادی، تہذیبی اور مذہبی خیالات سے متاثر تھے اور اُن کی ذہنی نشو و نما انہیں حالات کے سایے میں ہوئی ہے۔ انہیں اپنے زمانے کی سیاست اور سیاسی حالات سے بظاہر کوئی خاص تعلق نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے زمانے کے معاشی، معاشرتی حالات سے بھی براہ راست کوئی خاص دلچسپی نہیں لی، وہ مذہبی آدمی بھی نہیں تھے اور انہیں اپنے زمانے کی مذہبی زندگی سے بھی کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ لیکن چونکہ انہوں نے ان حالات کی اغوش میں آنکھ کھولی اور انہیں کے سایے میں ان کی نشو و نما ہوئی، اس لیے وہ براہ راست نہیں تو بالواسطہ طور پر ان سے ضرور متاثر ہوئے ہیں۔ اور ان کی شخصیت میں ان حالات کے اثرات بہت گہرے نظر آتے ہیں۔ اُن کی حرکات و سکنات، عادات و اطوار، انکڑ و خیالات، نظریات و تصورات سب میں ان حالات کے مختلف اثرات کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ان حالات نے جو مخصوص ماحول پیدا کیا ہے اور اُن کے ہاتھوں اُس زمانے کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جو مخصوص فضا قائم ہوئی ہے، اُس کا نمایاں اثر غالب کی شخصیت میں نظر آتا ہے۔ اس مخصوص ماحول میں جو معیار قائم ہوئے ہیں اور اس مخصوص فضا میں جن قدروں کی ترویج ہوئی ہے۔ غالب کی شخصیت اُن کی صحیح آئینہ دار ہے۔ یہ ظاہر وہ اپنے زمانے کی زندگی سے الگ تھلک رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی محدود سی دنیا علیحدہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا عام انداز ان کے بیستر ہم عصروں سے مختلف

معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اُس زمانے کی زندگی کا عام انداز ان کی شخصیت میں اپنی جہلک دکھانا ہے۔ اور جس ماحول نے اس انداز کو پیدا کیا ہے، وہ اُس کے صحیح ترجمان اور عکس نظر آتے ہیں۔

یہ زمانہ سیاسی اعتبار سے ایک انتشار اور اتراٹری کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں مرکزیت ختم ہوئی ہے۔ اقتدار کا خاتمہ ہوا ہے۔ طاقت نے دم توڑا ہے۔ حکومت وقت کی بنیادیں متزلزل ہوئی ہیں۔ نظام مملکت کی جان کے لالے بڑ گئے ہیں۔ نظام و نسق پر جان کٹی کا عالم طاری ہوا ہے۔ زندگی کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہیں۔ اس کے نتیجے میں، ہنگامے کھڑے ہوئے ہیں۔ کسی چیز کا کچھ ٹھیک نہیں رہا ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہے۔ زندگی میں کوئی نظام و ضبط باقی نہیں رہا ہے۔ بد نظمی زندگی کا قانون بن گئی ہے۔ شورشوں نے سر اٹھایا ہے۔ فتنے اُتار دیے ہیں۔ بغاوتوں نے جڑ پکڑی ہے۔ سازشوں کا بازار گرم ہوا ہے۔ شاہان وقت صرف نام کے بادشاہ رہ گئے ہیں۔ مخرب طاقتوں نے الہیں شاہ شطرنج سے زیادہ حیثیت نہیں دی ہے۔ جس کو بھی ذرا سا موقع ملا ہے اُس نے من مانی کی ہے اور جس کی لالہیں اُس کی بھوس کے خیال پر عمل ہوتا رہا ہے۔ انہوں نے ساتھ بیگنے بھی میدان میں آ گئے ہیں۔ سات مستدر ہار سے آئے ہوئے لوگوں نے ملکی سیاست میں باقاعدگی سے حصہ لینا شروع کر دیا ہے، اور طاقت کی ہوس نے انہیں جو خواب دکھائے انہیں عملی شکل دینے کی کوشش بھی انہوں نے باقاعدگی سے شروع کر دی ہے۔ وہ صحیح معنوں میں حکمران بن بیٹھے ہیں اور بادشاہوں کو اٹھانے بٹھانے کا کاروبار انہوں نے شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ اُن کا اقتدار بڑھنے لگا ہے۔ اس بڑھنے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر بہت سے لوگ اُن کے ساتھ ہو گئے ہیں۔ اور انہوں نے ان کے اقتدار کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ لیا ہے۔ چنانچہ عجیب عجیب تماشے ہوتے رہے ہیں۔ اس زمانے کی زندگی ان تماشوں کو نہ صرف دیکھتی رہی ہے، بلکہ ان تماشوں میں اُسے خود بھی شریک ہونا پڑا ہے۔ اور اس طرح وہ خود ایک تماشا بن گئی ہے۔

ان حالات نے اُس زمانے کی زندگی کے ہر شعبے کو بکڑ کر رکھ دیا ہے۔ معاشرتی زندگی مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ جو معاشرتی روایات سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر اُس وقت کے افراد تک پہنچی ہیں، انہیں ان لوگوں نے

عزیز تو رکھا ہے لیکن وہ انہیں پوری طرح برقرار نہیں رکھ سکے ہیں۔ معیار ڈانوا ڈول ہو گئے ہیں۔ قدریں متزلزل ہو گئی ہیں۔ صرف ان کا خیال باقی رہ گیا ہے۔ اس لیے ان کی عملی شکل اس زمانے میں ذرا کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ افراد کا اخلاق بگڑا ہے۔ لذت اور تعیش کے خیالات اخلاقی معیاروں کو ہٹا لے گئے ہیں۔ اس سیلاب کے سامنے بڑے بڑوں کا قدم جانا مشکل ہو گیا ہے اور وہ اس دھارے کے ساتھ بہہ نکلے ہیں۔ مذہبی اور دینی، ذہنی اور فکری تحریکیں بھی انہیں سہارا نہیں دے سکی ہیں۔ زندگی میں لوگوں نے پناہ ڈھونڈی ہے۔ ذہنی تعیش کو افراد نے اپنا مزاج بنا لیا ہے۔ فرار پسندی ان کی طبیعتوں میں داخل ہو گئی ہے۔ غرض اس زمانے میں زندگی نے عجب عجب طوفانوں کو اُٹھایا ہے۔ معاشی اور اقتصادی نظام میں رخنے پڑ گئے ہیں اور وہ درہم برہم ہو گیا ہے۔ جب سیاسی زندگی میں سکون و اطمینان اور معاشرتی زندگی میں اعتدال و توازن نہ ہو تو اقتصادی اور معاشی نظام کی بنیادوں کا متزلزل ہو جانا یقینی ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں معاشی اور اقتصادی نظام اقدار کے فشار نے زندگی میں کچھ عجب انتشار پیدا کر دیا ہے۔ افلاس اور ناداری عام ہوئی ہے۔ بڑے بڑوں کو اس انتشار کی وجہ سے مصیبتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ زرگری کی ہوس جاری رہی ہے اور اس ہوس نے اعلیٰ معیاروں کو پس منظر میں ڈال دیا ہے۔ لوگ اپنی اپنی فکر میں پریشان اور سرگرداں رہنے لگے ہیں۔ غرض اس زمانے کی زندگی مجموعی طور پر ان حالات کی وجہ سے بڑے ہی انتشار اور افراتفری سے دو چار ہوئی ہے۔

غالب نے اس آشوب قیامت کی آغوش میں آنکھ کھولی اور اسی سیاسی انتشار، معاشی معاشرتی افراتفری اور ذہنی فشار کے سانچے میں زندگی کے دن گزارے۔ یہ سارا ہلچلا انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ناسازگار حالات کے تمام مناظر ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزرے۔ انہوں نے ان کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی۔ ان کے نشیب و فراز کا انہیں علم ہوا۔ چنانچہ اس زمانے کی زندگی کا متد و جزر ان کی شخصیت میں بھی اپنا اثر دکھانا ہے۔ وہ اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے زمانے کی زندگی کا جزو معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ گہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ اس زندگی کی صحیح سمجھائی کرتے ہیں۔ اور اس زمانے میں جو واقعات ظہور پذیر

ہوئے ہیں ، مجموعی طور پر ان کا اثر ان کی شخصیت میں کسی نہ کسی زاویے سے اپنی جھلک ضرور دکھانا ہے ۔ اس لیے ان حالات و واقعات کی تفصیل و جزئیات کی تلاش و جستجو غالب کے مطالعے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے کیوں کہ اسی آنکھ میں ان کی زندگی اور شخصیت کے خط و خال صحیح طور پر نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں ۔

۲

وہ زمانہ جس کی آغوش میں غالب نے آنکھ کھولی اور جی ماحول میں انہوں نے زندگی کے دن گزارے ، ہندوستانی مسلمانوں کے انحطاط و زوال کا زمانہ ہے ۔ مغلوں کی سلطنت اس زمانے میں زندگی اور موت کی کشمکش سے دو چار ہوئی ہے اور اس پر عرصے تک نزع کا عالم طاری رہا ہے ۔ انحطاط و زوال کی وہ کیفیت جو اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد رونما ہوئی ، اس زمانے میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی ۔ عالمگیر کا انتقال ۷۰۷ھ میں ہوا ۔ اس کی آنکھ بند ہوتے ہی سلطنت سیاسی ہنگاموں سے دو چار ہوئی ۔ مرنے وقت اس نے اپنے بیٹوں کو میل جول کے ساتھ رہنے کی چار وصیت کی تھیں ، اس کا کوئی اثر نہ ہوا ۔ ادھر اس کی آنکھ بند ہوئی ادھر آپس میں جھگڑے شروع ہو گئے ۔ تخت و تاج کے لیے لڑائیوں کا ایک سلسلہ جاری ہوا ۔ کبھی ایک بادشاہ تخت پر بیٹھا ، کبھی دوسرا ۔ اس ماحول نے سازشوں کو ہوا دی ۔ چنانچہ مغلوں کی حکومت میں دور دور تک سازشوں کے جال پھیلا دیے گئے ۔ ان سازش کرنے والوں نے کٹھ پتلیوں کی طرح بادشاہوں کو اپنی گرفت میں رکھا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کی ماری ساکھ ختم ہو گئی ۔ طاقت نے جواب دے دیا ۔ ہر چیز منتشر ہو گئی ۔ افراتفری کا دور دورہ ہوا ۔ اس صورت حال سے بعض باغیانہ قوتوں نے فائدہ اٹھایا اور یہ لوگ ہندوستان پر حکومت کرنے کے خواب دیکھنے لگے ۔ چنانچہ لڑائیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو کم و بیش انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک جاری رہا ۔ ان طاقتوں میں مرہٹے ، سکھ اور انگریز خاص طور پر پیش پیش رہے ۔ ہندوستان کی تاریخ میں تقریباً تین چوتھائی صدی کا زمانہ انہیں ہنگاموں کی قاریج ہے ۔

یہ ہنگامے کبھی بھی نہ ہونے یا کم از کم یہ صورت اختیار نہ کرتے ۔ اگر مغلوں کی سلطنت میں داخلی طور پر مرکزیت اور استواری باقی رہتی لیکن مغلوں کی ہوس نے بھائی کو بھائی کے خون کا پیاسا بنا دیا ۔ وہ بات بات پر ایک دوسرے سے لڑنے لگے ۔ سلطنت کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے ایک دوسرے کے خون کو بانی کی طرح بہایا ، جیسے وہ ان کے نزدیک جہت ہی معمولی سی بات تھی ۔ ان حالات نے جماعت ہندویوں اور سازشوں کے لیے زمین ہموار کی ۔ چنانچہ مغلوں کے دور آخر میں یہ سازشیں اور جماعت ہندواں زندگی کا جزو بن گئیں ؛ اور اُس زمانے کی سیاسی تاریخ انہیں سازشوں اور جماعت ہندویوں کی ایک داستان معلوم ہوتی ہے ۔ یہ سازشیں درباروں ہی تک محدود رہتیں تو صبر تھا ۔ محسوس تو اس بات کا ہے کہ انہوں نے اپنے حدود سے باہر نکل کر بیرونی طاقتوں سے ساز باز بھی شروع کر دی ۔ اور اس طرح ان کے علم بردار ان طاقتوں کے اشاروں پر رقص کرنے لگے ۔ اس زمانے میں مغلوں کا دربار دو جماعتوں کی سازشوں کا شکار رہا ۔ ان میں ایک تو ایرانی جماعت تھی اور دوسری تورانی ۔ ہندوستان کی سیاست میں اُس وقت انہیں کا عمل دخل تھا ۔ یہ لوگ آپس میں لڑتے رہتے تھے ، اور اس کا اثر اس زمانے کے سیاسی حالات پر پڑتا تھا ۔ سر جادو ناتھ سرکار نے 'تاریخ احمد شاہی' کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس زمانے کا تمام فتنہ و فساد ایرانی اور تورانی امراء کے آپس کے جھگڑوں کا نتیجہ تھا ۔ وہ شاہزادوں کو آپس میں لڑاتے تھے تاکہ ان کی اپنی اہمیت محسوس کی جائے اور انہیں من مانی کرنے کے مواقع ملتے رہیں ۔ ان سازشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مارے ملک میں ابتری پھیل گئی ۔ صوبے دار اپنے اپنے علاقوں میں خود مختار بن بیٹھے اور اس طرح مغلوں کی مرکزیت کا خاتمہ ہو گیا ۔ بنگال میں علی وردی خاں نے اپنی حکومت بنا لی ۔ اودھ میں سعادت علی خاں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا ۔ نظام الملک نے دکن میں ایک نئی حکومت کی بنیاد ڈال دی ۔ اس طرح ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ۔ اس کے نتیجے میں بعض نئی طاقتوں نے بھی سر اٹھایا ۔ سکھ پنجاب میں حاکم بن بیٹھے اور مسلمانوں کے خلاف ہنگامے کرنے لگے ۔ مرہٹوں نے دکن میں

وہ اودھم مچایا کہ زیست مشکل ہو گئی۔ دلی اور اُس کے قس پاس کے علاقوں میں جالوں اور روہیلوں نے اپنے ہنگاموں سے قیامت برپا کر دی۔ اور پھر ان حالات کو دیکھ کر انگریز بھی ہندوستان کی سیاست میں بھالہ پڑے۔ ساحلی علاقوں میں تو ان کا اثر بہت پہلے سے موجود تھا۔ اب جو آنتوں نے یہاں کی سیاسی زندگی کے عام انتشار کو دیکھا تو ان کے دل میں طاقت حاصل کرنے کی خواہش بیدار ہو گئی اور وہ بھی ان ہنگاموں میں شریک ہو گئے۔ غرض مغلوں کے انحطاط کے باعث ہندوستان میں سیاسی اعتبار سے بڑی ہی غیر یقینی کیفیت پیدا ہوئی۔ اور ساری زندگی میں انتشار اور ہنگاموں کا کچھ اس طرح دور دورہ ہوا کہ ہر چیز کی بنیادیں ہل گئیں، اور زندگی کا ہر شعبہ اپنی جگہ کچھ اکھڑا اکھڑا سا نظر آنے لگا۔

غالب نے جب آنکھ کھولی تو اپنے زمانے کی زندگی کو اسی صورت حال سے دو چار دیکھا۔ یہ شاہ عالم کا زمانہ تھا، جس کی حکومت کچھ عرصے تک مرہٹوں کے رحم و کرم پر رہی لیکن بالآخر ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے مرہٹوں کو دلی سے نکال باہر کیا اور اس طرح شاہ عالم بادشاہ ایک صیاد کے چنگل سے نکل کر دوسرے صیاد کے چنگل میں پھنس گیا۔ یہ وہی بد قسمت اور تیرہ روزگار شاہ عالم تھا جس نے اس سے قبل زمانے کے پانیوں عجب عجب ستم اٹھائے تھے۔ پورے پینتالیس برس تک اُس نے حکومت کی اور ان پینتالیس برسوں میں اس نے وہ کچھ دیکھا کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ خاصے عرصے تک انگریزوں نے اُسے اپنا الہ کار بنائے رکھا۔ 'دو برس تک بادشاہ کو شجاع الدولہ ساتھ ساتھ لیے پھرا۔ کبھی بنارس لیے گیا، کبھی الہ آباد، کبھی لکھنؤ۔ ظاہر میں بادشاہ معلوم ہوتا تھا مگر در حقیقت وہ لہدی اعزاز کے ساتھ نہا'۔ پھر انگریزوں نے اس کی پنشن مقرر کر دی اور وہ الہ آباد میں رہنے لگا۔ ادھر دلی میں احمد شاہ ابدالی نے جوان بخت کو نائب بادشاہ مقرر کیا تھا اور اس طرح دلی کی سلطنت چل رہی تھی۔ مرہٹوں اور جاٹوں کے ہنگامے جاری تھے۔ شاہ عالم کو الہ آباد میں رہتے ہوئے خاصا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس لیے ۱۷۷۱ء میں اُس نے دلی جانے کا ارادہ کیا۔ اور بغیر کچھ سوچے سمجھے

چل دیا۔ میجر جنرل سر ووپرٹ پا کر صاحب کچھ فوج لے کر کٹوا نک
بادشاہ کے ساتھ گیا۔ یہاں ان جنرل صاحب نے بادشاہ سے عرض کیا کہ
آب دلی نہ جائیے، مگر بادشاہ نے نہ مانا جن اضلاع میں بادشاہ ہو کر
چلا گیا پھر اس کی حکومت کا کوئی نشان ان میں نمودار نہ ہوا۔ اب اس
بادشاہ کی سلطنت میں دو مخالف گروہ تھے۔ ایک مسلمان، جو یہ جانتے تھے
کہ احمد شاہ ابدالی جس قدر ملک ہمارے لیے چھوڑ گیا ہے، اس کو اپنے
قبضے میں رکھیں۔ دوسرے مرہٹے تھے، جو یہ جانتے تھے کہ پانی پت کی
لڑائی میں جو نقصان ہوا ہوا ہے اُسے ہوا کریں۔ اس کے سوا شجاع الدولہ
نہا جو اس کی ناک میں رہتا تھا کہ جو گروہ ضعیف ہو اُس سے کچھ
لے مرے۔ انگریز بھی اپنی دانش مندی سے اعتدال کے ساتھ اس منصوبے
کے دریغے تھے۔ اب بادشاہ فتح گڑھ میں پہنچا۔ یہاں احمد بخش پنکھن انیس
دنوں میں مرا تھا۔ اُس کے بیٹے مظفر الدولہ نے پانچ لاکھ روپہ قرائتہ
بیش کیا۔ بادشاہ نے یہاں برسات کے سبب سے قیام کیا۔ اس وقت تین ہزار
مرہٹوں کی سپاہ دلی میں موجود تھی۔ مادھو جی سیندھیا چلے فرخ آباد میں
بادشاہ کے پاس آیا اور اپنے عہد و بیان بادشاہ سے ٹھہرا گیا۔ اور
۲۵ دسمبر ۱۷۷۱ء کو بادشاہ قلعہ میں داخل ہوا۔ عبدالاحد خان کشمیری
بادشاہ کا مقرب ہوا۔ مجدد الدولہ کا اُس کو خطاب ملا۔ وہ مدار المہام
بادشاہ کے گھر کا ہوا۔ یہ ایک آدمی بڑا سکڑا اور فریبی تھا۔ اُس کے کاموں
کا آگے حال معلوم ہوگا۔ مرزا نجف خان نے سپاہیوں اور بہادروں کو تلاش
کرنے اپنے تئیں لائق سپہ سالار بنایا۔ اب یہاں بادشاہ کو اُس کے دوستوں
یعنی مرہٹوں نے چین نہیں لئے دیا۔ دلی اور اُس کے آس پاس چھوٹی چھوٹی
لڑائیاں ہوتی رہیں۔ کبھی جانوں نے ہنگامہ کیا، کبھی مرہٹے شورش برپا
کرتے رہے، کبھی سکھوں کی یورشیں جاری رہیں۔ بالآخر مادھو جی سیندھیا
دلی پر قابض ہو گیا۔ بیشتر سردار اُس کے مطیع ہو گئے۔ شاہ عالم بادشاہ
اُس وقت لال قلعے میں ایک معزز قیدی تھا۔

۱۔ ذکا اللہ : تاریخ ہندوستان : جلد نہم ، صفحہ ۳۰۹

۲۔ W. Francklin : The History of the the Reign of Shah

Auhum : P. 179.

اسی زمانے میں غلام قادر روپیہ کو عروج حاصل ہوا اور اُس نے اپنے باپ کے کھوئے ہوئے جاہ و منصب کو حاصل کرنے کے خیال سے دلی پر حملہ کرنے کے منصوبے بنائے۔ کچھ لڑائیوں کے بعد دلی میں اُس کا تسلط ہو گیا۔ اسی زمانے میں وہ شاہ عالم بادشاہ سے فاراض ہو گیا۔ کیونکہ اُس نے سیدھا سے ساز باز کر رکھی تھی۔ "بادشاہ نے ایک خط سیدھا کو لکھا تھا کہ امداد کے واسطے آؤ اور وہ غلام قادر کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس نے یہ خط بادشاہ کے آگے ڈالا۔ اور اُس کو اور اُس کے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ہتھیار ڈال دو۔ انہوں نے حکم کی اطاعت کی۔ اس کم بخت موذی نے بادشاہ کو قید میں ڈال دیا اور سلیم گڑھ میں سے کسی موزق مرزا کو بلا کر بادشاہ کے تخت پر بٹھا دیا اور یدار بخت اُس کا لقب رکھا۔ اور سب سپروں سے اُس کو بادشاہ منوایا۔ تین روز بادشاہ مرے آب و دانہ گزرے۔ اب غلام قادر نے انتظام کے ساتھ قلعے کے لوٹنے کا ارادہ کیا۔ برابر کا دعوے دار اُس کا مرزا اسماعیل یک تھا۔ اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اپنے لشکر میں چلے جاؤ۔ وہ چلا تو گیا مگر بہت جلد اُس کو اپنی حالت یہ معلوم ہوئی کہ بغیر لیے دے چلا آیا۔ ایک آدمی غلام قادر کے پاس بھیجا کہ یاروں کا حصہ یاد رہے۔ سارے شہر کے دولت مند اور معزز اہل کاروں کو بلا کر کہہ دیا کہ ہوشیار رہو اور اپنی حفاظت کا بندوبست کرو۔ اور اپنے سپاہیوں اور نائبوں کو حکم دے دیا کہ اگر روپے لوٹیں تو تم بھی لوٹو۔ غلام قادر نے اول اپنے نئے بادشاہ سے کہا کہ تمام لیکھتا سے جوابدہا لے لو۔ جب اُس سے بھی پیٹ نہ بھرا تو شاہ عالم پر دولت ہٹانے کے لیے غضب توڑنا شروع کیا۔ اُسے یقین تھا کہ اس بوڑھے کو سارے خزانے دقتیے معلوم ہوں گے۔ اب کوئی ظلم و ستم باقی نہ رہا جو اس مظالم نے اس ضعیف پیرانہ سال بادشاہ اور اُس کی اولاد پر نہیں کیا۔ اس کو یدار بخت کے ہاتھوں ہٹوایا اور طرح طرح کی جسمانی تکلیفیں دیں۔ ۳ جولائی کو یکموں کے بدن پر سارے کے قیل ڈال دے اُن کے گلابی کال مارے تھپڑوں کے لال کو دے اُن کے درد ناک آہ و نالے سے مارا محل تھراتا تھا مگر اس کم بخت کے دل میں ذرا رحم نہ آتا تھا۔ اسماعیل یک سے ذرا کٹی دیتی تھی۔ اس کے پاس ۳ جولائی کو پانچ لاکھ روپیہ بھیج دیا اور پھر کئی روز بعد سات لاکھ روپیہ بھیجا۔ سپاہیوں سے بھی

انسانیت کے ساتھ رویہ لیا۔ پہلی اگست کو بھر بادشاہ کو خزانہ بتانے کے لیے آڑے بالہوں لیا۔ اس پر بوڑھا بادشاہ چٹلایا کہ "ارے کم بخت! خزانہ کہاں دھرا ہے۔ میرے بیٹ میں رکھا ہے۔" اسے چیر کر نکال لیے۔ "اب بوڑھی بوڑھی بیگموں کی کم بختی آئی۔ اب تک ان کی تعظیم و تکریم ہو رہی تھی کہ ان سے ساری دولت کا ہتہ لگ جائے گا۔ جب ان سے کام نہ چلا تو ان پر غضب ڈھایا۔ ان سب بوڑھیوں میں ممتاز محل سب سے زیادہ ممتاز تھیں۔ انہیں کی سب سے زیادہ نصرتی کی۔ سب مال و اسباب چھوین، بے چاری کو قلعے سے نکال دیا۔ جس کو بادشاہ نے بنایا تھا اس کی تعظیم و تکریم کو بھی اس نے سلام کیا۔ حتیٰ کے دم اس کے سامنے اڑائے۔ دیوان خاص میں بادشاہ کے برابر جا بیٹھا۔ ۶ تاریخ کو تخت کو بھی آگ لگا کر سارا چاندی سونا اس میں سے نکال لیا۔ تین روز کے اندر سارا فرش اکھاڑ ڈالا کہ کہیں اس کے نیچے دھینہ پاتھ لگے۔ اب ۱۰ اگست ۱۷۷۸ء آئی۔ یہ وہ تاریخ ہے کہ جس کو ہمیشہ خاندان تیموریہ کی تاریخ میں یاد رکھنا چاہیے۔ غلام قادر نے یعقوب علی اور بن چار بٹھانوں کو ساتھ لیا اور شاہ عالم کو دیوان خاص میں بلایا اور بھر خزانہ کو پوچھا۔ اس نے کہا اگر خزانہ مجھے معلوم ہوتا تو میں کیوں کر اپنے ظروف غرہ و طلائی کو بیچ کر اپنے نوکروں کی لٹخواہ تقسیم کرتا۔ اگر کوئی دھینہ گڑا دیا ہوا ہوگا تو مجھے کیا اس کا علم ہے۔ اس پر غلام قادر نے کہا کہ "اب تو کسی کام کا نہیں، تیرا دنیا میں رہنا بیکار ہے۔ آنکھیں تیری نکال لینی چاہئیں" اس پر آہ سرد بھر کر بادشاہ نے کہا کہ "یہ وہ آنکھیں ہیں جو ساتھ برس تک کلام اللہ پڑھتی رہی ہیں۔ ان پر رحم کر" یہ سن کر بادشاہ کے بیٹے ہونوں کو جو اس عالم میں اس کے ہمراہ تھے بے تحاشا مارنا دھاڑنا شروع کیا۔ اس پر بادشاہ نے کہا کہ "ان آنکھوں کے رکھنے کے لیے میں نے اس عذاب اور مصیبت کو دیکھنے کے واسطے نہیں کہا۔ تو ابھی انہیں نکال لیے۔" غرض وہ سفاک تخت پر سے کودا اور بادشاہ کو نیچے لٹا، چھاتی پر چڑھا، ایک آنکھ اپنے خنجر سے نکال لی۔ دوسری آنکھ نکالنے کو یعقوب علی سے کہا۔ اس نے انکار کیا تو فوراً اس کا تلوار سے سر اڑا دیا۔ اس خوف سے اور بٹھانوں نے دوسری آنکھ نکال لی اور بھر بادشاہ کو سلیم گڑھ میں لیے چلے۔ اس وقت جو قلعے کی کیفیت تھی فلم سے بیان نہیں ہو سکتی۔

کوئی شاہ زادہ ہے بس بے کس، غم کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ کوئی شاہ زادی
 سکتے کے عالم میں ہے ہوش تھی۔ کوئی ہائے شاہ عالم، ہائے شاہ عالم
 کہہ کر سر ہیٹ رہی تھی۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو آنسو سے پر نہ تھی۔
 کوئی دل نہ تھا جو اس غم سے خالی تھا۔ جب شہر میں یہ غمیں پھیلیں
 تو خوف و ہراس کی وجہ سے لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔
 لیکن اسی عالم میں مریٹے آگئے۔ لڑائی ہوئی۔ غلام قادر زخمی ہو کر
 گرفتار ہوا۔ منہرا میں اُسے سیندھیا کے سامنے پیش کیا گیا۔ سیندھیا نے
 اس کی بڑی فضیحت کی۔ ایک کدھے پر اٹا سوار کیا۔ اور ایک پہرا ساتھ
 کیا اور ہر ایک دکان سے ایک ایک کوڑی نواب ہاون بحال کے نام سے
 منگوائی۔ پھر اُس کی زبان کاٹ لی، پھر اُس کی آنکھیں پھوڑ ڈالیں پھر
 ناک کان، ہاتھ پیر کاٹ لیے۔ اس طرح لوٹھڑا بنا کر بادشاہ کی خدمت میں
 دلی بھیجا۔ مگر راہ میں موت نے بڑی رفاقت کی۔ کہتے ہیں ۳ مارچ ۱۷۸۹ء ع
 کو ایک درخت میں اُس کو لٹکا کر بھانسی دے دی۔ یہ لاش قیمہ قیمہ
 اندھے بادشاہ کے رو برو دیوان خاص میں بھی کش ہوئی۔ لوگ شاہ عالم
 کے استقلال و صبر و تحمل کی بڑی تعریف کرتے ہیں کہ جس وقت آنکھیں
 اُس کی نکالی گئیں اُس نے آف نہ کی۔ اور خدا کو یاد کرتا رہا اور اس
 حد سے کے بعد بھی اتنے دنوں تک زندہ رہا۔ ”شاہ عالم کی وفات ۶۔۸۔۱۷۸۹ء
 میں ہوئی۔ زندگی میں زمانے نے اُس پر ایسے ستم ڈھائے کہ جن کے خیال
 سے کایا مند کو آنا ہے۔ انگریزوں کی چال بازیاں، مریشوں کی قریب کاریاں
 سکھوں کی ہتکامہ آرائیاں، روہیلوں کی ستم شعاریاں، اُس نے نہ صرف اپنی
 آنکھوں سے دیکھیں، بلکہ اُسے براہ راست ان سب کا شکار ہونا پڑا۔ اُس
 زمانے میں اس شاہ وقت سے زیادہ مظلوم اور بریشان حال کوئی اور شخص
 نظر نہیں آتا۔

یہ ہتکامے غالب نے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھے لیکن کانوں سے
 سنے ضرور۔ البتہ ان کی وجہ سے انتشار اور انرا تفری کی جو فضا اُس زمانے
 میں پیدا ہوئی، وہ انہوں نے نہ صرف دیکھی، بلکہ اُن پر اس فضا کا اثر
 بھی ہوا۔ وہ رجب ۱۲۳۱ھ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء ع میں پیدا ہوئے۔ یہ شاہ عالم

ہی کا زمانہ تھا لیکن انہوں نے جب آنکھ کھول کر دیکھا تو انگریز آکرہ اور دلی پر حکمران ہو چکے تھے۔ لارڈ لیک کی فوجیں ۱۸۰۳ء میں دلی میں داخل ہوئیں۔ ان فوجوں نے مرہٹوں کا قلع قمع کر دیا۔ اور انہیں مار کر دلی سے باہر نکال دیا۔ بادشاہ اب لک مرہٹوں کے رحم و کرم پر تھا۔ لیکن اب انگریزوں نے اسے پناہ دی۔ اس کی بادشاہت کو برقرار رکھا۔ اور ایک لاکھ روپیہ سالانہ اُس کی پنشن منور کی۔ ۱۸۰۶ء میں جب شاہ عالم کا انتقال ہوا تو اس کا ولی عہد اکبر شاہ ثانی تخت پر بیٹھا اور ۱۸۳۷ء تک بادشاہ رہا۔ اس کے زمانے میں ہنگری نو خم ہو گئے۔ کیونکہ انگریزوں کی گرفت دلی پر خاصی مضبوط ہو چکی تھی۔ البتہ دربار میں سازشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ انگریز ان سازشوں کو تشویش کی نظر سے دیکھتے رہے لیکن انہوں نے بادشاہت کو نہیں چھیڑا۔ مغلوں کی نام نہاد حکومت برقرار رہی۔ سکھ انگریزوں کا چلنا رہا۔ اکبر شاہ ثانی کے بعد محمد سراج الدین ظفر بہادر شاہ تخت پر بیٹھے اور ۱۸۵۷ء تک حکمران رہے۔ اُن کے زمانے میں غدر بڑا اور انہوں نے بھی عجب عجب ستم سمیے۔ جوان بیٹوں اور پوتوں کو اُن کی آنکھوں کے سامنے قتل کیا گیا خود جلا وطن کیے گئے۔ اُن کے ساتھ ہی مغلوں کی حکومت ہندوستان سے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

مغلوں کے دور آخر کے یہ سیاسی حالات اُس ماحول کو پوری طرح پیش کر دیتے ہیں جو غالب کے زمانے میں موجود تھا اور جس کے سامنے میں انہوں نے زندگی بسر کی تھی۔ ان حالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلوں کی سلطنت کو گہن لگ گیا تھا۔ اور انگریزوں کے باقائدہ تسلط کے وقت تک وہ اسی عالم میں رہی۔ اس زمانے میں سازشوں کا بازار گرم رہا۔ مغل صرف نام کے بادشاہ رہ گئے۔ اس حالت کو دیکھ کر بعض طاقتوں نے ہندوستان کی سیاسی زندگی میں حصہ لینا شروع کیا۔ اور وہ طاقت حاصل کرنے کے خیال سے ہنگری برپا کرتے رہے۔ ان میں مرہٹے، سکھ، جاٹ، روہیلے اور انگریز سب ہی شامل تھے۔ اس زمانے کی سیاسی تاریخ انہیں طاقتوں کی ہنگامہ آرائیوں کی تاریخ ہے۔ ان طاقتوں کے پیش نظر کوئی بڑا نصب العین نہیں تھا۔ یہ سب کے سب ہندوستان میں کسی طرح اپنا اثر قائم رکھنا چاہتے تھے تاکہ انہیں دولت ملتی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغلوں کو مٹا دینا اُن کے

پیش نظر نہیں تھا۔ وہ تو ان کو اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے تھے۔ اور ان کی خواہش یہ تھی کہ مغل ان کے دست نگر رہیں۔ اس صورت حال نے اس انتشار میں کچھ اور بھی اضافہ کیا جو مغلوں کے سیاسی انحصار کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

مرہٹے اس انتشار کو پیدا کرنے میں پیش پیش رہے۔ اورنگ زیب عالمگیر ہی کے زمانے سے انہوں نے مسلمانوں کے خلاف ہنگامے شروع کر دے تھے۔ اورنگ زیب نے انہیں کچلنے کی کوشش کی۔ ایک حد تک اسے کامیابی بھی ہوئی لیکن اس کے مرتے ہی انہوں نے بغیر سر اٹھایا اور مغلوں کے خلاف اچھا خاصا عداوت قائم کر لیا۔ اس زمانے میں ان کی طاقت بڑھنے لگی۔ اس کی ایک وجہ شہزادوں اور صوبہ داروں کی آپس کی دشمنی بھی تھی۔ مرہٹوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ اٹھارویں صدی میں وہ تہالی ہندوستان کی طرف بڑھنے لگے۔ اس وقت مغلوں کی حالت خراب تھی، اور روز بروز بد سے بدتر ہوتی جاتی تھیں۔ اس لیے ان کے مقابلے میں صف آرا ہونے کے بجائے مغلوں نے ان کے ساتھ مصالحت کرنے اور انہیں مراعات دینے کی حکمت عملی کو اختیار کیا۔ اس حکمت عملی نے ان کی جعب اور بڑھادی۔ بعض مغل بادشاہوں اور سید برادران کی کشمکش نے مرہٹوں کو اور بھی حاوی کر دیا۔ چنانچہ وہ دلی پر حملہ آور ہونے کی ہمت کرنے لگے۔ سید حسین علی نے جب مرہٹوں کو دکن میں چوتھ و پیرہ وصول کرنے کا حق دیا تو بادشاہ کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور اس نے مرہٹوں کے اس حق کو تسلیم نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسین علی نے مرہٹوں کی مدد سے دلی پر چڑھائی کی۔ اس کے بعد ان کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور انہوں نے زیادہ طاقت حاصل کرنے کی باقاعدہ کوششیں شروع کر دیں۔ چنانچہ وہ دلی اور دوسرے علاقوں پر حملے کرتے رہے۔ لیکن اس وقت تک ان کا مقصد صرف لوٹ مار تھا۔ اس لوٹ مار اور غارتگری نے سارے ملک میں دہشت پھیلا دی۔ بادشاہ تک اس خوف و دہشت کا شکار ہوئے۔ مرہٹوں کے مظالم کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ لوگوں کو مار ڈالنا اور آبادیوں کو تباہ کر دینا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل

تھا۔ وہ صرف لوٹ مار اور قتل و غارت ہی میں پیش پیش نہیں تھے، لوگوں کو تکلیف دے کر خوش بھی ہوتے تھے۔ لوگوں کے ہاتھ پر اور ناک کاں کاٹ دینا، عورتوں کو اٹھا لے جانا اور ان کے ساتھ زنا کرنا ان کے معمولات میں داخل تھا۔ آئندہ رام غلام نے چند اشعار میں اس آشوب قیامت کی تصویر کھینچی ہے جو مرہٹوں نے اٹھارویں صدی میں برہا کر رکھا تھا۔

بر دل ما تیرہ روزاں زان صف مرکاں گزشت
آئہ از فوج دکن بر ملک ہندوستان گزشت
در چمن بر بسرگ کل ہا لکھورد صبح از نسیم
بر کسریاں الحجہ از دستم شب بجران گزشت

مرہٹوں کے ان ہنگاموں نے خلی خدا کو پریشان کر دیا۔ اسی پریشانی کو دیکھ کر شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آ کر جہاد کرنے کی دعوت دی۔ اس نے یہ دعوت قبول کی اور پانی پت کی تیسری لڑائی ہوئی جس میں مرہٹوں کی طاقت کا تعرازہ بکھر گیا۔ اس کے بعد بھی وہ برابر اپنی قوتوں کو جمع کرنے کی کوشش کرتے رہے اور ان کی سازشیں شاہی ہندوستان میں بھی جاری رہیں۔ شاہ عالم کے زمانے میں ان کے رہنا سیندھیا نے اچھا خاصا اقتدار حاصل کر لیا۔ انگریزوں کے سامنے اس کی کچھ پیش نہ گئی۔ غرض سازنوں اور جھگڑوں کا سلسلہ برابر جاری رہا اور مرہٹے ایک زمانے تک اس وقت کی زندگی کے لیے مصیبت بنے رہے۔ ان کی وجہ سے سکون ناپید ہو گیا۔ زندگی متزلزل ہو کر رہ گئی۔ نظام اقدار کی بنیادیں ہل گئیں۔ اور اگرچہ انیسویں صدی کے شروع میں انگریزوں نے ان کا قلع قمع کر دیا لیکن ان کی سیاسی دغاچو کڑی نے جو اثرات جھوڑے تھے، وہ عرصے تک باقی رہے۔ غالب نے آنکھ کھول کر دیکھا تو اپنے ماحول کو انہیں حالات سے دو چار پایا :-

اس سیاسی انتشار کو پیدا کرنے میں مرہٹوں کے ساتھ ساتھ سکھ بھی پیش پیش رہے۔ مغلوں سے سکھوں کی دشمنی بہت پرانی تھی۔ اس کا آغاز اس وقت سے ہوا، جب سکھوں نے اپنے آب کو مذہبی تحریک کے چائے

ایک فوجی طاقت میں تبدیل کرنا چاہا۔ اور وہ ہندوستان کی سیاست میں طاقت حاصل کرنے کے خواب دیکھنے لگے۔ گرو نانک نے جو روحانی تحریک شروع کی تھی، اُس کو گرو گوہند سنگھ نے خالص مادی اور دنیاوی بنا دیا۔ چنانچہ مسلمانوں سے سکھوں کے جھگڑے شروع ہو گئے اور وہ خوش گوار تعلقات جو باہر اور اکبر کے زمانے میں تھے، ان کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کی بنیاد تمام لر سیاسی تھی۔ سکھوں کے گرو ارجن سنگھ نے تو ایک ہورا سیاسی نظام تیار کر لیا تھا اور وہ اس کو علی جملہ پہنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ وقت کے ساتھ ساتھ سکھوں میں ملک گیری اور حصول دولت کی ہوس بڑھتی گئی اور اسی صورت حال نے بقول ڈاکٹر تارا چند ایک مذہبی تحریک کو ایسی جماعت میں تبدیل کر دیا جس کو حکمرانی کی ہوس نے دہوانہ بنا دیا۔ سکھوں کے ساتھ مسلمانوں کے جھگڑے جہانگیر ہی کے وقت سے شروع ہو گئے تھے، جب ہاشمی شہزادے خسرو کو گرو ارجن نے ہتھ دی تھی۔ اس پر بادشاہ نے گرو ارجن کو دربار میں طلب کیا اور انہیں سزا دی۔ سکھوں نے اپنی تنظیم کا کام جاری رکھا۔ اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے میں سکھوں کے گرو تیغ بہادر نے کشمیر میں بغاوت کے شعلے بھڑکائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ زیب عالم گیر نے انہیں قتل کی سزا دی۔ غرض اس طرح مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان اختلافات بڑھتے گئے اور دشمنی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اورنگ زیب عالم گیر جب تک زندہ رہا وہ کچھ نہ کر سکے۔ اُس کے مرنے ہی جب اُس کے جانشینوں میں جھگڑے شروع ہوئے تو سکھوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور وہ مسلمانوں کے خلاف ہنگامے کرنے پر تل گئے۔ سکھوں کی نفرت صرف حکومت اور شاہان وقت ہی کے خلاف نہیں تھی، عام مسلمانوں کے بھی وہ جانی دشمن تھے۔ چنانچہ جب بھی انہوں نے کوئی حملہ کیا تو اُس میں عام مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگے اور انہیں تباہ و برباد کیا۔ ان کے ظلم و ستم کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ بچوں اور عورتوں تک کو یہ لوگ مار ڈالتے تھے۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر دیتے تھے۔ مسلمانوں کے دلوں میں اُن کے اس ظلم و ستم کی وجہ سے دہشت بیٹھ گئی تھی۔ مرد اُن کے ڈر کی وجہ سے ہندوؤں کے

گھروں میں جھپ جاتے تھے، اپنے نام بدل لیتے تھے اور عورتیں اپنی عزت اور ناموس کو بچانے کی غرض سے کنوؤں میں ڈوب کر جان دے دیتی تھیں۔ ہندوستان میں اس وقت جو سیاسی انتشار تھا، اس نے سکھوں کو من مانی کرنے کا موقع دیا اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی طاقت بڑھتی گئی۔ ۱۷۷۹ء میں نادر شاہ کا حملہ ہوا، اس کے بعد سکھوں کی طاقت اور ہمت میں اضافہ ہو گیا۔ ۱۷۷۹ء سے ۱۷۶۵ء تک متعدد بیرونی حملوں کی وجہ سے حالات خراب ہو گئے اور سکھوں کو ہنگامہ آرائی کا موقع ملا۔ انہوں نے ۱۷۶۴ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا اور جہلم سے جہاں تک اپنا تسلط قائم کر لیا۔ ۱۷۶۵ء اور ۱۸۰۰ء کے درمیان ان کا اقتدار اور بڑھا۔ انک سے کرنال تک اور ملتان سے جموں تک ان کے قبضے میں آ گیا۔ اور انہوں نے دواپور اور روہیل کھنڈ پر بھی حملے کرنے شروع کر دیے۔ انیسویں صدی کے شروع میں سہاراجہ رنجیت سنگھ نے پنجاب میں اپنا اقتدار قائم کیا، اور سکھوں کی طاقت اپنے پورے عروج پر پہنچ گئی۔ یہ اس زمانے میں ان ہنگامہ آرائیوں کا سلسلہ کسی حد تک ختم ہوا جو اس سے قبل سکھوں نے برپا رکھے تھے۔ رنجیت سنگھ نے ۱۸۰۹ء میں انگریزوں کے ساتھ صلح کر لی جس کی رو سے اس کی حکومت دریائے ستلج تک محدود کر دی گئی۔ انگریزوں کے ساتھ اس صلح نامے نے دلی اور اطراف دلی میں تو سکھوں کے ہنگاموں کو ختم کر دیا لیکن پنجاب اور سرحد کے علاقوں میں ان کی سلطنت دشمنی جاری رہی، انہوں نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ اور اسی کے نتیجے میں مولانا سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد عمل میں آئی۔

سکھوں کے ساتھ اس زمانے میں جاتوں کا بھی عروج ہوا اور مسلمانوں کے دور آخر میں انہوں نے بھی بڑے ہنگامے برپا کیے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد ان لوگوں نے بھی دلی اور اطراف دلی میں لوٹ مار شروع کر دی۔ یہ لوگ بھی مسلمانوں کے جاتی دشمن تھے اور ان کے

۱۔ غلام حسین خاں : سیر المتاخرین : صفحہ ۳۰۲

۲۔ خلیق احمد نظامی : تاج مشائخ چشت : صفحہ ۳۱۸

۳۔ Lyall : Rise and Explanation of British Power in India

پیش نظر بھی مسلمانوں کی بنیادوں کو متزلزل کرنا تھا۔ دلی اور آگرے کے درمیان انہوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے قلعے بنا لیے تھے اور موقع پا کر مسلمانوں پر حملے کرتے رہتے تھے۔ ان کا مقصد مسلمانوں کو پریشان کرنا اور لوٹ مار کر کے اپنی ہوس کو پورا کرنا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے مکتوب میں ان جاٹوں کے بارے میں لکھا ہے :

”غیر مسلموں میں ایک قوم جاٹ ہے جس کی بود و باش دلی اور آگرہ کے درمیان ہے۔ یہ دونوں شہر بادشاہوں کے لیے دو حویلیوں کی مانند رہے ہیں۔ مغل بادشاہ کبھی آگرہ میں رہتے تھے تاکہ ان کا دیدار اور رعس راجپوتانہ لگ بڑے اور کبھی دہلی میں فروکش ہوتے تھے تاکہ ان کی شوکت اور ہیبت سہرنہ اور نواحی سہرنہ تک اثر ڈالے۔ دہلی اور آگرہ کے درمیان کے مواعجات میں قوم جاٹ کشت کاری کرتے تھے۔ زمانہ شاہ جہاں میں اس قوم کو حکم تھا کہ گھوڑوں پر سوار نہ ہوں، بتدوین اپنے پاس نہ رکھیں اور اپنے گڑھی نہ بنائیں۔ بعد کے بادشاہوں نے رفتہ رفتہ ان کے حالات سے غفلت اختیار کر لی اور اس قوم نے فرصت کو غنیمت جان کر بہت سے قلعے تعمیر کر لیے اور اپنے پاس بتدوین رکھ کر ہٹ ماری کا طریقہ شروع کر دیا۔ اورنگ زیب اُس وقت دکن میں قلعہ بیجاپور و حیدر آباد کو فتح کرنے میں مشغول تھا۔ دکن ہی سے ایک فوج جاٹوں کی تادیب کے لیے اُس نے روانہ کی اور اپنے بوٹے کو فوج کا سردار مقرر کیا۔ رئیسان راجپوتانہ نے اس شہزادے سے مخالفت کر لی۔ لشکر میں اختلاف واقع ہوا۔ جاٹوں کی بھڑائی سے عاجزی پر اکتفا کر کے فوج بادشاہی واپس ہو گئی۔ پھر فرخ سیر کے زمانے میں اس جماعت کی شورش پھر جوش میں آئی۔ قطب الملک وزیر نے زبردست فوجیں ان کی طرف بھیجیں۔ چوراس جو اس قوم کا سردار تھا، بعد جنگ صلح پر راضی ہو گیا۔ اُس کو بادشاہ کے سامنے لانے اور تقصیرات کی معافی دلوائی۔ یہ کام بھی خلاف مصلحت عمل میں آیا۔ پھر شہد پد شاہ میں اس قوم کی سرکشی حد سے تجاوز کر گئی اور چوراس کا چچازاد بھائی سورج مل اس جماعت کا سردار ہو گیا اور فساد کا راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ شہر یاتہ جو اسلام کا قدیم شہر تھا اور جہاں علماء و مشائخ سات سو سال سے اقامت پزیر تھے، اُس شہر میں قہراً اور جبراً قبضہ کر کے مسلمانوں کو ذلت و خواری

کے ساتھ وہاں سے نکال دیا۔ اس کے بعد سرکشی برابر اڑھتی گئی۔ بادشاہوں اور امیروں کے اختلاعات اور غفلت کی بنا پر کوئی بھی اس جانب متوجہ نہ ہوا۔ اگر بالفرض ایک امیر اس کی تنبیہ کا قصد کرے تو سورج مل کے کارکن دوسرے امراء کی جانب رجوع کرتے ہیں اور اس طرح بادشاہ کے مشورے کو بلٹ دیتے ہیں۔ ہر چہ شاہ کے عہد میں صفر جنگ ابرائی نے خروج کیا اور سورج مل سے سازش کر کے ابرائی دہلی پر حملہ کر دیا اور تمام باشندگان شہر کہتے کو لوٹ لیا۔ ہر چہ شاہ نے شہر کے دروازوں کو بند کر کے جنگ ٹوپ خانہ شروع کی۔ محض خدا کے فضل سے صفر جنگ اور سورج مل دو تین ماہ کے بعد فاکامیاب واپس ہوئے اور صلح و موافقت کی داغ بیل ڈالی۔ چونکہ بادشاہ کے آدمی جنگ سے تھک چکے تھے، اس لیے انہوں نے صلح کو غنیمت شمار کیا۔ اس کے بعد سے سورج مل کی شہرت ترقی پا گئی۔ دہلی سے دو کوس کے فاصلے سے لیے کر آکرہ کے آخر تک طول میں اور مہوات کے حدود سے لبروز آباد و شکوہ آباد لک عرض میں سورج مل قابض ہو گیا۔ کسی کی طاقت نہیں کہ وہاں اذان و نماز جاری کر سکے۔“

غرض جائوں نے مفلوں کے دور آخر میں ایسے ہنگامے برپا کئے کہ خاں خدا ان کے ظلم و ستم سے تنگ آ گئی۔ مسلمانوں پر تو عرصہ حیات تنگ ہو گیا۔ دلی اور اس کے اطراف کے باشندے اس زمانے میں ان کی وجہ سے خوف زدہ تھے۔ گھبراہٹ اور پریشانی ان پر طاری تھی۔ خلیق احمد نظامی نے ’چهار کشتن شجاعی‘ کے مصنف کا ایک بیان نقل کیا ہے جس میں اس نے جائوں کے ہنگاموں کی وجہ سے پیدا ہونے والی پریشانیوں کی وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ”ایک مرتبہ جب جائوں نے لوٹ مار شروع کی تو دہلی کے باشندے گھبراہٹ اور پریشانی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ وہ در بدر کئی بہ کئی مارے مارے پھرتے تھے بلکہ اسی طرح جیسے کوئی ٹوٹا ہوا جہاز ظالم سوجوں کے رحم و کرم پر ہو۔ ہاتھوں کی طرح ہر شخص پریشان حال اور گھبراہٹا ہوا نظر آتا تھا“ شاہ ولی اللہ

۱۔ خلیق احمد نظامی : شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات :

صفحہ ۱۰۱ - ۱۰۲

۲۔ ایضاً : صفحہ ۳۲۴

نے بھی حافظ جابر اللہ کے نام ایک خط میں جاٹوں کے مظالم کا ذکر کیا ہے ۔
 وہ لکھتے ہیں ۔ "دلی میں ایک حادثہ عظیم واقع ہوا ۔ قوم جاٹ نے
 دلی کے شہر کپتہ کو لوٹا اور حکومت اس فساد و شرارت کو دلع کرنے
 سے عاجز رہی ۔ انہوں نے مال لوٹے عزت و ناموس کو برباد کیا اور مکانات
 کو آگ لگائی ۔ اور یہ لوٹ مار کا حادثہ اوائل ۱۶۶۱ء میں ہوا اور آخر
 شعبان تک جاری رہا ۔" جاٹ ایک جاہل قوم تھی ۔ وہ پڑھنا لکھنا
 تک نہیں جانتے تھے ۔ انہیں کسی چیز کا علم نہیں تھا ۔ اس لیے وہ
 جنگیوں اور وحشیوں کی طرح ہنگامے برپا کرتے تھے ۔ ان جاٹوں نے مغلوں
 کے دور آخر میں زبست مشکل کر دی تھی ۔ ان کے ہنگاموں کا یہ سلسلہ
 انگریزوں کے تسلط کے وقت تک جاری رہا ۔ جب انگریز دلی پر حکمران
 ہو گئے تو سکھوں اور مرہٹوں کی شورشوں کے ساتھ ساتھ جاٹوں کی شورش
 بھی ختم ہو گئی ۔

غالب نے اپنی آنکھوں سے جاٹوں کے یہ ہنگامے تو نہیں دیکھے کیونکہ
 انہوں نے جب ہوش سنبھالا تو انگریز دلی میں داخل ہو چکے تھے ۔ لیکن
 جو اثرات ان جاٹوں نے دلی کی زندگی پر اپنی شورش سے چھوڑے تھے ،
 اس کو انہوں نے ضرور دیکھا اور وہ ان سے متاثر بھی ہوئے ۔ ان
 ہنگاموں نے دلی کی سیاسی ، معاشرتی اور معاشی زندگی کی بنیادیں ہلا دی
 تھیں ۔ اسیویں صدی کے شروع کی دلی میں بھی اس کا اثر باقی تھا ۔ اس
 لیے غالب ان اثرات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے ۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسیویں صدی کے شروع میں انگریزوں نے
 قلعہ کی حیثیت سے داخل ہو کر ان تمام ہنگاموں کو ختم کیا جو مرہٹوں ، سکھوں
 اور جاٹوں نے اس سے قبل برپا کر رکھے تھے اور اس طرح اس سیاسی انتشار
 کا بالآخر خاتمہ ہوا جس کا سلسلہ تقریباً ایک صدی سے دلی اور اطراف دلی میں
 جاری تھا ۔ اب زندگی کی غیر یقینی کیفیت بڑی حد تک ختم ہو گئی اور لوگ
 وقتی طور پر کسی حد تک مطمئن بھی ہو گئے ۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ
 انگریز بہ ذات خود ایک ایسے سیاسی انتشار کا باعث بنے جس کا تصور

نہی اس سے قبل کسی نے نہیں کیا تھا۔ جب ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجیں دلی میں داخل ہوئیں تو گویا صحیح معنوں میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور اس ملک کے باشندے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیے گئے۔ سیاسی طاقت تو انہوں نے اس سے قبل بھی حاصل کر لی تھی۔ وہ بادشاہوں کو لڑائے اور ان کے ساتھ خود بھی لڑتے تھے۔ ہندوستان کے بعض علاقوں میں تو باقاعدہ ان کی حکومت تھی اور اس حکومت کو انہوں نے اپنی حکمت عملی اور شمشیر کے زور سے حاصل کیا تھا۔ وہ اس وقت تک اتنے طاقتور ہو چکے تھے کہ مغل بادشاہوں کی ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں تھی، وہ انہیں اپنا آلہ کار بناتے تھے۔ انہیں تخت سے اتارنا اور تخت پر بٹھانا ان کے لیے معمولی بات تھی۔ وہ بادشاہ سے دیوانی لے سکتے تھے اور ان کی طرف سے اسے پنشن مل سکتی تھی۔ غرض انہوں نے ہندوستان کی سیاست میں بڑا عمل دخل پیدا کر لیا تھا، ان کی طاقت اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ ہندوستان کے حکمرانوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور پھر انہوں نے اس وقت تک جو کچھ حاصل کر لیا تھا، وہ اسی پر قانع نہیں تھے۔ ان کی سیاسی ریشہ دوانیاں جاری تھیں، اور وہ دلی میں بیٹھ کر سارے ہندوستان پر حکومت کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

۱۸۰۳ء کی لڑائی میں انہوں نے دلی کو فتح کر لیا تھا۔ وہ چاہتے تو اس وقت مغلوں کی بادشاہت کو ختم کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ کیوں کہ ان کے خیال میں مغل بادشاہ کو اپنا آلہ کار بنا کر باقی رکھنا سیاسی اعتبار سے زیادہ مناسب تھا۔ چنانچہ انہوں نے بوڑھے بادشاہ شاہ عالم کی بادشاہت کو قائم رکھا۔ شاہ عالم کے ایما ہی پر انہوں نے دلی کی لڑائی لڑی اور وہ فاتح کی حیثیت سے اس شہر میں داخل ہوئے۔ بادشاہ مرہٹوں، جاٹوں اور روہیلوں کی شورشوں سے اتنا پریشان ہو چکا تھا کہ اس نے انگریزوں کو اپنا نہایت دہندہ تصور کیا اور ۱۶ ستمبر ۱۸۰۳ء کو لارڈ لیک سے دربار میں ملاقات کی۔ حالانکہ اس سے قبل اس نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کے لیے تیار ہے، کیونکہ اس کے خیال میں یہ لوگ جس ملک میں جاتے ہیں وہاں نہایت خاموشی سے طاقت حاصل کرنے کی کوشش

کرتے ہیں۔ لیکن انگریزوں کی فتح نے اب اس کے خیال کو بدل دیا اور اس نے انگریزوں کی آمد کو ایک نعمت غیر مترقبہ تصور کیا۔ لارڈ لیک کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ اُسے بادشاہ کی طرف سے خطاب دیا گیا۔ ویسی خطاب جو اس سے قبل سیندھیا کو دیا جا چکا تھا۔ اور جس کا مطلب یہ تھا کہ بادشاہ کی طرف سے نظم و نسق کی تمام ذمہ داری اسے سونپ دی گئی ہے۔ چلے یہ کام سیندھیا کے سپرد ہوا تھا۔ اب یہ دستار لارڈ لیک کے سر پر باندھی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز صحیح معنوں میں حکمران ہو گئے اور دلی میں اُن کے نام کا سکہ چلتے لگا۔ چنانچہ ویلزلی نے بادشاہ کو یہ خط لکھا کہ انگریزوں کے زمانے میں اُسے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ اور وہ اسن و اطمینان کے ساتھ بسر کر سکے گا۔ ظاہر ہے اس خط کا مطلب یہی تھا کہ انگریزوں کی سیاسی طاقت نے مختلف شورشوں کو ختم کر دیا ہے اور اب وہ بادشاہ کی حفاظت کریں گے اور اُسے زندہ رہنے کا موقع دیا جائے گا۔ انہوں نے یقیناً بوڑھے بادشاہ شاہ عالم کو زندہ رہنے کا موقع دیا اور اس طرح مطمئن ہو کر اپنی سیاسی طاقت کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے کام میں مصروف ہو گئے۔

اس وقت صرف لال قلعے میں بادشاہ کی حکومت تھی۔ اس کی چہار دیواری کے باہر انگریزوں کا سکہ چلتا تھا۔ انگریز لال قلعے کے اندر بادشاہ کی حکومت کو تسلیم کرتے تھے۔ جو لوگ قلعے میں آباد تھے اُن کا شمار بادشاہ کی رعایا میں ہوتا تھا اور شاہی خاندان کے افراد کی شہزادوں کی طرح عزت کی جاتی تھی۔ شاہی دربار کے آداب کا خیال رکھنا چاہنا تھا۔ دربار باقاعدگی سے منعقد ہوتے تھے۔ خطابات کا سلسلہ قائم تھا۔ دربار کی مخصوص زبان بھی باقی تھی۔ انگریز دوسرے درباریوں کی طرح دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ انگریز ریڈیٹ دیوان خاص میں باقاعدگی کے ساتھ حاضر ہوتا تھا۔ دوسرے درباریوں کی طرح وہ تقار خانے کے سامنے اپنی سواری سے اُترتا تھا اور پیدل چل کر لال پردے کے پیچھے سے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور عام درباریوں اور اسراء کی طرح سامنے کھڑا رہتا تھا۔

اگرچہ سارے ہندوستان میں اب مغل بادشاہ کی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔ وہ انگریزوں کا پٹن یافتہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن لال قلعے کے اندر اس کی حکومت تھی اور اُسے پورا اقتدار اور شان و شکوہ حاصل تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس اقتدار اور شان و شکوہ کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ کیونکہ مغلوں کی حکومت کا تو خاتمہ ہو چکا تھا۔ انگریز صحیح معنوں میں حکمران ہو چکے تھے اور بادشاہ کی حیثیت محض شاہ شطرنج کی رہ گئی تھی۔

شاہ عالم بادشاہ اس عالم میں ۱۸۰۶ء تک زندہ رہا۔ وہ مغل بادشاہ جس نے بچپن میں نادر شاہ کا حملہ دیکھا، سریشوں اور روہیلوں، سکھوں اور جاٹوں کی شورشیں جس کی آنکھوں کے سامنے اُٹھی نہیں، ہانی بت کی تیسری لڑائی جس کے سامنے ہوئی تھی اور جو انگریزوں کے مقابلے میں ہکسر کے مقام پر صرف آرا ہوا تھا۔ جس نے کلاہو کے زمانے میں انگریزوں سے آہ آباد کے مقام پر صلح کی تھی جو ہسٹنگز کی پروا کئے بغیر انگریزوں کو چھوڑ کر دلی چلا آیا تھا۔ تقریباً تین جوتھائی صدی کے ان سیاسی ہنگاموں سے دو چار رہ کر ۱۸۰۶ء میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔ اس کے بعد کئی بادشاہ تخت پر بیٹھے لیکن انگریزوں کے سیاسی اقتدار پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ جس طرح چاہتے تھے، ان بادشاہوں کے ساتھ برتاؤ کرتے تھے۔ ان کے سیاسی اقتدار اور عسکری طاقت نے ان بادشاہوں کو ان کا دست نگر بنا دیا تھا۔ مغلوں کے آخری تاج دار بہادر شاہ ظفر تک یہ صورت حال باقی رہی۔ بالآخر ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی۔ یہ انگریزوں کی سیاسی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی آخری کوشش تھی، جس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کی سلطنت ختم ہو گئی۔ انگریز حکمران ہو گئے اور اس سر زمین پر سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے۔

یہ سیاسی ماحول تھا جس کے سامنے میں غالب نے آنکھ کھولی۔ ان میں سے بعض واقعات تو ان کی آنکھوں کے سامنے ہوئے۔ بعض واقعات ان سے قبل ہو چکے تھے۔ لیکن ان واقعات نے ان کے ماحول پر جو اثر کیا تھا، اس کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے ضرور دیکھا۔ سریشوں کی یورشیں،

جاٹوں اور سکھوں کے ہنگامے اور انگریزوں کی ہوس ملک گیری کے سارے تماشے انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اور ان سب کے نتیجے میں ان کا ماحول جس انتشار اور افراتفری سے دو چار ہوا تھا، اُس کو انہوں نے شدت سے محسوس کیا۔ وہ جب پیدا ہوئے تو یقیناً بہت سے ہنگامے غم ہو چکے تھے۔ انگریزوں نے مرہٹوں کی طاقت کو غم کو دیا تھا۔ لیکن وہ خود صحیح معنوں میں حکمران بن بیٹھے تھے اور مغلوں کی حکومت صرف لال قلعے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس صورت حال نے بہت سے فتنوں کو جنم دیا۔ ماحول میں سازشیں ہی سازشیں تھیں۔ انگریزوں نے ان سازشوں کو ہوا دی تاکہ ان کا اقتدار باقی رہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس سر زمین پر ان کی بنیادیں زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوتی چلیں۔

غرض غالب کے سیاسی ماحول میں بڑا انتشار تھا، زندگی کی بنیادیں متزلزل ہو گئی تھیں اور ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی۔

۳

اس سیاسی صورت حال نے اس زمانے کے مسلمانوں پر عرصہٴ حیات تنگ کر دیا تھا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کی تاریخ مسلمانوں کے درد و الم کی ایک طویل داستان ہے۔ ۱۷۳۲ء میں نادر شاہ کا حملہ ہوا اور مسلمانوں کی پریشانیوں کا ایک ایسا ناب کھل گیا جو ۱۸۵۷ء کے بعد تک جاری رہا۔ ہر صبح ان کے لیے ایک نئے فتنے کا پیغام لاتی تھی۔ —مرہٹے، جاٹ، سکھ، تینوں کی ہنگامہ آرائی نے زندگی کو ایک مصیبت بنا دیا تھا۔ پھر افغانوں کے حملوں نے تو جان ہی نکال دی۔ —سکھوں، مرہٹوں اور جاٹوں کے حملوں سے نجات ملی تو غیر ملکی حکومت کا تسلط سر پر پایا۔ مسلمان باخ —و سال سے زیادہ تک حکمرانی کر چکے تھے اور ان ہی سے سیاسی اقتدار بھی چھینا گیا تھا۔ اس بنا پر انگریزی حکومت نے ان پر سختی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مسلمانوں کے جان، مال اور آبرو سب پر مصیبت آئی اور پوری قوم پر نکتہ اور افسردگی کا عالم طاری ہو گیا۔ ان حالات میں معاشی بد حالی اور

معاشرتی الخطا نے پرورش پائی - جینے کے لالچے بڑ گئے - زندگی دوبارہ ہو گئی - زندہ رہنے کے لیے افراد نے عیش کوشی اور تعیش پسندی کا سہارا لیا ، جس نے ماری معاشرتی زندگی کی صورت مسلخ کر دی - اخلاق معیار بدل گئے اور زندگی کے حقائق سے فرار اور اس کی اعلیٰ قدروں سے انحراف اُن کا مزاج بن گیا - اسی صدی کی دہائی میں یہ معاشی بد حالی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشرتی افراتفری زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے ، اور تقریباً ہر طبقے کے افراد اس کے شکار دکھائی دیتے ہیں - جس سر زمین پر کم و بیش ایک صدی تک سیاسی اقتدار کو حاصل کرنے کے لیے یہ ہنگامے ہوتے رہیں ، جہاں مرکز کم زور ہو گیا ہو ، جہاں بادشاہ صرف نام کے بادشاہ رہ گئے ہوں ، جہاں داخلی شورشوں نے ساوے نظام کو درہم برہم کر دیا ہو ، جہاں بیرونی طاقتوں نے سیاست میں اپنا اثر قائم کر لیا ہو اور جہاں داخلی انتشار سے تنگ آکر لوگ بیرونی حملہ آوروں کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھنے کے لیے تیار ہو جائیں ، وہاں اس صورت حال کا پیدا ہو جانا ایسا کچھ عجیب نہیں ہے -

اور تک زب عالم گیر کی وفات کے بعد مغلوں کی حکومت روز بروز سیاسی اعتبار سے کم زور ہوتی گئی تو اس کا اثر معاشی ، اقتصادی اور معاشرتی زندگی پر بھی ہوا - دور آخر کے مغل بادشاہ اس صورت حال سے بالکل بے خبر رہے - سیاسی انتشار نے انہیں اپنی دنیا الگ بنانے کے لیے مجبور کر دیا تھا - اس محدود دنیا میں رہ کر وہ اپنی زندگی کے دن گزارنا چاہتے تھے - انہیں اس کا علم نہیں تھا کہ ان کے اس پاس کی زندگی میں اندر ہی اندر کس طرح کے طوفان اٹھ رہے ہیں اور اُن پر ان طوفانوں کا نتیجہ کیا ہونے والا ہے - دولت کو بڑھانے اور اس کے نظام کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جس سکون کی ضرورت ہوتی ہے ، وہ انہیں نصیب ہی نہیں تھا - یہی وجہ ہے کہ وہ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا خیال تک دل میں نہیں لاتے تھے - زندگی میں اُن کی دلچسپیاں ایسی چیزوں سے بڑھ گئی تھیں جن کے لیے دولت درکار ہوتی ہے اور جن کو حاصل کرنے کے لیے قاروں کے خزانے بھی ہوں تو خالی ہو جاتے ہیں - سیاسی انتشار نے دولت کی پیداوار کو گم کر دیا تھا - مرکزی کم زوری نے دولت کی فراہمی کے ذرائع اور وسائل محدود کر دیے تھے لیکن دولت کو صرف کرنے

کی ہوس بڑھ گئی تھی۔ اخراجات میں اضافہ ہو گیا تھا اور اس کی وجہ ہوا و ہوس اور ذہنی تعیش اور عیش کوشی کے وہ میلانات تھے جن کو ان بادشاہوں نے اپنے مزاجوں میں داخل کر لیا تھا۔ اورنگ زیب کے بعد جیسے بھی بادشاہ ہوئے کم و بیش سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ دولت کو ہانی کی طرح جہانا اُن کے معمولات میں داخل تھا۔ اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ کی لمبائی مشہور ہے۔ اُس نے اپنی دولت کو اس طرح لٹایا کہ سالی اعتبار سے اس کی حکومت تباہی کے قریب پہنچ گئی۔ اس کے بعد جہاں دار شاہ کے زمانے میں اس کا حال کچھ اور بھی خراب ہو گیا۔ اُس کی عیاشی نے خزانے خالی کر دیے۔ اُس نے بھی دولت بری طرح لٹائی۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کی محبوبہ لال کنور پر دو کروڑ روپیہ سالانہ خرچ ہوتا تھا۔ دربار میں عیش و عشرت کی فضا تھی۔ اس پر بری طرح روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ فرخ سیر کو گھوڑے پالنے کا شوق تھا۔ اُس نے بے شمار گھوڑے پال رکھے تھے اور ان گھوڑوں پر ہزاروں روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ شاہ عالم کے اخراجات زیادہ نہیں تھے۔ آخر وقت میں تو جو رقم اُسے انگریزوں سے ملتی تھی، اس میں سے وہ خاصا بچا لیتا تھا۔ کیونکہ بڑھاپے میں اُس کے اخراجات محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن اُس کے جانشین اکبر شاہ ثانی نے تخت نشین ہونے کے بعد انگریزوں سے زیادہ رقم طلب کرنے کی خواہش ظاہر کی کیونکہ اس کے اخراجات بڑھ گئے تھے۔ اس وقت دلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور وہ سیاہ و سفید کے مالک بن چکے تھے۔ اس لیے مغلوں کی دولت اُن کے ہاتھ میں تھی۔ ملک کی معاشی اور اقتصادی زندگی کو اُنہوں نے اپنے قبضے میں گر لیا تھا۔ غرض انگریزوں سے قبل قبل بادشاہوں کی زندگی کے عام انداز نے ملک کی معاشی اور اقتصادی زندگی کی بنیادیں ہلا دیں۔ اُن کے بعد جو رہی صبی کمر تھی وہ انگریزوں نے پوری کر دی۔

یہ انگریز دولت کے بھوکے تھے۔ ہندوستان کی دولت نے اُن کی آنکھوں کو غیرہ کر دیا تھا۔ وہ اسی دولت کو حاصل کرنے اور اس کے ذرائع

اور وسائل پر قبضہ جانے ہی کے لیے اس ملک کی سیاست میں داخل ہوئے تھے۔ شروع شروع میں حکومت کرنا ان کا مقصد نہیں تھا۔ وہ سلطنت بنانے کے خواب کم دیکھتے تھے۔ صرف دولت حاصل کرنا ان کے پیش نظر تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس ملک کی دولت کو خوب خوب لوٹا۔ اٹھارویں صدی میں دولت کو لوٹنے کا یہ سلسلہ براہ راست جاری رہا۔ بے شمار دولت وہ انگلستان لے گئے۔ خزانے کے خزانے انہوں نے خالی کر دیے۔ یہ کمپنی کے زمانے کی بات ہے۔ کمپنی کی بنیاد تجارت ضرور تھی، لیکن حالات نے تجارت سے زیادہ لوٹ مار کو اس کا نصب العین بنا دیا تھا۔ وہ بادشاہوں سے دولت حاصل کرتے تھے۔ عوام کو لوٹتے تھے۔ اس ملک کی معاشی اور اقتصادی زندگی کو سوارقا ان کے پیش نظر نہیں تھا۔ انہیں صرف اپنے آپ سے اور اپنی ہوس سے ہمدردی تھی۔ اسی لیے حکمران ہونے کے بعد بھی وہ جان کی معاشی اور اقتصادی حالت کو سوارقے کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ لوٹ مار کا سلسلہ اب بھی اسی طرح جاری رہا۔ انہوں نے اس ملک میں اپنا زرعی نظام قائم کیا جس نے نئی جاگیرداریاں پیدا کیں۔ اس کا مقصد بھی اپنے شکم کو بھرنا تھا۔ اس زمانے میں رشوتیں لینے اور تحفے قبول کرنے میں بھی وہ پیش پیش رہے۔ یہاں کے سیاسی انتشار نے ان کی طاقت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس طاقت سے انہوں نے غلط فائدہ اٹھایا، انفرادی اور اجتماعی طور پر انہوں نے جان کی دولت سے خوب خوب اپنی جھولیاں بھریں اور ساری دولت کو سمیٹ کر سامعہ پھار لے گئے۔ اس صورت حال نے جان کی معاشی اور اقتصادی زندگی کو جو نقصان پہنچایا، اس کی مثال تاریخ میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔ داخلی لڑائیوں، بیرونی حملوں اور سیاسی سازشوں نے بھی اس زمانے کی معاشی اور اقتصادی زندگی کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا کہ انگریزوں کی اس ہوا و ہوس نے پہنچایا۔ مختصر یہ کہ کمپنی نے اپنی تجارت اور حکومت کے مخلوط عہد میں حکومت کے ہر دمے میں خوب زرخشی کی اور اس طرح ہندوستان کی صنعت و حرفت اور تجارت کو بہاد کیا۔ انہیں بڑے عہدوں سے خارج کیا۔ عدالتوں کو ذریعہ آمدنی قرار دینے کے ساتھ ہندوستانیوں سے حقیر کا برتاؤ کیا۔ ان

شکایات اور دیگر وجوہ کی بنا پر پارلیمنٹ نے ۱۸۳۲ء میں کمپنی سے تجارت کرنے کا حق چھین لیا۔ لیکن اس کے بعد تو مختلف طریقوں سے اور بھی لوٹ مار شروع ہوئی۔ پہلے دن سے ہندوستان کی تجارت، ملک گیری اور ملک داری میں جو رویہ ہندوستان سے کہا گیا تھا، اس کا منافع تو ہمیشہ کمپنی کے حصہ داروں میں تقسیم ہوتا رہتا تھا اور جو خسارہ ہوتا وہ ہندوستان پر قرضہ قرار دیا جاتا۔ اب کمپنی سے حق تجارت سلب کرتے وقت سلطنت برطانیہ نے طے کر دیا کہ اس نام نہاد قرضے کی رقم پر، جو کروڑوں کی تعداد میں تھا، ہندوستان کے خزانے سے ساڑھے دس فی صدی سالانہ سود کمپنی کو دیا جاتا کرے اور چالیس سال آئندہ تک قرضہ کی اصل رقم کمپنی کو ادا نہ کی جائے، بلکہ صرف اس کا سالانہ سود ادا ہونا رہے اور باوجود سال بہ سال ادا ہونے کے چالیس سال کی میعاد گزر جانے پر کمپنی کو سو فی صدی کی ایک مزید رقم دی جائے تب اس کے قرضے سے سبک دوشی ہو سکے گی۔^۱ غرض اس طرح مختلف طریقوں سے دولت کی کوچ کھسوٹ اور لوٹ مار کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جس وقت تک انگریز اس سر زمین پر حکمران رہے۔

ہندوستان کا معاشی اور اقتصادی نظام ان حالات کی وجہ سے تقریباً ڈیڑھ سو سال تک ایک کرب مسلسل کے عالم میں رہا اور انیسویں صدی میں تو اس پر نزع کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ افلاس جہاں کے لوگوں کا مندر بن گیا۔ نہ صرف عوام بلکہ بادشاہ اور امراء تک اس کے شکار ہوئے۔ خلیفہ احمد نظامی نے 'تاریخ منالک چشت' میں مختلف لکھنے والوں کے حوالے سے اٹھارویں صدی کی معاشی اور اقتصادی حالت کی جو تصویر کھینچی ہے، تھوڑے سے فرق کے ساتھ کم و بیش یہی کیفیت انیسویں صدی کی بھی تھی۔ وہ لکھتے ہیں: "احمد شاہ کے زمانے میں شاہی خزانے کی یہ حالت تھی کہ دو دو ڈھائی ڈھائی سال تک محلات کے ملازمین کو تنخواہیں نہیں ملتی تھیں۔ بادشاہ کی ساکھ اس قدر گر گئی تھی کہ سپاہی اور سپاہکار بھی قرض

۱۔ مولانا طفیل احمد منگھوری: مسلمانوں کا روشن مستقبل : صفحہ ۷۸۔

۲۔ ایضاً : صفحہ ۹۔

دینے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ اس زمانے میں شہزادیوں کو لیں لیں دیں کے عالمی کرنے پڑتے تھے۔۔۔“ سرسید احمد خاں لکھتے ہیں : ”اکبر شاہ اگرچہ تخت نشین ہوئے مگر اخراجات کی تنگی کا وہی عالم تھا جو شاہ عالم کے وقت میں تھا۔ شاہ عالم ہی کے وقت میں اخراجات کی نہایت تنگی تھی۔“ تمام کارخانے بند ہو گئے تھے۔ شاہزادوں کو جو قلعے کے قلعے میں رہنے تھے ماہواری روپیہ نہیں ملتا تھا اور وہ چھتوں پر چڑھ کر چلائے تھے کہ بھوکوں مرنے ہیں، بھوکوں مرنے ہیں۔“ اسیر (Spear) نے اپنی عالمانہ تصنیف Twilight of the Mughals میں مغل شہزادوں کے درد ناک مصائب کا نقشہ کھینچا ہے اور بتایا ہے کہ ”ان شہزادوں کو بھوک سے مر جائے دیا جاتا تھا، لیکن مزدوری یا ملازمت کرنے کی اجازت بھی اس وجہ سے نہ ملتی تھی کہ یہ ان کے دون مرتبت تھا۔ ان کی حالت جانوروں سے بدتر تھی۔“ غرض اس طرح اس زمانے کی معاشی و اقتصادی بد حالی نے ہر طبقے کے افراد کو زبوں حال کر دیا تھا اور ان میں سے ہر ایک کی حالت ایسی تھی کہ اس کو دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ لیکن حالات اس درجہ خراب ہو چکے تھے کہ ان کو درست کرنا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں تھی۔ لوگوں کو اس زبوں حالی کا احساس ضرور تھا۔ لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے چار زندگی سے ذہنی طور پر ایک بیزاری پیدا ہو گئی جس نے انہیں بے عمل بنا کر ایک فراری ذہنیت کا شکار کر دیا۔ زندگی کی حقیقتوں سے منہ موڑ لینے کے خیالات ان کے چار پیدا ہونے لگے اور ایک غیر متوازن زندگی بسر کرنا ان کا مزاج بن گیا۔ اس کی جھلک زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اس زمانے کی معاشرتی زندگی کو اس صورت حال نے بہت متاثر کیا ہے۔

مغل عظیم معاشرتی روایات کے علم بردار تھے اور دور آخر تک آنے آنے تو ان کی ان معاشرتی روایات نے ایک ترشے ہوئے پیرے کی صورت

۱۔ سرسید احمد خاں : سیرت امیر : صفحہ ۲۲ - ۲۳

۲۔ خلیق احمد نظامی : تاریخ مثالیہ ج ۱ : صفحہ ۳۳۵

اختیار کر لی تھی۔ ان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ دولت و ثروت خاک میں مل گئی۔ شان و شکوہ پر اذہار کے بادل چھا گئے۔ معاشی اعتبار سے افلاس کی تاریکیوں نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ ہسے ہسے کو محتاج ہو گئے لیکن معاشرے آن ہان کو انہوں نے حتی المقدور باقی رکھا۔ بلکہ اس زمانے میں تو معاشرے روایات کو برقرار رکھنے اور ان کو فروغ دینے کا خیال تو ان کے یہاں کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا۔ چنانچہ اس معاشی بد حالی کے باوجود، جو اس زمانے میں سیاسی انتشار اور زوال کی وجہ سے ان کا مقدر بن گئی تھی، انہوں نے اپنی زندگی کے معاشرے تقاضوں کو پورا کیا اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی روایات کو عظیم سمجھا اور اپنی محدود دنیا میں رہ کر ان روایات کو برتنے اور ان کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان روایات کو برتنے کے خیال ہی نے ان کے لیے اس میں زیست کا کچھ سامان پیدا کر دیا۔ ورنہ تو سیاسی انتشار اور معاشی انحطاط و زوال نے ان کے لیے زندگی دوبارہ کر دی تھی اور ماحول کو جہنم بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں انہوں نے رہن سہن میں زیادہ نفاس پیدا کی۔ زندگی کے لطیف پہلوؤں سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا۔ عیش و عشرت کی طرف وہ زیادہ راغب ہوئے۔ لہو و لعب اور تفریح کو انہوں نے اپنی زندگی میں زیادہ اہمیت دی۔ انہوں نے لذت پسندی اور تعیش پرستی کا ماحول پیدا کیا۔ محفلیں منعقد کیں۔ مجلسوں کو آراستہ کیا۔ اپنے آس پاس اور گرد و پیش، رقص و سرود، موسیقی و مصوری، شعر و شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ سے دلچسپی لینے کی ایک فضا قائم کی جس کے نتیجے میں عوام اور خواص سب ہی ان سے لطف لینے لگے۔ غرض اس طرح لطیف چیزوں سے دلچسپی لے کر زندگی کو زیادہ سے زیادہ لطیف بنانے کی طرف خاص طور پر توجہ کی گئی۔ چنانچہ اس زمانے میں یہ رجحان عام ملتا ہے اور ہر شخص کی زندگی اسی رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے نتیجے میں لذت پرستی کے خیالات ضرور بھیلے ہیں۔ تعیش پسندی کا ماحول ضرور پیدا ہوا ہے۔ لہو و لعب میں زندگی بسر کرنے کی ایک فضا ضرور قائم ہوئی ہے۔ لیکن ان سب کی نہ میں زندگی کو ایک فن بنانے کا احساس ضرور کار فرما ملتا ہے۔ یہ معاشرت اور معاشرے روایات مغلوں کے دور آخر میں لال تلخے کے

اندرو محدود ہو کر رہ گئی ہے اور اس کے باہر لوگوں نے قلعے کو اس معاشرت اور معاشرتی روایات کی علامت سمجھا ہے۔ چنانچہ لال قلعے کے اندر زندگی کو بسر کرنے کے جو معیار قائم ہوئے ہیں اور وہاں سلاطین و امراء نے اپنے آپ کو جس رنگ میں رنگا اور اپنی زندگی کو جس سانچے میں ڈھالا ہے، اسی کو قلعے سے باہر لوگوں نے معیار بنایا ہے اور وہ خود بھی اسی رنگ میں رنگ گئے ہیں۔ چنانچہ ساری دلی اس زمانے میں معاشرتی اعتبار سے اسی سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے جس کی تشکیل و تعمیر لال قلعے کے اندر ہوئی تھی۔ قلعے کے باہر بھی اس زمانے میں لوگ اپنے آپ کو امیر سمجھتے اور اس امانت و ریاست کو برقرار رکھنے کے لیے زمین و آسمان کے قلعے ملتے ہیں۔ زندگی کے لطیف پہلوؤں سے لگاؤ اور نفس چیزوں سے دل چسپی ان کے مزاجوں میں داخل ہو گئی ہے اور اسی کو انہوں نے زندگی کا معیار سمجھا ہے۔ لہو و لعب اور عیش و عشرت کے خیالات ان کے چاں بھی بیدار ہوئے ہیں اور انہوں نے ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش یہی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی میں رنگینوں کا دور دورہ نظر آتا ہے اور ہر شخص اپنے اپنے فکر اور معیار کے مطابق زندگی کو ان رنگینوں سے روشناس کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ گھر گھر عذیبی مسند ہوتی ہیں اور عشاؤں کو آرامہ کیا جاتا ہے۔ رقص و سرود کے بازار گرم ہوتے ہیں اور زندگی کو ایک دلہن کی طرح سجانے کی کوشش کی جاتی ہے اور شمشیر و منان کی بجائے طاؤس و رباب کی اولیت کے خیالات دلوں میں گھر کر لیتے ہیں۔

اس کا سلسلہ اور رنگ رُعب عالم گیر کی وفات کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ محمد شاہ اور فرخ سیر کے زمانے سے لے کر شاہ عالم، اکبر شاہ ثانی اور ہادر شاہ ظفر تک نہ صرف یہ سلسلہ جاری رہا بلکہ اس میں وقت کے ساتھ ساتھ کچھ شدت ہی پیدا ہوتی گئی۔ محمد شاہ کے زمانے میں تو اس میں ہوس ہستی اور تعیش پسندی کو زیادہ دخل رہا تھا لیکن آخری بادشاہوں کے چاں یہ رجحان نسبتاً کم نمایاں نظر آتا ہے، برخلاف اس کے وہ معاشرت اور معاشرتی روایات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور انہیں باقی رکھنے کا خیال انہیں زندگی کے ان پہلوؤں کی طرف زیادہ متوجہ کرتا ہے جن میں عیش و عشرت اور تعیش پسندی کے رجحانات بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ دوسرے

لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ باوجود سیاسی انحطاط و زوال کے اس زمانے کے بادشاہوں کے پاس ایک معاشرتی شعور تھا اور وہ ہر اس چیز سے دلچسپی لیتے اور اسے برقرار رکھنے کی کوشش کرتے تھے جس کا تعلق ان کی معاشرت اور معاشرتی روایات سے تھا۔ وہ صرف ہوس کے بندے ہی نہیں تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد صرف تیش ہی نہیں تھا۔ ان کے پیش نظر معاشرت اور معاشرتی زندگی بھی تھی۔ ان دونوں کو انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کر دیا تھا کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

لال قلعہ، جیسا کہ چلے کہا جا چکا ہے، اس زمانے میں معاشرتی زندگی کا مرکز تھا اور دلی شہر کے تمام رہنے والے اسے اپنی معاشرت کی ایک علامت سمجھتے تھے۔ بادشاہوں کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ اس لیے انہوں نے ان تمام ہنگاموں کے باوجود، جن سے وہ دوچار ہوتے رہے لال قلعے کی مرکزیت اور اس کی معاشرتی اہمیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ حالات بھی ایسا کرنے کے لیے کچھ سازگار رہے۔ اگرچہ اس زمانے میں بہت سی جنگیں ہوتی رہیں۔ مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں اور روہیلوں کی یورشوں کا سلسلہ جاری رہا لیکن لال قلعہ اس کے باوجود تباہ نہ ہوا۔ اس پر کبھی زبردست گولہ باری نہیں ہوئی۔ کہیں کہیں سنگ سرخ اور سنگ مرمر کی دیواروں کو نقصان ضرور پہنچا لیکن یہ نقصان بہت معمولی تھا۔ البتہ محل بالکل تباہ ہو گیا۔ نادر شاہ قزاق طاؤس اور جواہرات کے خزانے اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کے بعد ایرانیوں اور سورج مل جاٹ نے رنگ محل کی چاندی کی چھتیں اتار لیں اور قیمتی جواہرات وغیرہ لوٹ کر لے گئے، پھر غلام قادر روہیلے نے قلعے میں ہنگامہ برپا کیا لیکن وہ بھی اسے تباہ نہ کر سکا، صرف جواہرات وغیرہ نکالنے کی غرض سے فرش کھود ڈالے، اور شاہی کتب خانے کو بہت سی قیمتی چیزوں سے محروم کر دیا۔ ان میں سے کچھ تو لکھنؤ چلے گئے جنہیں نواب وزیر اودھ نے خرید لیا۔ مرہٹوں کے زمانے میں قلعے کو اصل حالت میں برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی لیکن رقم نہ ہونے کی وجہ سے مرمت وغیرہ نہ ہو سکی۔ شاہ عالم کا ناپا ہونا ان کے لیے مفید ثابت ہوا۔ کیونکہ ایک طرف تو اس کا دل بچھ گیا تھا۔ اس کے اخراجات محدود ہو گئے تھے۔ اسے زیادہ روپے کی

ضرورت نہیں تھی۔ دوسرے اسے قلعے کی تباہی کا احساس ہی نہیں تھا، کیونکہ ناپیتا ہونے کی وجہ سے تباہی اور بربادی کے وہ مناظر اس کے سامنے نہیں تھے، جن سے قلعہء معلول دوچار ہو چکا تھا۔ اس لیے قلعے کی مرمت کی طرف شاہ عالم نے کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس کام سے کہیں زیادہ اہم اس کے نزدیک اپنے بڑے خاندان کی پرورش اور دیکھ بھال تھی۔ اس کے جانشین اکبر شاہ نے بے شک تخت نشین ہونے کے بعد قلعے کی مرمت کی طرف توجہ کی۔ لیڈی نوچٹ (Lady Nugent) نے ۱۸۱۲ء میں یہ لکھا ہے کہ قلعے کے دیوان خاص کی چیت درست ہو چکی ہے اور خاصی سرمع ہے۔ قیمتی جواہرات کی جگہ اب نقلی جواہرات لگا دیے ہیں اور تقریباً تمام جواہرات نقلی ہیں لیکن ان کا اثر دیکھنے والے پر اچھا ہوتا ہے۔ لیکن یہ سلسلہ غالباً جاری نہ رہ سکا۔ کیونکہ ۱۸۲۵ء میں بشپ ہیبر (Bishop Heber) نے لکھا ہے کہ محل کا حال خراب ہے اور اس میں ہر طرف ویرانی برستی ہے۔ شاہ برج میں گندگی ہے اور وہ ویران ہے۔ غسل خانے اور لواڑے سوکھے پڑے ہیں، اندر کوڑے کے ڈھیر لگے رہتے ہیں اور پرندے گندگی پھیلانے رہتے ہیں۔ لیکن یہ صورت ہمیشہ باقی نہیں رہی۔ بہادر شاہ ظفر کے تخت نشین ہونے کے بعد پھر قلعے کی طرف توجہ کی گئی اور ۱۸۳۸ء میں رزولوشن نے یہ لکھا ہے کہ قلعے کی حالت بہت بہتر ہے اور اس کی طرف خاص توجہ کی جا رہی ہے لیکن یہ سلسلہ بھی جلد ہی ختم ہو گیا کیونکہ بہادر شاہ اس وقت تک خاصے ضعیف ہو گئے اور انہوں نے قلعے کے ظاہری پہلوؤں کی طرف توجہ نہیں دی۔ اس کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ بہادر شاہ ظاہری پہلوؤں سے زیادہ داخلی اور باطنی پہلوؤں کی طرف توجہ دیتے تھے اور ان کے نزدیک ذہنی اور روحانی معاملات کی اہمیت زیادہ تھی۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ مغلوں کے دور آخر میں قلعے کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کی کوشش کی گئی۔ بعض بادشاہ اس کام کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہوئے لیکن انہوں نے قلعے کو مغلوں کی معاشرتی زندگی کی ایک علامت ضرور سمجھا اور اس کو زیادہ نکھارنے اور سنوارنے کی کوشش کی انہوں

نے اس شان و شوکت اپنی محدود آمدنی میں بھی حتی الاسکان برقرار رکھا جو انہیں اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی تھی۔

لیکن اپنی روایات کو برقرار رکھنے کی یہ کوشش اور کلاوش کوئی مستقل صورت اختیار نہ کر سکی۔ کیونکہ سیاسی انحطاط و زوال کے باعث پیدا ہونے والی معاشی بد حالی نے قلعہ معلیٰ میں بھی اپنے قدم جما لیے تھے۔

بادشاہ تک اس زمانے میں چلے مرہٹوں اور پھر انگریزوں کے رحم و کرم پر رہا، یہ لوگ سیاح و سفیر کے مالک تھے۔ اس لیے ان کی مقرر کی ہوئی پنشن پر بادشاہ اور اس کے خاندان کی زندگی کا دار و مدار تھا۔ یہ لوگ قلعہ میں بھی بہت تھے۔ شاہی خاندان کے سیکڑوں آدمی قلعے میں رہتے تھے لیکن ان میں بیشتر کی معاشی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ معاشرتی

زندگی کی بلند سطح کو قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس زمانے میں میجر جارج کسنگھم (Major George Cunningham) نے لکھا ہے کہ جو لوگ

سلاطین کہلاتے ہیں وہ اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے رہتے ہیں۔ ان دیواروں کے اندر بے شمار چٹائیوں کے نیچے ہوتے جھوٹے ہیں جن میں یہ پامال اور پریشان حال مخلوق آباد ہے۔ انہیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ ان کے پاس نہ تو کھانے کے لیے کچھ ہے اور نہ پہننے کے لیے۔ ان میں سے بعض بادشاہ کے قریبی عزیز ہیں۔ ان کی زندگی کا دار و مدار بادشاہ کی سخاوت اور رہنمائی کے رحم دلی پر ہے۔ ان میں بعض رشتے

میں بادشاہ کے بھائی اور چچا ہوتے ہیں۔ ان کی کوئی معاشرتی حیثیت نہیں ہے۔ انہیں دیوار تک میں حاضر ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ انگریزوں نے

۸۰۳ ع میں ان کی حالت زار پر ترمس کھا کر کچھ مراعات ضرور دیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان سے ان کی قسمیں نہیں بدل سکتی تھیں۔ وہ جہاں تھے وہیں رہے اور ان کی معاشرتی حیثیت بلند نہ ہو سکی۔

ان کے مقابلے میں بادشاہ کے بیٹوں کا معاشرتی مرتبہ کسی قدر بلند تھا۔ انہیں نسبتاً زیادہ آزادی حاصل تھی۔ انہیں روپہ بھی کچھ زیادہ ملتا تھا۔ دربار میں بھی انہیں جگہ دی جاتی تھی لیکن انہوں نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا تھا۔ اکبر شاہ کے بیٹے مرزا جہانگیر کا حال بعض

لوگوں نے تفصیل سے لکھا ہے ۔ اس سے اس زمانے کے شہزادوں اور ان کی معاشرتی زندگی پر خاصی روشنی پڑتی ہے ۔ کرنل سلیمن (Col. Sleeman) نے ۱۸۱۶ء میں اس سے ایک ملاقات کا حال بیان کیا ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ ”وہ برائے کی بڑی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس سے بہتر شراب نہیں بنائی ۔ لیکن اس میں صرف ایک ہی خرابی ہے کہ اس سے بہت جلد نشہ ہو جاتا ہے ۔ وہ اس شراب سے لطف حاصل کرنے کے لیے ہر گھنٹے کے بعد ایک بڑا گلاس پیتا رہتا تھا ، یہاں تک کہ اس پر بد مستی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی ۔ ناچنے اور گانے والیاں مستقل اس کے سامنے ناچتی اور گاتی رہتی تھیں ۔ وہ بہت چھوٹی عمر میں مر گیا ۔ ظاہر ہے کہ ایسی زندگی بسر کرنے والا آدمی زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتا تھا“ ۔ ”میرزا جہانگیر کے بھائی میرزا ہاجر کا بھی کم و بیش یہی حال تھا ۔ اس نے تو قلعے میں انگریزی طرز کی عمارت تعمیر کر لی تھی ۔ اسی میں رہتا تھا ، انگریزی لباس پہنتا تھا اور شہر میں مستقل طور سے گھومنا اس کا محبوب مشغلہ تھا“ ۔ یہ لوگ ایک زوال آثار معاشرتی ماحول کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ زوال و انحطاط اس زمانے کی معاشرت میں موجود تھا اور تھوڑے سے فرق کے ساتھ تقریباً تمام لوگ اس میں پاپا رہ زنجیر تھے ۔

پھر بھی اس زمانے میں ان معاشرتی روایات کی جھلکیاں بعض لوگوں میں ضرور نظر آتی ہیں جو مغلوں کے ساتھ مخصوص تھیں ۔ بعض لوگوں نے اکبر شاہ کی بڑی تعریف کی ہے ۔ جہاد شاہ بھی اس اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں ۔ انھوں نے اپنے زمانے میں ان معاشرتی روایات کو زندہ رکھنے کی کوشش کی جو انھیں ورثے میں ملی تھیں اور جنھیں وہ بہت عزیز رکھتے تھے ۔ ان دونوں بادشاہوں کے زمانے میں درباروں کی شان و شوکت قائم رہی اور انگریزوں کے حکمران ہونے کے باوجود شاہان مغلیہ کے جاہ و جلال میں فرق نہیں آیا تھا ۔ وہ روایتی شان و شکوہ کے ساتھ درباروں میں بیٹھتے تھے اور سائل ان کے سامنے پیش کیے جاتے تھے ۔

۱۔ W. H. Sleeman : *Rambles and Recollections*: P. 509

۲۔ Major Archer : *Tours in Upper India* : P. 383

بشپ ہببر (Bishop Hebbber) نے اکبر شاہ کے دربار کی حقیقت سے بڑی ہی بھرپور تصویر کھینچی ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ کس طرح وہ قلعے کے مختلف حصوں کو طے کر کے بادشاہ کے دربار میں پہنچا۔ کتنی بار اسے نذر پیش کرنی پڑی، کس طرح اسے خلعت پہنایا گیا۔ کس انداز میں اس کی آؤ بھکت ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر کو یہی بعض لوگوں نے بہت سراہا ہے۔ وہ فطرتاً نیک، شریف اور سادہ مزاج بادشاہ تھے۔ دن بھر لکھنا پڑھنا، قرآن مجید کا مطالعہ کرنا اور فکر سخن میں محو رہنا اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ انہیں ادب اور چالیاہت سے دلچسپی تھی۔ روزانہ وہ جمنا کی سیر کرتے تھے۔ برسات میں سرولی جاکر رہنا اور برسات کی دل چسپیوں میں حصہ لینا اُن کے معمولات میں داخل تھا۔ انہیں مختلف تہواروں سے دلچسپی تھی اور وہ اُن میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ عرسوں میں شریک ہونا بھی اُن کے معمولات میں داخل تھا، اور اُن کے زمانے میں عرس بڑے اہتمام سے منائے جاتے تھے۔ غرض ان دونوں بادشاہوں کا انداز اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ ایک میں درباری شان و شکوہ تھا اور دوسرے میں سادگی اور درویشی تھی لیکن دونوں کا زمانہ معاشرتی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے عہد میں مغلوں کی معاشرتی روایات کو نہ صرف برقرار رکھا گیا بلکہ معاشرتی زندگی میں بعض نئی دلچسپیاں پیدا کی گئیں، جنہوں نے وقت کے ساتھ ساتھ نئی معاشرتی روایات کا رعب اختیار کر لیا۔ منشی فیاض الدین نے اپنی کتاب 'ہزم آخر' میں اس زمانے کی معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے دہلی کے آخری دو بادشاہوں اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ کے طریق معاشرت کی تصویر پیش کی ہے۔ اس پوری تصویر میں صرف آسائش اور عیش کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ رات اور دن جتن میں گزرتے تھے۔ کبھی تورے ہندی ہے، کبھی رت جنگا کبھی نو روز، کبھی آخری چہار شنبہ، کبھی خواجہ صاحب کی چھڑیاں، کبھی سلونو، کبھی بھول والوں کی سیر—غرض ہزم ہی ہزم ہے، رزم کا کہیں نام نہیں۔ قلعہ معلیٰ کے باہر جو طوفان برپا ہے، اس سے بے خبر نکر فردا سے بے نیاز—ایسا معلوم ہوتا ہے رقص ہری پتکراں اور

’غوغائے راجہ گراں‘ میں ساری دنیا سمٹ کر آ گئی ہے۔‘ اس بیان میں کسی قدر مبالغہ آرائی ضرور ہے لیکن ویسے یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے میں معاشرتی زندگی انہیں دل چسپیوں میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اور چونکہ بادشاہ انہیں بہت اہمیت دیتے تھے اس لیے اُن کی دیکھا دیکھی عوام نے بھی انہیں اپنے معمولات میں داخل کر لیا تھا۔ اسراء اور عوام بھی ان میں دلچسپی لیتے تھے اور اُس زمانے کے مخصوص حالات نے ان باتوں کو اُن کی زندگیوں کا جزو بنا دیا تھا۔ وہ بھی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے خواب دیکھتے رہتے تھے۔ خوش وقتی اُن کے نزدیک بھی معیار بن گئی تھی۔ بقول غالب ہزاروں خواہشیں ایسی تھیں کہ ہر خواہش پر اُن کا دم نکلتا تھا۔ اُن کا دل غم کھانے میں بودا تھا اور مے کلفام کے کم ہونے کا رنج بھی اُن کے لیے بہت تھا۔

ان حالات نے ایک ایسی معاشرت کو پیدا کیا جس میں زندگی کی حقیقتوں کی طرف توجہ کم تھی۔ اُن سے چشم پوشی کرنے اور انہیں بہلا دینے کا خیال زیادہ تھا۔ تعیش پسندی اور لذت پرستی اس معاشرتی زندگی کی بنیاد تھی اور زندگی کے اس انداز کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مذہب اور دین داری کے ساتھ ساتھ بھی لذت اور تعیش کے یہ سلسلے قائم رہ سکتے تھے۔ چنانچہ اُس زمانے میں جی ہوا ہے۔ لوگ ایسی اکتساب لذت اور حصول تعیش کے بیچھے بھاگتے رہے ہیں۔ بعض جگہ تو اس صورت حال نے لطافت اور رنگینی کی صورت اختیار کی ہے لیکن بعض جگہ اس میں انتہا پسندی نے ابتذال کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔ درگاہ قلی خان نے انہی دل چسپ کتاب ’سرفع دہلی‘ اگرچہ مجدد شاہی عہد میں لکھی ہے لیکن اُس سے شاہ عالم، اکبر شاہ اور بہادر شاہ کے عہد کی معاشرتی زندگی پر بھی خاصی روشنی پڑتی ہے کیونکہ اس وقت بھی ٹھوڑے سے فرق کے ساتھ زندگی کا عام انداز وہی تھا۔ مجدد شاہ کے زمانے کی سی شدت تو اس زمانے میں باقی نہیں رہی تھی لیکن اس زندگی کے لیل و نہار کم و بیش وہی تھے۔ اس زمانے کے بازاروں، محفلوں، مجلسوں اور دوسری دلچسپیوں کا جو حال آلوہوں نے لکھا ہے، وہ بڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قلمی کے باہر

جو چوک سعد اللہ خان کے نام سے مشہور ہے ، اس کی کیفیت انہوں نے اس طرح بیان کی ہے :

”ہنگامہ اش عاذی دروازۃ قلعہ است و مجمعش در فضائے پیش کاہ جلوہ خانہ ۔ سبحان اللہ کثرتے می شود کہ نظر از ملاحظہ محسوسات رنگا رنگ دست و پا گم می کند و نگاہ بہ مشاہدہ قبضہ و امثال در تماشا و تعداد امثال ، مواد نمنا در آئینہ خانہ حیرت می نشیند ، ہر طرف رقص امارد خوش رو قیامت آباد و ہر سو شور انباشہ منجالی ہعشر بنیاد“ ۔

”یہ چوک قلعہ شاہی کے دروازے سے شروع ہوتا ہے ۔ وہ دہلی کا بہت ہی خوبصورت بازار ہے ۔ یہاں صبح و شام اس قدر مجمع رہتا ہے اور اس قدر رنگا رنگ جلوے نظر آتے ہیں کہ پہلی دفعہ دیکھنے والا دیکھ کر حیرت زدہ سا ہو جاتا ہے اور ایک اجنبی شخص کے لیے یہ بازار نکار خانہ“ چین معلوم ہوتا ہے ۔ کیونکہ یہاں حیرت اور دلچسپی اور تعجب کی بہت سی چیزیں ہیں ۔ نیا شخص کسی کسی کو دیکھے ۔ بازار کے ایک طرف خوبصورت اور اور طرحدار مردوں کا ناچ ہوتا ہے ۔ یہ ناچ اس قدر دلچسپ ہوتا ہے کہ آدمی بس کھڑا دیکھا ہی کرے ۔ ناچ دیکھنے والوں کی ایک بیوڑ لگی رہتی ہے ، جو عدائے حسین و مرجبا سے آہاں سر ہر اٹھا لیتی ہے ، جس کو من کر ہر گزرنے والے کا دل زبردستی ناچ کی طرف کھینچ جاتا ہے“ ۔

اور دہلی کے بعض امراء کی دلچسپیوں اور مزاج کی رنگینیوں کا ذکر اس طرح کیا ہے :

”اعظم خان ہسر ندوی خان برادر زادہ خان جہاں بہادر عالمگیری از امراء عظیم الشان بمقتضائے رنگینی“ مزاج و سہارت راگ مدوح مطربان ہندوستان طبیعتش امارد پسند است و مزاجش بہ محبت

۱- درگاہ قلی خان : مرقع دہلی : صفحہ ۱۴

۲- حسن نظامی: ہرانی دہلی کے حالات (ترجمہ مرقع دہلی) : صفحہ ۲۳

سادہ رویاں در بند مداخل جاگیرتش صرف اخراجات این رقمہ است و حاصل روزگارش خرج ہا انداز مقدم ۔ طبقہ ہر جا از اسرے رنگیں میر می باید بروایت دل خواہ در کھند رقابت خود می اندازد از ہر طرف از سادہ روئے بیامی می رسد بہ ذام احساسی می کشد جمعی ازین گروہ بحسن سعیش بمنصب مناسب امتیاز یافتہ ایسی بساط اند و برخی بمراعات خانگی اشاکفا کردہ رنگ افروز محفل نشاط در سواری بتان تمام و تجمل مالا کلام بر اسبان باد ہا سواری شوند غرض ہر جا سبزہ رنگی نظر می آید منسوب بہ اعظم خان است و ہر کجا نو خطی جلوہ کند از وابستہائے آن عظیم الشان بہ پرتو خال این گل رخاں صبح پیری را غضاب می کند و ہوا ہمہ کم فرصتی ہائے زمان فرصت حیات در استجلاب و حظوظ نفسانی در شتاب

”خان جہاں بہادر عالم گیری کا بھائی اور فدوی خاں کا لڑکا ہے ۔ دہلی کے بڑے امیروں میں ہے ۔ رنگین مزاج اور بڑا سنج ہے ۔ فن موسیقی کا ماہر ہے ، ہندوستان کے مطرب اور موسیقی دان اعظم خاں کی بہت عزت کرتے ہیں ۔ حسن برص ہے خوب صورت لڑکوں ، نو خط مردوں اور ماہ رو حسنین کی محبت میں گرفتار رہتا ہے ۔ اس کی جاگیر کی آمدنی کا اکثر حصہ حسن برستی کی لڑ بو جاتا ہے ۔ جہاں کہیں کسی خوب صورت لڑکے کی خبر سنتا ہے ، فوراً اس کو حاصل کرنے یا اس سے ملنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے ۔ یہاں تک کہ اس کو اپنا بنا لیتا ہے ۔ ایسے ہی اگر کسی خوش جال عورت کا حال سنتا ہے تو اس کو بھی قبضے میں لانے کی کوشش کرتا ہے اور کسی نہ کسی طرح اس کو حاصل کر لیتا ہے ۔ عشق بازی اور حسن برستی کے سلسلے میں نثر اور بے خوف ہے ۔ اس سلسلے میں بے شمار روپیہ خرچ کر ڈالتا ہے ۔ عباسی اس کی زندگی ، امرد برستی اس کا شعار اور زن برستی

اُس کی عادت ہے ۔ اس کی محفل نشاط میں منتخب حسینان جہاں کا چمکھٹا رہتا ہے ۔“

”میرزا منو کہ از امیر زادہائے زمانہ است و درین فن محرک رہا
یکانہ ۔ اکثر از امرا زادہ ہائے احکام ضروری این علم ازو یاد
می گیرند و ہشاگردیش نظر می کنند شیرازہ این محفل است و باعث
انتظام این بزم غلبان مشاغل ۔ غانہ اش بہشت شداد است و کاشانہ اش
آشیان مجمع ہری زاد ہر نو خط و رنگیں کہ با این محفل ربط نہ دارد
فرد بنطل است و ہر ملیح کہ باین مجمع مربوط نیست از حلیہ اعتبار
عاشل مجلس دارالعیار شاہدان است و بزمش حکم امتحان گل رخاں
لقد قراخہ حسن تاہ دارالضرب بزمش رجوع نہ کند کامل عیار
نہست چہ شد کہ مثل طلائے دست افشار است و سم جہاں تا در کوزہ
جمعش گداز نیابد چاندی نیست چہ شد کہ اگر تفرہ خالصی است ۔“

”یہ حضرت بھی مشہور امیر زادے ہیں اور حسن پرستی اور
امر د نوازی کے فن میں یکانہ“ روزگار سمجھے جاتے ہیں ۔ بڑے بڑے
نواب زادے دولت مند ہیں اور میرزا منو کے اس فن خاص کو
سیکھتے ہیں اور میرزا کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں ۔ میرزا منو
کی محفل رفتانہ تک اچھے اچھوں کی رہائی نہیں ہوتی اور وہ میرزا
کی صحبت کے لیے قرضتے ہیں ۔ میرزا کی محفل بہشت شداد کا نمونہ
ہے ۔ جہاں ہری زاد غلبان ، جادو نگاہ لڑکے اور خوب صورت
مطربوں اور معشوقوں کا مجمع رہتا ہے ، مشہور ہے کہ میرزا کی
بزم جہاں حسن و خوب صورتی کی امتحان گاہ ہے کیونکہ میرزا
عشق بازی اور حسن پرستی کے فن میں اتنا کامل ہے کہ کسی
حسین کا اس کے چنگل سے نکل جانا یا میرزا کا کسی حسین سے

۱۔ حسن نظامی : برائی دہلی کے حالات : (ترجمہ مرقع دہلی) :

صفحہ ۳۸ ، ۳۹

۲۔ درگاہ قلی خان : مرقع دہلی : صفحہ ۲۷ - ۲۸

محبت نہ کرنا اُس حسین کے لہجے کی علامت ہے۔ دہلی کی ہر حسین لڑکی اور ہر حسین لڑکے کا میرزا کے تعلق میں ہونا لازمی ہے۔ یہ مثل مشہور ہے کہ جو امرد میرزا متو کی محفل کی زینت نہیں وہ عیارِ کامل نہیں ہے اور اُس کو معشوقیت کی تمیز نہیں ہے۔“

ان بیانات سے مغلوں کے دورِ آخر کی دلی، اُس کی معاشرت اور اس معاشرت کے علم برداروں پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ کم و بیش یہی حال امراء و رؤساء کا بہادر شاہ ظفر کے وقت تک رہا۔ ان میلانات کے اثرات اس زمانے کی معاشرتی زندگی پر اسے گہرے ہونے کہ عوام تک نے اپنے آپ کو اسی رنگ میں رنگ لیا اور اس طرح ہر طرف ایک عیش و عشرت، لذت پسندی اور ہوا و بوس کی فضا قائم ہو گئی۔ اس زمانے کا ہر فرد اسی فضا میں سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے انکڑ و خیالات، عقائد و توہیات اور عادات و اطوار سب میں اس کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان لوگوں نے زندگی کے اسی انداز کو اپنا نصب العین بنا لیا ہے اور اُس کو عملی جامہ پہنانے کے خیال میں وہ سب کے سب سرگردانِ فطر آئے ہیں۔ اس زمانے کے مخصوص حالات نے ان میں سے ہر ایک کو اتنا پسند بنا دیا ہے اور اُن کی انتہا پسندی نے مجموعی طور پر معاشرتی زندگی میں عجب عجب گلی کھلائے ہیں۔

بظاہر یہ زندگی بڑی رنگین اور ہرکارِ نظر آتی ہے۔ اس کے ہر شعبے پر رنگین پردے بڑے ہونے دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں بڑی دلکشی ہے۔ یہ دھناتی سے بھرپور ہے۔ اس میں دلچسپی کا رُخا سامان ہے۔ یہ آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس رنگینی اور ہرکاری کے جے بنیاد اور بے اساس ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ایک خواب و خیال کی دنیا معلوم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو انقطاع و زوال کے بغیر تعمیری احساس نے پیدا کیا تھا۔ اب آگے بڑھنے کے راستے بند ہو گئے تھے۔ شمشیر و سان کی جگہ طاؤس و رہاب نے لے لی تھی۔ رزم کی جگہ

بزم کا دور دورہ تھا۔ اس لیے لوگ زندگی کے حقائق کو پہلا دینا چاہتے تھے۔ اس کے سنگین معاملات سے چشم پوشی کرنا ان کے مزاجوں میں داخل ہو گیا تھا۔ اس لیے ان کی زندگی متوازن نہیں رہی تھی۔ اس زمانے کے لوگ عظیم معاشقِ روايات کے علم بردار تھے لیکن اب سیاسی انتشار اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشی بد حالی نے ان روايات کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ اس لیے وہ ان روايات کو سینے سے لٹائے رکھنا چاہتے تھے لیکن روايات کو اصل صورت میں باقی رکھنے کے لیے سیاسی اقتدار اور معاشی انضباط کی ضرورت تھی اور یہ دونوں چیزیں عفا ہو چکی تھیں۔ اس لیے ان معاشقِ روايات کو برقرار رکھنے کے خیالات افراد سے عجیب عجیب حرکتیں سرزد کراتے تھے۔ معاشقِ زندگی میں لذت پسندی کا خیال انہیں دورے میں ملا لیکن اب اس خیال نے عجیب و غریب صورتیں اختیار کر لی تھیں۔ اس میں فراری ذہنیت نمایاں تھی۔ اس لیے انتقال کا رنگ روپا ہونے لگا تھا۔ تاج محل اور لال قلعے کی تعمیر کے لیے اس زمانے میں وسائل موجود نہیں تھے۔ اس لیے تخلیقی صلاحیتیں ان بزمِ آرائیوں کی نذر ہو گئی تھیں جن کا مقصد صرف ذہنی تعیش تھا۔ اس زمانے کی زندگی کے مختلف شعبوں میں افراد کی حرکات و سکنات اسی صورت حال کی آئینہ داری کرتی ہیں۔

۴

یہ صورت اس ذہنی ہستی کا نتیجہ تھی جس کو سیاسی انتشار اور معاشی ہراگندگی کے ہاتھوں وجود میں آنے والے انحطاط و زوال نے پیدا کیا تھا۔ مغلوں کے دورِ آخر کا تقریباً ڈیڑھ سو سال کا زمانہ اسی ذہنی ہستی اور انحطاط و زوال کی نشان دہی کرتا ہے۔ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات سے لے کر بہادر شاہ ظفر کے معزول ہونے تک ہندوستان کی زندگی اسی صورت حال سے دو چار رہی۔ مسلمانوں پر اس کا نسبتاً زیادہ اثر ہوا۔ کیونکہ وہ براہِ راست ان حالات سے دو چار ہوئے۔ اس آشوب قیامت نے ان پر عرصہٴ حیات تنگ کر دیا جو اس زمانے میں سیاسی اقتدار کی کمی اور مرکز کی کم زوری کی وجہ سے سکھوں اور چالوں کی شورشوں نے برپا کیا تھا۔ معاشی بد حالی نے ان کے لیے زیست دشوار کر دی اور وہ جو کچھ کر سکتے تھے

وہ نہ کر سکے یہی اُن کی راہوں میں حائل رہی۔ چنانچہ اُنہیں میدان چھوڑنا پڑا اور وہ عملی زندگی سے منہ موڑ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اُنہوں نے خیال کی دنیا میں محفلیں سجائیں اور اُن کا وہی حال ہوا جو عام طور پر ان حالات میں رومانی سزاج لوگوں کا ہوتا ہے۔ وہ معاشرتی روایات کو برقرار تو رکھتے ہیں۔ اُن کی زندگی میں نفاست اور لطافت بھی نظر آتی ہے۔ اُن کی مجلسوں میں رونقوں کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن اس ذہنی ہستی اور اخلاقی انحطاط کے اثرات بھی اُن کے یہاں نمایاں ہیں جن کو عام طور پر وہ بے اعتدالی پیدا کرتی ہے جو رومانیت کی بنیاد ہے۔ یہ بے اعتدالی اس زمانے کی زندگی میں بہت عام ہے اور اس نے معاشرتی زندگی کے شیرازے کو منتشر کر کے رکھ دیا ہے۔ چنانچہ ہر چیز اس زمانے میں نمود و نمائش کا ذریعہ بن گئی ہے۔ ہر شعبے میں ہوا و ہوس کے خیالات نے گہر کر لیا ہے اور اس کی تکمیل ہی کو لوگ زندگی کا مقصد سمجھنے لگے ہیں۔

ان حالات میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ذہنی اور فکری تحریک چلتی ہے جس کا مقصد زندگی کو راہ راست پر لانا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں اُسی بعض اہم ذہنی اور فکری تحریکیں ملتی ہیں جن کا شباب مغلوں کے انحطاط و زوال کا یہی زمانہ ہے۔ اس تحریک کی ابتدا شاہ ولی اللہ دہلوی سے ہوتی ہے۔ اُنہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے سیاسی انحطاط، معاشی انتشار اور معاشرتی پراگندگی کو محسوس کیا اور انہیں اس سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ یہ کام آسان نہیں تھا کیونکہ اُس زمانے میں ایک عام افراطی کا دور دورہ تھا۔ سکھوں کے ہنگاموں، جالوں کی پورشوں اور مرہٹوں کے حملوں نے نہ صرف سلطنتِ مغلیہ کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا تھا، بلکہ عام مسلمانوں کے لیے بھی زندگی دشوار کر دی تھی۔ بادشاہ اور امراء ان حالات کی تاب نہ لا کر عیش و عشرت میں گم ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے اپنے آس پاس اور گرد و پیش کو بھلا دیا تھا اور زندگی کے حقائق سے اس طرح اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں جیسے انہیں ان حالات سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس صورت حال نے سازشوں کا ماحول پیدا کیا۔ ہوس ملک گیری بڑھ گئی۔ لوگ دولت کے پچھے بھاگنے لگے۔ کسی کے سامنے کوئی بڑا نصب العین نہ رہا۔ لوجی طاقت کم زور ہو گئی۔ بغاوتوں نے سر اُٹھایا۔ سازشوں کے فتنے بیدار ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کی حکومت

ختم ہو گئی۔ معاشی اور اقتصادی حالات بد سے بدتر ہونے لگے۔ معاشرتی زندگی میں فراری ذہنیت کا عکس نظر آنے لگا۔ غرض ایک عام ہراگندی پھیل گئی۔

شاہ ولی اللہ نے ان حالات کو بغور دیکھا، ان کے نشیب و فراز پر نظر ڈالی۔ سیاسی معاشی، معاشرتی اور تہذیبی معاملات کا غور سے مطالعہ کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کے الصطاط و زوال، ان کے قومی انتشار اور ملی ہراگندی کا سبب دین اور مذہب سے علیحدگی اور اسلام کے صحیح اصولوں سے یگانگی ہے۔ اسی نے ان کے یہاں ڈھیلا ڈھالا بن پیدا کیا ہے اور وہ صحیح زندگی کے راستے سے ہٹ گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ زندگی کا سارا نظام بکڑ گیا ہے۔ معاشی نظام اقدار میں نا ہمواری پیدا ہو گئی ہے۔ معاشرتی مذہبیات عام ہو گئے ہیں۔ لہو و لعب زندگی کا جزو بن گیا ہے۔ نیش پرستی مزاجوں میں داخل ہو گئی ہے۔ لذت پسندی کے خیالات عام ہو گئے ہیں۔ اپنی کتاب 'تہذیبات' میں انہوں نے ان تمام پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے اور مسلمانوں کے تمام طبقوں کو ان حالات سے باہر نکلنے کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اس زمانے کے مسلمان امراء کو مخاطب کر کے کہتے ہیں :

”اے امیرو! یہ دیکھو! کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے؟ دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جا رہے ہو اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے تاکہ ان میں بعض بعض کو کھانے اور نکلنے رہیں، چاہے کہ تم اپنی شہوانی خواہشوں کو نکاح کے ذریعے پورا کرو۔ خواہ تمہیں ایک سے زیادہ ہی نکاح کیوں نہ کرنا پڑیں۔ لیکن تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لہذا کھانوں کی قسمیں پکوائے رہو اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو۔ اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ کسی طرف منعطف نہیں ہوتی۔“

۱۔ شاہ ولی اللہ : تہذیبات (بہ حوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی

مکتوبات) : مرتبہ خلیق احمد نقاشی : صفحہ ۶، ۸

اور عوام کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں :

”اپنا مصارف وضع قطع میں تکلف سے کام نہ لیا کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارے نفوس بالآخر فسخ کے حدود تک پہنچ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندے اُس کی آسائیوں سے غائدہ اٹھائیں۔ انا کہانے کی کوشش کرو جس سے تمہاری ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ دوسرے کے سینے کے بوجھ بننے کی کوشش نہ کرو کہ اُن سے مانگ مانگ کر کھایا کرو یا تم اُن سے مانگو اور وہ نہ دیں۔ اس طرح بے چارے بادشاہ اور حکام کے لیے بوجھ نہ بن جاؤ۔ تمہارے لیے جی ہنسندہ ہے کہ تم خود کھا کر کھایا کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں معاش کی بھی رائے سجھائے گا جو تمہارے لیے کافی ہوگی۔ اسے آدم کے جیو! جیسے خدا نے ایک جائے سکونت دے رکھی ہو۔ جس میں وہ آرام کرے۔ انا ہانی جس سے سیراب ہو۔ انا کھانا جس سے بسر ہو جائے۔ انا کھڑا جس سے تن ڈھک جائے۔ ایسی بیوی جو اُس کی رین سہن کی جدوجہد میں مدد دے سکتی ہو تو یاد رکھو کہ دنیا کامل طور سے اُس شخص کو مل چکی ہے۔ چاہیے کہ اس پر خدا کا شکر ادا کرے۔“

اس طرح جو لوگ بری رسموں کو معاشرتی زندگی کا اہم حصہ سمجھنے لگے تھے۔ اُن کے بارے میں لکھا ہے :

”تم نے ایسی فاسد رسمیں اختیار کر لی ہیں جن سے دین متغیر ہو گیا ہے۔ مثلاً ہوم عاشورہ کو تم اطلی حرکات کرتے ہو۔ ایک جماعت سے اُس دن کو ماتم کا دن بنا رکھا ہے۔ کچھ لوگوں نے اس دن کو کھیل تماشوں کا دن بنا لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اُسے مذہبی مناسک کا دن بنا رکھا ہے۔ پھر تم شب برات میں جاہل قوموں کی طرح کھیل تماشے کرتے ہو اور

۱۔ شاہ ولی اللہ : تفسیلات (بدحوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات) :

تم میں سے ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ اس روز مردوں کو کثرت سے کھانا بھیجنا چاہیے۔“
 اور جو لوگ معاشرتی زندگی میں بعض رسموں کو پورا کرنے کے لیے فضول خرچی کرتے ہیں انہیں مخاطب کر کے کہا ہے :
 ”بہتر تم نے ایسی رسمیں بنا رکھی ہیں جن سے تمہاری زندگی تنگ ہو رہی ہے مثلاً شادیوں میں فضول خرچی ، طلاق کا ممدوع بنا لینا ، بیوہ عورت کو بلٹھا رکھنا ۔ تم نے موت اور غم کو عہد بنا رکھا ہے۔“

غرض شاہ ولی اللہ نے اس وقت کی ماری زندگی کو بدلنے کی کوشش کی ہے ۔ اُس کو نئی راہوں پر گامزن کرنا چاہا ہے ۔ اُس کے مختلف شعبوں میں نیا خون دوزائے کے سلسلے میں وہ پیش پیش رہے ہیں ۔ اُن کی تحریک اُس وقت کی اہم تحریک تھی ۔ اس تحریک کی نوعیت بد یک وقت دینی بھی تھی ، سیاسی بھی ، معاشی بھی تھی معاشرتی بھی ۔ انہوں نے زندگی کے ان تمام شعبوں میں ایک نئی روح بھونکی ہے اور انہیں صحت مندی سے ہم کنار کرنے کا اہم کام انجام دیا ہے۔ بقول شیخ محمد اکرام ”شاہ ولی اللہ قومی زندگی کے ایک بڑے نازک دور میں پیدا ہوئے ۔ اُن کا ظہور اُس زمانے میں ہوا جب اسلامی حکومت کی بنیادیں اکھڑ رہی تھیں اور اس ملک میں صدیوں جاہ و جلال سے حکومت کرنے کے بعد اس قدر آرام طلب اور کم زور ہو گئے تھے کہ وہ سریشوں اور سکھوں کے مقابلے میں تساہل اختیار کرتے تھے ۔ شاہ صاحب کو اس صورت حال کا افسوس ہوتا ہوتا ۔ لیکن جو شخص عملی کام کرنا چاہے اُسے اپنا دائرۂ عمل محدود اور معین کرنا پڑتا ہے ۔ شاہ صاحب اپنے آپ کو اس کام کے لیے موزوں نہیں سمجھتے تھے کہ وہ عملی زندگی میں دخل انداز ہو کر واقعات کی رو کو روکیں ۔ لیکن جس کام کے لیے وہ موزوں تھے اور جو کچھ کم ضروری نہ تھا (یعنی رسول اکرم کی خلافت باطنیہ) اس کے لیے اُنہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی ۔ وہ ان عیوب اور کوتاہیوں سے پوری طرح واقف تھے جو مسلمانوں کی انفرادی اور

اجتماعی زندگی میں گھر کر گئی تھیں اور جن کی وجہ سے انہیں یہ روز بد دیکھنا نصیب ہو رہا تھا ۔ شاہ صاحب نے انہیں پوری طرح بے نقاب کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کا ازالہ ہو جائے۔ ” یہ بہت ہی اہم کام تھا کیونکہ اس وقت کی زندگی حد نظر تک پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں بھٹک رہی تھی ۔ اچھے راستہ نظر نہیں آتا تھا ۔ منزل کی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی ۔ شاہ ولی اللہ کے انکار و خیالات نے اُس کے لیے شمع راہ کا کام کیا جس کی روشنی میں اُس زمانے کے مختلف شعبوں نے ارتقائی سفر جاری رکھا ۔ یہ تحریک بنیادی طور پر ذہنی اور فکری تحریک تھی ۔ اس میں عمل کا پہلو نمایاں نہیں تھا ۔ اس وقت حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اسی تحریک نے آگے بڑھ کر عملی صورت بھی اختیار کی ۔ شاہ اسماعیل شہید اور مولانا سید احمد بریلوی اسی تحریک کے چشم و چراغ ہیں ۔ لیکن اُن کے یہاں عمل کا جذبہ تحریک حیاہ کی صورت اختیار کرتا ہے ۔ اور یہ سردان حق آگاہ باطل کے مقابلے میں حق کی قوتوں کو صف آرا کرتے ہیں اور راہ حق میں لڑتے ہوئے شہید ہو جاتے ہیں ۔ ان بزرگوں نے شاہ ولی اللہ اور اُن کے صاحب زادوں سے نفیس حاصل کیا ۔ شاہ ولی اللہ کے صاحب زادوں میں شاہ عبد العزیز ، شاہ رفیع الدین ، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبداللہ تھے ۔ انہوں نے اپنے والد کی وفات کے بعد اُن کی ذہنی اور فکری تحریک کو جاری رکھا اور مسلمانوں کی دینی زندگی کو سدھارنے ، معاشرتی معاملات کو سنوارنے اور تہذیبی حالات کو نکھارنے میں پیش پیش رہے ۔

شاہ عبدالعزیز ۱۵۹ھ تا ۲۳۶ھ میں پیدا ہوئے ۔ اپنے والد شاہ ولی اللہ سے علم حاصل کیا اور پندرہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے ۔ جب شاہ ولی اللہ صاحب کا انتقال ہوا تو اُن کی عمر سترہ سال تھی ۔ وفات کے بعد یہ شاہ صاحب کے خلیفہ مقرر ہوئے اور ساٹھ سال تک اپنے والد کے کام کو جاری رکھا ۔ علم حدیث کے درس کی طرف انہوں نے خاص طور پر توجہ کی ۔ چنانچہ ہندوستان کے اکثر محدثین کا سلسلہ آپ سے ملتا ہے ۔ اپنے والد کی طرح وہ تصنیف و تالیف کی طرف توجہ نہ

کر سکے۔ کیونکہ اُن کا زیادہ وقت درس و تدریس میں صرف ہوتا تھا اور وہ ارشاد و ہدایت کے کام میں مصروف رہتے تھے۔ اُس زمانے کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے جو اہم کام شروع کر رکھا تھا، اُس کو اُس زمانے کے لوگ کتنی اہمیت دیتے تھے اور اُن کے دلوں میں شاہ صاحب کی کتنی عزت تھی۔ جن نامور ہستیوں نے اُن سے فیض حاصل کیا اُن میں شاہ رفیع الدین، شاہ محمد اسحاق، شاہ غلام علی، مفتی صدر الدین آزاد، مولوی مخصوص اللہ، مولوی عبدالحی، مولانا میر محبوب علی، مولانا فضل حق غیر آبادی، مفتی الہی بخش کاندھلوی اور مولانا سید احمد برہلوی وغیرہ کے نام خاص طور پر مشہور ہیں۔ شاہ عبدالعزیز نہ صرف اسلامی علوم کے ماہر تھے بلکہ دوسرے علوم و فنون پر بھی اُن کی نظر بہت گہری تھی۔ زبان و ادب کے بھی وہ بہت ماہر تھے۔ چنانچہ اُس زمانے کے بعض شاعروں نے بھی اُن سے فیض حاصل کیا ہے۔ مومن بچن ہی میں اُن کے مدرسے سے منسلک ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے ابتدائی تعلیم بھی وہاں حاصل کی اور اُن کے وعظ بھی سنے۔ ذوق نے بھی اُن کی شاگردی اختیار کی اور اپنی غزلیں اُنہیں دکھائی۔ ناصر لذیر نرائی نے ’لال قلمی کی ایک جھلک‘ میں اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”کون نہیں جانتا کہ حضرت شاہ نصیر صاحب دہلوی اکبر شاہ ثانی اور ابو ظفر بہادر شاہ اور شیخ ابراہیم ذوق کے استاد تھے۔ جب شاہ صاحب کا ذوق سے دل کھٹا ہو گیا اور اصلاح موقوف ہوئی تو ذوق پر جمعہ کو مولانا عبدالعزیز صاحب کے وعظ میں جانے لگے اور وعظ بہت غور سے سننے لگے۔ کسی دوست نے اس کا سبب پوچھا تو ذوق نے کہا ”استاد مجھ گدہ گار سے ناخوش ہو گئے۔ شعر و سخن میں اصلاح ملتی نہیں۔ اس کا بدل میں نے یہ نکالا ہے کیونکہ شاہ عبدالعزیز صاحب اردو زبان دانی میں شاہ نصیر صاحب سے کسی طرح کم نہیں۔ اُن کے بیان اور گفتگو کو سنتا ہوں اور اردو کے عاویزے روز سرہ یاد کرتا ہوں۔“

۱۔ شیخ محمد اکرام : رود کوثر : صلفہ ۹۰۔

۲۔ آزاد : آبِ حیات :

اس لیے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب اپنے والد ماجد کے حکم کے بموجب اردو زبان سیکھنے کے لیے خواجہ میر درد صاحب کی خدمت میں جھپٹن سے حاضر ہوئے تھے اور چپ چاپ بیٹھے ہوئے آپ کی تقریر سنا کرتے تھے اور محاورات کو دل ہی دل میں چنا کرتے تھے۔ مولانا ولی اللہ صاحب اپنے بچوں سے کہا کرتے تھے جس طرح اصول حدیث اور اصول فقہ فن ہے اسی طرح حصول زبان بھی فن ہے اور اردو زبان کے موجد و مجتہد خواجہ میر درد صاحب ہیں۔ آپ کی صحبت کو اس فن کے واسطے غنیمت سمجھو، خواجہ صاحب کہتے ہاں ہیں۔ چنانچہ شاہ عبد القادر صاحب خاص طور پر میر درد صاحب کے شاگرد تھے۔“

غرض شاہ عبدالعزیز سے نہ صرف علماء نے بلکہ شعراء نے بھی استفادہ کیا کیونکہ وہ جامع کمالات تھے۔ ہر علم اور فن میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔ بقول سر سید: "ذات فیض سات ان حضرت با برکت کی فنون کسب و وہی اور مجموعہ" فیض ظاہری و باطنی تھی۔ اگرچہ جمع علوم مثل منطقی و حکمت و ہندسہ و ہیئت کو خادم علوم دینی کا کرکر تمام ہمت و سراسر سعی کو تحقیق غوامض حدیث نبوی و تفسیر کلام اللہ اور اعلائے اعلام شریعت مقدسہ حضرت رسالت باطنی میں مصروف فرماتے تھے اور سوا اس کے جو کہ چلائے آئینہ باطن صقل عرفان و اہقان سے کمال کو پہنچی تھی، طالبان صافی نہاد کی ارشاد و تلقین کی طرف توجہ عام تھی۔ اس پر بھی علوم عقلیہ میں سے کون سا علم تھا کہ اُس میں پکتائی اور ایک فنی نہ تھی۔" غرض وہ بہت بڑے عالم تھے، اور علمی حیثیت سے اُن کے بلند مرتبے کو ہر ایک نے تسلیم کیا ہے۔ اس علم سے انہوں نے اس زمانے کے مسلمانوں میں ایک نئی روح بھونکی۔ انہیں زندگی بسر کرنے کا گر بتایا اور چمنے کے صحیح آداب سکھائے۔ اور اس طرح اُن میں زندگی اور جولانی کی ایک لہر دوڑائی۔ انہوں نے اپنے زمانے کے حالات کا جائزہ لیا اور اس زمانے میں مختلف فوٹوں کے زیر اثر زندگی جن نئے رجحانات سے آشنا ہو رہی تھی،

۱۔ ناصر تذیر فراق : لال قلمی کی ایک جھلک : صفحہ ۶۳

۲۔ سرمد احمد خان : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۵۲

اُن کا غیر مقدم کیا اور اُن کے قبول کرنے کی طرف لوگوں کو بھی توجہ دلائی۔ شاہ عبدالعزیز کا انتقال ۷ شوال ۱۲۳۸ھ یعنی ۱۷ جولائی ۱۸۲۳ع کو ہوا۔ مومن نے جو اپنے اصلی امام حبیب اللہ سے نہیں بلکہ شاہ صاحب کے دیے ہوئے امام مومن خان سے زیادہ مشہور ہوئے، تاریخ کہیں 'دست یداد اجل سے بے سرو پا ہو گئے

فقر و دیں، فضل و پیر، لطف و کرم، علم و عمل

اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ فقر و دیں، فضل و پیر، لطف و کرم اور علم و عمل کا مجسمہ تھے۔ انہوں نے اپنے زمانے میں انہیں عام کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں اُن کے ذوق و شوق اور اتہاک نے انہیں یہ ذات خود ایک ادارہ اور ایک تحریک بنا دیا۔

شاہ عبدالعزیز کے ساتھ ساتھ اُن کے بھائی شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی بھی اس کام میں پیش پیش رہے جس کا آغاز اُن کے والد شاہ ولی اللہ نے کیا تھا۔ انہوں نے بھی اپنے علم و فضل اور درس و تدریس سے اس وقت کے مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ شاہ رفیع الدین ۱۱۹۳ھ مطابق ۱۷۴۹ع میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد شاہ ولی اللہ سے علوم حاصل کیے۔ جب شاہ عبدالعزیز آخر عمر میں درس و تدریس کا کام نہ کر سکے تو وہ کام شاہ رفیع الدین نے سنبھالا۔ اُن کا سب سے اہم کارنامہ قرآن مجید کا تحت اللفظ ترجمہ ہے۔ ساری زندگی انہوں نے دین اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی۔ ۱۲۳۲ھ ۱۸۱۹ع میں انتقال کیا۔ شاہ عبدالقادر بھی شاہ ولی اللہ کے نامور فرزند تھے۔ انہوں نے بھی ساری زندگی درس و تدریس میں گزاری۔ علم سے فارغ ہو کر اکبر آبادی مسجد میں کوشہ نشین رہے۔ قرآن کا با محاورہ ترجمہ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اس ترجمہ نے مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا کی کیونکہ انہیں دین کو براہ راست سمجھنے کا موقع ملا۔ علم فقہ، حدیث اور تفسیر کے بھی وہ زبردست عالم تھے اور انہوں نے مسلمانوں میں ان علوم کے ذریعہ سے بھی دین اور دنیا دونوں کو سمجھنے کا شعور پیدا کیا۔ آپ کے علم و فضل کا بیان کرنا ایسا ہے کہ کوئی کتاب کی تعریف اور لٹک کی

مدح بلندی کے ساتھ کرے۔ زبان کو کیا طاقت کہ ایک حرف حضرت کی صفات سے لکھ سکے اور نام کی کیا مجال کہ آپ کی مدائح سے ایک ذرہ لکھ سکے۔ کسب فیض باطن سوائے والد ماجد کے اور بزرگوں کی خدمت سے بھی اتفاق ہوا ہے۔ ہر با ثقات کی زبان سے سنا گیا کہ جس امر میں کچھ فرمایا ویسا ہی ہے کم و کاست ظہور میں آیا، باوجود اس کے کہ بسبب کثرت اخلاقی کے کسی کے حق میں کچھ ارشاد نہ کرنے اور کسی کو نہ فرمانے کہ ادھر بیٹھ یا ادھر لیکن من جانب اللہ لوگوں کے دل میں آپ کا ایسا رعب چھایا ہوا تھا کہ رومائے شہر جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے، بسبب ادب کے دور دور خاموش بیٹھتے اور بدون آپ کی تحریک کے مجال سخن نہ پاتے اور ایک دو بات سوا بارا نہ دیکھتے کہ کچھ اور کلام کریں۔“ غرض شاہ عبدالقادر پڑے ہاتھ کے بزرگ اور بڑے ہی متبحر عالم تھے۔ ان کا فیض اُس زمانے میں عام تھا۔ باقاعدگی سے درس دیتے تھے۔ وعظ کا سلسلہ بھی جاری کر رکھا تھا۔ ان میں اچھے اچھے لوگ شرکت کرتے تھے۔ مومن نے بھی ان سے استفادہ کیا۔ چین کی معمولی تعلیم کے بعد جب ذرا ہوش سنبھالا تو والد نے شاہ عبدالقادر صاحب کی خدمت میں پہنچایا، ان سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھنے رہے۔ حافظے کا یہ حال تھا کہ چو کچھ شاہ صاحب سے سنتے تھے فوراً یاد کر لیتے تھے۔“ غرض شاہ عبدالقادر کا فیض عام تھا۔ انہوں نے اُس زمانے میں دین کے اصولوں کو عام کرنے اور ان کی روشنی میں صحیح زندگی بسر کرنے کی فضا قائم کی۔ ۱۰۴۴ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ شاہ عبدالقادر کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالغنی تھے۔ اگرچہ وہ اپنے بڑے بھائیوں کی طرح مشہور و معروف نہیں لیکن جس دینی اور اصلاحی تحریک کی دافع بیل شاہ ولی اللہ نے ڈالی تھی اور جس کو ان کے بڑے بھائیوں نے زندہ رکھا تھا، اُس میں ان کا بھی خاصا حصہ ہے۔ شاہ اسماعیل شہید انہیں کے بیٹے تھے جنہوں نے اسلامی علوم کو عوام میں پھیلایا، اور پھر مولانا سید احمد بریلوی کے ساتھ جام شہادت پی کر اپنے آپ کو ایک جت بڑا عالم باعمل ثابت کر دکھایا۔

یہ تحریک اپنے شباب پر اس وقت پہنچی ، جب اس زمانے کے سب سے بڑے عالم یا عمل مولانا سید احمد بریلوی جہاد کے خیال سے میدان میں آئے اور جنہوں نے مسلمانوں کو منظم کرنے اور کفار کے مقابلے میں صف آرا ہونے کی تحریک شروع کی کہ ان کے خیال میں اسی طرح اسلام کا بول بالا ہو سکتا تھا اور مسلمان اس قدر مذلت سے باہر نکل سکتے تھے جس میں وہ تقریباً ایک صدی سے بڑے ہوئے تھے ۔ مولانا سید احمد بریلوی نے شاہ عبدالعزیز کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا تھا اور شاہ عبدالقادر سے بھی انہیں نسبت خاص رہی تھی ۔ یہی سبب ہے کہ شاہ ولی اللہ کی تحریک کا ان پر گہرا اثر نظر آتا ہے ۔ برچند کہ انہوں نے مصلح یا مجدد ہونے کا کوئی بلند بانگ دعویٰ نہ کیا تھا لیکن تجدید اصلاح کا پورا سامان سپا کر دیا تھا ۔ قوم کی اخلاقی اور روحانی قباحتوں کو انہوں نے اپنی تصانیف میں بے نقاب کیا ۔ ملک میں قرآن فہمی اور درس حدیث کے چشمے لگا دیے جن کی وجہ سے غیر اسلامی عناصر آسانی سے نمایاں ہونے لگے ۔ اس سے بڑھ کر وہ ایک ایسی جماعت کی بنیاد ڈال گئے تھے جو ان کی اصلاحی تجاویز کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکتی تھی ۔ حضرت امام الہند کے جانشین شاہ عبدالعزیز نے اس کام کو جاری رکھا ۔ لیکن ان کی اصلاحی کوششوں میں ان کی طبیعتی مبالغہ روی نمایاں تھی ۔ اور مرض اس قدر عام اور پرانا ہو گیا تھا کہ اس کے ازالے کے لیے معمولی عرق سونف اور نمک سلجانی کافی نہ تھے بلکہ کسی بہت تیز اور کڑوی دوا کی ضرورت تھی ۔ یہ معالجہ شاہ صاحب کے خلیفہ مولانا سید احمد بریلوی اور ان کے رفقاء کا کرنے تجویز کیا ۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مولانا سید احمد بریلوی نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور مسلمانوں کی اس ذہنی اور اصلاحی تحریک کو معراج کمال تک پہنچانے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے ۔

مولانا سید احمد بریلوی یکم محرم ۱۲۰۱ھ یعنی ۲۴ اکتوبر ۱۸۸۶ء کو ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے ۔ ابتدا میں انہیں علم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ مکتب میں داخل ہوئے لیکن بڑھتے لکھنے میں جی نہ لگا ۔ جب سن شعور کو پہنچے تو لکھنؤ گئے ۔ وہاں کسی

امیر کی ملازمت کر لی۔ اس زمانے میں شاہ عبدالعزیز کے درس و تدریس کا شہرہ تھا۔ مولانا سید احمد بریلوی کے دل میں ان سے ملنے اور ایضاً حاصل کرنے کی خواہش بیدار ہوئی۔ چنانچہ وہ اسی مقصد سے دلی روانہ ہوئے۔ دلی پہنچے۔ شاہ عبدالعزیز نے انہیں اپنے بھائی شاہ عبدالقادر کے پاس بھیجا جو ان دنوں اکبر آبادی مسجد میں مقیم تھے۔ شاہ صاحب سے انہوں نے مختلف علوم پڑھے۔ قرآن کا مطالعہ بھی کیا۔ بالیس سال کی عمر میں وہ شاہ عبدالعزیز کے مرید ہوئے اور تقشیدیہ سلسلے میں ان سے بیعت کی لیکن زیادہ عرصے تک دلی میں نہ ٹھہر سکے۔ انہیں بعض مجبوریوں کی بنا پر رائے بریلی واپس جانا پڑا۔ وہاں کچھ عرصے قیام کرنے کے بعد وہ نواب امیر خان فرمائروائے ٹونک کے پاس چلے گئے اور فوج میں ملازمت کر لی۔ چھ ست سال وہاں رہے اور انہیں سپہ گری کے فن کو سیکھنے کا موقع ملا۔ جہاد کا شوق انہیں ہمیشہ سے تھا۔ یہاں اس شوق کو عملی جامہ پہنانے کے مواقع زیادہ فراہم ہوئے چنانچہ ست سال تک وہ یہاں جہاد کی ترغیب دیتے رہے۔ لیکن فوج میں ان کی حیثیت محض ایک سپاہی ہی کی نہیں تھی وہ متعدد لڑائیوں میں الیک دستے کے امیر اور نواب کے مشیر خاص کی حیثیت سے بھی شریک رہے۔ لیکن جب وہاں کی فضا سازگار نہ رہی تو انہوں نے دلی کا رخ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ نواب کی مدد سے ہندوستان میں حقیقی جہاد کے لیے زمین ہموار ہو سکے گی۔ لیکن جب نواب نے انگریزوں سے صلح کر لی تو یہ توقع ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی چنانچہ دلی واپس آ کر انہوں نے علیحدہ جہاد کی اس جد و جہد کو جاری رکھا۔ اس زمانے میں شاہ عبدالعزیز کے داماد مولانا عبدالغنی اور ان کے بھتیجے شاہ اسماعیل شہید نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس سے مولانا سید احمد کو بڑا سہارا ملا۔ انہیں ساتھ لے کر وہ دورے پر نکلے اور شمالی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کی۔ ان کے مواعظ سے بہت اصلاح و انقلاب ہوا۔ اس الیک سفر نے وہ کام کیا جو بڑے بڑے مسالغ کا تزکیہ، باطن اور بڑے بڑے علماء و مصنفین

۱۔ مسعود عالم ندوی : ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک : صفحہ

کی برسوں کی تربیت ظاہر کرتی ہے۔ ہر ہر جگہ سیکڑوں آدمی مٹی، مشورع عابد، متبع سنت اور رہائی بن گئے۔ ہزاروں فاسق و فاجر صالح اور اولیا اللہ ہو گئے۔ بیسیوں آدمی قتل کے ارادے سے آئے اور جان نثار بن گئے اور گھر بار چھوڑ کر آپ کے ساتھ ہو گئے یہاں تک کے میدان جنگ میں شہید ہوئے۔ جس نے ایک دفعہ زیارت کر لی وہ آپ کے رنگ میں رنگ گیا۔“ اسی زمانے میں شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبدالغنی نے ان کے اقوال و خیالات کو ’صراط مستقیم‘ کے نام سے یک جا کیا ہے۔ اس میں مختلف دینی معاملات پر خیالات کا اظہار ہے اور ان سے مولانا سید احمد بریلوی کی طبیعت کے اصلاحی بلکہ انقلابی میلان پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب میں سکھوں نے قیامت برپا کر رکھی تھی اور مسلمانوں پر عرصہٴ حیات تنگ کر دیا تھا۔ اس کی خبریں دلی تک پہنچتی تھیں۔ مولانا سید احمد بریلوی کو بھی اس کا علم ہوا۔ واقعہ ہوں یہاں کیا جانا ہے کہ جب مولانا وعظ کے لیے رام پور گئے تو وہاں بعض افغانوں نے اپنی روداد سنائی کہ جس طرح وہ پنجاب کے ایک علاقے میں ایک کنوئیں پر پانی پینے گئے۔ وہاں کچھ عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ انہیں پنجابی زبان نہیں آتی تھی۔ اس لیے انہوں نے اشارے سے پانی ہلانے کو کہا۔ تب ان عورتوں نے ادھر ادھر دیکھ کر پشتو زبان میں کہا کہ وہ مسلمان افغانوں کی بیٹیاں ہیں۔ سکھ انہیں یہاں زبردستی پکڑ کر لائے ہیں اور سکھ ہٹا کر جبراً یہاں رہنے پر مجبور کیا ہے۔ یہ سن کر مولانا کو بہت بڑا صدمہ ہوا اور انہوں نے یہ عہد کیا کہ وہ عنقریب سکھوں سے جہاد کریں گے۔“ اگرچہ فوراً یہ خیال عملی جامہ نہ پہن سکا۔ کیونکہ اس واقعے کے بعد وہ مکہ معظمہ چلے گئے۔ واپسی پر انہوں نے جہاد کی تحریک باقاعدہ طور پر شروع کی۔ سارے ہندوستان میں یہ تحریک اس طرح پھیلی جیسے جنگل میں آگ لگ جاتی ہے۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو سکھوں کے کے پنجوں سے نجات دلانا تھا۔ وہ ۱۸۴۷ء میں جہاد کے لیے روانہ ہوئے۔ چلے کابل گئے اور پھر کابل سے پشاور آئے۔ نوشہرہ اور اکوڑہ کے مقام پر

۱۔ سید ابوالحسن ندوی : سیرت سید احمد شہید : صفحہ ۸۵

۲۔ مولوی محمد جعفر : سوانح احمدی : صفحہ ۶۰

کئی لڑائیاں ہوئیں جن میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی۔ لیکن اس کے بعد مسلمانوں کے مقام پر جو لڑائی ہوئی اس میں مسلمان ناکام رہے۔ اس کا سبب موسم کی خرابی، سکھوں کی منظم فوجی طاقت اور بعض مسلمان سرداروں کی غداری تھی۔ اس کے بعد بھی کئی لڑائیاں ہوئیں۔ بالا کوٹ کی لڑائی آخری تھی۔ اس میں ان کا لشکر ایک ساتھی کی غداری سے محصور ہو گیا۔ اس معرکے میں چلے شاہ اسماعیل شہید ہوئے اور بالآخر ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۳۶ھ یعنی ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو مولانا کو بھی جام شہادت پینا پڑا۔ اس کی اصل وجہ افغان سرداروں کی غداری تھی جو بول-سید: ”ہندو زور اور نہایت طامع ہیں۔ سکھوں کے اموا سے آپ سے منحرف ہو گئے اور عین معرکہ جنگ میں آپ سے دغا کی از بسکہ مستی اللہی میں دولت شہادت آپ کے نصیب میں تھی“۔

ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید کے نام ہمیشہ سنبھلے حروف میں لکھے جاتے گئے۔ یہ دونوں عالم با عمل تھے اور انھوں نے انیسویں صدی کے مسلمانوں میں اپنے افکار و خیالات سے زندگی اور جولانی کی لہر دوڑائی۔ انھیں خواب غفلت سے بیدار کیا، دین کے اسرار و رموز ان پر روشن کئے حق و صداقت کی اہمیت واضح کی۔ اخوت اور آزادی کا تصور عام کیا اور اس کے لیے جان کی بازی لگا دینے کی اسٹک اور آرزو دلوں میں بیدار کی۔ حوصلوں کے چراغ جلانے اور ولولوں کی شمعیں فروزاں کیں اور اس طرح اس زمانے کے مسلمانوں کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید دونوں اس کام میں پیش پیش رہے اور شاہ ولی اللہ کی تحریک کو عمل سے ہم کنار کرنے کا سہرا انھیں دونوں کے سر ہے۔ یہ دونوں شاہ صاحب کی تحریک کے سلسلے کی بنیادی کڑی ہیں۔ ان کے افکار و خیالات میں شاہ ولی اللہ کی آواز صاف سنائی دیتی ہے [بقول مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی: شاہ صاحب (شاہ ولی اللہ صاحب) کی وفات پر پوری نصف صدی بھی نہ گزری تھی جو شاہ صاحب نگاہوں کے سامنے روشن کر کے رکھ گئے تھے] سید صاحب (مولانا سید احمد بریلوی) کے خطوط اور مکتوبات اور شاہ شہید کی ”منصب امامت“، ”طبقات“، ”تقویت الایمان“

اور دوسری تحریریں دیکھیں ۔ دونوں جگہ وہی شاہ صاحب کی زبان بولتی ہوئی نظر آئے گی ۔ شاہ صاحب نے عملاً جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ حدیث اور قرآن کی تعلیم اور اپنی شخصیت کی تاثیر سے صحیح الخیال اور صالح لوگوں کی ایک کثرت تعداد پیدا کر دی اور پھر ان کے بعد چاروں صاحب زادوں نے ، خصوصاً شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس حلقے کو بہت زیادہ وسیع کر دیا یہاں تک کہ ہزارہا ایسے آدمی ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے جن کے اندر شاہ صاحب کے خیالات نفوذ کئے ہوئے تھے جن کے ذہنوں میں اسلام کی صحیح تصویر اتر چکی تھی ۔ اور اپنے علم و فضل اور اپنی عمدہ سیرت کی وجہ سے عام لوگوں میں شاہ صاحب اور ان کے حلقے کا اثر قائم ہونے کا ذریعہ بن گئے تھے ۔ اس چیز نے اس تحریک کے لیے گویا زمین ہموار کر دی جو بالآخر شاہ صاحب ہی کے حلقے ، بلکہ یوں کہہیں کہ ان کے گھر سے اٹھنے والی تھی ۔ سید صاحب بریلوی اور شاہ صاحب شہید دونوں روحاً و معنأً ایک وجود رکھتے تھے اور اس وجود متحد کو مستقل بالذات مجدد نہیں سمجھتا ، بلکہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تجدید کا تشہہ سمجھتا ہوں " ۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید کی اسی تحریک کا سلسلہ تھی جس کی داغ بیل شاہ ولی اللہ نے ڈالی تھی اور جسے شاہ عبدالعزیز ، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے پروان چڑھایا تھا ۔

یہ بہ یک وقت ایک ذہنی اور عملی تحریک تھی ، جس نے مذہب ، دین ، سیاست ، معاشرت اور ثقافت سب ہی کو متاثر کیا ۔ وہ مسلمان جو اورنگ زیب عالمگیر کے وقت سے انحطاط و زوال کی اندھیاریوں میں بیٹھک رہے تھے ، انہیں اس تحریک نے روشنی عطا کی ۔ دین اور مذہب کا صحیح احساس ان کے یہاں پیدا ہوا اور انہوں نے اسے ایک نظام عمل کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کی ۔ مذہب کے جو غلط تصورات عام ہو گئے تھے ان کا خاتمہ ہوا ، بدعتوں کی بیخ کنی ہوئی اور راہ حق میں جان دے دینے کے خیالات عام ہوئے ۔ سیاسی زندگی میں آزادی حاصل کرنے اور جبر و استبداد کے مقابلے میں صرف آرا ہونے کا خیال اس نے بہلایا ۔ معاشرتی

زندگی میں صحیح معیار اس نے قائم کیے۔ معاشرتی زندگی کے نظام انتشار کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کی طرف توجہ دلائی اور ثقافت کو ارتقاء کی راہ پر کامزن کرنے کی ایک نیا قائم کی۔ غرض یہ تحریک ایک وسیع اور ہمہ گیر تحریک تھی، جس میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مسلمانوں کو ایک نئی زندگی سے آشنا کر کے ان کی کلیا ہلٹ دی۔ یہی سبب ہے کہ اس کا اثر اس زمانے کے ہر شعبے میں اپنی جھلک دکھاتا ہے۔



اس تحریک کے اثرات سب سے زیادہ اُس زمانے کی تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی زندگی پر نظر آتے ہیں۔ یہ محفل اس سے قبل ایک زمانے سے ہونی پڑی تھی۔ اس تحریک کے اثر سے اُس میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی اور صدیوں کے بعد اب یہ محفل اُس سر نو جم گئی۔ ہرچند کہ اُس محفل میں وہ عہد اکبری اور عہد شاہجہانی جیسی بات تو نہیں رہی تھی لیکن جہاں تک تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا تعلق ہے، اُس میں اُس زمانے کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی ایک جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ بقول حالی "تیرہویں صدی ہجری میں جب کہ مسلمانوں کا تنزل درجہ" غایت کو پہنچ چکا تھا اور اُن کی دولت، عزت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے، حسن اتفاق سے دارالخلافت دہلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہو گئے جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد دلاتی تھیں"۔ انقطاع و زوال کے باوجود ان محفلوں کا جتنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اب اُس زمانے کی تہذیبی زندگی نئی ذہنی تحریکوں کے زیر اثر ایک نئی زندگی سے آشنا ہو رہی تھی اور اس سے قبل انتشار اور پراگندگی کے جو بادل تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے افق پر چھائے ہوئے تھے، وہ اب چھٹنا شروع ہو گئے تھے اور تہذیب کا آئینہ ایک دفعہ پھر زندگی کے افق پر طلوع ہونے لگا تھا۔

مغلوں کی سیاسی طاقت تو یقیناً اس زمانے میں ختم ہو چکی تھی لیکن بعض طاقتوں کی دخل در اندازی کے باعث، ایک زمانے کے انتشار اور

برائے زندگی کے بعد اب زندگی کسی حد تک سکون اور اطمینان سے آشنا ضرور ہو گئی تھی۔ انگریزوں کے دلی میں داخل ہونے سے قبل تو مرہٹوں اور جائلوں نے وہ ہتکڑے برپا کیے تھے کہ لوگوں کا زندہ رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے ان حالات میں تہذیبی معاملات کی طرف توجہ ممکن نہیں تھی۔ اگرچہ دلی میں انگریزوں کے داخل ہونے اور برسر اقتدار آ جانے کو لوگوں نے اچھا نہیں سمجھا تھا، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس کے بعد حالات کسی حد تک معمول پر ضرور آ گئے اور لوگوں کو ایک جگہ جم کر بیٹھنے، غور کرنے، سوچنے، اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے، کچھ لکھنے پڑھنے اور علمی کام کرنے کے مواقع ضرور ملے۔ اس ماحول میں وہ ذہنی اور فکری تحریکیں جن کی نوعیت نیم سیاسی اور نیم مذہبی تھی فروغ پاتی رہیں۔ اس تحریک کے علم برداروں نے اس زمانے کی مذہبی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی پر گہرے نقوش چھوڑے۔ ان میں سے بیشتر نہ صرف مذہبی علوم کے عالم تھے بلکہ سیاست اور تاریخ، معاشرت اور عمرانیات سے بھی انہیں واقفیت تھی۔ انہیں اس زمانے کی زندگی کے نشیب و فراز کا پوری طرح علم تھا اور انہوں نے اس کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال بھی کیا ہے۔ ان میں سے بیشتر صاحب تصنیف بھی گزرے ہیں اور مختلف موضوعات پر ان کی باقاعدہ کتابیں موجود ہیں۔ انہوں نے زبان و ادب کے لیے بھی بڑا کام کیا ہے۔ ان کے اثر سے اس زمانے کی شاعری میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی ہے اور اس نے اس وقت کی سیاسی، تہذیبی، ذہنی اور جذباتی زندگی کے ان گنت پہلوؤں کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ پھر اس زمانے میں انگریزوں کے اثر سے ایک نئی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا آغاز بھی ہوا ہے جس میں مشرق و مغرب کی تہذیبی روایات نے آپس میں مل کر قوس قزح کی صورت اختیار کی ہے۔

اس زمانے کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو دیکھا جائے تو سب سے پہلے ان علماء پر نظر پڑتی ہے جنہوں نے دین اور مذہب کے مختلف پہلوؤں کو مفکرانہ انداز میں پیش کیا اور اپنی تحریر و تقریر دونوں میں ایک اجتماعی شان پیدا کی۔ شاہ ولی اللہ سے لے کر مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید تک اس کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ ان علماء دین کے کارناموں پر سرسید نے ’تذکرہ اہل دہلی‘ میں روشنی ڈالی ہے۔ اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ

اس زمانے میں کہسے بڑے بڑے عالم دلی کی سرزمین پر موجود تھے اور انہوں نے دینی معاملات و مسائل کو سمجھنے سمجھانے میں کیسا اجتہاد پیدا کیا تھا۔ اس تذکرے میں مولوی رشید الدین خان، مولانا محمد اسحق، مولوی محمد یعقوب، مولانا قطب الدین خان، مولوی عبدالخالق، مولوی فقیر حسین، مولوی محبوب علی، مولوی نصیر الدین، مولوی کریم اللہ، مولانا فضل امام، مولانا فضل حق، مولوی نور الحسن، مولوی کرامت علی، مولوی مملوک العی، مفتی سید رحمت علی، اخون شیر محمد، مولوی امام علی، مولوی امان علی، مولوی محمد جان، مولوی نواز علی، مولوی رستم علی، مولوی حاجی محمد اور ملا سرفراز کے حالات بیان کئے ہیں اور ان کے علمی اور دینی کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ ان علمائے دین میں نظریاتی اختلافات بھی تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے خیالات و افکار کو اپنے مخصوص حدود میں رہ کر پیش کیا ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کی انفرادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ان سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کے کارناموں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ مجموعی طور پر یہ سب کے سب اس زمانے کو علم و عمل کی ایک فضا سے آشنا کرتے ہیں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ انہوں نے دینی معاملات و مسائل پر غور و فکر کیا ہے اور مفکرانہ انداز میں اپنے خیالات عوام تک پہنچائے ہیں جن کی بدولت صریح دینی فضا قائم ہوئی ہے۔

شاہ ولی اللہ کے بعد ان کی دینی خدمت کو اس زمانے میں ان کے صاحب زادے شاہ عبدالعزیز نے جاری رکھا۔ وہ چودہ پندرہ برس کی عمر میں اپنے والد ماجد اشرف الاماجد علامہ حیات آگاہ شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی خدمت میں تحصیل علوم نقلی و عقلی اور تکمیل کمالات باطنی سے فارغ ہوئے۔ اس کے چند مدت بعد حضرت شاہ موصوف نے وفات پائی اور آپ کی ذات فائض البرکات سے مسند خلافت نے زینت و بجا اور ومداد ارشاد و ہدایہ نے روشنی بے منتہا حاصل کی۔ تمام علوم و نبوغ کو انہیں حضرت کی خدمت میں کسب کیا۔ علم حدیث و تفسیر بعد آپ کے تمام ہندوستان سے مفقود ہو گیا۔ علمائے ہندوستان کے خواجہ جیس اسی سرگروہ علماء کے حرم کمال کے ہیں اور جمیع کمال اس دیار کے چاشنی گرفتہ اسی زہد ابواب حقیقت کے مائدہ فضل و انضال کے "۔ ان کے حائو

شاہ رفیع الدین بھی اس کام میں پیش پیش نظر آتے ہیں اور اس زمانے میں دینی معاملات پر انہوں نے بھی غور و فکر سے کام لیا اور اپنے خیالات و نظریات درس و تدریس کے ذریعے سے عام کیے۔ "چونکہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب مرحوم بسبب کبرسنی اور ضعف مزاج و کثرت امراض کے دماغ تعلیم و تدریس طلباء نہ رکھتے تھے۔ سلسلہ تدریس کا حضرت کی ذات یا برکات سے جاری تھا۔ فضلاء نامی ہر دیار کے ارباب کمال سے منشور یکتائی حاصل کرچکے تھے۔ جب آپ کی خدمت میں پہنچتے اپنے تئیں طفل امجد خوان اور مبتدی محض سمجھ کر ابتدا سے انتہا تک بھر تحصیل پر کمر باندھتے۔ اسی واسطے دیار ہندوستان کے جمیع فضلاء نامی انہیں حضرت فیض موہبت کے مستفیضوں میں سے ہیں۔ ہر فن کے ساتھ ایسی مناسبت تھی کہ ایک وقت میں فنون متباہدہ اور علوم مختلفہ درس فرماتے تھے۔ جب ایک کی تعلیم سے دوسرے کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوتے، حضار خدمت کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسی فن میں جامہ یکتائی ان کے قامت استعداد پر قطع ہوا ہے۔" کم و بیش یہی حال شاہ رفیع الدین کے بھائی شاہ عبدالقادر کا تھا۔ وہ اپنے زمانے کے محقق مسائل دین، موسس معنی شرح متین، ہادی، شریعت اور ہر طریقت سمجھے جاتے تھے، آپ کے علم و فضل کا بیان کرنا ایسا ہے کہ کوئی کتاب کی تعریف ترویج اور فلک کی مدح ہندی کے ساتھ کرے۔ صاحب کشف تھے اور ایسا مکاشف صحیح کم کسی اہل سے اتفاق ہوا ہے۔" گوشہ نشینی ان کے مزاج میں داخل تھی۔ اکبر آبادی مسجد میں سناری زندگی گزاری۔ درس و تدریس اور وعظ کے ذریعے سے دین کے نکات کو عوام تک پہنچانا ان کی زندگی کا بنیادی مقصد تھا۔ اس زمانے کے بڑے بڑے لوگوں نے ان کے سامنے فخر کے ساتھ زانوئے ادب تہ کیا۔ علاہ میں مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید اور شعراء میں مومن خاں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ مولانا سید احمد بریلوی تو اس زمانے کے ایسے زبردست عالم یا عمل تھے کہ علم و عمل میں ان کی مثال نہیں مل سکتی۔ اوائل حال میں شوق طالب علمی وطن سے وارد

۱۔ سر سید احمد خاں : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۷۲

۲۔ ایضاً : صفحہ ۷۵

شاہجہاں آباد ہو کر حضرت ہا برکت مولانا عبدالقادر علیہ الرحمۃ کی خدمت سراسر افتاد میں حاضر ہو کر مسجد اکبر آبادی میں فروکش ہوئے اور صرف و نحو میں فی الجملہ سواد حاصل کیا۔ از بسکہ ذوق درویشی اور مسکینی طینت میں بڑی ہوتی تھی۔ اکثر خدمت اور اس مقام کے واردوں، خصوصاً درویشان پاک طینت جو دور دراز سے تحصیل علم باطنی کے شوق میں جناب عبدالقادر صاحب موصوف کی خدمت میں حاضر رہتے۔ خاطر داری اور سر انجام مہام میں ایسے بہ دل سرگرم ہوتے، گویا اس امر کو اہم مہام سمجھتے ہوئے تھے اور اس زمانے میں بھی اپنی اوقات کو طاعات و عبادات میں ایسا مصروف کیا تھا کہ جو لوگ صرف اس امر کے واسطے کتنج نشین اور گوشہ نشین تھے، ان سے بھی اس طرح مجموع اور حضور قلب سے ظہور میں نہ آتے تھے۔ اکثر مولانا نے مغفور رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اس بزرگ کے احوال سے آثار کمال ظاہر ہوتے ہیں اور مادہ اس سعادت منشی کا ترقی مدارج علیا کے قابل نظر آتا ہے۔“ ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ وہ تحریک جہاد ہے جس نے ہندوستانی مسلمانوں کے جسد مرہمہ میں جان ڈال دی۔ ہر طرف اسلام کے نام پر جان دے دینے کے خیالات عام ہونے لگے۔ ”تیرھویں صدی میں جب ایک طرف مسلمانوں کی سیاسی طاقت فنا ہو رہی تھی اور دوسری طرف ان میں شرکانہ رسوم اور بدعات کا زور تھا مولانا اسماعیل شہید اور حضرت سید احمد بریلوی کی مجاہدانہ کوششوں نے تجدید دین کی نئی تحریک شروع کی۔ وہ وقت تھا جب سارے پنجاب پر سکھوں کا اور باقی ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ ان دونوں بزرگوں نے اپنی بلند ہمتی سے اسلام کا علم اٹھایا اور مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی جس کی آواز ہالیہ کی چوٹیوں اور نیال کی ترائیوں سے لے کر خلیج بنکال کے کناروں تک یکساں پھیل گئی اور لوگ جوق جوق اس علم کے لیجے جمع ہونے لگے۔ سید صاحب کے خلفاء ہر صوبہ اور ولایت میں پہنچ چکے تھے اور اپنے دائرہ میں تجدید، اصلاح اور تنظیم کا کام انجام دے رہے تھے۔ شرکانہ رسوم مٹائے جا رہے تھے، بدعتیں چھوڑی جا رہی تھیں۔ نام کے مسلمان کام کے مسلمان بن رہے تھے، جو مسلمان نہ تھے وہ

نہی اسلام کا کلمہ بڑھ رہے تھے۔ شراب کی بوتلیں توڑی جا رہی تھیں۔ تازی اور سندھی کے خم لٹھائے جا رہے تھے۔ بازاری فواحش کے بازار سرد ہو رہے تھے اور حق و صداقت کی بلندی کے لیے علماء حجروں سے، امراء ابوانوں سے نکل نکل کر میدان میں آ رہے تھے اور ہر قسم کی ناچاری، مفلسی اور غربت کے باوجود تمام ملک میں اس تحریک کے سپاہی پھیلے تھے اور عباد تبلیغ اور دعوت میں لگے تھے^۱۔ مولانا اسماعیل شہید کا بھی اس تحریک میں بڑا ہاتھ تھا اور وہ بھی اس تحریک کے بہت بڑے علم بردار تھے۔ انہیں مولانا سید احمد کے دست راست ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اگرچہ وہ ان کے مرید تھے۔ لیکن دینی علوم میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ وہ وعظ کہنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اور دینی معاملات ایسی قابلیت سے ذہن نشین کراتے تھے کہ ہر بات آئینے کی طرح روشن ہو جاتی تھی۔ معقولات اور منقولات دونوں میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ دہلی میں ان کے وعظ کا اثر یہ ہوا کہ جامع شاہجہانی سے لے کر فسطح و معصیت کے مرکزوں تک خدا کا پیغام پہنچایا۔ شریعت کے احکام سنائے۔ اپنی مخصوص اور شہرۂ آفاق جرأت و شجاعت سے شرک و بدعت کا رد کیا، توحید و سنت کی منادی کی۔ چند ہی دنوں میں لال قلعے سے لے کر جھولڑیوں تک زبانوں پر آپ کا نام تھا۔ گھر گھر آپ کے مواعظ اور نئے عقائد کا چرچا تھا۔^۲ سرسید نے انہیں شاہ کشور شریعت گسٹری، ملک الملوک دیار دین پروری، قاصد بتان شرک و طغیان حاد سوچات علم و اہقان، موسس اساس کمال، سبذ اوضاع حال و قال، سالک مسالک ہدایت و ارشاد، بھلی آئینہ صافی اعتقاد، دائرۃ علوم، منطقہ آہان فہوم، مراتبی مدارج درجات عالی، پیشوائے ادانی و اعلیٰ، مرجع و مآب فضائل، کلم روئے طبائع فاضل، رموز فہم سوانر تفسیر قرآنی، دقیقہ یاب معالم تقدیرات ربانی کہا ہے، جامع کبالات صوری و معنوی، نکتہ سنج کلام الہی و حدیث نبوی، قدوۃ اہالی پیش گاہ قبول، جلال غوامض معقول و منقول، بانی مبنی فضل و انضال، مجدد قواعد تکمیل و اکمال، جاہد حق و یقین، مثبت دلائل دین کہا ہے اور

۱۔ سید ابوالحسن علی ندوی: سیرت سید احمد شہید: صفحہ ۱۳، ۱۵

۲۔ ایضاً: صفحہ ۳۸۳

اس میں شبہ نہیں کہ ان کی شخصیت ان تمام خصوصیات کی حامل تھی۔ کم و بیش یہی حال مولانا عبدالحی، مولانا محمد اسحق، مولانا محمد یعقوب وغیرہ کا تھا۔ یہ سب کے سب اپنے زمانے کے بڑے علمائے دین میں شمار ہوتے تھے اور علمی اعتبار سے ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔

ان کے علاوہ اس زمانے میں بعض ایسے عالم بھی تھے جو پوری طرح ان علماء کے ساتھ نہیں تھے اور جنہوں نے ان کی نظریاتی مخالفت بھی کی ہے لیکن علمی اعتبار سے ان کا پایہ بھی بہت بلند ہے۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں نام مولانا فضل حق شہر آبادی کا ہے۔ اس زمانے کی دلی میں وہ بھی موجود تھے اور اس وقت کے علمی مباحث میں بڑی گرم جوشی سے حصہ لیتے تھے۔ غالب کو ان سے بڑی عنیدت تھی۔ چنانچہ انہیں کی تحریک پر غالب نے اپنے اردو کلام میں بے دو ٹوٹ کے قریب نکال ڈالا۔ سرسید نے ان کو مستجمع کلمات صوری و معنوی، جامع فضائل ظاہری و باطنی کہا ہے اور لکھا ہے کہ ”جمع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا انہیں کی فکر عالی نے بنا ڈالی ہے۔ علمائے عصر بل فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سرگروہ اہل کمال کے حضور میں بساط مناظرہ آراستہ کر سکیں۔ ہاربا دیکھا کہ جو لوگ آپ کو پگاندہ فن سمجھتے تھے، جب ان کی زبان سے ایک حرف سنا دعویٰ کمال کو فراموش کر کے نسبت شاگردی کو اپنا فخر سمجھے۔ ہاں ہمہ کلمات علم و ادب میں ایسا علم سرفرازی بلند کیا ہے کہ فصاحت کے واسطے ان کی عبارت شستہ محضر عروج معارج ہے اور بلاغت کے واسطے ان کی طبع رسا دست آویز بلندی مدارج ہے۔“ غرض میں ان پر مقدمہ چلایا گیا اور کالے ہاتھ کی سزا ہوئی، وہیں انہوں نے ۱۸۶۱ء میں انتقال کیا۔ مولانا فضل حق کے مشہور شاگرد مولانا نور الحسن تھے۔ ان کا شمار بھی اس زمانے کے عالموں میں ہوتا تھا۔ ان کے مزاج میں خلق ایسا تھا کہ ہندوکان الہی کی دل شکنی آپ کے اعتقاد میں خانہ خدا کی بنیاد گرانے سے کم جرم نہیں اور علم ایسا کہ اس کو ایک جگہ فراہم لا کر فرق نہم ہر رکھ دیں تو یہ سب گرائی بار کے

۱۔ حالی : یادگار غالب : صفحہ ۱۰۲۔

۲۔ سرسید احمد خان : تذکرۃ اہل دہلی : صفحہ ۸۷۔

طبقات کرات کو اس طرح توڑنا ہوا ہستی کو مائل ہو اور محیط کے دوسری طرف سے گزر جائے کہ اوج سے حقیقت تک نگاہ کو ایک جادہ مستقیم محسوس ہو اور وقار اس درجہ میں کہ فلک دیوار کی ہزار گردشیں ان کی تکبیر کی ایک نشست میں سر مو تفاوت پیدا نہیں کر سکتیں۔“ اسی طرح مولانا فضل امام خیر آبادی کی بھی سرسید نے بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ علوم عقلم میں ان کی طبع دقاق سے اعتبار تھا اور علوم ادبیہ میں ان کی زبان داق سے انتخار۔“ غرض ایسے بے شمار بلند پایہ عالم اس زمانے میں موجود تھے ، جنہوں نے اپنے علم و فضل اور حسن اخلاق سے اس ماحول میں بڑی عالمانہ شان پیدا کر دی تھی ۔

یہ علما دین جو اس زمانے کی دلی میں موجود تھے ، بہت بلند مرتبے کے مالک ہیں ۔ ان کی کوششوں سے نہ صرف دین داری کی فضا قائم ہوئی بلکہ دہنی مسائل کو عالمانہ اور مفکرانہ زاویہ نظر سے دیکھنے کا ایک رجحان عام ہوا ۔ ان کے افکار و خیالات نے افراد میں ایک ذہنی تہذیب پیدا کی اور ان قدروں کا احساس و شعور ان کے یہاں عام ہوا ، جو تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی بنیاد ہوا کرنا ہے ۔ انہوں نے ایک علمی فضا بھی قائم کی جس میں غور و فکر کا صحیح سامان پیدا ہوا ۔ اور ان کی تدریس اور مواعظ کی بدولت افراد تزکیہ نفس کی طرف راغب ہوئے ، اور انہوں نے اپنے آپ کو ذہنی ، روحانی اور اخلاقی اعتبار سے زیادہ مہذب بنایا ۔ ان میں بہتر صاحب تصنیف و تالیف بھی گزرے ہیں ۔ شاہ ولی اللہ نے اس سے قبل تصنیف و تالیف کی ایک عظیم روایت قائم کی تھی ۔ اور ان کی تصانیف ’حجۃ اللہ الباقیہ‘ ’نقبات النبہ‘ ، ’الغز الکبیر‘ ، ’المعات‘ ، ’الطاف القدس‘ ، ’خبر کبیر‘ ، ’انصاف فی بیان سبب الاختلاف‘ ’الفاہ العارفین‘ وغیرہ بہت بلند مقام رکھتی ہیں ۔ اس کے بعد اگرچہ اس طرح تو تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری نہیں رہا ۔ کیونکہ ان کے جانشین درس و تدریس اور مواعظ کی طرف زیادہ متوجہ رہے ہیں۔ ان کے صاحب زادوں میں سے بعض نے اہم تصنیفی کارنامے انجام دیے ۔ یہ تصانیف ، عربی ، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں موجود ہیں ۔

۱۔ سرسید احمد خاں : تذکرۃ اہل دہلی : صفحہ ۷۷

۲۔ ایضاً : صفحہ ۸۶

شاہ عبدالعزیز کے زمانے میں شیعہ متی اختلافات زور پڑ گئے تھے۔ آپ نے ان مسائل پر عربی زبان میں کتابیں لکھیں۔ ان میں سے ’تحفۃ اثناء عشریہ‘ ایک مناظرہ کی کتاب ہے لیکن مخالفین بھی اس کی مناسبت تہذیب اور شائستگی کے مدح میں۔ اس کے علاوہ ’تفسیر عزیزی‘ میں آپ نے قرآن مجید کے پہلے سوا بارے اور آخری دو پاروں کی تفسیر فارسی میں کی ہے۔ اصول حدیث میں ’مجد‘، ’نافع‘ اور تاریخ حدیث میں ’بستان المحدثین‘ اور چند حواشی اور شرح کی کتابیں آپ سے یادگار ہیں۔ آپ کے فتووں کا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔ شاہ عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی کا زیادہ وقت درس و تدریس میں صرف ہوا لیکن آپ سے چند نظمیں اور کچھ نثر بھی یادگار ہے۔ آپ کا سب سے اہم کام کلام مجید کا تحت اللفظ اردو ترجمہ ہے جو آج تک مقبول اٹام ہے۔“ شاہ عبدالقادر صاحب کے مزاج میں ترک زیادہ تھا، اور وہ گوشہ نشین آدمی تھے۔ انہوں نے ساری زندگی اکبر آبادی مسجد میں گزار دی۔ درس و تدریس اور وعظ ان کے محبوب مشاغل تھے۔“۔ اس سبب سے تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ نہ کی لیکن قرآن شریف کا با محاورہ ترجمہ یا ’توضیح القرآن‘ (۵۰۹ ع) آپ سے یادگار ہے جس پر ہلا مخالفہ ہزاروں کتابیں نثار ہیں۔“۔ شاہ عبدالقادر کے شاگرد خاص مولانا سید احمد برہیلوی بنیادی طور پر ایک مجاہد تھے۔ ان کی زندگی جہاد کے منسوسے بنانے اور کافروں سے لڑنے میں گزر گئی۔ اس لیے تصنیف و تالیف کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کر سکے۔ البتہ ان کے دست راست مولانا عبدالحی اور شاہ اسماعیل شہید باوجود جہاد کے کاموں سے دلچسپی لینے کے تصنیف و تالیف کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ ان دونوں نے مل کر مولانا سید احمد کے اقوال و ارشادات کو جمع کیا ہے اور یہ کتاب ’صراط مستقیم‘ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب ایک منظم اور چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا اور چوتھا باب مولانا اسماعیل نے ترتیب دیا ہے اور اس میں طریق ولایت اور طریق نبوت کے اختلاف کا ذکر ہے اور چوتھے باب میں طریق سلوک راہ نبوت یعنی طریقہ ”مجدیہ“ کا

۱۔ شیخ محمد اکرام : رود کوثر : صفحہ ۳۹۰۔

۲۔ ایضاً : صفحہ ۳۹۶۔

۳۔ ایضاً : صفحہ ۳۹۶۔

یان ہے دوسرا اور تیسرا باب مولانا عبدالعزیز کا لکھا ہوا ہے جس میں ہندوستان کے مشہور سلسلہ ہائے تصوف کے اشغال و وظائف کو عام فہم زبان میں جمع کیا ہے اور بتایا ہے کہ چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ اور دوسرے طریقوں کے بزرگ اپنے مریدوں کو کس طرح نعام دیتے تھے اور صفائی قلب اور ترقی درجات کے لئے انہیں کون سے مراتب اور عمل سکھاتے تھے؟ اس کے علاوہ شاہ اسماعیل شہید نے ایک مستقل کتاب 'ثبوت الایمان' کے نام سے اردو زبان میں لکھی ہے۔ اس کتاب میں ایمان کے جزو یعنی خدا اور رسول پر بحث ہے۔ اُن کی بعض اور کتابیں بھی اہم ہیں ان میں 'ایک روزی' جسے آپ نے مسئلہ امتناع نظیر خاتم النبیین پر مولانا فضل حق خیر آبادی کے جواب میں ایک دن میں لکھا۔ 'رسالہ اصول فقہ'، 'منصب امامت'، 'طبقات'، 'ایضاح الحق الصریح الاحکام الحیت و الذریع'، 'مستوی سلک نور' اور 'تکویرا لعینین فی اثبات رفع الیدین' بھی اُن کی مشہور تصانیف ہیں۔ مولانا سید محمد بریلوی کے ساتھیوں میں مولوی کرامت علی جون پوری کی شخصیت بھی خاصی اہم ہے۔ یہ بھی صاحب تصنیف تھے اور ان کی تصانیف 'الردالبدعت'، 'دالغ الوساوس'، 'ترجمہ شہائل ترمذی'، 'ترجمہ مشکوٰۃ جلد اول'، 'مفتاح الجنّت' وغیرہ مشہور ہیں۔ ان علما نے دین کے علاوہ اس زمانے میں بعض دوسرے عالموں نے بھی تصنیف و تالیف کا کام کیا ہے۔ نواب صدر الدین خان آزدہ سے بہت سی نظم و نثر یادگار ہے۔ مولانا نواب قطب الدین خان نے اپنی منصبی مصروفیتوں کے باوجود "اکثر رسائل زبان ریختہ میں واسطی فوائد عوام کے تحریر کیے اور اس میں مسائل ضروریہ ہر طرح کے مندرج فرمائے اور حق یہ ہے کہ ان رسالوں سے خلی کو بہت فائدہ ہوا کہ ضروریات دین سے ہر شخص مطلع اور آگاہ ہو گیا۔ کتب حدیث سے 'مشکوٰۃ' کا ترجمہ زبان اردو میں بہت صاف و سستہ و فائدہ مند کیا ہے اور اکثر فوائد کتب متداولہ و غیر متداولہ سے اُس پر بڑھایا۔" مولانا فضل حق خیر آبادی بھی نظم و نثر پر پوری قدرت رکھتے تھے اور اُن

۱۔ شیخ محمد اکرام : موج کوثر : صفحہ ۱۲۔

۲۔ ایضاً : صفحہ ۳۷ - ۳۸۔

۳۔ ایضاً : صفحہ ۴۰۔

۴۔ ایضاً : صفحہ ۸۴۔

ہے یہی بہت سی تحریریں یادگار ہیں۔ غرض اس زمانے میں ان علما نے دین نے
 خاصا علمی ماحول پیدا کر دیا تھا اور اس طرح تصنیف و تالیف کی اچھی خاصی
 نضا قائم ہو گئی تھی۔ اس زمانے کی ثقافتی زندگی میں اس علمی ماحول اور
 تصنیفی فضائے ذہنی اور روحانی اعتبار سے بڑے اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔
 ان علما نے دین کے ساتھ ساتھ اس زمانے کی زندگی میں بڑے بڑے

اولیاء اللہ بھی موجود تھے اور انہوں نے بھی اس وقت کی ثقافتی زندگی پر
 گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ ان بزرگوں نے صرف ریاضت اور عبادت ہی میں
 کمال حاصل نہیں کیا ہے۔ اخوت اور انسانی محبت کے خیالات بھی عام کیے
 ہیں اور اپنے ان خیالات کو درس و تدریس، کشف و کرامات اور تصنیف و
 تالیف کے ذریعے سے عوام تک پہنچایا ہے۔ یہی سبب ہے کہ خلق خدا
 ان سے متاثر ہوئی ہے اور افراد نے ان کے اثر سے اپنے آپ کو مہذب بنایا
 ہے اور اس طرح ان کے فکر و عمل نے اس زمانے کی ثقافتی زندگی کو بہت
 متاثر کیا ہے۔ ان مشائخین اور اولیاء اللہ میں حضرت شیخ الشیوخ مولانا شاہ
 غلام علی، حضرت مولانا ابو سعید، حضرت مولانا شاہ عبدالغنی،
 شاہ محمد آفاق، حاجی علاؤ الدین احمد، مولانا فخر الدین، مولانا قطب الدین،
 حاجی غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب، خواجہ محمد نصیر ریخ، مولوی
 یوسف علی، حضرت شاہ غیاث الدین، شاہ سابر جٹلی، جناب میر ہدی صاحب
 میران شاہ مائو، شاہ جلال اور مولانا محمد حیات کے نام خاص طور پر مشہور
 ہیں۔ ان میں سے اکثر صاحب کشف و کرامات تھے۔ اکثر نے اپنے فیض
 کو عام کر رکھا تھا۔ اکثر معرفت و حقیقت کے اسرار و رموز کی درس و
 تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ ان میں بعض صاحب تصنیف و تالیف بھی
 گزرے ہیں اور بعضوں نے شعر و شاعری سے بھی دلچسپی لی ہے۔

حضرت شاہ غلام علی اس زمانے کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ ”علم اور
 عمل اور فضل و کمال اور تجرید و تجرد اور حلم و کرم اور سخاوت اتم اور
 ایثار و انکسار آپ کی ذات پر ختم تھے۔ دن رات اللہ اور اللہ کے رسول کے
 ذکر میں بسر کی اور دنیا و مافیہا کی خبر نہ رکھی۔ آپ کی ذات فیض آیات
 سے تمام جہان میں فیض پھیلا اور ملکوں ملکوں کے لوگوں نے ان
 کی بیعت اختیار کی۔ میں نے حضرت کی خانقاہ میں روم اور شام اور بغداد
 اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا کہ حاضر ہو کر بیعت کی

اور خدمات خائفہ کو سعادت ابدی سمجھا اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان ، پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ نفی دل کی طرح استثنائے تھے۔ " شاہ غلام علی خلیفہ شاہ ابو سعید تھے ۔ ان میں صفات ذاتی اور کمالات ظاہری اور باطنی ایسے تھے کہ جن کا کچھ حد و حساب نہیں ۔ حافظ کلام اللہ اور عاشق رسول اللہ اور علوم دینی آپ کو بہت مستحضر تھے اور دن رات انہیں کے درس میں گزرتے تھے ۔ علم قرأت میں پکتائے روزگار تھے ۔ کلام اللہ ایسی خوش آواز اور قرأت سے پڑھتے تھے کہ لوگ دور دور سے سنے آتے تھے۔ " ان کے بڑے بیٹے مولانا شاہ سعید احمد تھے ۔ انہیں علم حدیث و فقہ و تفسیر میں کمال حاصل تھا ۔ دن رات مشغلہ درس و تدریس جاری رہتا تھا ۔ مسائل دینی آپ کے فیض سے حل ہوتے اور فتویٰ شرع شریف آپ کی سہر سے مسجل کیے جاتے ۔ قدم بہ قدم اپنے بزرگوں کے طریقے پر چلتے اور اپنے پیروں کا طریقہ پڑھتے تھے ۔ نسب باطنی بہت مستحکم تھا۔ " کم و بیش یہی حال حضرت مولانا عبدالغنی ، شاہ محمد آفاق اور حاجی علاء الدین احمد کا تھا ۔ مولانا محمد نضر الدین بھی اس دور کے ایک اہم بزرگ تھے ۔ مقبول خدائے لایزال تھے ۔ خلق اللہ میں بھی ایسا قبول خاطر ہم پہنچایا کہ گروہا گروہ حصول نجات اور تحصیل ہدایت کے واسطے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لھے اور آپ کے ارشاد کو مانند حکم وحی کے راست اور درست جانتے تھے ۔ جتنے امراۓ ذوی الاقتدار اور سلطان عہد تھے ، آپ کی بیعت سے مشرف ہو کر آپ ہی کی خاک در کو وسیلہ ، آبرو اور آپ ہی کے غبار آستان کو تاج عزت و اعتبار سمجھتے تھے۔ کتاب "نظام العائد" اور "رسالہ مرحبہ" اور "المعز الحسن" حضرت ہی کی تالیفات میں سے ہیں۔ " خواجہ محمد نصیر رنج بھی اس عہد کے بزرگوں میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں ۔ خواجہ میر درد کے نواسے تھے ۔ آپ کو خصوصاً ریاضیات میں بہت دخل تھا ۔ علم موسیقی بہت خوب جانتے تھے اور تال اور لے سے ایسے

۱۔ سرسید احمد خاں : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۱۲ - ۱۳

۲۔ ایضاً : صفحہ ۱۸

۳۔ ایضاً : صفحہ ۱۹ - ۲۰

۴۔ ایضاً : صفحہ ۲۳ - ۲۵

واقعہ تھے کہ بڑے بڑے استاد اُن کے سامنے کان پکڑتے تھے اور خاک چاٹ کر نام لیتے تھے۔ علم حساب کو اُس سے زائد جانتے تھے اور مسائل حساب میں وہ مہارت ہم پہنچائی کہ مسائل لاینحل بہ آسانی حل فرماتے تھے۔ چنانچہ تال اور حساب میں اُن کی تصنیفات موجود ہیں۔ یہ توصفات ظاہری تھیں اور کبالات باطنی میں ان سب سے رتبہ بڑا تھا اور وہ مقام ہی اور تھا۔ یمن سے دلچسپی تھی اور ہر مہینے کی دوسری اور چوبیسویں کو مجلسی بین نوازی کی آب کے روبرو ہوا کرتی تھی۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، ریح تخلص تھا۔ "میر بھدی بھی اُس زمانے کے بزرگ تھے۔ مقبولان بارگاہ کبریائے الہی سے تھے۔ قبول خاطر خاص و عام میں بھی یہاں تک حاصل تھا کہ امراء و سلاطین آپ کے دیدار فیض انوار کو نعمت کبریٰ اور آپ کی خدمت میں حاضر رہنے کو ایک موہبت سمجھتے تھے، از اس کہ جنف باطن کی تاثیر سے ساکنین شعر کے، عموماً صادقین قللہ مبارک کے، علی الخصوص شہزادگان جلیل القدر آپ سے بہت رجوع کرتے تھے۔ غرض یہ بزرگ بے شمار خصوصیات کے مالک تھے اور انہوں نے اس زمانے کی ثقافتی زندگی میں بڑے کار ہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ انہوں نے عوام سے رشتہ استوار کیا اور اُن کی ذہنی اور روحانی تہذیب کی، امراء و رؤسا بھی اُن کے زیر اثر آئے اور اُن کی تہذیب میں بھی انہوں نے نمایاں حصہ لیا۔ انہوں نے زندگی کے اعلیٰ معیار قائم کیے۔ علم کے دریا بہائے، درس و تدریس میں مصروف رہے، تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ مختلف ذون، خاص طور پر موسیقی اور شاعری سے دلچسپی لی اور انہیں فروغ دینے کے سامان فراہم کیے۔ اس لیے اس زمانے کی ثقافتی زندگی کی بنیادوں کو استوار کرنے میں ان بزرگوں کا بڑا حصہ ہے۔

علائے دین اور مشائخین کے علاوہ اس عہد کی دلی میں دوسرے علوم و فنون کے ماہر بھی بڑی تعداد میں موجود تھے، ان میں سے ہر ایک اپنے علم اور فن پر پوری قدرت رکھتا تھا اور اس زمانے کی ثقافتی زندگی پر ان کے نقوش بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ طب کے علم اور فن کو ان لوگوں نے خاص طور پر ترقی دی اور اس کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔

حکیم احسن اللہ خاں کا نام اس سلسلے میں بہت نمایاں ہے۔ وہ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم فاضل تھے۔ مختلف علوم پر ان کی گہری نظر تھی۔ بہت قابل اور سمجھ دار سمجھے جاتے تھے۔ لوگوں کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ انہوں نے فنون حکمت و ہندسہ و ہیئت خدمت فضائلے عصر سے حاصل کر کر فن طبابت کو اپنے والد ماجد (حکیم محمد عزیز اللہ خاں) سے حاصل کیا اور از بس کہ حافظہ ہمارے لوح محفوظ تھا اور طبیعت جزو تدبیر تھی۔ چند مدت سے مدارج کمال سے کوئی باقی نہ رہا کہ طے نہ کیا ہو اور شفاۓ مرضاء داد الہی ہے جس کی زندگی سے مسیحا نے ہاتھ دھوئے ان کے نسخے سے جی کیا۔ اسی واسطے ساکنین شہر اور فاطمین دہر سوائے اس زندہ اہل کمال کے اور کسی طرف رجوع نہ کرتے۔ ان کی شہرت اور مقبولیت کی وجہ سے حضرت معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی عرض آرام گاہ نے اپنے پاس بلا کر عطاۓ خلعت اور عنایت خطاب عمدۃ الملک حافظ الزمان سے مشرف فرما کر خاص اپنے معالجے کے واسطے معین کیا اور تا دم زیست یہ سمجھے کہ اگر یہ سلالہ کرام ایک دم الگ ہو تو زندگی اس بادشاہ گردوں جاہ کی محال ہے اور ان کے انتقال کے بعد ہنگام گردوں نوامان حضرت ظل النہی فلک بارگاہی ابو ظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطانہ و افاض علی العالمین برہ و احسانہ نے کمال قدردانی و رتبہ شناسی سے اپنے سہہ جلوس میں طلب کیا اور سعادت نبض گری سے مستعد فرما کر احترام الدولہ اور ثابت جنگ خطاب سابق پر زیادہ کیا۔ اور از بس کہ حضور فیض گنجپور حضرت ظل اللہ کے مزاج اقدس میں ان کے کمالات جائے گیر ہوئے۔ روز بروز ترقی مدارج اور ارتقاۃ مناسب ظہور میں آئے لگا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ یہاں تک بادشاہ جم جاہ کی طبیعت پر تصرف ہوا کہ کوئی امر جزوی و کلی سے بے مشورہ صلاح اس صاحب تدبیر صائب کے وقوع میں نہیں آ سکتا۔ غرض حکیم احسن اللہ خاں بڑے ہائے کے عالم، طیب، حکیم اور مدبر تھے۔ ان کے علاوہ اس زمانے میں حکیم غلام نجف خاں کی بھی خاصی شہرت تھی۔ یہ حکیم احسن اللہ خاں اور حکیم شریف خاں کے شاگرد تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں سے قرابت قریبہ بھی

تھیں۔ اس لیے انہوں نے ان کی تعلیم میں انہماک کا اظہار کیا اور بہت تھوڑے عرصے میں وہ اپنے وقت کے اہم عالم اور طبیب ہو گئے۔ بہادر شاہ ظفر نے عبداللہ کا خطاب دیا۔ ایک زمانے تک طبیب کی حیثیت سے سرکارِ کمپنی کے ملازم رہے۔^۱ ”حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام حسن خاں کا شمار بھی اس زمانے کے اہم طبیبوں میں ہوتا تھا۔ حکیم غلام حیدر خاں کے بارے میں سرسید نے لکھا ہے کہ ”نمائے کامل ان کے دست حق پرست میں ودیعت ہے۔ راقم کو حضرت موصوف کی خدمت میں نسبت شاگردی حاصل ہے۔“ اور حکیم غلام حسن خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ ”کتبِ طبیب میں سہارت اور علاجِ معالجہ میں دستِ گاہ تمام رکھتے تھے۔“ ان کے علاوہ حکیم نصر اللہ خاں ، حکیم صادق علی ، حکیم امام الدین ، حکیم فتح اللہ خاں ، حکیم پیر بخش ، حکیم حسن بخش خاں ، حکیم محمد یوسف خاں وغیرہ کو بھی اس زمانے میں بڑی شہرت حاصل ہوئی تھی۔ یہ سب کے سب نہ صرف فنِ طب کے ماہر اور علاجِ معالجے میں اعلیٰ درجے کے طبیب تھے بلکہ دوسرے علوم کے ماہرین کی حیثیت سے بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ انہوں نے اپنے زمانے میں علمی ، فنی اور انسانی فضا قائم کی ، خلقِ خدا کو قائدہ پہنچایا۔ اس لیے اُس زمانے کی ثقافتی زندگی میں ان کا مرتبہ بھی بہت بلند ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اُس کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے اور نکھارنے ستارے میں انہوں نے بڑا کام کیا ہے۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُس زمانے میں اعلیٰ درجے کے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے ہیں اور انہوں نے صحیح ادبی اور شاعرانہ ماحول پیدا کیا ہے۔ اس شاعرانہ ماحول کے اثرات قلمی اور شہرِ دونوں میں نظر آتے ہیں۔ قاعدہ اُس زمانے میں تہذیب و ثقافت کا بڑا مرکز تھا۔ اور لوگ آجے دلی کی تہذیب و ثقافت کی علامت سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ جذباتی نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانے کے بادشاہوں نے باوجود اُن نامازگار حالات کے جن سے انہیں اس وقت دوچار ہونا پڑا ، حتی الامکان تہذیب اور ثقافت کی

۱۔ سرسید احمد خاں : تذکرہ اہلِ دہلی : صفحہ ۴۸۔

۲۔ ایضاً : صفحہ ۵۰۔

۳۔ ایضاً : صفحہ ۵۱۔

طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کی اور ان کی اس توجہ نے قلمیے کو ایک بہت بڑا تہذیبی اور ثقافتی مرکز بنا دیا۔ اس وقت تک اردو زبان قلمیے میں داخل ہو چکی تھی۔ اور لوگ قلمیے کی زبان کو معیاری اور مستند زبان سمجھتے تھے۔ فارسی کا اثر بھی باقی تھا لیکن اب رفتہ رفتہ اس کی جگہ اردو نے لے لی تھی اور اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے وقت میں تو سارے قلمیے میں اردو زبان ہی کو تہذیب و ثقافت کی زبان سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہ سے لے کر معمولی آدمی تک سب ہی اس کو اپنی مادری اور تہذیبی زبان سمجھتے تھے۔ اس صورت حال نے قلمیے کو تہذیب و ثقافت کا منبع اور سرچشمہ بنا دیا تھا۔ اور اس کے اثرات اس زمانے کی زندگی پر بہت گہرے تھے۔ بہادر شاہ کے زمانے میں اردو زبان و ادب کو دوبار کی سرپرستی حاصل ہوئی اور دبستان دہلی کے اردو ادب کا ایک مرکز بن گیا جس کا سب سے درخشندہ ستارہ عظیم غالب ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ غالب اس زمانے کے بہت بڑے شاعر ہیں اور انہوں نے شاعری کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی اس زمانے میں بعض اہم شاعر نظر آتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر خود شاعر تھے اور انہیں شاعروں سے دلچسپی بھی تھی۔ اس لیے انہوں نے قلمیے میں شعر و شاعری کا اچھا خاصا ماحول پیدا کر لیا تھا۔ ذوق ان کے استاد تھے اور انہیں ملک الشعراء کا منصب حاصل تھا۔ ان کی وفات کے بعد غالب کو بھی حیثیت حاصل ہوئی۔ دہلی قلمیے میں ملازم تو نہیں تھے لیکن ان کا وہاں آنا جانا ضرور تھا۔ اگرچہ انہیں ستائش کی کینا اور صلے کی پروا نہیں تھی کیونکہ بہت خود دار آدمی تھے لیکن کبھی کبھی کوئی انعام مل ضرور جاتا تھا۔ قلمیے میں باقاعدگی سے شاعرے ہوتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کو خود ان شاعروں سے دلچسپی تھی، اس لیے اس وقت کے تقریباً تمام اہم شاعروں کو ان شاعروں میں شریک کر لیتے تھے۔ غرض شاہ وقت بہادر شاہ ظفر کے دلچسپی لینے کی وجہ سے اس زمانے میں نہ صرف قلمیے میں اچھا خاصا شاعرانہ ماحول پیدا ہو گیا تھا بلکہ قلمیے سے باہر شہر میں بھی گھر گھر شعر و شاعری کے

چرخے تھے۔ غالب ، مومن ، شاہ نصیر ، ذوق ، ظفر ، آشفہ ، نیر و رخشاں ، عبس ، مہر و ج ، ظہیر ، عارف ، صہبائی وغیرہ کے اردو فارسی نغموں سے دلی کی ساری لضا گونجی ہوئی تھی۔ وہ اردو شاعری کے شباب کا زمانہ تھا بادشاہ سے لے کر ظفر تک سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے^۱۔

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ قلمیے میں ایک زمانے تک بار نہ ہانے کے باوجود ایک شاعر کی حیثیت سے غالب کی عظمت اس زمانے میں بھی تسلیم کی جاتی تھی ، اور اس عہد میں اعلیٰ درجے کے شاعرانہ ماحول کو پیدا کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ انہوں نے اردو اور فارسی دونوں میں اعلیٰ درجے کی شاعری کی ، اور وہ اپنے زمانے میں ان دونوں زبانوں کے مسلم الثبوت استاد سمجھے جاتے تھے۔ شیفہ کے خیال میں وہ ایسے نکتہ منج نفز گفتاؤں تھے کہ کم دیکھنے میں آتے ہیں^۲۔ سرسید نے انہیں موسیٰ اسس شیوہ یانی ، ہائی ہائے الفاظ و معانی ، عندلیب بہارستان سخن گستری ، طوطی شکرستان معنی پروری^۳ کہا ہے اور لکھا ہے : ”میں اپنے اعتقاد میں ان کے ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے اور ان کے ایک گل کو بہتر ایک گلزار سے جانتا ہوں اور اگر دیکھا جائے تو حق بھی یہی ہے۔ خوشا حال ان لوگوں کا جو آپ کی خدمت یا برکت سے مستفید ہوتے ہیں۔ اور جوہر گراںمایہ آپ سے حاصل کرتے ہیں۔ اس کو مفتہم جان کر بھی جزو دان حافظ اور مستفوق یاضی میں اسات رکھتے ہیں“ ، ذوق بھی اس زمانے میں مسلم الثبوت استاد سمجھے جاتے تھے اور چونکہ بادشاہ پادر شاہ ظفر کے استاد تھے ، اس لیے اس زمانے میں انہیں کچھ زیادہ ہی اہمیت دی جاتی تھی۔ شیفہ نے ان کے بارے میں لکھا ہے : ”قوت مثنیٰ کہ اور راست دیکھ کرے نہ دیدہ شد و معنیذا رطب و یابس کہ شیوہ بسیار گویاں است در کلامش کم تر و پر جمع اصناف سخن قدرت

۱۔ مرزا فرحت اللہ بیگ : دلی کا ایک یادگار مشاعرہ ، مضامین

فرحت : حصہ اول : صفحہ ۱۴۴

۲۔ شیفہ : گلشن بے خار : صفحہ ۱۳۹

۳۔ سر سید احمد خان : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۱۰۴

۴۔ ایضاً : صفحہ ۱۰۴

کام دارد۔ بالجمہ از شعرائے مسلم و مقرر است و باین پسہ کثرت فکر و
 ہجوم الشعار پنوز بہ ترتیب دیوان نہ پرداختہ صحبتی گاہ گاہ اتفاق می افتد
 از مستحبات زمان و مستحبات دوران است“۔ اس زمانے میں شاعرانہ ماحول
 میں ان کی حیثیت بھی بہت بلند تھی اور وہ بھی بہت مقبول تھے۔ بقول
 سرسید : ”دقیقہ سنجان روزگار سے گئے جا سکتے ہیں کہ جس کا کلام وحی
 نظام فخر متقدمین میں شرف متاخرین میں ہو اس کی ذات فائز البرکات
 بنی نوع میں کس قدر فضل و شرف رکھتی ہو گی“۔ ذوق کے ساتھ ساتھ
 مومن نے بھی اس زمانے کے شاعرانہ ماحول میں اضافہ کیا ہے۔ شیفتہ
 ان کے بارے میں لکھتے ہیں : ”شاعری دون مرتبہ اوست اماں چوں سخن
 درین فن است اعراض نامستحسن زبان جادو طرازش سحر را ہمرتبہ اعجاز
 رسانیدہ و سخن دلہیزرش طول را ہجابہ“ ایجاز گردانیدہ ، گوہر افشانی
 طبع نیسان بارش دامن دامن کاف جواہر دو جہب و آستین مقلسان الداخت و
 گل ریزی اندیشہ ہار نثارش جمن جمن رہاض جنت مجسم نظارگیاں جلوہ گر
 ساختہ“۔ اس زمانے کے شاعروں میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے اور ان
 کی بلندی کو سب ہی نے تسلیم کیا ہے۔ سرسید کے خیال میں : ”انہوں
 نے سخن گوئی کو بحد اعجاز پہنچایا اور شعر نے ان سے مرتبہ حکمت
 کا پایا۔ نکات سخن اور دقائق فن ان کے قلم سے اس طرح گرتے ہیں جیسے
 ابر سے باران لطافت“۔ شیفتہ بھی اس زمانے کے مشہور شاعر ہیں اور
 انہوں نے نہ صرف اعلیٰ درجے کی شاعری کی ہے ، بلکہ شاعروں کو اپنی
 شاعرانہ بصیرت سے نئی زندگی بخشی ہے۔ وہ شاعر ہی نہیں تھے ، شاعری
 کے بہت اچھے نقاد بھی تھے۔ اس لیے اس زمانے کے شاعرانہ ماحول کو
 عظمت سے ہمکنار کرنے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ صبیحی اگرچہ
 اردو کے شاعر نہیں تھے لیکن فارسی زبان پر انہیں پوری طرح عبور حاصل
 تھا۔ اور اس میں اعلیٰ درجے کی شاعری کرتے تھے۔ نیر و خشاں بھی

۱۔ شیفتہ : گلشن بے خار : صفحہ ۴۷

۲۔ سرسید احمد خاں : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۱۶۷

۳۔ شیفتہ : گلشن بے خار : صفحہ ۱۹۶

۴۔ سرسید احمد خاں : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۱۵۰

فارس کے اچھے شاعر تھے۔ عیش مجروح، عارف اور شہر نے اردو میں شاعری کی۔ اور اگرچہ ان کی شاعری میں وہ بات تو نہیں جو غالب، مومن اور ذوق کے یہاں ہے لیکن انہوں نے شاعری کی اس روایت کو باقی ضرور رکھا ہے جس کی بنیاد ان شعراء نے ڈالی تھی۔ اور پھر بہادر شاہ ظفر تھے، جنہوں نے نہ صرف اردو میں اعلیٰ درجے کی شاعری کی ہے بلکہ وہ ایک ایسا معجز تھے جس کے گرد یہ پورا شاعرانہ ماحول گھومتا تھا۔ ان کی طبیعت میں بڑی عاجزی اور انکساری تھی۔ اس لیے وہ آخر وقت تک ذوق اور پھر غالب سے اصلاح لیتے رہے لیکن اس سے ان کی قادر الکلامی پر حرف نہیں آتا۔ بلکہ یہ تو ان کی بڑائی کی دلیل ہے۔ ان کے زمانہ حکومت میں لال قلمی کے زندگی نامہ نگار حالات سے دوچار رہی لیکن ان حالات میں بھی انہوں نے اس زمانے کے شاعروں کا خیال رکھا اور حتی المقدور ان کی پرورش اور دیکھ بھال کی۔ شعر و شاعری سے انہیں گہرا لگاؤ تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اس میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس لیے انہوں نے اسے اس پاس زمانے کے تقریباً تمام شاعروں کو جمع کر لیا اور لال قلمی میں اردو شاعری کی ایک نیا قائم ہو گئی تھی۔

شاعری کے ساتھ اس زمانے میں دوسرے فنون کو بھی بہت فروغ ہوا۔ بہادر شاہ ظفر نے مصوری سے بھی دلچسپی لی اور اس وقت کے نامور مصوروں کو نوازا۔ انہوں نے مصوری کے دبستان دہلی کی روایت کو باقی رکھا، جس نے اس زمانے میں کم از کم دو اہم مصور راجہ جیون رام اور حسین نظر پیدا کیے۔ ان کی وجہ سے دلی میں مصوری کا شوق بھی عام ہوا۔ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کو موسیقی سے بھی بڑی دلچسپی تھی اور ان کے دور حکومت میں لال قلمی موسیقی کا بھی اچھا خاصا مرکز بن گیا تھا۔ موسیقی کی باقاعدہ محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور اس میں بڑے موسیقار حصہ لیتے تھے۔ ناصر نقیر فراق نے بی خانم کی زبان ان محفلوں کی روداد بیان کی ہے لکھتے ہیں: "میرا قاعدہ تھا کہ میں ایک سہنچے میں لال قلمی سے بارہ دری کے دو پھرے کیا کرتی تھی۔ ایک دوسری کو ایک چوبیسویں کو۔ ان قاریضوں کے اندر میر درد صاحب

کے وقت سے راگ کی دو محفلیں ہوتی تھیں اور اس دھوم دھام سے ہوتی تھیں کہ لال قلعے کے بادشاہ اور بادشاہ زادے پسند کرتے تھے۔ جب میں جہان پناہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جاتی تو حضور والا فرماتے : ”ہم سمجھ گئے آج چاند کی دوسری یا چوبیسویں ہے۔ بارہ دری جانے کی چھٹی چابٹی ہو۔ اچھا جاؤ یہ خواجہ صاحب کے چاں کی بڑی ہر برکت مہنیں ہیں۔ چھ شاہ پیا اور شاہ عالم ثانی اور اکبر شاہ ثانی اور ولی عہدی تک میں بھی ان میں شریک ہوا ہوں۔“ جب میں ہلکے کر لال قلعے میں آئی تو حضور کو آداب پچالائی۔ حضور فرماتے : ”کہو خاتم اس تاریخ میں غزل کیسی رہی۔ کون کنجی اچھا گئی؟ کس گوئے نے خواجہ چھ نصیر سے زیادہ داد لی؟“ جو کچھ مجھے حال معلوم ہوتا عرض کر دیتی۔ ایک اور جگہ لکھا ہے : ”سب شاہزادوں کو کانے جانے کا بڑا شوق تھا۔ اچھے اچھے گوئے اور کلاؤنٹ نوکر رکھ کر اس بات کو ان سے سیکھتے تھے۔ کوئی قسم کانے کی ایسی نہ تھی جسے یہ لوگ ادا نہ کرتے ہوں، کوئی ساز ایسا نہ تھا جو یہ لوگ سلیقے سے نہ بجاتے ہوں۔ اچھے اچھے استاد اس کام میں ان کے آگے کان پکڑتے تھے۔ مگر سارنگی ان میں سے کسی ایک کو نہ آتی۔ کہتے تھے ’اسان یہ ٹیڑھی کہہ رہے، نہ اس میں کوئی پردہ ہے، نہ سندری ہے، رستہ کیوں کر جلا جائے؟ یہ بیشہ وروں کا ہی حصہ ہے ان کی پٹی بولتی ہے۔ مرزا گوہر صاحب، مرزا کالے صاحب مرزا چڑیا صاحب ستار بجاتے میں استاد ہو گئے تھے۔“ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں موسیقی سے لوگوں کو کتنی دلچسپی تھی اور وہ اس میں کس طرح ڈوبے ہوئے تھے۔ خوش نویسی کا بھی اس زمانے میں بڑا چرچا تھا۔ اور اُسے بھی لوگ ایک اہم فن کی طرح سیکھتے تھے۔ بادشاہزادوں اور ان کے باپ دادوں کو اپن شوق ضرور ہوتے تھے؛ ایک مجبوم، ایک مصوری، ایک خوش نویسی کا اور ان سب میں کمال پیدا کرتے تھے۔ بادشاہ کو بھی اس فن سے دلچسپی تھی اور وہ عربی فارسی خط کے کمال تھے۔ خوش نویسی میں ان کے استاد میر کو صاحب تھے۔ اور بادشاہ نے بھی

اس پتھر میں سیکڑوں کو شاگرد کیا تھا*۔ اس زمانے کے خوش نویسوں میں سید محمد اسیر، آغا صاحب، مرزا عبداللہ بیگ، امام الدین احمد خان، محمد جان، اخوند عبدالرسول قندھاری، حافظ کاکو خان، میر امام الدین، مولوی حیات علی، پنٹل شنکر ناتھ، بدرالدین علی خان مہرکن، فیض علی خان، مرزا شاہرخ بیگ اور محمد عالم خاص طور پر مشہور ہیں، اور ارباب موسیقی میں بہت خان، راگ رس خان، میر ناصر احمد، چادر خان ستارون، وحیم سین ستارون، نظام خان، قائم خان، گلاب سنگھ، پکھاؤ جی، اور سکھوا پکھاؤ جی کے نام سر فہرست آتے ہیں۔ ان سب نے اس زمانے کی دلی میں ان فنون کی صحیح فضا پیدا کر کے الہیں منہانے کہاں پر پہنچا دیا تھا۔

یہ تو اس تہذیبی اور ثقافتی روایت کی تفصیل تھی جس کا تعلق مشرق سے تھا لیکن اس زمانے میں مشرق کی یہ تہذیبی اور ثقافتی روایات مغرب کی تہذیبیں اور ثقافتی روایت کے ساتھ شیر و شکر ہوتی ہیں۔ انگریزوں کی آمد کے بعد سے یہ سلسلہ باقاعدگی سے شروع ہوا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں شدت پیدا ہوتی گئی۔ لال قلعے تک اس کے اثرات پہنچے اور وہاں بعض لوگوں کے رہن سہن تک ہر اس کا اثر ہوا۔ بعض شہزادوں نے قلعے کے اندر مغربی طرز کی عمارتیں تعمیر کرائیں۔ انگریزی لباس پہنا اور رہن سہن کا انگریزی انداز اختیار کیا۔ اکبر شاہ ثانی کا دوسرا بیٹا مرزا بابر انگریزی طرز اختیار کرنے کے لیے خاص طور پر مشہور ہے۔ اُس نے لال قلعے میں دیوان عام کی پشت پر رنگ محل کے احاطے میں مغربی طرز کا ایک مکان تعمیر کرایا۔ وہ مغربی طرز کا لباس پہنتا تھا، جس کی کثیت وردی کی سی تھی۔ اُس کے مغربی طرز کے کوٹ پر سینے کے دواؤں طرف ستارے لکھے ہوتے تھے۔ وہ پاؤں میں بھاری بوٹ پہنتا تھا اور اُس کے ہاتھ میں ایک بھاری سی جینڑی ہوتی تھی۔ اس انداز سے وہ چھ گھوڑوں کی گاڑی میں بیٹھ کر سہر میں نکلتا تھا*۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں کی تہذیب و ثقافت کے اثرات بری طرح اندر ہی اندر مشرقی تہذیب و ثقافت پر اپنا رنگ

۱۔ ناصر ظہیر لڑائی : لال قلعہ کی ایک جھلک : صفحہ ۲۸-۲۹

۲۔ Percival Spear : Twilight of Mughals P. 64-65

چڑھا رہے تھے۔ ہر چند کہ شروع شروع میں اس کی حیثیت تقلید اور نقالی کی تھی لیکن جب انگریز باقاعدہ دلی پر حکمران ہو گئے، اور انہوں نے اس سر زمین پر اقامت اختیار کر لی تو مشرق و مغرب کی تہذیبوں کا یہ انصال اس زمانے کی زندگی کا بنیادی جزو بن گیا۔ جب انگریز دلی میں فاتح کے حیثیت سے داخل ہوئے تو بیشتر لوگوں نے کوئی خاص مزاحمت نہیں کی۔ بلکہ ان کے اس اقدام کو ایک حد تک پسند کیا۔ کیونکہ ان کے اس اقدام سے وہ ہنگامے ختم ہو گئے جن کی وجہ سے دلی ایک زمانے تک انتشار کی آماجگاہ بنی رہی تھی۔ انگریزوں نے اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد تعلیمی اور علمی معاملات کی طرف توجہ کی جس کا اثر اس زمانے کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی پر بڑا گہرا ہوا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم دہلی کالج کا قیام تھا، جو بہت تھوڑے عرصے میں ایک علمی اور تعلیمی ادارے سے زیادہ ایک تہذیبی اور ثقافتی مرکز بن گیا۔ مسلمانوں نے اس کی مخالفت بھی نہیں کی۔ بلکہ اُس وقت بعض اہم علماء نے اس ادارے کے ساتھ تعاون کیا۔ خود مولانا شاہ عبدالعزیز اس سلسلے میں بیش بیش نظر آتے ہیں۔ ”جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی کالج قائم کیا، اور لوگ وہاں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق متامل تھے تو آپ نے ان سب شبہات کو رفع کیا اور علی گڑھ کالج قائم ہونے سے پچاس سال پہلے انگریزی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کا نوحہ دیا“۔ اس لیے مسلمان اس ادارے کے ساتھ وابستہ ہونے لگے۔ کالج کا افتتاح ۱۸۲۵ء میں ہوا۔ اور اُس شاہانہ عطیے میں سے اس کالج کے لیے پانسو روپے ماہانہ مقرر کیے گئے۔ مسٹر جے۔ ایچ۔ ٹیلر مقامی مجلس کے سکریٹری ایک سو پچھتر روپے ماہانہ ہر اس کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ پندرہ مولوی کی تنخواہ ایک سو بیس روپے قرار پائی اور دو اور مولوی پچاس پچاس کے رکھے گئے۔ باقی پچیس پچیس اور اسی تیس کے تھے۔ طلباء کے لیے بھی وظائف مقرر ہوئے۔ سالانہ رپورٹیں باقاعدہ مجلس تعلیم عامہ کی خدمت میں بھیجی جاتی تھیں جن میں مولویوں کے عزل و نصب، سالانہ امتحان کے نتائج اور دوسرے امور متعلق کالج درج ہوتے تھے“۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ کالج دن دن رات چوکی ترقی

۱۔ شیخ محمد اکرام : رود کوثر : صفحہ ۳۹۴

۲۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق : مرحوم دہلی کالج : صفحہ ۶

کرتا کیا ، اور اس نے دلی کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں اپنے لیے جگہ بنا لی ۔

دہلی کالج کا سب سے اہم تہذیبی اور ثقافتی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اردو زبان کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ۔ اردو زبان اس وقت تک فارسی کی جگہ لے چکی تھی اور دلی میں ہر شخص اس کا شہدائی تھا ۔ اس زمانے میں جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ، بڑے بڑے عالم ، ادیب اور شاعر موجود تھے ۔ اور وہ درباری اور سرکاری زبان بھی سمجھی جاتی تھی ۔ اس کالج نے اردو زبان کو بہت اہمیت دی اور اس کی ترقی کے لیے بڑا کام کیا ۔ اس کالج کی بڑی خصوصیت یہ تھی اور اسی میں اس کی کامیابی کا راز تھا کہ ذریعہٴ تعلیم اردو تھا ، عربی ، فارسی ، سنسکرت کی تعلیم تو خیر اردو میں ہوتی ہی تھی ، لیکن دوسرے علوم جو داخل نصاب تھے ، ان کی تعلیم کا ذریعہ بھی اردو تھا^۱ ۔ سائنس کی تعلیم تک اردو میں ہوتی تھی ، اور ماسٹر رام چندر اور دوسرے اساتذہ نہایت خوش اسلوبی سے یہ کام انجام دیتے تھے^۲ ۔ ادب کی طرف بھی اس کالج نے خاص توجہ دی ۔ مختلف موضوعات پر کتابوں کے ترجمے بھی یہاں خاصی تعداد میں ہوئے ۔ یہاں مشاعرے بھی ہوتے تھے ، ادبی محفلیں بھی ہوتی تھیں ، تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری تھا اور ان سب باتوں نے مل کر اس کالج کو ایک ثقافتی مرکز کی حیثیت دے دی تھی ۔ جو لوگ اس کالج سے وابستہ تھے ، ان میں بیشتر بڑے لائق اور قابل تھے اور انہوں نے علم و ادب میں اضافہ کیا ہے ۔ مسٹر ہٹروس ، ڈاکٹر اسپرنگر اور مسٹر لیلر یہ کالج کے تین پرنسپل ایسے گزرے ہیں کہ انہوں نے کالج کی سچی خدمت کی اور اس کی ترقی و اصلاح میں دل سے کوشش کی ۔ طلبہ و اساتذہ پر ان کی بڑا اثر تھا اور ضمیر والے بھی ان کا ادب کرتے تھے ۔ خاص کر مشرقی شعبے کی اصلاح اور اردو زبان میں مغربی علوم کے ترجموں کے متعلق مسٹر ہٹروس اور ڈاکٹر اسپرنگر نے جو بے ریا کوشش کی وہ بہت قابل قدر رہے^۳ ۔ عربی کے اساتذہ میں مولوی ملوک العلی بڑے جید

۱۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق : مرحوم دہلی کالج : صفحہ ۱۵

۲۔ ایضاً : صفحہ ۲۶

۳۔ ایضاً : صفحہ ۱۲۷

عالم تھے اور دور دور اُن کے علم و فضل کی شہرت تھی۔ مولوی امام بخش صہبانی صدر مدرس فارسی اپنے وقت کے بہت بڑے فارسی ادیب تھے۔ مصنف اور شاعر بھی تھے۔ اُن کی کتابیں نصاب تعلیم میں داخل تھیں۔ شہر میں اُن کی بڑی عزت تھی۔ فارسی کتابوں کے علاوہ انہوں نے اردو صرف و نحو لکھی اور شمس الدین کی تصنیف 'حدائق البلاغۃ' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ شعرائے اردو کا انتخاب بھی کیا تھا جو اس زمانے میں چھپ گیا تھا۔ مولوی سبحان بخش بھی کالج میں مدرس تھے، اُن کی کتاب 'معاورات ہند' مشہور ہے۔ ابن خلکان کی تاریخ کا ترجمہ 'وقیات اعیان' انہیں کا کیا ہوا ہے۔ 'تذکرۃ مفسرین' اور 'تذکرۃ حکماء' بھی اُن کی مشہور کتابیں ہیں۔ ماسٹر رام چندر مائٹھی اور ریاضی کے استاد تھے اور ان موضوعات پر انہوں نے کئی کتابیں لکھی تھیں۔ مولوی احمد علی فارسی کے مدرس تھے۔ انہوں نے 'تاریخ کشمیر' کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ پنڈت رام کشن دہلوی بھی کالج میں مدرس تھے۔ انہوں نے علم طب پر ایک رسالے کا اردو میں ترجمہ کیا تھا اور ڈاکٹر اسپرنگر کے ساتھ مل کر قواعد صرف و نحو تالیف کی تھی۔ ایک کتاب زراعت پر بھی اُن سے یادگار ہے۔ ماسٹر حسین اگرچہ بچوں کو پڑھاتے تھے لیکن تصنیف و تالیف کا شوق تھا انہوں نے 'تاریخ مغلیہ' کا ترجمہ اردو میں کیا۔ اس کے علاوہ میکانکس کی شرح شریف، قانون ہمدی فوجداری، قانون وراثت وغیرہ کے ترجمے بھی اُن ہی کے کہے ہوئے ہیں۔ ہر دیو سنگھ بھی کالج میں منشی تھے انہوں نے اصول حساب پر ایک کتاب کا ترجمہ کیا۔ ماسٹر نور محمد نے پنکال اور تاریخ مغلیہ کا ترجمہ کیا۔ مولوی حسن علی خاں نے 'قانون مال'، 'کستان سمدی' اور 'الف لیلہ' (منتخب) کے ترجمے اردو میں کیے۔ اُن کے علاوہ کالج کے طالب علموں نے بھی تصنیف و تالیف میں بڑا نام پیدا کیا۔ ماسٹر رام چند مولوی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، مولانا محمد حسین آزاد، ڈاکٹر ضیاء الدین متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اور اُن کی تصانیف اردو زبان میں بڑا درجہ رکھتی ہیں۔ مولوی کریم الدین بھی کالج کے طالب علم تھے۔ اُن

۱۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق : مرحوم دہلی کالج : صفحہ ۱۴۸

۲۔ ایضاً : صفحہ ۱۴۸ - ۱۵۲

کی 'تعلیم النساء'، 'گلستان ہند'، 'مذکورہ شعرائے ہند' (طبقات شعرائے ہند) 'گلدستہ ناولینان'، 'مذکورۃ النساء'، 'ترجمہ ابوالفدا'، 'تاریخ شعرائے عرب' وغیرہ مشہور ہیں۔ ان اساتذہ اور طلباء نے اس کالج کے کام کو روشن کیا۔ اور تصانیف سے چار چاند لگا دیے۔ انہیں کی بدولت کالج ایک تعلیمی، علمی، تہذیبی اور ثقافتی ادارہ بن گیا اور مشرق و مغرب کی تہذیبی روایات کو انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ جی اُن کے سب سے بڑے کارنامے ہیں۔

غرض دلی اُس زمانے میں تہذیب و ثقافت کا بڑا مرکز تھا اور اس میں بڑے لائق اور قابل لوگ جمع تھے۔ بادشاہ کو خود تہذیبی اور ثقافتی معاملات سے دلچسپی تھی اور اُن کی اس دلچسپی نے لال قلعے کو ایک ثقافتی مرکز بنا دیا تھا۔ قلعے کے باہر شہر میں بڑے بڑے عالم، منکر، شاعر اور ادیب تھے جنہوں نے فکر و عمل سے تہذیب و ثقافت کی صحیح فضا قائم کر دی تھی۔ انگریز بھی اس سلسلے میں پیش پیش تھے اور اُن کا سب سے بڑا کارنامہ دہلی کالج کا قیام تھا جس نے اُس زمانے میں صحیح علمی اور ادبی ماحول پیدا کیا اور اس طرح ایک اہم تہذیبی اور ثقافتی ادارے کی حیثیت اختیار کر لی۔ اگرچہ انگریز اس کے روح رواں تھے لیکن اس میں مشرق کی تہذیبی اور ثقافتی روایات بھی پروان چڑھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کیونکہ انہوں نے مشرقی علوم و ادبیات کے بعض اہم علم برداروں کو اس ادارے میں جمع کیا تھا۔ یہ لوگ کشادہ دل اور روشن خیال تھے اس لیے انہوں نے اس عہد کے تقاضوں کو سمجھا اور وقت کی ضرورتوں کو محسوس کیا۔ چنانچہ اُن کی علمی اور ادبی کاوشوں نے اس ادارے کو مشرق و مغرب کی ثقافتی روایات کا ایک سنگم بنا دیا۔ اس صورت حال نے اُس زمانے کے تہذیبی اور ثقافتی ماحول میں ایک نئی زندگی پیدا کی اور اس طرح دلی ایک دفعہ پھر تہذیب و ثقافت کا ایک اہم مرکز بن گئی۔

۶

یہ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی ماحول تھا جس میں غالب پیدا ہوئے۔ اُن پر اس ماحول کا گہرا اثر نظر آتا ہے اور وہ اُس کی پیداوار معلوم

ہوتے ہیں۔ اس ماحول نے انہیں پیدا کیا ہے اور ان کی شخصیت اپنی بساط
 بھر خود بھی اُس کو پیدا کرنے کا باعث بنی ہے۔ خاص طور پر اس زمانے
 کے علمی اور ادبی ماحول کو پیدا کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ ظاہر ہے کہ
 اُس زمانے کے سیاسی حالات سے انہیں براہ راست کوئی سروکار نہیں تھا۔
 اس لیے وہ خود تو ان حالات کو متاثر نہ کر سکے لیکن ان کا اثر انہوں
 نے براہ راست نہیں تو بالواسطہ طور پر قبول ضرور کیا۔ یہی حال کم و بیش
 معاشی حالات کا ہے۔ اس زمانے کے معاشی حالات کو وہ خود تو متاثر
 نہ کر سکے لیکن ان حالات کے اثرات ان پر ضرور موجود ہیں۔ البتہ اس
 زمانے کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی سے وہ خود بھی متاثر ہیں اور ان کی
 شخصیت نے زندگی کے ان شعبوں کو متاثر بھی کیا ہے۔ غالب کی شخصیت
 اُس زمانے کی معاشرتی زندگی کی علامت ہے۔ وہ تہذیب و ثقافت کی صحیح
 سمجھندگی کرتے ہیں۔ انہوں نے اس میں بڑے چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ یہی وجہ
 ہے کہ ان کی شخصیت اُس زمانے کے تہذیبی اور ثقافتی اُنس پر ایک نہایت
 ہی درخشندہ ستارہ نظر آتی ہے۔

غالب
کی
تصانیف

آردو

(۱)

دیوان غالب

غالب کا متداول دیوان در اصل ان کے کلام کا انتخاب ہے۔ اس کے بارے میں آزاد نے آب حیات میں یہ لکھا ہے کہ یہ انتخاب غالب نے مولانا فضل حق غیر آبادی اور مرزا خانی کوتوال کے مشورے سے کیا تھا۔ لیکن امتیاز علی خاں عریض نے اس سے اختلاف کیا ہے اور شیفتہ کے 'گلشن بے خار' کے اس بیان کو کہ 'دیوانش را بعد تکمیل و ترتیب دیگر نگریست و فراوان ایات از آن حذف و ماضط کردہ قدرے قلیل انتخاب زدہ، بنیاد بنا کر یہ لکھا ہے کہ 'یہ تذکرہ مرزا صاحب کی نظر سے گزر چکا تھا، اور انہوں نے نہ صرف اس کی تقریظ لکھی تھی بلکہ اس کی بعض کوتاہیوں کی طرف مرتب کی توجہ بھی منعطف کی تھی۔ اگر مرزا صاحب اپنے کلام کے خود منتخب نہ ہوتے تو شیفتہ کیوں لکھتے اور یہ فرض محال وہ سنی ستانی لکھ بھی دیتے تو مرزا صاحب اس پر نکتہ چینی کیوں نہ کرتے' — حقیقت جو کچھ بھی ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب کا متداول دیوان ان کے کلام کا انتخاب ہے اور یہ انتخاب بڑے سلیقے سے کیا گیا ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ غالب کی شہرت اسی دیوان کی وجہ سے ہے۔

اس دیوان کا پہلا ایڈیشن مرید کے بھائی سید محمد خان چادر کے مطبع سید المطابع یا مطبع سید الاخبار سے شعبان ۱۲۵۷ھ (اکتوبر ۱۸۴۱ء) میں

چھپ کر شائع ہوا۔ یہ نسخہ ۱۰۸۰ صفحات کو محیط ہے اور اس میں ۱۰۹۵ شعر ہیں۔ اس کے شروع میں غالب کا فارسی دیباچہ اور آخر میں نواب ضیاء الدین احمد جہاد لیر رخشاں کی تقریظ ہے جو انھوں نے ۱۲۵۴ھ میں مرتب کیا تھا اور جب تین برس بعد ۱۲۵۷ھ میں شائع ہوا تو اس میں ۲۵ شعروں کا اضافہ کر دیا۔^۱

اس الیشن کے نسخے بالکل نایاب ہیں۔

غالب کے اردو دیوان کا دوسرا الیشن ۱۲۶۳ھ - ۱۸۴۷ع میں مطبع دارالسلام حوض قاضی دہلی میں چھپا۔ اس میں بھی غالب کا فارسی میں لکھا ہوا دیباچہ اور لیر رخشاں کی تقریظ شامل تھی۔ کل اشعار تعداد میں ۱۱۵۹ تھے۔ اس کے نسخے بھی آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس نسخے سے سرورق کی عبارت کا متن، غالب کا لکھا ہوا دیباچہ اور نواب ضیاء الدین احمد خاں لیر رخشاں کی تقریظ کا اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے :

دیوان اردو

تصنیف مشہری بند فلک البروج سبحانی، الفصح الفصائل دوراں، شہنشاہ شعرائے مالک ایران و ہندوستان، دقاق غوامش و رسوز سخن سنجی و نکتہ دانی، خلاق مضامین و معانی، سر آمد ارباب فضل و کمال، مہر مہر نبالت و اجلال، چناب مستطاب منبع الالقاء، مرزا احمد اللہ خاں جہاد ادام اللہ برکاتہم و حسناتہم، المتخلص بہ غالب و اسد بہ تصحیح و مقابلہ چناب صدر المدح در مطبع دارالسلام دہلی واقع محلہ حوض قاضی مہنیہ و اقل العباد عنایت حسین در ماہ مئی ۱۸۴۷ع پایتہام نور الدین احمد لکھنوی حلید الطباع ہوشیہ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مشام شمع آفتاباں را صلا و نہاد انہمن نشینان را مزدہ کہہ لختے از
سایان بجرہ گردانی آمادہ و دابنے از عود ہندی دست بزم دادہ است۔

نہ چوب پائے سنگ زوب خوردہ بہ پنجاہ ناٹھجی شکستہ بے اندام تراشیدہ،
 بلکہ بہ تیر شکستہ، بہ کارد ریز ریز کردہ، بسویان خراشیدہ، ایدوں نفس گداختی
 شوق بہ جستجوئے آتش پارسی است، نہ آتشی کہ در کلخ پائے بند افسردہ
 و خاموش و از کف خاکستری بمرگہ خودش سیہ پوش بینی۔ چہ بروے مسلم
 است از نا پای باستخوان مردہ نا بار شکستن و از دیوانگی بہ رشتہ
 شمع مزارکشہ آویختن۔ ہر آئینہ بدل گداختن فیروز و بزم فروختن را نشاید۔
 و بخ آتش بھن بر فروزندہ و آگنی پرست را بیادافراہ در آتش سوزندہ
 نیک میداند کہ برو بندہ در ہوائے آن رخشندہ آفر نعل در آتش است کہ
 بہ چشم روئی پوشنگ از سنگ برون تاغہ و در ایوان لہر اسپ نشو و نما
 یاتہ۔ غی را فروغ است و لالہ را رنگ و منہ را چشم و کندہ را چراغ۔
 بخشندہ یزدان درون بہ سخن بر فروز را سپاسم کہ شرارے ازان آتش
 تابناک بخاکستری خویش یاتہ بہ کاکو کاویہ شتالہ ام و از نفس دمہ بران
 بر نہادہ ہو کہ در اندک ماہہ روزگار انکماہ فراہم تواند آمد کہ بچمرہ را
 فروشنائی چراغ و رائیہ عود را پال شناسائی دماغ تواند بخشید۔
 بہانا نگارندہ این نامہ را آن در سر است کہ پس از انتخاب دیوان ریختہ بکرد
 آوردن سرمایہ دیوان فارسی بر خیزد و بہ استفادہ کمال این فرہورن پس
 زانوئے خویشین نشیند۔ امید کہ سخن سراپان سخنور ستانی ہر اگندہ ایائے
 را کہ خارج ازین اوراق یا بند از آثار قراوش رگ کلک این نامہ سیاہ نشانند
 و چاہد گرد آور را در ستائش و نکویش آن اشعار ممنون و ماخوذ نہ مگاند۔
 یا رب این بولے ہستی نا شنیدہ، از نیستی بہ ہدائی نا رسیدہ یعنی نقشی
 بہ ضمیر آمدہ فلانی کہ ہاسد اللہ خان موسوم و بہ میرزا نوشہ معروف
 و بہ غالب متخلص است چنانکہ اکبر آبادی مولد و دہلوی مسکن است
 فرجام کار غنی مدقن نیز ہاد۔“

تقریظ نواب ضیاء الدین احمد خان

”.....ترسم کہ آئند سرودم نہ سجتہ باشی۔ یانا مشغوب دیوان اردو
 زبان ست ریختہ کلک مسیحی قرطب خدام، قسطنطنیہ دانش، اسطرابلانی، جوہر

الینہ آفرینش ، معیار نقد گرانمایگی ، معراج سلم بلند باہنگی ، قہرمان قلمرو
 معنی پروری ، فرمان فرمانے گیان سختوری ، کیتی خدایگان نو آئین نگاری ،
 جہاں سالار تازہ گفتاری ، روان بھنی کالبد سخن گستری ، بینائی نزلے چشم
 دیدہ وری ، فرازندہ لوائے شوکت خامہ و فروزندہ چراغ دودہ آمد ، آہہ
 ناسخ شہرت ہمدانستان ، سرخیل انجمن نکستہ دانان — مستوی

سخن را از خیالی اورچمندی

معانی را ز فکرش سر بلندی

صبر غامبش بی دلیلبر است

بہشتی عہدلیبان را صبر است

مہین سرزد نہ آہائے غاوی

چہن شاگرد عقل کل عالی

جہاں را بے دریغ آموزگار است

گزین معنی شناس روزگار است

مر و سر دفتر شیوا بیازان

دریں فن اقتضار ہم زبانان

بہ جولانگاہ معنی یکہ تازے

نابلون نظرے حکمت ترازے

لکھنوی ریش گنج معانی

چو ابر آذری در درخشانی

ز صہبائے سخن سرشار گشتہ

ورق از لکڑ او گلزار گشتہ

موجہ کش ، صافی منشی ستودہ خوانے فرو پیدہ کشی ، بزرگ نہاد پاکیزہ
 گوہر ، فرشتہ سرشت آژرم گستر ، کپی گزار مہر پرور ، خورشید فروغ
 کیوان فر ، نکویش نکوہ ، ستائش ستای ، کشور معنی را دہ خدای ، سر تا سر
 وفا و فتوت ، دیدہ تا دل حیا و مروت ، درک مصور ، روح مجسم ، عالم جان
 و جان عالم ، والا حسب ، عالی نسب ، سنی و سنی واپسین و خورشور ، آداس
 حضرت چارمیں دستور ، اعنی استادی ، سرشدی ، سولائی ، اغی میجزا اسد اللہ
 خان چادر غالب اللہم کمل الکلام بدیمونہ بقایہ و حوصلہ العرام عینونہ
 لقاہ ، ہوش آہیں ، نیاز گستر ، محمد ضیاء الدین نیر ، از دیر باز والائی

انقبضہ، پست دران انقبضہدی و گرائی قدر سیک الدران سنجیدی کہ این گراسی
برادر زادہ ہا را کہ پکن پکن غلب الصدق دود مان شمیر بل ایوانا ہائے
مطامین دلبذیر است، بہ تعلیم نو آسوزان لکو از ہد قشاسی، بر انگیزد
و این از زلفہ جواہر بارہ را کہ ہر یک ازان سیمی ساعد شخصی خرد را
بارہ و نازنین بیکر ہوش را گوشوارہ است بہ شمشہ بیش طاق شناسائی
بر آویزد۔ بازے کار ساز ایزد بزرگہ را ہزاران مہاس کہ دریں زمان کہ
سنہ ۱۲۵۴ م مقصدہ ہجریہ نبویہ علی صاحبہا افضل التحیات و اکمل الصلوٰۃ،
بہ یک ہزار و دویست و پنجد و چار رسیدہ، آن دیرین پیچ و دلشن
آرزو بہ مساعلت روزگار راست ہتجار و قلاوڑی بخت بیدار، خوشتر از آنکہ
میخواستہم روای گرفت۔ شاد کاسی در دل جا گزید و اندوہ تردد گردآوری
بدر رفت۔ چون باحصائے افراد این بابوں صحیفہ شتاقم ہمگی اشعار شعری
شعار غزل و مصیدہ و قطعہ و رباعی یک ہزار و نود و اند یافتہ۔ الا یا توانا
ہوشان ہوشی و شتوا گوشان گوشا! ہر شاہراہ شہانت فراوانی نیکو معانی
ہاید رفت نہ در ہیقولہ، پیفارہ زنی خردہ ہر قاف ایات گرفت۔ چنانچہ
خود آن والا آموزگار دو گزارش این ہتجار بہ پارسی نامہ، خویشن در پردہ ساز
آن گفتار خود می ہراید۔ آری راست میفرماید۔ فرد :

نگویم تا نباشد نفر غالب اندک

چہ غم گریست اشعار من

از من یاد کاری و برائے دیگران تذکاری ہاد

مکت تمام شد۔“

۶۱ - ۱۸۶۲ع میں دیوان غالب دوبارہ چھپ کر شائع ہوا۔ اس کی

روداد مولانا مہر نے اس طرح بیان کی ہے :

”۱۸۶۰ع میں دیوان کا نیا ایڈیشن چھاپنے کا خیال پیدا ہوا۔ مئی

۱۸۵۷ع میں اردو دیوان کا ایک نسخہ خوش خط لکھوا کر نواب

یوسف علی خان والی رام پور کے لیے بھیجا تھا۔ جنوری ۱۸۶۰ع

میں رام پور گئے تو اُس کی ایک نقل لے کر نواب ضیاء الدین خان

کی نمائش کے مطابق اُن کے پاس ارسال کر دی۔ رام پور ہی میں

تھے کہ عظیم الدین میرٹھی نے اردو دیوان کے چھاپے کی اجازت

کے لیے خط لکھا۔ واپسی پر وہ میرٹھ پہنچے تو منشی ممتاز علی صاحب جو غالب کے دوست تھے، عظیم الدین کے سفارشی بن گئے اور نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نے کاپیاں دیکھنے کا ذمہ اٹھا لیا۔ غالب راضی ہو گئے اور دلی پہنچ کر نواب ضیاء الدین احمد خان والا قلمی نسخہ نواب مصطفیٰ خان کے پاس میرٹھ بھیج دیا۔ عظیم الدین نے دیوان کا جھاننا ابھی شروع جوں کیا تھا کہ منشی شیو نرائن صاحب اکبر آبادی نے دیوان کے لیے اصرار و ابرام کیا اور کہا کہ بڑے اہتمام سے اپنے مطبع میں چھاپوں گا۔ غالب نے تقاضا کر کے دیوان عظیم الدین سے واپس لیا اور منشی شیو نرائن کے پاس آکر بھیج دیا۔ وہاں بھی اس کی اشاعت میں تاخیر ہوئی تو دلی میں محمد حسین خان کے مطبع احمدی واقع شاہدرہ میں دیوان چھپوا لیا۔“

یہ نسخہ حد درجہ غلط چھپا تھا۔ اس لیے غالب نے از سر نو کان پور میں چھپوانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اپنے قلم سے مطبوعہ نسخے پر تمام غلطیاں درست کیں۔ اس کی پشت پر ایک رقمہ محمد حسین خان مالک مطبع احمدی کے نام لکھ کر تصحیح شدہ نسخہ ان کے پاس بھیج دیا۔ محمد حسین خان نے اسے مطبع نظامی کان پور میں چھپوایا۔ یہ ایڈیشن ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ جون ۱۸۶۲ء میں مکمل ہوا۔“

مالک رام لکھتے ہیں :

”اس دوران میں شیو نرائن بھی دیوان کا چھاپا شروع کر چکے تھے۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ دیوان دہلی اور کان پور دو جگہ سے شائع ہو گیا ہے تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سر دست اس کا چھاپا ملتوی کر دیا تھا اور آخر اسے اگلے برس ۱۸۶۲ء میں پورا کر کے شائع کیا۔ وہ غالباً دیوان کے ساتھ مرزا کی تصویر بھی چھاپنا چاہتے تھے۔ چنانچہ غالب نے اپنی قلمی تصویر ان کی نذر کی تھی۔ مگر ان کے شائع کردہ دیوان کے ساتھ تصویر نہیں

۱۔ سہر : غالب : صفحہ ۳۸۹

۲۔ ایضاً : صفحہ ۳۹۰

چھپ چکی ہے۔ غالب کی زندگی میں ان باغ کے علاوہ اور کوئی اڈیشن شائع نہیں ہوا۔“

غالب کی وفات کے بعد انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی میں متداول دیوان کے بے شمار اڈیشن شائع ہوئے۔ ان کی تفصیل تحصیل حاصل ہے۔ ان میں صرف امتیاز علی خان صاحب عرشی کا مرتب کیا ہوا ’دیوان غالب‘ ایسا ہے جو اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس میں انہوں نے غالب کا تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام یک جا کر دیا ہے اور اس پر ہایت مفید حواشی بھی لکھی ہیں۔ اس دیوان کو انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ نے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا۔

سرور صاحب اس کے بارے میں لکھتے ہیں :

”غالب کے کلام کے چوتھے اڈیشن شائع ہوئے ہیں ان میں ’نسخہ‘ حمید، (اتوار الحق) ’ارمغان غالب‘ (اکرام) ، ’انطباع غالب‘ (عرشی) ’اردو دیوان غالب‘ (مالک رام) کی خاصی اہمیت ہے۔ غالب کے تنقیدی شعور کے مطالعے کے لیے ان نسخوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ عبداللطیف کو سب سے پہلے غالب کے سارے اردو کلام کو تاریخی ترتیب کے ساتھ جمع کرنے کا خیال آیا تھا۔ مگر ان کے تیار کیے ہوئے مواد کا صرف نصف حصہ چھپ سکا۔ اکرام نے پہلے ’غالب نامہ‘ اور بعد میں ’ارمغان غالب‘ میں یہ کوشش کی مگر ادھوری۔ مالک رام نے ’نسخہ‘ حمید کے منتخب اشعار اور متفرق شعر مروجہ دیوان میں شامل کر کے ، عام پڑھنے والوں کے لیے ایک اچھا اڈیشن تیار کر دیا۔ مگر زیر نظر اڈیشن جو اردو کے مشہور محقق اور غالبیات کے ماہر جناب امتیاز علی عرشی کی برسوں کی محنت کا نتیجہ ہے نہ صرف ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے ، بلکہ کلام کی تاریخی ترتیب اور صحت ، نسخوں کے اختلاف کی نشان دہی ، شرح اور ضروری حواشی کے لحاظ سے اب تک کی ساری کوششوں پر بھاری اور اردو میں ادبی تحقیق اور عالمانہ نظر کا ایک قابل فخر اور ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔“

۱۔ مالک رام : ذکر غالب : صفحہ ۱۳۳

۲۔ آل احمد سرور : دیباچہ دیوان غالب : (عرشی)

نسخہ حمیدہ

غالب کا متداول دیوان جو بار بار شائع ہوا ہے، دراصل ان کے کلام کا انتخاب ہے۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے اشعار کہے تھے جو شائع نہیں ہوئے، لیکن محفوظ رہے۔ ”دیوان غالب“ کو ان اشعار کے ساتھ ”دیوان غالب جدید“ کے نام سے مفتی محمد انوار الحق نے ۱۹۱۹ء اور پھر ۱۹۲۶ء میں بھوپال سے شائع کیا۔ یہی دیوان ”نسخہ حمیدہ“ کے نام سے مشہور ہے۔

اس نسخے کے مرتب مفتی انوار الحق نے اس دیوان کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے :

”یہ بات تو علی العلوم سب کو معلوم ہی ہے کہ غالب نے اپنے چند سطن فہم احباب کے مشورے سے اشعار کا ایک بڑا حصہ مشکل اور مفق ہوئے کی بنا پر قلم زد کر دیا تھا۔ اور مروجہ اور مطبوعہ دیوان کی یہ سر و پا بربدہ غزلیں اسی دیوان کی بھی کچھ ہی نشانیاں ہیں جو اپنائے زمانہ کی آمان بستی سے شائع ہونے سے پہلے ضائع ہو گیا اس کے علاوہ خود غالب کے مکتوبات نظم و نثر سے بھی اس کا قطعی ثبوت ملتا ہے۔ لیکن اب تو کسی ایسے ثبوت کی ضرورت ہی نہیں۔ کیونکہ اب تک جس دیوان کو معدوم ثابت کیا جاتا تھا، غرض حسن اتفاق سے وہ یہ جیسے مکمل حالت میں مل گیا۔

اسیاد ہے کہ شوق کے پاتھ اسے ہاتھوں پاتھ لیں اور قدر دانی کی نگاہیں اسے دل میں جگہ دیں۔

اس نایاب کتاب کو محفوظ رکھنے کا شرف کتب خانہ حمیدہ بھوپال کو حاصل ہے۔ یہ تو یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ دیوان پاں کیونکر پہنچا۔ لیکن تاریخ، کتابت اور سہروں وغیرہ سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ غالباً رئیس وقت نواب غوث محمد خان صاحب کے بیٹے بیان فوج دار محمد خان صاحب کے لیے لکھا گیا تھا۔ چنانچہ اس کے شروع میں ایک صفحے پر یہ لکھا ہوا ہے ”دیوان ہذا من تصنیف

مرزا نو شاہ دہلوی المتخلص بہ اسد از کتب خانہ فیض آثار عالم پناہ
 میان فوج دار بہد خان جہادر دام البانہ قلمی خوش خط۔۔۔۔۔ اور
 اس کے سامنے ان کی مہر ہے ۔ اور خاکسے ہر کاتب کے قلم کی یہ تحریر
 موجود ہے ۔ ”دیوان من تصنیف مرزا صاحب و قبلہ المتخلص بہ اسد
 و غالب سلمہ رجم علی ہذا العبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم
 شہر صفر المظفر ۱۲۳۷ھ من الهجرة النبویہ صورت اتمام یافت۔۔۔“
 اس کا خط نہایت پاکیزہ اور نظر فریب ہے ۔ شروع میں خوبصورت
 طلافی کالم اور تمام صفحات پر سنہری جدول ہے ۔ جگہ جگہ میان
 فوج دار بہد خان صاحب کی مہریں ثبت ہیں جن میں سے بعض ۱۲۳۸ھ
 اور بعض ۱۲۴۱ھ کی ہیں ۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان کم
 سے کم ایک بار اور ممکن ہے چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے
 غالب کے پاس بھی گیا ہے اور ان کی نظر سے گذرا ہے ، اور انہوں
 نے خود اس میں جا بہ جا اصلاحیں کی ہیں ۔ کیونکہ اگرچہ ان
 اصلاحوں کا خط بہت خراب اور شکستہ ہے لیکن پھر بھی اس میں
 اور غالب کی طرز تحریر کے موجودہ نمونوں میں ایک گونہ مشابہت
 پائی جاتی ہے ۔ اور گو محض اس کی بنا پر ان کو غالب کا قلمی نسخہ
 قرار دینا شاید درست نہ ہو ۔ لیکن خود ان اصلاحوں کی نوعیت
 ایسی ہے کہ ان کو مصنف کے سوا اور کسی کے قلم کی طرف
 منسوب کرنا مشکل ہے ۔ کیونکہ ان میں سے اکثر ایسی ہیں کہ
 لفظ کو کاٹ کر اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیا ہے یا کبھی مصرع
 کی کچھ صورت بدل دی جاتی ہے ۔ بہت سی غزلیں بھی اسی قلم سے
 حاشیے پر بڑھائی گئی ہیں جن میں سے بیشتر مرتبہ دیوان میں مجسمہ
 موجود ہیں ۔ البتہ بعض ایسی بھی ہیں کہ ان میں بھی دوبارہ پھر
 کچھ انتخاب ہوا ہے اور مطبوعہ دیوان میں ان کے پورے شعر شائع
 نہیں ہوئے ۔ لیکن حقیقت میں اس امر کا ثبوت کہ یہ غالب کا
 گم شدہ دیوان ہی ہے ، خط کی مشابہت اور کاتب کی تحریر کا محتاج
 نہیں ہے بلکہ اس سے بڑی وجہ اور یقینی دلیل خود اس کے اشعار ہیں

آفتاب آمد دلیل آفتاب

ناظرین چپ اس کا مطالعہ کریں گے تو خود کہہ دیں گے کہ

غالب کا کلام ہے ، اور غالب کے سوا اور کسی کا ہو ہی نہیں سکتا۔ مروجہ دیوان میں چنتی کئی چوٹی غزلیں ہیں وہ سب اس میں مکمل موجود ہیں۔ جو اشعار مغربی طور پر تلاش کر کے بعض دیوانوں میں بڑھائے گئے تھے اور جن کی بابت قیاسی طور پر کہا جاتا تھا کہ غالب کے ہیں ، وہ بھی سب کے سب اس میں ہائے جاتے ہیں^۱۔

اس دیوان میں ۲۵۵ غزلیں ہیں اور کل ۱۸۸۳ اشعار ہیں۔ اس کے علاوہ قصیدے ، رباعیاں اور قطعات بھی تعداد میں متداول دیوان سے زیادہ ہیں۔

اس اعتبار سے وہ دیوان خاصی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں غالب کا ایسا کلام مل جاتا ہے جو عام دیوان میں نہیں ملتا۔

- ۱۔ مفتی انوار الحق: دیوان غالب (نسخۂ حیدرہ): صفحہ ۵۰۷
- ۲۔ غالب کے غیر مطبوعہ کلام کے بارے میں مولانا سہر لکھتے ہیں :

”غالب نے ابتدا میں میرزا بیدل کے رنگ میں اردو شعر کہنے شروع کیے تھے اور دس برس کی مدت میں ایک دیوان جمع کر لیا تھا۔ جب ہوش آیا اور شاعری کی حقیقت سے آگاہی ہوئی تو ان میں سے صرف دوڑے سے اشعار باقی رکھے، باقی قلم انداز کر دیے۔ انہی اشعار کا ایک مجموعہ اعلیٰ حضرت نواب حمید اللہ خان بہادر فرمایا روئے یھوہال کی توجیہات عالیہ سے ’نسخۂ حیدرہ‘ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جو اردو اشعار دیوان کی طباعت کے بعد کہے گئے ، وہ یا تو ان کے رفعات میں آ گئے ہیں یا بعض کسی مسودات سے لے کر شائع کیے جا چکے ہیں۔ مثلاً چند چیزیں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے ’الہلال‘ میں چھاپ دی تھیں۔ کچھ اشعار دیوان کے اس ایڈیشن میں چھپ چکے ہیں جو نظامی بدایونی نے خاص اہتمام سے شائع کیا تھا۔ کچھ اشعار آسی صاحب نے ’مکمل شرح کلام غالب‘ میں جھانپے ہیں۔ لیکن بعض اشعار اس وقت تک منظر عام پر نہیں آئے۔

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۶۱ پر)

نسخہٴ حیدریہ کے دو ایڈیشن یورپال سے شائع ہوئے تھے۔ اب یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۰)

حضرت مولانا ابوالکلام سے معلوم ہوا کہ نواب سعید الدین احمد خان طالب مرحوم کے پاس اردو دیوان کا ایک قلمی نسخہ تھا، جس میں غالب کے غیر مطبوعہ اشعار بھی تھے۔ مولانا نے ان اشعار کی نقل لے لی تھی۔ ارادہ یہ تھا کہ انہیں ’الہلال‘ (دور اول) میں شائع کر دیں۔ لیکن سوہ اتفاق سے ’الہلال‘ بند ہو گیا اور بعض دوسرے مسودات کے ساتھ یہ اشعار بھی ضائع ہو گئے۔

میں نے اس دیوان کی تلاش شروع کر دی۔ مولانا مظہر الدین صاحب شیرکوٹی مرحوم مالک ’الاسان‘ و ’وحدت‘ کی وساطت سے طالب مرحوم کے متعدد عزیزوں سے ملا۔ لیکن قلمی دیوان کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ اس تلاش میں نواب صلاح الدین مرحوم کی یکم سے ایک اور قلمی دیوان مل گیا، جس کے حاشیے پر اور بعض اوراق پر متفرق اشعار درج تھے۔ میرا خیال ہے کہ کاتب نے انہیں غیر مطبوعہ سمجھتے ہوئے الگ درج کیا۔ لیکن ان میں سے بعض مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں۔ کچھ اشعار ’اردوئے معلول‘ میں چھپ چکے ہیں مگر اب تک دیوان میں شامل نہیں ہو سکے۔ مثلاً :

میں ہوں مشتاق جفا مجھ پہ جفا اور سہی

تم ہو بہداد سے خوش اس سے سوا اور سہی

متفرق اشعار ’الہلال‘ یا دوسرے رسائل کے حوالے سے دیوان غالب کے نسخہٴ نظامی میں چھپ چکے ہیں۔ مثلاً والی رام پور کے نعل صحت کا قصہ، دو تین قطعات، سخن نکید، کہن نکید والی محزل، بعض اشعار رام پور والے ’نکاتیب غالب‘ میں شائع ہو چکے ہیں۔ مثلاً ہر سات والا قطعہ جو نواب کاتب علی خان مرحوم کو بھیجا گیا تھا۔ اس کا شعر یہ ہے :

جناب قبلہ حاجات اس ہلاکش نے

بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۶۲ پر)

نایاب ہے اور کسی قیمت پر دستیاب نہیں ہوتا ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۱)

جو اشعار اب تک غیر مطبوعہ سمجھے جا سکتے ہیں ، اس لیے کہ کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوئے ، وہ ذیل میں درج ہیں :

آپ نے مستیِ الضر کہا ہے تو سہی
یہ بھی اے حضرت ایوب گلا ہے تو سہی
رجِ طاقت سے سوا ہو تو نہ پیشوں کیوں سر
ذہن میں خوبیؔ تسلیم و رضا ہے تو سہی
ہے غنیمت کہ ہم امید گزر جائے گی عمر
نہ ملے داد مگر روز جزا ہے تو سہی
دوست ہی کوئی نہیں ہے جو کرے چاہہ گری
نہ سہی لیکہ کھائے دوا ہے تو سہی
غیر سے دیکھیے کیا خوب لبابی اس نے
نہ سہی ہم سے ہر اس بات میں ونا ہے تو سہی
قتل کرتا ہوں ایسے قالمہؔ اعمال میں میں
کچھ نہ کچھ روز ازل تم نے لکھا ہے تو سہی
کیسی آجائے گی کہوں کرتے ہو جلدی غالب
شہرۂ لیزی شمشیر قضا ہے تو سہی

ممکن نہیں ہے بھول کے بھی آ رہے ہوں
میں دشتِ غم میں آہوئے سیاد دیدہ ہوں
ہوں درد مند چہر ہو یا اختیار ہو
گد قالمہؔ کشیدہ گد اشک چشیدہ ہوں
جاں لب یہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا ذہن
از بس کہ تلخیؔ غم ہجراں چشیدہ ہوں
نے سجدہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ
میں معرضِ مثال میں دست بریدہ ہوں
ہوں خاکسار پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ
نے دانہؔ افتادہ ہوں نے دام چیدہ ہوں

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۶۳)

اب پروفیسر حمید احمد خان صاحب نے اس کو ازسرنو مرثیہ کیا ہے اور مجلس ترقی ادب لاہور اس کو شائع کر رہی ہے ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۲)

جو چاہیے نہیں وہ سری قدر و منزلت
میں ہوسک بہ قیمت اول خریدہ ہوں
ہر گز کسی کے دل میں نہیں ہے سری جبکہ
ہوں میں کلام نفز ولے نا شنیدہ ہوں
اہل ورع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل
ہر عاصیوں کے زمرے میں میں ہر گزیدہ ہوں
ہانی سے سک گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

حاشیے اور متن کے علاوہ محولہ بالا قلمی نسخے کے اول و آخر کے بعض اوراق پر چند اشعار اردو اور فارسی کے موجود ہیں جو میرے علم کے مطابق آج تک کہیں شائع نہیں ہوئے ۔ مثلاً یہ اشعار جو غالباً لوہارو والوں کی طرف سے تقاضائے تشریف آوری کے جواب میں کہے گئے :

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے
پنیں ہادۂ ناب اور آم کھائیں
سر آغاز موسم میں اندھے ہیں ہم
کہہ دلی کو چھوڑیں لوہارو کو جاتیں
سوا ناچ ہے جو کہ مطلوب جان
تہ واں آم پائیں نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں
ابھی جا کے ہوچھو کہہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹے کہاں پائیں اسی کے بھول
وہ کڑوے کرلیے کہاں سے منگائیں
لفظ گوشت ، سو بھڑ کا ریشہ دار
کہو اس کو کیا کھا کے ہم حظ الہائیں

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۶۳ پر)

(۳)

عود ہندی

غالب کے خطوط کا چلا مجموعہ 'عود ہندی' کے نام سے ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ (۲ اکتوبر ۱۸۶۸ء) کو یعنی مرزا کی وفات سے تقریباً چار ماہ پہلے شائع ہوا۔ اگرچہ تمام مسودہ ۱۸۶۶ء میں مکمل ہو کر مطبع میں دیا جا چکا تھا۔ یہ نسخہ ۱۸۸۸ء صفحات پر چھپا تھا۔ اس کے شروع میں منشی ممتاز علی خاں کا دیباچہ اور آخر میں حکیم غلام مولا صاحب فنی میرٹھی کی تدریظ اور مختلف اصحاب کے چار تاریخی قطعے ہیں^۱۔

حالی نے لکھا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ مگر سنہ مذکورہ میں جب کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے اور بہت دن 'سہر فیہ روز' کے لکھنے میں مصروف ہو گئے، اس وقت یہ ضرورت ان کو اردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہوئی۔ قیاس کہتا ہے کہ انہوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے ہیں^۲۔

لیکن مولانا مہر نے اس سے اختلاف کیا ہے اور لکھا ہے کہ غالب ۱۸۵۰ء سے قبل اردو میں خط و کتابت شروع کر چکے تھے لیکن چونکہ اس زمانے میں فارسی کا رواج تھا، اس لیے اس کو اس وقت زیادہ اہمیت نہیں دی گئی^۳۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان خطوط کی اہمیت کو محسوس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۲)

دو شعر سہرے کے ہیں جو نواب شہاب الدین احمد خان ثاقب کی شادی کے موقع پر کہے گئے تھے :

ہم نشیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدین خاں
یزم شادی ہے فلک کا کشاں ہے سہرا

ان کو لڑیاں نہ کہو بحر کی موجیں مسجھو
ہے تو کشتی میں ولے بحر رواں ہے سہرا

سہاراجہ الور نے 'گلستان' کا ایک نہایت عمدہ نسخہ میر ہنجہ کش سے لکھوایا تھا اور بہت روایت اس کی تزیین پر صرف کیا تھا۔

۱۔ مالک و ام : ذکر غالب : صفحہ ۱۳۴

۲۔ حالی : یادگار غالب :

۳۔ مہر : غالب : صفحہ ۳۹۷

کیا گیا۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کے دلوں میں ان کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا۔

سب سے پہلے منشی شیو نرائن نے ان خطوط کو چھاپنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن غالب نے ان کو مناسب خیال نہیں کیا اور منشی شیو نرائن کو لکھا :

”اردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقمہ ایسا ہو گا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہو گا۔ ورنہ صرف سرمری ہے۔ اس کی شہرت میری سخن وری کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرورت ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان کا چھاپنا میرے خلاف طبع ہے۔“

لیکن ۱۸۶۱ء میں چودھری عبدالغفور سرور اور منشی ممتاز علی خاں کے اصرار پر ان خطوط کو شائع کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے جو ان صاحبوں نے اکٹھے کر لیے تھے۔

مہر صاحب لکھتے ہیں :

”منشی ممتاز علی خاں نے مختلف رقعات جمع کرائے۔ سرور نے اپنا مجموعہ مع دیباچہ منشی صاحب کے حوالے کر دیا۔ خواجہ غلام غوث خاں صاحب نے خبرنے بعض دوسرے خطوط فراہم کر دیے۔ اس وقت تک بھی خیال تھا کہ تمام خطوط کی اشاعت ضروری نہیں۔ صرف وہ شائع کیے جائیں جن میں علمی رنگ نمایاں ہو۔ اسی لیے غالب نے خواجہ غلام غوث خاں کو لکھا تھا کہ اب یہ عبارت جو آپ کو لکھ رہا ہوں مجوزہ مجموعہ ”نثر میں شمول کے لائق نہیں ہے لیکن بعد میں جتنے خطوط مل سکے، علمی اور غیر علمی کے امتیاز کو نظر انداز کرتے ہوئے مجموعے میں داخل کر دیے گئے۔ اس مجموعے نے ”عود ہندی“ نام پایا۔“

اس مجموعے پر ممتاز علی خاں نے پیش لفظ لکھا اور اس میں ان خیالات کا اظہار کیا :

”مجھے ملت سے اس کا خیال تھا کہ فارسی تصنیفیں تو ان کی بہت مرتب ہوئیں اور چھاپی گئیں۔ لوگوں نے قبض اٹھائے ، تعویذ بازو بنائے مگر کلام اردو نے سوائے ایک دیوان کے ترتیب نہ پائی۔ یہ دولت ارباب شوق کے ہاتھ نہ آئی۔ حالانکہ نثر اردو ان کی اوروں کی فارسی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ یہ سلاست بیان ، شستگی زبان ، روزمرہ کی صفائی اور ان کی شوخی کس کو سیر ہے۔ اے یہی ترتیب دیجیے ، قدر دانوں پر افسانہ کیجیے۔“

اور مرزا صاحب کے شاگرد پکتا چودہری عبدالغفور سرور تخلص سے یہ ذکر آیا تو انہوں نے جننے خطوط ، مرزا صاحب کے ان کے نام آئے تھے ، سب کو ایک جا کر کے ، اور اس پر ایک دیباچہ لکھ کے وہ مجموعہ منابت کیا۔ عرصے تک سرگرم تلاش رہا۔ جا بجا سے اور قہر میں مرزا صاحب کی ہم پتچائی۔ بڑی محنت اٹھائی۔ تب سمجھا بر آئی۔ اور مجموعہ مرتب ہوا۔ آج ہوا اپنا مطلب ہوا۔ خواجہ غلام غوث خاں بے غیر تخلص جو نواب معلی القاب لٹینٹ گورنر بہادر محالک مغربی و شمالی کے میر منشی اور میرے خدمت خاص اور حضرت غالب صاحب کے مخلص بالاختصاص ہیں، اس تلاش میں میرے معین و مددگار رہے۔ بہت کچھ ذخیرہ ان کی بدولت ہم پہنچا۔ اس کتاب کی دو فصل اور ایک خانہ ہے۔ چلی فصل میں چودہری صاحب کے مرتب کیے ہوئے خطوط اور ان کا لکھا ہوا دیباچہ ، دوسری فصل میں میرے جمع کیے ہوئے رقعات اور خانے میں چند تئری ہیں جو جناب غالب نے اوروں کی کتابوں پر تحریر فرمائی ہیں۔

’عود ہندی‘ اس کتاب کا نام ہے۔ خوشبو اس کی تمام عالم میں پھیلے۔ اسی دعا پر ختم کلام ہے۔“

’عود ہندی‘ کے اس ایڈیشن میں عبدالغفور سرور نے دیباچہ لکھا تھا اور اس میں یہ خیالات ظاہر کیے تھے :

”اب ارباب اختیار کو معلوم ہو کہ میں انکسار ظہور عبدالغفور

متخلص بہ سرور ماربروی بدو شعور سے اہل سخن کا طالب اور صاحب کلام کا خواہاں تھا۔ چپ کلام بلاغت نظام رشک صائب فخر طالب جناب امده اللہ خان غالب کا دیکھا، دل کو بیایا، پکتا پایا۔ قریلی مراسلات میں قدم بڑھایا۔ ہر کتابت کا جواب آیا۔

سبحان اللہ! وہ زبان کہاں پاؤں کہ ان کے خلق کا بیان لب پر لاؤں۔ مجھ سے ناچیز حقیر پر وہ ذرہ نوازی مہر وار فرمائی کہ میری نظر میں میری آبرو بڑھائی۔ کبھی جواب مراسلہ میں لسانی و درنگ اور اصلاح شعر و عبارت میں دریغ اور تنگ نہ فرمایا۔ جو نامہ کہ بہ نام میرے بہ عبارت اردو تحریر کیا، مکتوب سادہ رویوں سے دلریا تر۔ اور ہر سطر اس کی سلسلہ سویوں سے تاپ فرسا زیادہ ہے۔ جس آنکھ نے دیکھا وہ بیٹا ہے۔ جس کان نے سنا وہ شنوا ہے۔

بس تنہا متلفظ ہونا اور آپ ہی آپ مزہ الہانا خلاف انصاف جانا دل مائل کلام بہ شہرت عام ہوا۔ اور پتوز بہ قصد نا تمام تھا کہ بہ حسن اتفاق فخر زمان، وحید دوراں، جناب ممتاز علی خان صاحب مشوٹن میرٹھ۔ کہ عالم و بھان شباب میں بہ تہذیب نفس شب بیدار، تہجد گزار، دل نرم، ہنگامہ محبت گرم، اخلاقی مجسم، شفیق مکرّم فطرت ارجمند، ہمت بلند، خصائل حمیدہ، اوصاف پسندیدہ، پاک نہاد متحد یا اتحاد، پاکیزہ روش، اخلاق منش، سخن شناس، انصاف اساس، خوش تقریر، عظیم النظیر ہیں، رونق افزائے ماربرہ ہوئے اور قدوم تقدس لزوم سے اس قصے کو مشرف کیا۔

ایک روز محفل مدوح میں ذکر ہمہ دانی و شہوا یانی جناب استاد ی و غدوسی درمیان آیا۔ ارشاد کیا کہ کلام مرزا صاحب لسم جان فرا اور شمیم دل کشا ہے۔ فارسی کا کیا کہنا، اردو بھی پکتا ہے۔ نظم و نثر فارسی میں تو مجلیٰ بہ حلیہ انطباع ہوا۔ لیکن نثر اردو زبور طبع سے عاری آیا۔ اگر وہ خطوط کہ بہ نام تمہارے آئے اور تم نے سنائے ہیں، جمع کرو تو میں بیڑا اٹھاتا ہوں۔ اس نعوید سے نسیم تاثیر نے تہجد دل کھلایا۔ منشا خاطر ظہور میں آیا۔ وہ مکتوب کہ بہ نام میرے آئے تھے، ترتیب دیے۔ گویا جواہر سے ہا کان

قلم دان سے نکل کر کشتی 'اوراق' میں جمع کیے۔ چونکہ محبت جناب غالب سرے حال پر بہت غالب ہے۔ لہذا نام۔ اس انشا کا 'سہر غالب'، مناسب ہے۔ سال ختم تالیف بھی اس نام سے مطابق پایا طبیعت اور بڑھی۔ تحریر تاریخ کو دست قلم بڑھایا۔

انشا مملو بہ حد مطالب لکھی
یعنی ہے 'دوستان طالب لکھی'
موسوم کیا جو 'سہر غالب' سے سرور
تاریخ بھی اس کی سہر غالب لکھی

۱۲۷۸ھ

کوکب شعر شاعران ہند پر تو التفات غالب سے روشن اور خاک فکر ہندیان آبیاری سکرت مبلوح سے گلشن ہو جیو۔ آمین ثم آمین! اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ سرور نے 'عود ہندی' کی اشاعت سے قبل 'سہر غالب' کے نام سے غالب کے خطوط کا مجموعہ مرتب کر لیا تھا۔ لیکن بعد میں اس کو دوسری تحریروں کے ساتھ شامل کر دیا۔ مجموعہ 'عود ہندی' کے نام سے شائع ہوا۔
'عود ہندی' کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور گذشتہ دو سال میں اس کے متعدد ذیل الیٹن شائع ہوئے:

- ۱۔ مطبع میرٹھ ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۸ع (۲ رجب ۱۲۸۵ھ)
- ۲۔ مطبع نارا تلی دہلی ۲۳ فروری ۱۸۷۸ع (۲ صفر ۱۲۹۵ھ)
- ۳۔ مطبع نول کشور کان پور ستمبر ۱۸۷۸ع (رمضان ۱۲۹۵ھ)
- ۴۔ مطبع مفید عام آگرہ مئی ۱۹۱۰ع
- ۵۔ مطبع نول کشور کان پور ۱۹۱۳ع (بآر چہارم)
- ۶۔ مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۲۷ع
- ۷۔ فیشنل پریس الہ آباد ۱۹۲۹ع
- ۸۔ مطبع انوار احمدی الہ آباد
- ۹۔ مطبع کریمی لاہور

۱۔ عبدالغفور سرور: دیباچہ 'عود ہندی'

۲۔ مولانا سہر غالب: ۳۔ ۳۔ ۳۔ ۳۔

۱۰۔ مطبع گلزار ہند اسٹیم پریس لاہور

۱۱۔ مجلس ترقی ادب لاہور۔ مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل جون

ع ۱۹۶۷

(۳)

اردوئے معلیٰ

”اردوئے معلیٰ“ غالب کے خطوط کا دوسرا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ ۶ مارچ ۱۸۶۹ء کو چھپ کر شائع ہوا۔ یہ ”اردوئے معلیٰ“ کا پہلا حصہ تھا اس میں ۶۴ صفحات تھے۔ اس کے آخر میں تین صفحات کا غلط نامہ لیا۔ اسی مطبع سے یہ حصہ دوبارہ یکم وجب ۱۳۰۸ھ (۱۱ فروری ۱۸۹۱ء) کو شائع ہوا۔

اردو معلیٰ کی ترتیب میں خود غالب نے بھی دلچسپی لی۔ وہ اس طرح کہ جب ’عود ہندی‘ کی طباعت میں تاخیر ہوئی تو بعض احباب کے اصرار پر انہوں نے اپنے کچھ خطوط جمع کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کو دوسرے مجموعے کی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں اپنے احباب کو خط لکھے اور خطوط کی نقلیں بھیجنے کی طرف اس طرح توجہ دلائی :

”مطبع اکمل المطابع میں چند احباب میرے مسودات اردو جمع کرنے اور ان کو چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگتے ہیں اور اطراف و جوانب سے فراہم کئے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا وہ جہاں بھیجتا ہوا بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمھارے پاس بہت ہوں گے۔ اگر ان کا پاسل ہنا کر یہ سبیل ڈاک بھیج دو گے یا آج کل میں کوئی ادھر آنے والا ہو اس کو دے دو گے تو موجب میری خوشی کا ہوگا۔“

(خط بنام علاؤالدین احمد خان)

”اچھی حضرت! یہ منشی ممتاز علی خان کیا کر رہے ہیں۔ رقمیں جمع کئے اور نہ چھپوانے فی الحال پنجاب احاطے میں ان کی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ ان سے کہیں

استعارات کی غجبت سے در شاہوار ہائی ہائی - جس کی رنگینی فترات سے
خون جگر لعل رسانی - نہیں نہیں - یہ متانش کچھ سرمایہ' نازش نہیں -
کیا موتی کیا لعل ان کی وجہ قدر و مقدار یعنی آب و ناب اندک
تقریر میں ناپاب ہے - اور یہ قیامت تک ہکساں - تہی دستان سرمایہ'
سخن کو فیض رساں عبارت متین کی کیفیت دیکھ کر جامی تو کیا
افلاطون غم نشیں کے نسے ہرن ہوتے ہیں اور اس کے ادراک غوامض
میں اپنی عقل و غرد کھوتے ہیں - جہاں سر خوشان خمستان معانی
جرعہ خوار ہادۂ کنتار اور نشہ' حسن بیان سے سرشار ہوں پھر ہم
سے نارسیدہ اس پختی مطالب کو کیا پائیں ، کہاں سے ایسی قوت
متخیلہ لائیں - سوائے اس کے کہ یہ راہ باریک دیکھ کر قدم لڑکھڑائیں
اور انہی نانہمی پر عری اشغال میں غوطہ کھائیں - مگر افسوس کہ
اس جنس گران ارز کا کوئی خریدار نہ ہوا اور یومف مصر سخطانی
کا طالب دیدار نہ ہوا - حضرت کا ظہور حضرت اکبر شاہ کے عہد
میں ہوتا ، شاہ عباس دارائے ایران کے عصر میں ہوتا - نظیری اپنا
نظیر دیکھ لیتا ، ظہوری کو فن شعر میں اپنا حریف غالب نظر آجاتا
غیر اب ہم یوں دل خوش کرتے ہیں کہ اگر حضرت اس وقت میں
زیست بجز جہاں ہوتے تو ہم کہاں ہوتے - یہ ہمارے طالع کی خوبی
یہ ہماری خوش نصیبی کہ ایسے منتطب روزگار کے جال یا کال سے
متقیں انوار فیض ہوئے اور شرف قدم ہوس چہرہ اندوز - جب حضرت
کو دیکھ لیا گویا سب سخندان پیشینہ کو دیکھ لیا - جب حضرت
کا کلام سن لیا سب کا کلام سن لیا - سین میرے قول کی یہ اردو کی
تحریر ہے کہ سہل الممتع بلکہ مجمع النظیر ہے - اس اردو کا لیا انداز
ہے کہ جس کے دیکھنے سے روح کو ہتزار ہے جو کہ بعد تکمیل
ہو جائے کلیات نظم و نثر فارسی کہ وہ ایک آویزۂ گوش فصاحت و
ہیراہ' گاوے بلاغت ہے اور ہندوستان سے ایران تک ہر نکتہ
سنج کی رود زبان ہے مدت سے حضرت کو طرزِ لواپاد اردو سے اکڑے
اور خط و کتابت میں اسی کا برتاؤ ہے - جب شائقین ہنر دوست نے
اس نمک ہندی کا سڑہ چکھا ، ہر ایک سرمایہ' لذت مائدہ سجد کر
طلب کر خواستگار ہوا - اس واسطے منشی جواہر سنگھ صاحب جوہر

کہ یہ صاحب اخلاق و مروت میں یکتا اور علم دوست و ہنر آشنا ملازمین معزین سرکار سے ہیں اور اب ہیشن دار ہیں عالم فارسی کو خوب جانتے ہیں اشعار بھی اسی زبان میں فرماتے ہیں منشی صاحب کے اشعار قابل دہد ہیں جناب مرزا صاحب قبلہ کے شاگرد رشید ہیں چنانچہ خود جناب مرزا صاحب فرماتے ہیں - ع - در معرکہ تبخیم کہ جوہر داریم - ان کی طبع والائے یہ اقتضا کیا کہ یہ گوہر ہائے شب فروز ملک تحریر میں منسلک ہو کر زینت بخش عروس سخن ہوں اور یہ گہائے ہراگندہ جمع ہو کر ایک جا گلستہ ہوں تا اس کی رواج روح پرور سے دماغ نکتہ سراہان غیرت چمن ہو، اس واسطے - میرنظرالدین صاحب مہتمم اکمل المطابع دہلی نے سعی بلیغ پاپاں اور لالہ بھاری لال صاحب منشی مطبع مذکور نے کوشش فراوان سے اکثر خطوط جمع کئے اور قصد انطباع کیا اور "اردوئے معنی" نام رکھا گیا اور ان خطوط کو دو حصوں پر منقسم کیا - پہلے حصہ میں صاف صاف عبارت کے خط تحریر کئے تا کہ طلبائے مدرسہ فائدہ اٹھائیں - دوسرے حصہ میں مطالب مشککہ کی تحریر اور تخریظ وغیرہ لکھی تا مستوران معنی باب اس کے دیکھنے سے مزا پائیں اور منشی صاحب موصوف نے اس ہیمچدان خاکسار یعنی مجروح دل افکار سے اس کا دیباچہ لکھنے کو فرمایا - بندہ یہ سن کر حیران ہوا کہ یا رب دو شاہوار کے سامنے خرف ریزوں کا کیا اعتبار اور لعل و زمرد میں پتھر کے ٹکڑوں کا کیا وقار - مگر الاسرفی الادب سمجھ کر اور اپنے کو اسی خوان نعمت کا ذلہ چین جان کر یہ چند سطریں لکھیں - بقول عربی :

جو ذرہ گرچہ حقیریم نسبت میں اس

کہ آفتاب بود لقطۃ مقابل ما

قربان علی بیگ سالک کی تقریظ

"شیدائیان شاہد دلفریب سخن ہر وقت اس کے خربدار اور شیفگان حسن معانی ہر دم اس کے خواستگار رہتے ہیں کہ اچھا کلام جو مطبوع طبایع ناظرین خرد پیشہ اور پسند خواطر شائقین دوست اندیشہ ہو میسر آئے - صاحب نظران دیدہ ور جن کی آنکھیں شہستان معانی کی سیر سے سیر ہوتی ہیں -

مشاہدہ ماہ پیکر ان سہر شمال سے تسلی نہیں پاتے۔ اور رنگین مشااں نکلتے
 ہرور جن کے دماغ میں گلستان سخن جو غیر اعلاام سپہر -خنوڑی و ماہ منیر
 آسمان معنی گستری شہسوار عرصہ لکھ دانی یکہ تاز میدان جادو بیانی قرمان
 روانے کشور نازک خیالی زینت الزائے اورنگ یمنالی قاتر نثری رفعت - شاعر
 شعری رتبت - چمن آرائے گلستان فصاحت - حدیقہ پرائے غیاہان بلاغت -
 فروغ ازم آفرینش - نور دیدہ ہنش - استاد یگانہ - مسلم الثبوت زمانہ روشک
 عرف و غیرت طالب جناب استاذی نجم الدولہ دہر الملک اسد اللہ خان پھادر
 نظام جنگ غالب کی زبان معجز بیان پر آیا ہوا اور خامہ "ہرورین افشاں سے
 نکلا ہوا علی الخصوص یہ سنیہ" بے نظیر و مجموعہ "دلہنہر جس کا ہر حرف
 باعث نظارۂ چشم نظارگیاں اور ہر لفظ سبب نازکی" دیدہ مشتاقان ہے۔ ہر سطر
 کو دریائے موج خیز معانی اور ہر فقرہ کو گلزار ہمیشہ چار رنگین بیانی کہنا
 چاہیے - عبارت سے سلسیل کی سلاست پیدا - مضامین سے آب کوثر کی لطافت
 ہویدا - کمنہ انداز رسا میں گردن معانی شکو - شیرینی" ادا ہر ادائے شیریں
 لبان نثار - غور کیجیے کہ فراہم آنا اس نسخہ" بے بدل کا - اور طبع ہوا
 اس کتاب سے مثل کا کیونکر غنیمت نہ سمجھا جائے۔ ناظرین کو نظر ارازی
 و شائقین کو مذاق سخن فراوانی مبارک - کیوں کر شکر فراہمی نہ ادا کیا
 جائے۔ ہاں اے سائلک اندوہیں کیسا شکر بہ کیا کلام ہے اے بے غیر
 گرم و ہنگام ماتم غم ہے -

باید چو شمع در دل شہا گریستن

مر گرم بودن از تہ دل با گریستن

نا ساؤکار جسم مرا نا گداختن

نا غوش گوار چشم مرا نا گریستن

گریست از کراوش مر چشمہ حیات

باید بعر خضر و مسیحا گریستن

ہنوز یہ نامہ" دلاویز تمام و کمال تشریف طبع نہ پا چکا تھا کہ سپہر

سے سہر نے بتاریخ ۲ ذیقعہ ۱۲۸۵ ہجری جامہ" حیات جناب مغفور و مرحوم

کو چاک کیا - آفتاب علم و کمال کو رنج خسوف دکھایا - ماہتاب فضل

و ہنر کو صدمہ" کسوف میں پھنسا یا -

اس ستم گار سے کوئی بچھے
ہاتھ اس والدہ سے کیا آیا
نہ سوجھا کہ عالم میں تاریکی چھائے گی - زمانہ کو تسکین نہ ہاتھ
آنے کی - آنکھیں اشک بار دل بیقرار ہوں گے مگر :
نیش عرق نہ از اپنے کہیں است
مقتضائے طبیعتی اپنی است

اپنی عادت سے ناچار ہے - دشمنی اہل کمال سے اس کا شعار ہے - کوئی
مبتلائے آفت ہو - خواہ گرفتار مصیبت ہو - اس کو اپنی گردن کا رنگ
دکھانا - کسی نہ کسی یگانہ آفاق کا نقل ہستی صفحہ روزگار سے مٹانا -
سخن آرائی نوحہ سرائی سے کیوں کر بدل ہو - سخن منجی کے عوض کبھی
نالہ پر درد اور کبھی آہ سرد لب پر ہے - کہے جب یہ ہار گراں اندوہ دل
پر ہو دل کی حال ہے کہ ہشہ نہ جائے - کیسی تاریخ خاتمہ کتاب - کیسا
سال وفات ہاں گفتگو کو مختصر کرتا ہوں اور ایک قطعہ لکھتا ہوں -

قطعہ

کیا کہوں کچھ کہا میں جانا
لب پہ نالوں کا از دہام ہوا
صدہ مرگ حضرت غالب
سبب رنج خاص و عام ہوا
ہے یہی سال طبع سال وفات
آج ان کا سخن تمام ہوا
(۵)

مکاتیب غالب

غالب نے دربار رام پور سے منسلک ہونے کے بعد جو خطوط والیان
ریاست کو لکھے تھے ، وہ اس مجموعے میں یک جا کر دیے گئے ہیں -
مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے ان کو مرتب کیا ہے اور ایک مفصل
مقدمے اور مفید حوالے کے ساتھ ان کو رام پور سے شائع کیا ہے - اس
کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا - اس کے بعد اس کے چار

اڈیشن اور شائع ہوئے۔ آخری اڈیشن ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔

اس مجموعے کے حروف پر یہ عبارت ملتی ہے :

”نجم الدولہ دیرالملک مرزا اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ دہلوی متخلص بہ غالب کے آون عرائض و خطوط کا مجموعہ جو نواب فردوس مکن، نواب خلد آفیاں (طاب ثراہا) یا دیگر وابستگان دربار کی خدمت میں لکھے گئے تھے۔“

مکاتیب غالب کی ترتیب اور اشاعت کی تفصیل بشیر حسین زہدی صاحب نے اس طرح بیان کی ہے :

”نواب فردوس مکن کے دامن جود و سخا میں پناہ لیتے والے حضرات کی طویل فہرست میں مفتی محمد سعد اللہ مراد آبادی ، میرزا اسد اللہ خان غالب دہلوی ، منشی مظفر علی خان امیر لکھنوی ، منشی امیر احمد مینائی ، صاحب عالم ، میرزا رحیم الدین حیا دہلوی ، شیخ علی بخش بیار ، میر عوض علی عدیل ملیح آبادی خوش نویس نستعلیق اور منشی ابنا پرشاد لکھنوی داستان گو وہ ممتاز ہستیاں ہیں جن سے ارہاب علم و ادب بخوبی واقف ہیں۔

لیکن ان تمام صاحبان فضل و کمال میں نجم الدولہ دیرالملک، میرزا اسد اللہ خان بہادر غالب دہلوی کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ آغاز ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق خیر آبادی کی وساطت سے نواب فردوس مکن نے انھیں فن سخن میں اپنا مشیر خاص مقرر فرمایا تھا۔ ابتداً نواب فردوس مکن وقتی عطیات سے میرزا صاحب کی امداد فرماتے رہتے تھے لیکن غدر کے بعد ان کی پیشین بند ہو گئی تو نواب صاحب نے جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ ماہوار تنخواہ جاری فرما دی تھی، جو ان کے انتقال کے بعد تک خلد آفیاں کے خزانے سے ملتی رہی اور مرزا صاحب کی وفات پر ان کے مینیٹر حسین علی خان شادان کے وظیفے کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔

اس رشتے کی بدولت ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء تک دربار رام پور اور میرزا غالب کے درمیان سلسلہ مراسلات جاری رہا۔ اس مراسلات کا

معتد بہ حصہ محکمہ عالیہ دارالانشا (پولیشکل ریکارڈس آفس) رام پور میں محفوظ تھا۔ ۱۹۳۵ء میں احقر نے اعلیٰ حضرت ہندوگان حضور بر نور کپتان ہڑائیس عالی جاہ ، فرزند دل پذیر دولت انگلشیہ ، مخلص الدولہ ناصر الملک، امیرالامراء نواب سید محمد رضا علی خان بہادر مستعد جنگ فرمان روائے رام پور دام اقبالہم و ملکہم کی توجہ ہابیوں اس نادر و نایاب ذخیرے کی اشاعت کی طرف مبذول کرانے کی جرات کی ۔

ہندوگان اعلیٰ حضرت کی ذات گرامی اپنے آہائے کرام کی طرح سرپرستی علوم و آداب میں عموماً اور پرورش زبان اردو میں خصوصاً اقرات و امائل میں ممتاز ہے ۔ بنا بریں حکم عالی نافذ ہوا کہ اس مجموعے کو باحسن وجوہ مرتب کر کے افادۂ ارباب ذوق کے لیے شائع کر دیا جائے ۔

میں نے مولوی امتیاز علی عرشی (ناظم کتب خانہ رام پور) کو جن میں علمی قابلیت ، ذوق سلیم اور علم و ادب کی عملی خدمت کے جذبات جمع ہیں اور مجھے ان سے آئندہ کے لیے بہت بلند اور خوش آئند توقعات ہیں ، اس ادبی خدمت کے سر انجام پر مامور کیا اور وقتاً فوقتاً مناسب ہدایات اور مشورے دیتا رہا ۔ ان کی مسلسل دو سال کی سعی و جانفشانی کے بعد آج یہ مجموعہ اس قابل ہوا ہے کہ اعلیٰ حضرت شہریار رام پور دام اقبالہم و ملکہم کے حضور میں پیش کیا جا سکے ۔“

اور مولانا امتیاز علی خان عرشی نے دیا جے میں اس مجموعے کا تعارف اس طرح کرایا ہے :

”۱۹۳۵ء میں جناب معلیٰ القاب عالی مرتبت سید بشیر حسین صاحب بہادر زیدی ، چیف منسٹر ریاست رام پور نے حقیر عرشی کو حکم دیا کہ ہندوگان اعلیٰ حضرت ہڑائیس کپتان عالی جاہ ، فرزند دلپذیر دولت انگلشیہ ، مخلص الدولہ ، ناصر الملک، امیرالامراء ، نواب سید محمد رضا علی خان بہادر مستعد جنگ فرمان روائے رام پور دام اقبالہم و ملکہم کے آہائے ہابیوں کے مطابق میرزا اسد اللہ خان بہادر

غالب دہلوی کے مکاتیب جو موصوف نے نواب فردوس سکاں ، نواب خاندان اشیان (طاب ثراہا) یا دیگر وابستگان دربار کے نام لکھے تھے ، اور عرصے سے محکمہ عالیہ دارالانشا میں محفوظ تھے ، ضروری حواشی اور ایک سیر حاصل مقدمے کے ساتھ مرتب کروں ۔

میری علمی بے مضاعفی اس بارگراں کی کسی طرح متحمل نہ تھی اور دامن ہمت اس شرف بے پایاں کے احاطے کو کوتاہ نظر آتا تھا مگر بہ مضائقے :

من دریں رتبہ از کجا ، لیکن

مور پروردہ سلیمان است

یہ تعمیل حکم ترتیب مکاتیب کا کام شروع کیا اور مسلسل دو سال کی شب و روز کی محنت کے بعد اس مجموعے کی ترتیب کے فیصلے سے سبک دوش ہوا ۔^{۱۱۱}

(۶)

خطوط غالب

غالب کے خطوط کا یہ مجموعہ منشی مہیش پرشاد نے مرتب کیا اور اس کی پہلی جلد پروفیسر عبدالستار صدیقی صاحب کی نظر ثانی کے بعد ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا ۔ اس پر عبدالستار صدیقی صاحب نے ایک عالیانہ مقدمہ بھی لکھا ہے اور اس میں مہیش پرشاد صاحب کی محنت کو سراہا ہے ۔ لکھتے ہیں :

”غالب کے اردو خطوں کے دو مشہور مجموعوں ’غود ہندی‘ اور ’اردوئے معلیٰ‘ کو شائع ہونے سے بہتر برس ہو چکے اور اب تک یہ دونوں کتابیں کئی بار چھپیں ، مگر اردو شاعر کے ان سادہ برکار نمونوں کو خوش اسلوبی سے ترتیب دینے یا ان کے متن کی ، جیسی چاہیے تھی ، تصحیح کرنے کی کوشش نہ ہوئی ۔ ہر نئی اشاعت میں کچھ نئی غلطیاں آ داخل ہوئیں ۔ جہاں تک کہ اخیر اشاعتوں کا مشکل ہی ہے کوئی صدمہ غلطیوں سے بچا ہے ۔ ان غلطیوں کی خاطر خواہ

اصلاح تب ہی ہو سکتی ، جب غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خط سب کے سب مل جائے ۔ اصل خطوط کا ہاتھ آنا تو بڑی بات، چھاپے کے برائے نسخوں کا ملنا بھی دشوار ہو گیا ۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا تھا ، کام کی مشکبیں بڑھتی جاتی تھیں اور یقین نہ آتا تھا کہ کوئی کبھی اس کٹھن کام کو کر سکے گا ۔ ہزار آئیں منی سہی پرشاد کی ہمت کو کہ وہ کمر باندھ کے اٹھ کھڑے ہوئے اور بڑی مستعدی سے غالب کے خطوں کے متعلق بہت والہ مواد جمع کیا ۔ نہ صرف 'عود ہندی' اور 'اردوئے معلیٰ' کے خطوں کو اک جا کر کے تاریخی سلسلے سے ترقیب دیا ، بلکہ جو اور خط کریں اور شائع ہوئے تھے ، ان کو بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا اور کچھ ایسے خط بھی ، نہ معلوم کن مشکلوں سے حاصل کیے ، جو اب تک شائع نہیں ہوئے تھے ۔ اس سارے قہرے کو انہوں نے تاریخی سلسلے سے مرتب کیا اور کئی برس کی لکھتار محنت اور دوڑ دھوپ کے بعد ایک ضخیم مجموعہ 'خطوط غالب' کے نام سے دو جلدوں میں تیار ہوا۔ پہلی جلد اب شائع ہوئی ہے اور امید ہے کہ دوسری جلد کا چھاپا بھی اسی سال ہو جائے گا۔“

سنی سہی پرشاد اس مجموعے کے بارے میں لکھتے ہیں :

”۱۹۲۳ء کی بات ہے کہ مجھے مرزا غالب کے خطوط کو بڑھاد پڑا ۔ اس وقت مطبوعہ خطوط کے اغلاط و اسقام معلوم ہوئے اور ان کے باب میں بعض امور کا خیال ہوا ۔ چنانچہ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج یہ نسخہ حضرت غالب کے قدردانوں کی خدمت میں پیش ہو رہا ہے۔ 'عود ہندی' اور 'اردوئے معلیٰ' میں جتنے خطوط ہیں ، وہ سب اس مجموعے میں اک جا کر دے گئے ہیں ۔ اور ان کے علاوہ بہت سے خط اس میں شامل ہیں ، جو ان دونوں کتابوں کے کسی نسخے میں نہیں ملتے۔ بلکہ کسی اور کتاب یا مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہوئے ہیں، کچھ ایسے بھی ہیں، جو اب تک کسی شائع نہیں ہوئے۔ یا شائع ہو چکے ہیں مگر ان میں جا بجا غلطیاں تھیں ۔ جو خط 'عود ہندی'“

یا 'اردوئے معلیٰ' میں ہیں ، ان کے مطابق اور تصحیح کی کوشش کی گئی ہے ۔ جہاں کہیں ایک متن کے دو یا زیادہ نسخوں میں اختلاف تھا ، بہتر صورت کو متن میں رکھا اور اختلاف اگر کاتب کے سہو پر مبنی پایا گیا تو اس سے قطع نظر کیا گیا ۔ صرف اسم اختلافات حاشے میں درج کئے ہیں ۔ کہیں کہیں متن میں کوئی لفظ کم معلوم ہوا اور اس کے بغیر جملہ ناقص ہو گیا تھا تو ضروری لفظ بڑھا دیا گیا اور اس طرح کا اضافہ کہیں دار لکھپوں کے اندر رکھا گیا ہے ۔

ہر ایک مکتوب الہ کے نام کے خط تاریخی ترتیب سے مرتب کئے گئے ہیں ۔ ہر مکتوب الہ کے نام کے چلے خط کی تاریخ کے لحاظ سے مکتوب الہوں کی تقدیم و تاخیر کی گئی ہے ۔ 'عود بندی' میں بہت تھوڑے خط آئے ہیں ، جن میں تاریخی درج ہیں مگر ان میں اکثر ایسے ہیں کہ ان میں دن اور مہینہ لکھا گیا ہے مگر سنہ نہیں ہے ۔ 'اردوئے معلیٰ' کے بہت سے خطوں میں تاریخی ہیں لیکن کہیں ہجری کہیں عیسوی تاریخیں ہیں ، کہیں دونوں ، اور بعض تاریخی غلط بھی ہیں ۔ اس مجموعے میں تمام تاریخوں کو ایک ڈھنگ پر رکھنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ جن خطوط میں صرف ہجری تاریخیں ہیں ۔ ان کے مطابق عیسوی تاریخیں خط کے آخر میں درج کر دی گئی ہیں ۔ اس التزام کے ساتھ کہ جتنا حصہ اصل میں نہیں ہے ، وہ کہیں دار لکھپوں کے اندر رکھا گیا ہے ۔ کہیں حاشے میں تاریخ درج کر دی گئی ہے ۔ جس خط میں کوئی تاریخ درج نہیں ملی ، اس کے زمانے کا تعین الدرونی شہادت یا کسی اور ذریعے سے کی گئی ۔ مثلاً منشی پرگوبائی نفاذ کے نام کے چلے خط کا وقت 'اسعد الاخبار' اگرہ کے ۲۰ اگست ۸۳۹ھ کے برجے سے معین کیا جا سکا ۔ اس لیے کہ اس میں منشی صاحب کے دیوان پر میرزا غالب کی لکھی ہوئی تفریط کا ذکر ہے ۔" غرض یہ مجموعہ بڑی محنت اور تلاش و جستجو سے مرتب کیا گیا ہے ۔ اس میں والیان ریاست رام پور کے نام وہ خط بھی شامل کر لیے گئے ہیں ،

جو 'مکاتیب غالب' کے نام سے استیاز علی عرشی صاحب نے مرتب کر کے شائع کیے تھے ۔
 اندوس ہے کہ 'خطوط غالب' کی صرف ایک جلد شائع ہوئی۔ دوسری جلد شائع نہ ہو سکی ۔

(۷)

نادرات غالب

میرن صاحب کے نواسے آفاق حسین آفاق دہلوی نے اس مجموعے میں وہ خطوط جمع کر دیے ہیں جو غالب نے منشی نبی بخش حقیر اکبر آبادی کے نام لکھے تھے ۔

میر سہدی مجروح اور میر افضل علی میرن صاحب ان خطوط کو جمع کرنے پہلے اور بالآخر یہ آفاق حسین صاحب کو ورثے میں ملے اور انہوں نے ان کو مرتب کیا، حواشی لکھے اور ۱۹۴۹ء میں پہلی بار یہ مجموعہ مشہور پریس کراچی میں چھپوا کر ادارۃ نادرات کراچی سے شائع کیا ۔
 آفاق حسین صاحب کہید میں لکھتے ہیں :

"بزرگوں کے تبرکات میں مرزا غالب کے یہ غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل تھے ، جنہیں 'نادرات غالب' کے نام سے ارباب نظر کی خدمت میں سرمایہ' ناز بنا کر پیش کیا جا رہا ہے ۔ یہ خطوط مرزا غالب کے عزیز دوست میر سہدی حسین مجروح اور میر افضل علی عرف میرن صاحب نے فراہم کیے تھے ۔ لیکن کسی وجہ سے ان کی اشاعت کی نوبت نہ آ سکی ۔ چونکہ میں نے اس خاتوادے میں آنکھیں کھولی ہیں اس لیے اس گنج گراں سرمایہ کو محفوظ رکھنے کا شرف بھی میرا ہی حصہ رہا ۔ اس صحیفہ' ادب کا مملکت و نصرف پر چند ہر چند میرے لیے قابل رشک رہا ہے ۔ لیکن دنیائے ادب کو اس سے محروم رکھنا بھی ایک گناہ ہے کم نہ تھا ۔ ویسے بھی اس کی اشاعت ادبی خدمت کے علاوہ ایک ایسا قومی فرض تھی ، جسے ادا کیے بغیر سبک دوشی ممکن نہ تھی ۔ مجھے اپنی سعادت پر بجا طور پر فخر ہے کہ یہ کام میرے ہی ہاتھوں انجام پا رہا ہے ۔ اردو زبان اپنے سرمایہ' ادب میں

اس گراں مایہ اصالے پر جس قدر ناز کرے کم ہے۔“
 ہائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے ’سرنامہ‘ کے عنوان
 سے اس مجموعے کا تعارف کرایا ہے۔ لکھتے ہیں :

”آفاق حسین آفاق صاحب میرن صاحب کے نواسے ہیں۔ ’اردوئے
 معلیٰ‘ جن کی نظر سے گذری ہے وہ میرن صاحب سے بخوبی واقف ہیں۔
 میرن صاحب کو مرزا صاحب سے عقیدت نہیں، عشق تھا اور مرزا
 صاحب بھی ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان کے پاس مرزا صاحب
 کے ہاتھ کے لکھے ہوئے پتے سے خط تھے۔ ان میں سے چند انہوں
 نے مجھے بھی عنایت فرمائے تھے۔ آفاق صاحب کو مرزا صاحب کے
 خطوط کا ایک مجموعہ جو اب تک شائع نہیں ہوا، ترکے میں ملا ہے۔
 یہ سب خط مرزا صاحب کے قدر شناس اور عزیز دوست منشی نبی بخش
 حقیر کے نام ہیں۔ مرزا صاحب منشی نبی بخش حقیر کی سخن فہمی
 اور ذوق کے بہت قائل تھے اور ان سے انہیں خاص تعلق اور خلوص
 تھا، جو ان رقعات کے لفظ لفظ سے نمایاں ہے۔ اس بنا پر یہ خطوط
 بہت بیش قدر ہیں۔

آفاق صاحب نے صرف خطوط کی اشاعت پر ہی نہیں کی بلکہ مرزا
 صاحب کے بہت سے نجی اور معاشرتی حالات، قلم سے تعلق اور
 روزمرہ کی زندگی کی بہت سی باتیں بھی اس مجموعے میں شامل کر دی
 ہیں۔ ایک اور اچھا کام یہ کیا کہ ان خطوط میں نیز دوسرے خطوط
 میں جن اصحاب اور مقامات کے نام آئے ہیں، ان کے حالات بھی
 تلاش کر کے لکھ دیے ہیں۔ بعض خطوط کے سنہ اور تاریخ کی تصحیح
 بھی کر دی ہے۔

مرزا غالب پر بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے گئے اور انہی
 اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ یہ مجموعہ جسے آفاق صاحب نے
 ’قادات غالب‘ کا نام دیا ہے، اس موضوع میں قابل قدر اضافہ ہے۔
 اس میں بہت سی ایسی باتیں ملتی ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں

ملیں گی۔ آٹائی صاحب نے نہ صرف جٹ سے ان غیر مطبوعہ قادر رفعات کو ضائع ہونے سے بچا لیا جو منشی نبی بخشی حنیز کے نام ہیں۔ بلکہ اپنی طرف سے تلاش و تحقیق کے بعد ایسے حواشی وغیرہ کا اضافہ کیا ہے جن میں بہت سی کار آمد معلومات ہیں۔“

(۸)

خطوط غالب

غالب کے خطوط کا مجموعہ مولانا غلام رسول سہر نے مرتب کیا ہے۔ اور اس مجموعے میں وہ تمام خطوط آگئے ہیں جن کا مرتب کو سراغ مل سکا ہے۔ اس میں صرف وہ خطوط نہیں ہیں جو ’مکتب غالب‘ اور ’نادرات غالب‘ میں شائع ہو چکے ہیں۔

اس مجموعے میں خطوط کو تاریخی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ جن خطوط پر تاریخیں نہیں تھیں، ان کے بارے میں داخلی شہادتوں کی بنا پر فیصلہ کیا گیا ہے کہ وہ کس زمانے کے ہوں گے۔

مولانا سہر نے اس مجموعے میں ان لوگوں کے حالات بھی بڑی محنت سے مرتب کر کے درج کر دیے ہیں، جن کو غالب نے یہ خطوط لکھے تھے۔ ابتدا میں تعارف کے عنوان سے مولانا سہر نے اس مجموعے کی خصوصیات اس طرح بیان کی ہیں :

”اس مجموعے میں میرزا کے وہ تمام خطوط آگئے ہیں، جن کا مرتب کو سراغ مل سکا۔ صرف دو مجموعوں کو چھوڑا گیا۔ ایک مکتب رام پور کا مجموعہ، دوسرا منشی نبی بخشی حنیز کے نام خطوط کا مجموعہ، جو ’نادرات غالب‘ کے نام سے چھپا۔

تمام خطوط تاریخ وار مرتب کر دیے گئے ہیں۔ جن خطوط پر تاریخی ثبت نہیں تھیں، ان کے بارے میں داخلی شہادتوں کی بنا پر قیاساً فیصلہ کیا گیا کہ وہ کس زمانے کے ہوں گے۔ اغلب ہے اکثر قیاس درست ہوں۔ اگر کہیں لغزش ہو تو اسے مرتب کی سخی نازما کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔

تمام مکتوب الہم کے حالات لکھ دے گئے ہیں تاکہ مرزا کے ساتھ ان کے تعلق کی حیثیت واضح ہو جائے اور خطوط ملاحظہ فرمائے وقت وہ حیثیت سامنے رہے۔

خطوط میں جا بجا مقامی اور تاریخی تلمیحات ہیں، جن کی حقیقت مکتوب الہم سے بخفی نہ تھی۔ لیکن عام خواندگان کرام تشریح کے بغیر انہیں سمجھ نہیں سکتے۔ اور خطوط سے پندر طالب و ذوق لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ مرتب نے حتی الامکان تمام تلمیحات کی تشریح کر دی ہے۔

ابتدا میں مقدمہ لکھا ہے، جس میں انسانے غالب کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ ان خصوصیات کو مد نظر رکھتے ہوئے خطوط کا مطالعہ یقیناً زیادہ دلچسپی کا باعث ہو گا۔^{۱۱۱} شیخ غلام علی ابتد سبز لاپور نے اس مجموعے کے کئی ایڈیشن شائع کئے ہیں، آخری ایڈیشن چوتھی بار ۱۹۶۹ ع میں شائع ہوا ہے۔

(۹)

تکات و رقعات غالب

یہ مختصر سا مجموعہ میجر فلر ڈائرکٹر محکمہ تعلیم پنجاب نے مرتب کروایا اور فروری ۱۸۶۷ء میں ہمد سعادت علی خاں صاحب نے مطبع مراچی دہلی میں چھپوا کر شائع کیا تھا۔ اس کے سرورق پر یہ عبارت ملتی ہے :

”حسب الحکم میجر فلر صاحب بہادر ڈائرکٹر پبلک اسٹرکشن مالک پنجاب“

یہ دو رسالے نامی یہ تکات غالب و رقعات غالب

تصنیف جناب اسد اللہ خاں

ہمد سعادت علی خاں کے مطبع مراچی میں طبع ہوئے

اس میں غالب کے دو مختصر رسالے شامل ہیں۔ ایک تو ”تکات غالب“

اس رسالے میں غالب نے فارسی زبان کے قواعد پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ رسالہ اردو زبان میں ہے۔ دوسرے رسالے میں غالب کے چند فارسی خطوط

ہیں جو انہوں نے 'ہنج آہنگ' سے انتخاب کیے ہیں۔
 'نکلت و رفعت غالب' کو غالب کے شاگرد ماسٹر پیارے لال آشوب
 نے مرتب کیا ہے۔

(۱۰)

قادر نامہ

اس مختصر سی کتاب کو غالب نے عارف کے بیٹوں باقر علی خاں اور
 حسین علی خاں کے لیے مرتب کیا تھا۔ یہ رسالہ 'نامہ نامہ' اور 'خالقی باری'
 کے طور پر لکھا گیا ہے۔

'قادر نامہ' کا پہلا ایڈیشن مجلس پرس دہلی سے ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) میں
 شائع ہوا تھا۔ اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں راقم نے
 دیکھا ہے۔

فارسی

(۱۱)

کلیات غالب

غالب کے فارسی دیوان کا پہلا ایڈیشن ۱۸۳۵ء میں مطبع دارالاسلام دہلی میں چھپا تھا۔ اس کے بعد کلیات مکمل صورت میں مطبع نول کشور سے ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا۔ اس کی تفصیل مالک رام نے اپنے ایک مضمون میں پیش کی ہے لکھتے ہیں :

”ہم یہ خیال کرتے ہیں حق یہ جانب ہیں کہ دیوان مستعبر،
نوسبر ۱۸۳۵ء سے ماہی میں مرتب ہوا۔ دوسری بات یہ کہ اس کا
نام ”مہخاند“ آرزو سرانجام“ رکھا گیا تھا۔ بد قسمتی سے نا حال اس کا
کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ اس وقت تک دیوان کا جو سب
سے پرانا مخطوطہ ملا ہے، خدا بخش اورنٹیل لائبریری ہنٹ میں محفوظ
ہے۔ اس کی کتابت کی تاریخ ۱۱ ربیع الآخر ۱۲۵۴ھ (۳ جولائی
۱۸۳۸ء) ہے اور اس کے کاتب غالب کے مشہور دوست لالہ چوچ مل
کھتری ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ مخطوطہ اصل نسخہ سے لمبے خالہ آرزو
سرانجام“ ہی کی نقل ہو۔ ہر حال یہ خطی نسخہ بھی غالب کا دیکھا
ہوا ہے اور اس کے حاشیے میں بعض چیزیں خود ان کے قلم سے
اضافہ ہوئی ہیں۔

فارسی دیوان پہلی مرتبہ ۱۸۳۵ء میں چھپا۔ جیسا کہ اس کے صفحہ
اول پر تحریر ہے۔ یہ نواب ضیاء الدین احمد خان نیر بخشاں کی
تصحیح و ترتیب ہے۔ مطبع دارالاسلام حوض قاضی دہلی میں طبع ہوا
تھا۔ یہ بڑے سائیز کے پندرہ سطری مسطر پر لکھا گیا ہے۔ کاتب
خوش خط اور بڑی حد تک صحیح نویس ہے غلطی کم کرتا ہے۔
اس کے آغاز اور آخر میں خود غالب کا لکھا ہوا دیباچہ اور تقریب ہے

جو اس وقت بھی دیوان میں ملتی اور پنج آہنگ کے آہنگ چہارم میں بھی شامل ہے۔ دیوان میں نظم و نثر ۵۰۶ صفحات پر محیط ہے۔^{۱۱} دیوان کا دوسرا ایڈیشن بہت مدت بعد ۱۸۶۳ ع میں شائع ہوا۔ یہ ۵۶۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۱۲)

ابر گہرہار

غالب کی یہ فائیمام مشہور کلیات فارسی میں شامل تھی۔ لیکن ۱۸۰۸ء مطابق ۱۸۶۳ ع میں حکیم غلام و غیا خان کے اصرار پر علیحدہ چھپوائی۔ یہ مشہور اکمل المطابع دہلی میں مسٹر فخرالدین کے اہتمام سے چھپی۔ اس کے ساتھ انہوں نے دو قصیدے، تین قطعے اور دس رباعیاں بھی شامل کر دیں۔ بعد میں ان کو ’سید چین‘ میں بھی شامل کر لیا گیا۔^{۱۲}

(۱۳)

سید چین

’سید چین‘ میں غالب کا متفرق فارسی کلام ہے۔ یہ مجموعہ سب سے پہلے ۱۲۸۳ء مطابق ۱۸۶۷ ع میں محمد مرزا خان کے مطبع مجددی، کوچہ چیلان دہلی میں چھپ کر شائع ہوا۔

۱۹۳۸ ع میں مالک رام صاحب نے اس کا نیا ایڈیشن تیار کیا جو جتید برق پریس دہلی میں چھپا اور مکتبہ جامع دہلی کی طرف سے شائع ہوا۔ مالک رام صاحب لکھتے ہیں: ”پہلے ایڈیشن میں ترقیہ کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ اس میں یہ قصے دور کر دیا گیا ہے۔ لیز مرزا کا بہت سا

۱۔ مالک رام: غالب کی فارسی تصانیف، انکار غالب نمبر ۱۹۶۶

صفحہ ۱۳۰

۲۔ غلام رسول مسر: غالب: صفحہ ۳۱۲

کلام جو ادھر ادھر منتشر حالت میں پڑا تھا وہ بھی اکٹھا کر کے اس میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس ایڈیشن میں ۸۰۷ شعر ہیں۔^۱

(۱۴)

ہنج آہنگ

’ہنج آہنگ‘ غالب کی فارسی نثر کا مجموعہ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن مطبع سلطان دہلی میں ۱۸۴۹ ع حکیم غلام نجف خاں کے اہتمام سے چھپا۔ یہ ایڈیشن ۹۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن اپریل ۱۸۵۳ ع میں منشی نور الدین احمد لکھنوی کے مطبع دارالسلام دہلی میں چھپ کر تیار ہوا۔ اس ایڈیشن میں ۴۴ صفحات ہیں۔ پہلے ایڈیشن کے مقابلے میں اس ایڈیشن میں دو نثری تحریریں زیادہ ہیں۔ ایک تو دیباچہ ’دیوانِ رفیعہ‘ نواب حسام الدین احمد خاں دوسرے دیباچہ ’تذکرہ الموسوم بہ طلسم راز فراہم آوردہ میر سہدی۔‘

غالب کی زندگی میں ’ہنج آہنگ‘ کے ہیں دو ایڈیشن شائع ہوئے

(۱۵)

سہر نیم روز

غالب نے ’سہر نیم روز‘ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۳ ع) میں مکمل کی اور اس کا پہلا ایڈیشن مرزا فتح الملک غلام فطر الدین عرف مرزا لغزو کے مطبع قطر المطابع دہلی سے شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن بڑے سائز کے ۱۱۶ صفحات پر مشتمل تھا۔

اس کتاب میں غالب نے خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھی ہے۔ ۱۸۵۰ ع میں بہادر شاہ ظفر نے یہ کام ان کے سپرد کیا تھا اور اس لیے وہ قلعے میں باقاعدہ ملازم ہو گئے تھے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ ’ہرتوستان‘ کے نام سے پوری تاریخ دو حصوں میں لکھیں گے۔ پہلے حصے ’سہر نیم روز‘ میں امیر تیمور سے لے کر بہایوں تک کے حالات و واقعات کی تفصیل ہوگی۔

۱۔ مالک رام : ذکر غالب : صفحہ ۱۲۷

۲۔ مالک رام : غالب کی فارسی کی تحریریں ، ”انکار“ فروزی

اور دوسرے حصے 'ماہ نیم ماہ' میں جلال الدین اکبر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کے تاریخی حالات و واقعات کا بیان ہوگا۔ بعد میں اس منصوبے میں شاہ وقت کے حکم سے یہ تبدیل ہوئی کہ بجائے امیر تیمور کے آغاز آفرینش سے اس کتاب کو شروع کیا گیا تھا۔ واقعات کو فراہم کرنے کا کام حکیم احسن اللہ خاں کے سپرد کیا گیا تھا۔ غالب ان واقعات کو قاری کے قالب میں ڈھالنے پر مامور تھے۔ غالب نے پہلا حصہ 'سہر نیم روز' تو مکمل کر لیا، اور وہ چھپ کر شائع بھی ہو گیا لیکن 'ماہ نیم ماہ' کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ کیوں کہ ۱۸۵۷ء میں غدر پڑا، اور وہ بساط الٹ گئی۔ بہادر شاہ اور ان کے خاندان پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹے۔ چنانچہ 'ماہ نیم ماہ' مکمل نہ ہو سکی۔

چونکہ 'سہر نیم روز' میں 'ماہ نیم ماہ' کا ذکر تھا۔ اس لیے لوگ اس کے بارے میں دریافت کرتے رہتے تھے۔

غالب لکھتے ہیں :

"اکثر صاحب اطراف و جوانب سے 'ماہ نیم ماہ' کے ابھرنے کا حکم بھیجتے ہیں اور میں جی میں کہتا ہوں کہ جب 'سہر نیم روز' کی عبارت نہ سمجھے تو 'ماہ نیم ماہ' کو لے کر کیا کریں گے۔ صاحب 'سہر نیم روز' کے دیباچے میں میں نے لکھ دیا ہے کہ اس کتاب کا نام 'ہرتوستان' ہے اور اس کے دو جلد ہیں۔ پہلی جلد میں ابتداء خلقت عالم سے پہاویں بادشاہ تک کی سلطنت کا بیان، پہلے حصے کا نام 'سہر نیم روز' اور دوسرے حصے کا نام 'ماہ نیم ماہ'۔ پہلا حصہ چھاپا گیا۔ جا بجا بھیجا گیا قصہ تھا جلال الدین اکبر کے حالات لکھنے کا کہ امیر نیر تک کا نام و نشان مٹ گیا۔"

(۱۶)

دستبوی

'دستبوی' کا پہلا ایڈیشن منشی بر گوہال نقشہ منشی نبی بخش حقیق، مرزا حاتم علی بیگ سہر اور منشی شیو فرائی آرام، کی نگرانی میں مطبع

مقد خلائی آگرہ میں نومبر ۱۸۵۸ء میں چھپا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۸۶۵ء میں لٹریٹری سوسائٹی روپبلکنگ ہاؤس کے مطبع میں قاضی عبد الجلیل جنوں کے ایہام سے شائع ہوا۔ تیسرا ایڈیشن اسی مطبع سے ۱۸۷۱ء میں چھپ کر شائع ہوا۔

غالب نے اس کتاب میں اپنے حالات اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی تفصیل لکھی ہے۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے اٹھوٹے نے اس کو لکھنا شروع کیا اور ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء کو ختم کیا۔
برگواں تفتہ کو لکھتے ہیں :

”میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد سحر اور اپنی سرگشت یعنی پندرہ مہینے کا حال تحریر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ دستاویز کی عبارت یعنی ہاوسی قدیم میں لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو ظلم اس میں درج ہے وہ بھی بے آسوس عربی ہے۔ ہاں امخاص کے نام نہیں بدلے وہ عربی، انگریزی، ہندی، جو ہیں لکھ دے ہیں۔“

”دستبہ“ کا فارسی متن اور اس کا ترجمہ رسالہ ”اردوئے معلیٰ“ دہلی (شمارہ ۲-۳) میں بھی شائع ہوا ہے۔

(۱۷)

کلیات نثر غالب

”پنج آہنگ“ کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا ”سپریم روز“ ۱۸۵۳ء میں چھپ نہیں سکی، اور ”دستبہ“ کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۶۵ء میں نکلا تھا۔ یہ کتابیں جلد ہی قایم ہو گئیں۔ اس لیے منشی لال کشور نے جنوری ۱۸۶۸ء میں ان تینوں کو ”کلیات نثر غالب“ کے نام سے شائع کر دیا۔

(۱۸)

قاطع برہان

غالب نے 'قاطع برہان' کو ۱۳۷۶ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں مکمل کیا اور یہ کتاب ۱۳۷۸ھ (۱۸۶۲ء) میں مطبع نول کشور میں چھپی۔ ایک روایت اس کی قیمت مقرر ہوئی۔ اس سے پہلے اڈیشن میں ۹۸ صفحات تھے۔ آخر میں غالب کی لکھی ہوئی تفریط بھی شامل تھی۔ اس کی کثافات مشہور شاعر امیر اللہ تسلیم نے کی تھی۔ ان کی تاریخ بھی اس اڈیشن کے آخر میں درج ہے۔

یہ کتاب غالب نے غلو کے بعد لکھی۔ اس زمانے میں ہر طرف خاموشی اور اداسی کا عالم تھا۔ اس زمانے میں انھوں نے وقت گزارنے کے لیے مہنہ سہن تبریزی کی کتاب 'برہان قاطع' کا مطالعہ شروع کیا۔ اس کتاب میں انھیں بے شمار غلطیاں نظر آئیں۔ چنانچہ 'قاطع برہان' کے نام سے ان اصلاحات کو شائع کیا۔

صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں :

"اس درماندگی کے دنوں میں جیسے کی 'برہان قاطع' میرے پاس تھی۔ اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزارہا لغت غلط، ہزارہا بیان لغو، عبارت بوج، اشارات ہا در ہوا۔ میں نے سو دو سو لغت کے اصلاحات لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور 'قاطع برہان' اس کا نام رکھا ہے۔ چھپوانے کا مقدر نہ تھا۔ مسودہ کاتب سے صاف گروا لیا ہے۔ اگر کہو تو بہ سبیل مستعار بھیج دوں۔ تم اور جردشہری صاحب اور جو اور سخن شناس اور متصف ہوں اس کو دیکھیں اور پھر میری کتاب میرے پاس پہنچ جائے۔"

(۱۹)

درلش کاویانی

'درلش کاویانی' در اصل 'قاطع برہان' کا دوسرا اڈیشن ہے جس کو غالب نے کچھ ترمیم اور اضافے کے ساتھ ۱۸۶۵ء میں اکمل المطابع دہلی میں چھپوا کر خود شائع کیا۔ اس اڈیشن میں کل ۱۵۶ صفحات تھے۔

‘قاطع برہان’ کی اشاعت کے بعد غالب کی مخالفت کا ایک طوفان اُٹھا اور مندرجہ ذیل رسائلے ان کے جواب میں لکھے گئے :

- ۱۔ ‘عمرق قاطع’ مولفہ مولوی سادات علی - یہ مطبوعہ ۱۸۶۳ء مطبع احمدی ماہدرہ دہلی صفحات ۹۶۔
- ۲۔ ‘سالم برہان’ مولفہ مرزا رحیم بیگ۔
- ۳۔ ‘قاطع القاطع’ مولفہ مولوی امین الدین پشاور۔
- ۴۔ ‘سوند برہان’ مولوی آغا احمد علی۔

غالب اور ان کے اصحاب نے ان کے جواب میں مندرجہ ذیل رسائلے لکھے :

- ۱۔ ‘دفاع ہڈیاں’ مولفہ نجف علی مطبوعہ اکمل المطابع دہلی ۱۸۶۳ء ۲۸ صفحات۔
- ۲۔ ‘لطائف غیبی’ ۴۴ صفحات کا یہ رسالہ دو حقیقت غالب نے خود لکھا تھا لیکن اپنے دوست سیف الحق میاں داد خان سیاح کے نام سے شائع کیا تھا۔
- ۳۔ ‘سوالات عبدالکریم’ غالب کا لکھا ہوا رسالہ ضخامت کی ۸ صفحے۔
- ۴۔ ‘نامہ غالب’ یہ خط غالب نے میرزا رحیم بیگ مصنف ‘سالم برہان’ کے نام لکھا تھا۔ اگست ۱۸۶۵ء میں چھپا۔ ‘عود ہندی’ میں بھی شامل ہے۔
- ۵۔ ‘تغییر’ غالب کا لکھا ہوا ۳۲ صفحے کا یہ رسالہ اکمل المطابع دہلی میں چھپا۔ اس میں مولوی احمد علی کے اعتراضات کے جواب میں - یہ رسالہ ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا۔

(۲۰)

گل رعنا

‘گل رعنا’ غالب کے فارسی اور اردو کلام کا انتخاب ہے۔ یہ انتخاب غالب نے کلکتہ کے دوران قیام میں اپنے دوست مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر کیا تھا۔

مالک رام صاحب اس کے متعلق لکھتے ہیں :

”مولوی سراج الدین احمد کلکتہ کے ہفتہ وار فارسی اخبار ’آئینہ‘ مسکندر کے ایڈیٹر بھی تھے۔ وہ مرزا کے کلام کے بہت قدر دان تھے۔ جناحہ انہوں نے فرمائش کی کہ آپ اپنے اردو اور فارسی کلام کا انتخاب میرے لیے تیار کر دیجیے۔ اس پر مرزا نے وہیں کلکتہ میں ۱۸۲۸-۲۹ء میں ’گل رعنا‘ کے نام سے ایک انتخاب مرتب کیا۔ بد قسمتی سے یہ کتاب ناپید ہو گئی۔ البتہ غالب نے اس کے آغاز و انجام کے لیے جو فارسی نثر لکھی تھیں، وہ محفوظ رہ گئیں اور یہ بھی اس لیے کہ یہ ’ہنج آہنگ‘ میں شامل کر لی گئی تھیں۔ اس انتخاب کے چند اوراق مولانا حسرت سوبانی مرحوم کے پاس تھے جو ان کی وفات کے بعد ان کے قیمتی کتب خانے کے ساتھ خالق ہو گئے۔ خوش قسمتی دیکھیے کہ ۱۹۵۷ء میں میرے ایک سہریان دوست نے اچانک اس کا ایک مکمل نسخہ مجھے تحفہ میں دیا۔ میرے علم میں یہ اس کتاب کا واحد نسخہ ہے۔“

مالک رام صاحب نے اس کو دلی سے شائع بھی کر دیا ہے۔ ’گل رعنا‘ کا ایک قیمتی نسخہ حکیم محمد نسی خان صاحب کے کتب خانے میں بھی ہے۔

(۲۱)

انتخاب غالب

’انتخاب غالب‘ غالب کے فارسی اور اردو کلام کا انتخاب ہے جو انہوں نے نواب خلد آشیان کی فرمائش پر ۱۸۶۶ء میں مرتب کیا۔ اس انتخاب کو امتیاز خان صاحب عروسی نے مقدمے اور حواشی کے ساتھ مطبع قیثمہ بمبئی میں چھپوا کر ۱۹۴۲ء میں شائع کیا۔ بشیر حسین زیدی صاحب ’تقریب‘ کے عنوان سے اس انتخاب کے بارے میں لکھتے ہیں :

”نواب خلد آشیان نے فارسی و اردو کے چہدہ اشعار کی ایک بیاض مرتب فرمانے کے سلسلے میں مرزا اسد اللہ خان غالب سے فرمائش کی کہ اپنے اردو اور فارسی کلام کا انتخاب ارسال کر دیجیے تاکہ اسے شامل بیاض کر لیا جائے۔ ستمبر ۱۹۶۶ء میں، میرزا

۱۔ مالک رام : غالب کی فارسی تصانیف ’انکار غالب‘ نمبر ۶۶

صاحب نے اس ارشاد کی تعمیل کی اور یکے بعد دیگرے کتابت اردو و فارسی کے خود کردہ انتخابات جدا جدا گانہ کتابی صورت میں نقل کرا کے ، نواب جلد آشیانی کے حضور میں ڈاک کے توسط سے پیش کئے ۔

سرکار کے ملاحظے کے بعد ، یہ دونوں نسخے کتاب خانے کو بھیج دیے گئے ۔ اس عہد کے منتظمین کتب خانہ نے ، صرف فارسی انتخاب کو شعبہ ”دواہین“ میں داخل ہونے کا شرف عطا کیا ، اور رسم زمانہ کے مطابق انتخاب اردو کو ناقابل التفات خیال کر کے ، کتاب خانے کے ”ردی گھر“ میں گمنامی کی گہری نیند سلا کر مطمئن ہو گئے ۔ حسن اتفاق سے مولوی اسحاق علی خاں عرشی ، ناظم کتاب خانہ نے ”ردی گھر“ کی مناع کلمہ کا جائزہ لیتے ہوئے ، دوسرے فوائد کے ساتھ اردو انتخاب بھی برآمد کر لیا ، اور میرزا صاحب کی نہکی ہوئی زندگی کا یہ کارنامہ ، ملک کے ارباب ذوق کے لیے محفوظ ہو گیا ۔“

عرشی صاحب نے اس انتخاب کی تفصیل دیہامے میں لکھی ہے اور اس کی قدر و قیمت کی وضاحت کی ہے ۔ اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں :

”مرزا صاحب نے یہ انتخاب چند روز کے اندر مرتب کیا تھا ۔ عجلت میں ہوں بھی ذہن کی تمام قوتیں کامل اشتراک و ہم آہنگی سے کام نہیں کر سکتیں ۔ میرزا صاحب کے یہاں اس پر مستزاد یہ تھا کہ آئے دن کی بیاریوں سے ان کے قولے ظاہر و باطن بے حد کمزور و ناتوان ہو گئے تھے ۔ تنگ دستی اور پریشان روزگاری نے طرح طرح کی دماغی العینوں میں الگ گرفتار کر دیا تھا ۔ اب انہیں شعر و سخن کی جگہ کافور و کفن کی پڑی رہتی تھی ۔ اور صرف موت کی آس پر ہی رہے تھے ۔ ان حالات میں مستبعد نہیں کہ اچھے برے میں فرق و تمیز کرنے وقت ان سے اچھے شعر نظر انداز ہو گئے ہوں ، اور دو چار معمولی اشعار کو کسی وقتی جفے کے تحت چن لیا ہو ۔

پہر حال یہ انتخاب بے حد قابل قدر اور غالب سے متعلق ادب میں ایسا نایاب اضافہ ہے جس کی قدر و قیمت میں برابر ترقی ہوتی رہے گی۔^{۱۱۱}

(۲۲)

مثنوی دعاء صباح

”مثنوی دعاء صباح“ اس دعا کا ترجمہ ہے جو حضرت علی سے منسوب ہے۔ غالب نے اس دعا کا منظوم فارسی ترجمہ اپنے بیاض عباس ایک عشر کی فرمائش پر کیا۔

مالک رام لکھتے ہیں :

”یہ مختصر سا رسالہ ہے۔ اوپر جلی قلم سے عربی عبارت اور اس کے نیچے کسی اور کا کیا ہوا فارسی نثری ترجمہ ہے۔ پھر اس کے نیچے غالب کا منظوم ترجمہ ہے۔ یہ مثنوی مرزا کی زندگی ہی میں مطبع نول کشور میں چھپی تھی لیکن اس پہلے ایڈیشن کے نسخے نایاب ہیں۔ میرے علم میں اس کا صرف ایک نسخہ ہے۔ اس میں کل ۲۶ صفحے ہیں۔ ”دعاء صباح“ کے ۱۲۳ شعر پہلے ۲۴ صفحوں میں آ گئے ہیں۔ صفحہ ۲۴ پر سات شعر ایک اور دعا کے ہیں جو حضرت زین العابدین سے منسوب ہے اور جس سے متعلق روایت ہے کہ اسے ”دعاء صباح“ کے بعد سجدے میں پڑھنا چاہیے۔“^{۱۱۲}

(۲۳)

متفرقات غالب

”متفرقات غالب“ میں پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب نے غالب کے متفرق کلام کو ایک نادر و نایاب بیاض کو سامنے رکھ کر مرتب کیا اور یہ کتاب ۱۹۳۷ء میں رام پور کے ہندوستان پریس میں چھپ کر شائع ہوئی۔

یہ مجموعہ غالب کے فارسی خطوط، مثنوی باد مخالف اور ایک اور

۱۔ عرشی : دیباچہ انتخاب غالب

۲۔ مالک رام : غالب کی فارسی تصانیف : ”انکار“ غالب نمبر : صفحہ ۱۰۲

مثنوی پر (جو ۱۸۵۳ ع) میں تشیع کے الزام سے برأت کے اظہار کے لیے لکھی گئی تھی، مستعمل ہے۔

مسعود صاحب 'مقدمہ' میں لکھتے ہیں :

"مرزا غالب کے غیر مطبوعہ مکتوبات و منظومات کا یہ مجموعہ جو 'معارف غالب' کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے، غالب کے قدر دانوں کے لیے خاصی دلچسپی کا باعث ہو گا۔ اور غالب کے متعلق تحقیق کرنے والوں کے لیے کچھ نیا مواد فراہم کر دے گا۔ اس مجموعے میں جو چیزیں شامل ہیں، ان کے بارے میں کچھ ضروری باتیں ذیل میں بیان کی جاتی ہیں :

میرے کتب خانے میں ایک بیاض ہے جس میں مرزا غالب کے اڑتالیس (۳۸) فارسی خط، دو فارسی قطعے، ایک فارسی مثنوی، اور ایک اردو غزل بھی شامل ہے۔ یہ کل خط ایسے لوگوں کے نام ہیں جو کلکتہ میں مقیم تھے۔ اور یہ سب نظمیں ایسی ہیں جو غالب نے کلکتہ کے قیام کے زمانے میں کہی تھیں۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کسی کلکتہ کے رہنے والے ہی نے یہ تمام چیزیں اس بیاض میں جمع کی ہیں۔ ان میں سے چند نظمیں اور چند خطوط کے اقتباس اپنے ایک مضمون کے سلسلے میں رسالہ "الناظر" لکھندو کے دسمبر ۱۹۳۸ ع کے پرچے میں شائع کر دے تھے۔"

'معارف غالب' کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں غالب کے غیر مطبوعہ خط ہیں اور دوسرے حصے میں غیر مطبوعہ منظومات۔ خط مولوی میراج الدین احمد، مرزا احمد بیگ خان، ابوالقاسم خان ادارۂ جام جہاں نما اور شیخ ناسخ کے نام ہیں۔ منظومات کے حصے میں ایک غزل در توصیف میرزا احمد بیگ خان طہان و مرزا ابوالقاسم خان قاسم، قطعہ قاسم بہ غالب، قطعہ غالب بہ قاسم، قطعہ حذیم در جواب قطعہ قاسم، مثنوی باد غالب، ایک سلام اور ایک مثنوی شامل ہیں۔ آخر میں دو ضمیمے ہیں، ضمیمہ الف میں رقعہ قاطب بنام غالب اور ضمیمہ ب میں جواب مثنوی غالب کو درج کیا گیا ہے۔

۱۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب : مقدمہ معارف غالب :

سمعود صاحب نے 'مستقرات غالب' پر ایک مفصل مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں غالب کی ان غیر مطبوعہ تحریروں کی اہمیت پر تفصیلی بحث کی ہے ۔

(۲۳)

باغ دودر

'باغ دودر' غالب کی فارسی نظم و نثر کا مجموعہ ہے ۔ اس کا واحد قلمی مسطورہ سید وزیرالحسن صاحب عابدی کے پاس محفوظ تھا ۔ اس مجموعے کو عابدی صاحب نے چلے اورنٹیل کالج میگزین میں چھاپا اور اب اس کو کتابی صورت میں بھی چھاپ دیا گیا ہے ۔ لیکن یہ کتاب باقاعدگی کے ساتھ ۱۹۷۰ ع میں اورنٹیل کالج کے جشن صد سالہ کے موقع پر شائع کی جائے گی ۔

عابدی صاحب دیباچہ " اشاعت ثانی میں لکھتے ہیں :

"اس سے پہلے 'باغ دودر' راقم نے مجلہ " دانش کدہ خاور شناسی " دانش گاہ (یونیورسٹی اورنٹیل کالج میگزین) میں دو قسطوں میں شائع کی تھی ۔ پہلی قسط میں کتاب کا حصہ " نظم ۱۹۶۰ میلادی مسیحی میں اور دوسری قسط میں حصہ " نثر ۱۹۶۱ میں طبع ہوا تھا ، لیکن تحقیق نامہ " باغ دو درجو تعلیقات پر مشتمل ہے ۔ اور تیسری قسط کے طور پر چھپنا تھا ، ابھی طبع کو نہیں دیا گیا تھا کہ کالج کی طرف سے فیصلہ ہوا کہ 'باغ دودر' ادارے کے جشن صد سالہ میں تاسیس (سال ۱۹۷۰ م) کی یاد گار مطبوعات کے سلسلے میں مستقل کتاب کے طور پر شائع کی جائے ۔ چنانچہ تحقیق نامے کو تیسری قسط کے طور پر چھاپنے کے بجائے کتاب کی اس دوسری اشاعت میں شامل کر کے پیش کیا جا رہا ہے ۔"

'باغ دودر' موجودہ صورت میں ۱۳۰ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اصل کتاب ۱۹۸۰ صفحے پر ختم ہو جاتی ہے ۔ البتہ صفحات میں عابدی صاحب کے

لکھے ہوئے حواشی ہیں۔ صفحہ ۲۹۸ پر خانمہ کاتب کے تحت مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے :

”آگریدگار سپر و ماء را سپاس کہ درس زمان فرغندہ تواناں کتاب فیض انتساب سید حین از تصنیف خان والا شان شہنشاہ قلعرو سخن گستری ، یکہ تاز عرصہ“ یعنی بروری ’علامہ عصر‘ ہانی مہانی نظم و نثر رشک عرفی و فخر طائب نجم الدولہ دہراعلک امد اللہ خان غالب رحمہ اللہ علیہ حسب فرمائش منشی پیرا سنگھ صاحب کھتری ساکن دہلی واقع کوجہ گندی کلی کہ یکے از شاگردان حضرت مصطفی اللہ بخط بدخط احقرالعباد عنایت علی تاریخ ہفتم جولائی ۱۸۶۰ع روز پنجشنبہ صورت اختتام پزیرفت۔“

اور شروع میں مندرجہ ذیل عبارت ہے :

دو در دار و این باغ آراستہ
درو بند از پر دو برخاستہ

”بنامیزد سید حین مہوہ را گویند کہ پایان موسم برشاغسار ماند و چون آن را بچیتند شاغسار سراسر بے بار ماند۔ ہر آئینہ آئینہ ہی از انطباع کلیات فارسی گفتہ شد با آئینہ ہنگام فراہم آوردن نگارش دست ہم نہ دادہ بود اینک در اوراق جداگانہ ضبط کردہ شد و این را سید حین نامیدہ آمد۔ دائم کہ از فراہم آوردن دہ ہزار بیت کلیات چہ کشود کہ ازین اہیات کہ در شاہر بہ ہزار نتواند رسید خواہد گشتود۔ ناسور کہن را از قراوش گریز نیست ، تا باید زیست سخن باید گفتہ ناچار تا زندہ ام این مجموعہ مقالات پریشان انتہا نہ خواہد پزیرفت۔ شیائکہ در علم و عمل نا تمام می گزوم۔ این نیز نا تمام خواہد ماند چون زنجیرہ نظم کراں بزہرت ، نا گہ ہاران نثری چند آوردند۔ آن را نیز دوس مجموعہ گنجائیدم و باغ دودر نامیدیم۔ از آن جا کہ سید باغ دودر یک ہزار و دوسد و ہشتاد و سہ عدد دارد۔ و از روئے حسن اتفاق با آغاز نگارش صحیفہ مطابق افتاد ، این نام لطیفہ دیگر دارد۔“

’ہایع دودر‘ کا پہلا حصہ منظومات پر مشتمل ہے ۔ اس میں قطعات ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، مثنویاں ، قصائد ، غزلیات ، فردات اور رباعیات شامل ہیں ۔ دوسرے حصے میں مثنویات کو یک جا کیا گیا ہے ۔ اس میں مختلف نگارشات، خطوط بنام منشی جواہر سنگھ جوہر، رائے جہج مل کھتری ، محمد فضل اللہ ، منشی نبی بخش ، نواب علاؤالدین خان ، جان جا کوب ، میر ولایت علی ، رجب علی خان ، تنفیل حسین خان، ہرگوپال لختہ، بالکے لال ، میر احمد حسین میکنی ، قطب الدولہ شاہ صاحب ، نوروز علی خان، بیجا سنگھ شامل ہیں ۔

عابدی صاحب نے ان سب پر مفید ، حوانسی لکھے ہیں جو کتاب کے آخر میں شامل ہیں ۔

غالب
کی
شاعرانہ عظمت

غالب ایک عظیم شاعر ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت کو سب ہی نے تسلیم کیا ہے۔ اردو میں شاید وہ تنہا شاعر ہیں، جن کی شاعری دل نشیں اور دل آویز ہونے کے ساتھ ساتھ خیال انگیز اور فکر خیز بھی ہے۔ وہ دلوں کو لپیٹتی، حواس پر مٹلاتی اور روح پر سرخوشی بن کر چھا جاتی ہے۔ لیکن اس کا سحر بس یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ وہ لکڑ کو اذن پرواز بھی دیتی ہے۔ اس کے ہاتھوں ذہن میں اجالا بھی ہوتا ہے اور وہ ادراک میں تیزی اور شعور میں بیداری بھی پیدا کرتی ہے۔ غالب صرف محسوسات ہی کے شاعر نہیں ہیں، ان کے چان غور و فکر اور سوچ بچار کا بھی خاصا سامان ملتا ہے۔ وہ زندگی کو دیکھنا اور بسر کرنا ہی نہیں سکھائے، اس میں حقیقتوں کی تلاش و جستجو کا درس بھی دیتے ہیں۔ اور نہ صرف یہ بلکہ ان حقیقتوں کے مختلف پہلوؤں کا ادراک بھی ان کے عیش نظر رہتا ہے۔ وہ بظاہر معمولی سی بات کہتے ہیں، لیکن اس کی تہ میں انسانی زندگی کی کوئی بڑی ہی اہم حقیقت ہوتی ہے۔

بادی النظر میں وہ کوئی بہت ہی معمولی سا خیال پیش کرتے ہیں، لیکن اس کی تہ میں بھی کوئی بڑا ہی فلسفیانہ نکتہ ہوتا ہے۔ غالب عظم انسان بھی ہیں اور عظیم شاعر بھی، عظیم فن کار بھی ہیں اور عظیم مفکر بھی۔ زمانے کے عظیم نباض بھی ہیں اور تہذیب کے عظیم علم بردار بھی اور ان کی شاعری ان کی عظیم شخصیت کے انہیں پہلوؤں کی ایک نہایت ہی حسین اور دل آویز تصویر ہے۔

اس تصویر میں عظمت کا رنگ بہت نمایاں نظر آتا ہے ۔ وہ بڑی ہی باوقار معلوم ہوتی ہے ۔ وجاہت اس کے ایک ایک انداز سے لٹکتی ہے ۔ شان و شکوہ اس کے ہر خط سے بھونٹا پڑتا ہے ۔ اس میں جلال بھی ہے ، جلال بھی ۔ وہ برکاز بھی ہے ، سادہ بھی ۔ اس میں گہرائی بھی ہے ، گہرائی بھی ۔ وسعت بھی ہے ، ہمہ گیری بھی ۔ بلند آہنگی بھی ہے ، آہستہ روی بھی ۔ اس میں بڑا تنوع ہے ۔ بڑی ہی رنگا رنگی ہے ۔ وہ ہشت چلو رکھتی ہے بلکہ بڑی ہی پہلودار شاعری ہے ۔ وہ آئندہ ہے اور آئندہ بھی دکھاتی ہے ۔ ہر شخص اس آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ سکتا ہے ۔ ہر فرد کو اس میں اپنے گرد و پیش کی تصویر نظر آ سکتی ہے ۔ اس کے آہنگ میں اس عہد کے دل کی دھڑکنوں کو سنا جا سکتا ہے ۔ بظاہر وہ محدود ہے کہوں کہ وہ ظرف تنگنائے غزل سے باہر نہیں نکلتی ۔ لیکن اس کی وسعتوں کا کوئی ٹیکالہ نہیں ۔ اس میں اختصار اور اجمال ضرور ہے لیکن اس کے باوجود اس میں جو غضب کی گہرائی و گہرائی ہے وہ کسی دوسری جگہ ڈھولے سے بھی نہیں مل سکتی ۔ ہر چند کہ وہ دشنہ و خنجر اور بادہ و ساغر سے گہرا ربط رکھتی ہے لیکن اس کی تہ میں ناز و غمزہ کی بات اور مشاہدہ حق کی گفتگو کو دیکھا اور سنا جا سکتا ہے ۔ وہ بڑی ہی برکاز شاعری ہے ۔ اس کو دیکھ کر بعض اوقات آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں ۔ لیکن اس کی جگمگاہٹ دلوں کو نور اور آنکھوں کو سرور بخشتی ہے ۔ وہ بڑی ہی مریض اور زورنگار ہے اور اکثر اس میں ان شبستانوں کا سا ماحول نظر آتا ہے ، جس میں ہر وقت رنگ و نور کی بارشیں ہوتی رہتی ہیں اور جن کی آب و تاب اور چمک دمک میں یہ یک وقت حسن و جلال بھی نظر آتا ہے اور عظمت و جلال بھی !

غالب غزل کے شاعر ہیں ۔ انہوں نے غزل کے بنیادی موضوع حسن و عشق کی حقیقت سے بڑی ہی بھرپور تصویریں کھینچی ہیں ۔ ان کی علیحدہ شاعری زندگی سے معمور ہے ۔ وہ زندگی آمیز بھی ہے اور زندگی آموز بھی ۔ اسی لیے وہ زندگی سے بیزاری نہیں سکھاتی ۔ بلکہ زندگی کو ہموار کرنے کا درس دیتی ہے ۔ اس میں جذبات کی بڑی اہمیت ہے لیکن وہ تمام تر جذباتی نہیں ہے ۔ اس میں روایت کے اثرات ہیں لیکن روایتی ہونے سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں ۔ اس میں ایک فرد کی انفرادی کیفیات کی ترجیح ضرور ہے ۔

لیکن وہ ایک سماجی پس منظر بھی رکھتی ہے۔ وہ اپنے زمانے کی پہلووار ہے۔ اس میں زمانے کے مخصوص حالات کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ اسی لیے اس کی سماجی اہمیت بھی ہے۔ وہ ایک تہذیب کی عکاس اور آئینہ دار ہے۔ اس میں فرائی ذہنیت کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ تو بنیادی انسانی جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ اس سے انسانی زندگی کے جذباتی پہلوؤں کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں بڑی ہی ستھری فضا ہے۔ وہ بڑی پاک صاف اور شفاف ہے۔ جیسے کوثر و نسیم میں دھل کر نکلی ہو۔ اس میں تہذیبی پہلو غالب ہے۔ وہ بڑی سہج ہے۔ اسی لیے تہذیب کرتی اور مجذب بناتی ہے۔ اس سے دلوں میں تاریکی اور آنکھوں میں الدھیرا نہیں ہوتا۔ وہ تو زندگی میں شععیں سی فروزاں کرتی اور دلوں میں دے سے جلاتی ہے۔ روشنی دینا اور منور کرنا ہر حال میں اس کے پیش نظر رہتا ہے۔ اور ہر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ جذباتی زندگی کے شعور کو عام کرتی ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر سوچنا اور غور کرنا سکھاتی ہے۔ اس لیے اس کے خالص جذباتی پہلو میں بھی ایک مفکرانہ آہنگ کا احساس ہوتا ہے اور ایک فلسفیانہ زاویہ نظر کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

یہ عقیدہ شاعری سیدھی سادا اور سہاٹ نہیں ہے۔ اس میں بیج و خم ہیں۔ نشیب و فراز ہیں۔ یہ خاصی پہلو دار ہے۔ اس میں نہیں ہیں۔ اس میں رمز و ایما ہے۔ اشارہ و کنایہ ہے۔ یہ کچھ نہ کہنے پر بھی نہ جانے کیا کیا کچھ کہتی ہے۔ اسی لیے اس میں معنوی گہرائی کا احساس بھی ہوتا ہے اور صوری گہرائی بھی نظر آتی ہے۔ غالب کی عظمت اسی میں ہے کہ عشقہ موضوعات کو پیش کرتے ہوئے وہ عینی رجحانات کا شکار نہیں ہوئے۔ ذہنی الجھنوں نے ان کا راستہ نہیں روکا۔ اسی لیے ان کی صورت مسخ نہیں ہوئی۔ وہ اس وقت کے ایک عام صحت مند انسان کی ذہنی و جذباتی کیفیت کی پوری طرح ترجمانی کرتی ہے۔ یہ انسان ایک خاص معاشرے کا فرد ہے۔ چنانچہ اس کی عام حرکات و سکنات اس معاشرے سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ اسی لیے اس کی ایک ایک بات میں اس معاشرے کا عکس نظر آتا ہے۔ غالب نے اس معاشرے میں آنے والے فرد کی جذباتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنی عقیدہ شاعری میں بے نقاب کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ غالب کی عشقہ شاعری اپنی ایک مضبوط بنیاد رکھتی ہے۔ وہ محض خیالی

نہیں ہے۔ اس میں حقیقت و واقعہ کا خون ہے۔ غلوہی و صداقت کی گرمی ہے۔ اس کا اپنا ایک نظام ہے۔ اس کا آغاز حسن ہوسنی سے ہوتا ہے کہ یہ حسن ہوسنی انسانی قہر میں داخل ہے۔ غالب نے اس حسن کو اپنے آس پاس اور گرد و پیش دیکھا ہے۔ وہ اس حسن سے متاثر ہوئے ہیں۔ اس نے ان کے دل کو لپھایا ہے۔ ان کی زندگی میں رنگینی پیدا کی ہے اور اس طرح یہ زندگی ان کے لیے بلا کی حسین اور یہ دنیا غضب کی دل آویز بن گئی ہے۔ غالب نے اس حسن اور دل آویزی سے زندگی کو بسر کرنا سیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی ان کے لیے ایک فن بن گئی ہے اور انہوں نے ہمیشہ اس کو ایک فن ہی سمجھا ہے۔ ان کی ساری شاعری میں شروع سے آخر تک اس خیال کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ زندگی کو فن بنانے کی فکر میں سرگرداں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کاوش ان کے ہاں برابر جاری رہتی ہے۔ اس لیے ان کے ہاں زندگی کے سارے ساتھ اس کا سوز بھی ملا جلا نظر آتا ہے۔ جب انہیں زندگی میں خاطر خواہ حسن نہیں ملتا اور وہ فن بنتی ہوئی نہیں دکھائی دیتی، تو وہ اداس اور غمگین دکھائی دیتے ہیں اور وقتی طور پر روٹھنے کا سا انداز ان کے ہاں پیدا ہوجاتا ہے۔ یہی ان کے غم کی بنیاد ہے۔ انہیں زندگی کو حسین دیکھنے کی کھنا ہے۔ جب یہ کھنا پوری نہیں ہوتی تو وہ اپنے اوپر اداسی طاری کر لیتے ہیں۔ ان کا دل غم کھانے میں بہت بڑا ہے۔ ان کے لیے مٹے گل قام کے کم ہونے کا رنج بھی بہت زیادہ ہے، بلکہ یہی تو ان کا غم ہے۔ اس لیے غالب نے حسن کو اتنی اہمیت دی ہے۔ یہ حسن صرف گوشت پوست کے افسانوں ہی میں نہیں ہوتا۔ یہ تو کائنات کی ہر چیز میں ہوتا ہے۔ یہ حسن قول و فعل میں بھی ہے۔ رشتے اور رابطے میں بھی ہے۔ انسان کی کوئی بات بھی اس سے خالی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب زندگی بسر کرنے کے لیے ایک حسن نظر کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہی خیال ان کی شاعری میں تہذیب کو پیدا کرتا ہے اور اسی سے وہ خود بھی سہذب بنتی ہے۔ غالب کی زندگی اور فن کا محور بھی حسن اور اس کے مختلف چلو ہیں۔ یہ حسن غالب کے ہاں کسی ایک چیز تک محدود نہیں۔ اس کا عمل دخل ہو زندگی کے مختلف اور متنوع پہلوؤں میں ہے۔ وہ تو انہیں ہر طرف جھایا ہوا نظر آتا ہے۔ اس لیے تو وہ حیرانی کے ساتھ اس کو دیکھتے ہیں اور

سوچنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ پری چہرہ لوگ کسے ہیں ؟ اور ان کا غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے ؟ شکن زلف عنبریں کیوں ہے ؟ اور نگہ سرمہ سا کی کیا حقیقت ہے ؟ اور نہ صرف یہ بلکہ یہ خیال بھی ان کے ہاں غور و فکر کی تحریک پیدا کرتا ہے کہ آخر اس کے علاوہ زندگی میں جو حسن ہے وہ کہاں سے آیا ہے ؟ سبز و گل کے حسن کا منبع کیا ہے ؟ اگر کیا چیز ہے ، ہوا کیا ہے ؟ اور یہ سلسلہ کہیں رکنا نہیں ۔ غالب کی شاعری میں الہیں مناظر اور مظاہر کی تلاش و جستجو ہے ۔ اس کا آغاز حیرت سے ہوتا ہے ۔ اور حیرت ہی غور و فکر کی بنیاد ہے ۔ لیکن غالب صرف اس غور و فکر تک ہی اپنے آپ کو محدود نہیں رکھتے ۔ غور و فکر کے ساتھ ساتھ اس سے لطف افروز ہونے اور اس کے پاتھوں پیدا ہونے والی مسرتوں سے سینہ بھر لینے کی تمنا بھی ان کے ہاں جاری رہتی ہے ۔ اس صورت حال سے ان کی عصب کو سہارا ملتا ہے اور وہ اس کے لیے ایک ستون بن جاتی ہے ۔ غالب کے عشق کا منبع بھی حسن اور اس سے پیدا ہونے والی لذت ہے ۔ اس کا وجود حسن سے دلچسپی لینے اور متاثر ہونے کے نتیجے ہی میں ہوتا ہے اور حسن سے یہ دلچسپی انسانی فطرت میں داخل ہے ۔ اس لیے غالب کے نزدیک عشق ایک بنیادی انسانی جذبہ ہے ۔ اس کے بغیر انسان کی تکمیل ممکن نہیں ۔ غالب اسے ایک رشتہ سمجھتے ہیں ۔ ان کے نزدیک وہ ایک تعلق ہے ۔ ایک لگاؤ ہے ۔ ایک نسب ہے ۔ جس کی نوعیت یہ یک وقت جذباتی بھی ہے ، ذہنی بھی ، جسمانی بھی ہے ، روحانی بھی ۔ لیکن غالب افلاطونی عشق کے قائل ہیں ۔ طبعاً وہ رومانی ہیں ۔ ان کے عشق میں اس رومانی مزاج کے اثرات بھی ملتے ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود وہ عشق کا تمام تر تخیلی تصور نہیں رکھتے ان کی شاعری میں نو عس عام انسانوں کا عشق رہتا ہے ۔ اسی لیے وہ اسے انسانوں کی جذباتی زندگی کا ایک نظام سمجھتے ہیں ۔ خواہش اور جذبہ اس عشق کی بنیاد ہے ۔ انسان اس خواہش کی تکمیل اور اس جذبے کی تعبیر جانتا ہے ۔ اس لیے فنی رابطے بنتے اور رشتے قائم ہوتے ہیں ۔ اور انسانی زندگی کے نسب و نرازا انہیں وشتوں اور رابطوں کے گرد گھومتے ہیں ۔ انسان ان کو قائم اور ہاں رکھنے کے لیے نہ جائے کیا کیا کچھ کرتا ہے ۔ عجب عجب حرکتیں اس سے سرزد ہوتی ہیں ۔ لیکن وہ اس سے دامن نہیں ہٹا سکتا ۔ ہر حال

غالب کے عشق کی نوعیت انسانی ہے۔ اس کی بنیادیں حقیقت پر استوار ہیں۔ وہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ لیکن اس کی تکمیل آسان نہیں۔ اس کے لیے تو نہ جانے کیا کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ نہ جانے کیسے کیسے بخت خواں طے کرنے پڑتے ہیں، تب کہیں جا کر وہ روق ہستی کا باعث بنتا ہے۔ اس کے بغیر الجھن بے شمع نظر آتی ہے۔ عشق سے طبیعت کو زہمت کا مزا ملتا ہے۔ وہ اسے درد کی دوا بھی سمجھتے ہیں اور درد لا دوا بھی۔ لیکن عشق کی آزمائشوں سے گذرنا ان کے نزدیک آسان نہیں۔ وہ تو اس کو ٹبرد پیشہ سمجھتے ہیں اور اسی لیے ان کے خیال میں وہ طلب کار مرد ہوتا ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تو باب ٹبرد ہونے کی ضرورت ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو انسان اس کی ایک دھمکی میں مرجاتا ہے۔ غالب عشق کا ایک فعال تصور رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ اس کو زندگی اور اس کی کشمکش سے الگ کر کے نہیں دیکھتے۔ اسی لیے معاشرتی زندگی، ان کے خیال میں، اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ معاشرتی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ حالات ہی اس کی قدریں متعین کرتے ہیں۔ ماحول ہی اس کے معیاروں کو بناتا ہے۔ یہ خیالات غالب کے عشق کو حقیقت سے قریب کرتے ہیں۔ اس کی حیثیت تمام تر جذباتی ہی نہیں رہتی۔ وہ بعض غم عشق ہی کو سب کچھ نہیں سمجھتے، غم حیات کو بھی دیکھتے ہیں۔ بلکہ بعض جگہ تو غم حیات کا خیال ان کے چہاں غم عشق پر غالب آ جاتا ہے۔ اور غم حیات ایک ایسی چیز ہے کہ محبوب کی وفا سے بھی اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ اور پورے عشق غالب کے یہاں صرف دنیاوی معاملات تک محدود نہیں ہے۔ وہ ایک روحانی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اس لیے غالب اس کے وجدانی پہلو پر بھی غور کرتے ہیں۔ اور یہیں سے ان کی شاعری میں عشق کی منکرانہ تحلیل اور اس کے فلسفیانہ تجزیے کا آغاز ہوتا ہے۔ غرض غالب کے تصور عشق کی نوعیت انسانی ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کے اظہار میں زندگی کے ان گنت انسانی اور اخلاقی حقائق بے نقاب ہوتے ہیں۔ غالب کی عظمت اس میں ہے کہ انہوں نے ان سب کو پیش کرنے میں ایک فلسفیانہ آہنگ کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور اس فلسفیانہ آہنگ کے ساتھ ایک انسان کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ جو کچھ وہ دیکھتا ہے، جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے، جو کچھ سوچتا ہے، ان سب کی تصویریں غالب کی شاعری میں ملتی ہیں۔

اس عشقیہ شاعری میں اس حقیقت کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ غالب کا مزاج بنیادی طور پر فلسفیانہ ہے ۔ اور یہ فلسفیانہ مزاج کسی حدود کا باند نہیں ہے ۔ یہ تو پھیل کر بے گراں ہونا چاہتا ہے ۔ اس کی نظر ہو ساری زندگی پر ہوتی ہے ۔ وہ تو کل کائنات کو اپنے پیش نظر رکھتا ہے ۔ غالب نے بھی اپنے آپ کو صرف عشق اور اس کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی میں تک محدود نہیں کیا ہے ۔ انھوں نے عشق کو وسعت ضرور دی ہے ۔ اس کو متنوع معاملات کا حامل ضرور بنایا ہے ۔ لیکن وہ اس دائرے سے باہر بھی نکلے ہیں اور حیات و کائنات کے مختلف مسائل کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے ۔ ان معاملات کی نوعیت ما بعد الطبیعیاتی بھی ہے ، اخلاقی بھی ۔ نفسیاتی بھی ہے ، عمرانی بھی ۔ غالب نے ان سب میں فلسفیانہ حقائق کی تلاش و جستجو کی ہے ۔ لیکن اس سلسلے میں انھوں نے جنی باتیں بھی کہیں ہیں ، وہ کسی نہ کسی زاویے سے انسان اور انسانی زندگی کو سمجھنے میں معاون ضرور ہوتی ہیں ۔ غالب ان باتوں کو اسی مقصد سے پیش کرتے ہیں ۔ ان میں انسان کی بلندی اور اس کے ارتقا اور تہذیب کا خیال ہوتا ہے ۔ غالب کے نزدیک انسان عظیم ہے ۔ اس کی عظمت کا کوئی ٹھکانا نہیں ۔ یہ دنیا ، یہ زندگی ، یہ ساری کائنات انسان کی ہے ۔ انسان کے لیے ہے ۔ انسان نہ ہو تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ۔ ان کو انسان سے الگ کرنے کا خیال غالب کے یہاں سب سے زیادہ نمایاں ہے ۔ لیکن اس کی وضاحت انھوں نے براہ راست نہیں کی ہے ۔ بالواسطہ طور پر اس خیال کو جگہ جگہ واضح کیا ہے ۔ جہاں کہیں بھی وہ انسان کی زبوں حالی ، اس کی محرومی اور ناکامی کا بیان کرتے ہیں ، وہاں در حقیقت اس کی نہ میں یہی خیال ہوتا ہے ۔ انسان کی عظمت کا احساس زندگی میں انسان کی محرومی کے خیال کو ابھارنا ہے ۔ غالب کا میلان تصورات اور عینیت کی طرف ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انسان کے لیے ایک مثالی ماحول کی تمنا کرتے ہیں ۔ اور جب زندگی میں اس کے لیے یہ ماحول نہیں پیدا ہوتا تو وہ اس کی شکایت کرتے ہیں اور یہ خیال ہر جگہ ان کے یہاں نمایاں ہوتا ہے کہ انسان اس ماحول کے نہ ہونے کے باوجود زندہ رہتا ہے اور اسی میں اس کی عظمت کا راز ہے ۔ زندگی انسان کو جینے نہیں دیتی ۔ زندگی میں وہ جن چیزوں کی تمنا کرتا ہے ، وہ اسے نصیب نہیں ہوتی ۔ لیکن اس کے باوجود وہ زندگی سے منہ نہیں

موڑنا ۔ بلکہ ان نامازگار حالات میں بھی زندگی بسر کرنا ہے ۔ غالب کی فکر میں ان خیالات کی گونج جگہ جگہ سنائی دیتی ہے ۔ اور وہ در حقیقت انہیں کی بدولت عظمت ہے ہم کنار ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

غالب کو اپنے مسائل تصوف پر بڑا ناز ہے ۔ وہ ان پر بڑا فخر کرتے ہیں اور وہ فخر و ناز بے جا نہیں ہے ۔ کیونکہ ان کے یہاں تصوف انسان اور انسانیت کی ذہنی اور روحانی تہذیب کے لیے ایک راہ عمل ہے ۔ غالب اس تہذیب پر ایمان رکھتے ہیں اور انسانی ارتقا میں ان کے نزدیک اس کی بڑی اہمیت ہے ۔ اس لیے اس کا پورا نظام غالب کے جہاں مل جاتا ہے ۔ توحید غالب کا ایمان ہے لیکن یہ توحید صرف ذات باری کے بیان تک محدود نہیں ۔ وہ تو اس سلسلے میں وحدت الوجود کے تمام پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں اور اس کا مقصد صرف مابعد الطبیعیاتی ہی نہیں ہوتا بلکہ انسان کو بعض حدود کا پابند بنانا ہوتا ہے ۔ کہ ان حدود میں رہ کر ہی ذہنی تہذیب ہو سکتی ہے ۔ اصل شہود اور شاہد و مشہود کو ایک سمجھنا ، پر حجاب کو پردہ ساز چالنا ، ایک برق حسن کے جلوے سے زمین تا آسمان پر چیز کو سرشار دیکھنا اور اسی طرح کی ان گنت باتیں جو غالب کے جہاں جگہ جگہ ملتی ہیں ، در حقیقت ان کی بنیاد انسان کی ذہنی تہذیب ہے ۔ اس طرح سوچے بغیر انسان زندگی کو سمجھا نہیں جا سکتا اور اس کی اصل حقیقت سے اس کو واقفیت نہیں ہو سکتی ۔ ان خیالات کے باوجود انسان کی زندگی میں بے راہ روی بھی پیدا ہو سکتی ہے ۔ معیاروں کا خیال اس کی نظروں سے اوجھل بھی ہو سکتا ہے ۔ بنیادی انسانی قدریں اس کے یہاں نظر انداز ہو سکتی ہیں ۔ ظاہر ہے اس طرح وہ ارتقا کے واسطے پر آگے نہیں بڑھ سکتا اور اس کی ذات ایک مثالی نظام حیات کو قائم کرنے میں معاون نہیں ہو سکتی ۔

انسان یہ سب کچھ کرنا ہے اور اس کی بدولت اسے زندگی کو بسر کرنے کے آداب آ جاتے ہیں اور وہ اس کو بسر کرتا بھی ہے لیکن اس کے باوجود زندگی بسر کرنے میں اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوتی ۔ جو کچھ وہ کرنا چاہتا ہے ، نہیں کر سکتا ۔ اسی لیے وہ زندگی میں انسان کو اس کی عظمت کے باوجود محسوس محسوس سمجھتے ہیں ۔ قید حیات و بند غم میں انہیں کبھی فرق نظر نہیں آتا ۔ انہیں تو وہ دونوں ایک معلوم ہوتے ہیں اور

ان کے خیال میں موت سے پہلے انسان کو اس سے نجات نہیں مل سکتی۔ زندگی میں انہیں موت کا کھٹکا لگا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کی نگاہیں کارگاہ ہستی میں لالچ کو داغ سناں دیکھتی ہیں اور انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ خون گرم دھقان ہی در حقیقت برق خرمین کا ہیولا ہے۔ انہیں خیالات کا یہ اثر ہے کہ غالب انسانی زندگی کو فریب اور عالم کو دام خیال سمجھتے ہیں۔ اور انہیں اس کی کوئی مضبوط بنیاد نظر نہیں آتی۔ لیکن اس کے باوجود وہ زندگی سے مایوس نہیں ہیں۔ ان کے ہاں قنوطیت نہیں ہے۔ حزن و یاس سے وہ کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ زندگی کا انداز نظر انہیں غم سے دھار کرتا ہے۔ وہ اداس ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن زندگی کی مسرتوں سے کنارہ کشی اختیار نہیں کرتے۔ مسرتوں کا خیال ہم ہر صورت ان کے پیش نظر رہتا ہے اور وہ اس خیال کو زندگی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ غالب کے خیال میں وہی انسان عظیم ہے جو ان مسرتوں کو تلاش کرتا ہے۔

یہ خیالات غالب کی شاعری میں بہت نمایاں ہیں۔ ان کو پیش کرنے میں ایک منکرانہ انداز اور فلسفیانہ آہنگ ہے۔ غالب کی بڑائی اس میں ہے کہ انہوں نے ان خیالات کو زندگی سے الگ نہیں کیا ہے۔ وہ انسانی زندگی کو سمجھنے اور بسر کرنے میں مدد و معاون ہوتے ہیں۔ انسانی زندگی سے گہرے لگاؤ ہی نے ان خیالات کو پیدا کیا ہے۔ اسی لیے ان کی بنیادوں میں استواری نظر آتی ہے۔

غالب کی فکر ماورائی نہیں ہے۔ ان کے خیالات محض مابعدالطبیعیات ہی سے تعلق نہیں رکھتے۔ ان کی نوعیت انسانی ہے اور وہ انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں انسانی نفسیات کی ترقیاتی کے ساتھ ساتھ ایک اجتماعی زاویہ نظر سے عمرانی معاملات کی ترجمانی بھی ملتی ہے۔ اپنے زمانے کے تہذیبی اور معاشرتی پہلوؤں کو انہوں نے اپنی غزلوں میں بڑی خوبی سے سمویا ہے۔ ان کی شاعری میں جگہ جگہ ان کی اپنی شکست کی آواز ضرور سنائی دیتی ہے۔ لیکن ایک تہذیب اور ایک نظام معاشرت کی آواز شکست سے بھی اس میں قدم قدم پر دوچار ہوتا بڑتا ہے۔ غالب نے لوگ ایسے ماحول میں آنکھ کھولی تھی جو انحطاط و زوال سے دو چار تھا۔ جس میں ہر چیز کی

بنیادیں ہل چکی تھیں۔ جس میں زندگی کے تمام شعبے کچھ اکٹھے اکٹھے سے نظر آتے تھے۔ تہذیب کے آفتاب کو گہن لگ رہا تھا۔ سیاسی قدروں کے ستارے جھلجھلا رہے تھے۔ معاشرتی معاشی قدروں کی شعیں بجھ چکی تھیں۔ اس صورتِ حال نے اجتماعی زندگی میں ایک حشر سا برپا کر رکھا تھا۔ نفسی نفسی کی کیفیت تھی۔ ہوں محسوس ہوتا تھا جیسے آفتاب سوا نیڑے ہر آگیا ہے۔ زندگی میں ایک عجیب انتشار تھا۔ افراد ان حالات کے ہاتھوں پریشان تھے۔ انہیں ایک حکومت کے دم توڑ دینے کا بڑا غم تھا۔ ایک تہذیب کے متزلزل ہو جانے کی وجہ سے ان کی آنکھیں پرٹم تھیں۔ ان کے دلوں میں آندھیوں کے غبار تھے۔ اور ان کی زندگی ایک ذہنی کرب کے عالم میں گزر رہی تھی۔ غالب نے اس صورتِ حال کو شدت سے محسوس کیا۔ انہیں خود بھی ان حالات کا غم تھا۔ اسی لیے ان کی آنکھیں بھی پرٹم دکھائی دیتی ہیں۔ غالب کے یہاں جو شدید غم ہے اس کی نوعیت بظاہر انفرادی نظر آتی ہے لیکن اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو اس میں اجتماعی رنگ و آہنگ کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ غالب کا سارا غم درحقیقت معاشی معاشرتی اقدار کی ناہمواری کی پیداوار ہے۔ اس ناہمواری کا نتیجہ تھا کہ غالب جو کچھ کرنا چاہتے تھے، وہ نہ کر سکے۔ انہوں نے زندگی سے جن چیزوں کا تقاضا کیا، وہ انہیں نہ مل سکیں۔ کیوں کہ حالات اس کے لیے سازگار نہیں تھے۔ ساری زندگی میں انتشار تھا۔ اس انتشار کے عالم میں افراد کی ہمتوں کے پر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی صورتِ حال غالب کے دل میں داغ بن گئی ہے۔ اور اس نے ان کی ساری شاعری میں ایک کسک کا سا عالم پیدا کر دیا ہے۔ غالب کی لے یوں تو بڑی جاندار ہے لیکن وہ اسی وجہ سے زخمی معلوم ہوتی ہے۔ اس کو سن کر دل دور آتا ہے اور آنکھیں پرٹم ہو جاتی ہیں۔

اپنے زمانے کے عمرانی معاملات کو غالب نے کھلم کھلا پیش نہیں کیا ہے۔ ان کو بھی کرنے میں ان کی تہ داری، ان کی رمزیت اور ایمانیت اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ لیکن جو شخص ذرا بھی سماجی شعور رکھتا ہے اور جس کو غزل کے مزاج سے تھوڑی سی بھی واقفیت ہے، وہ ان کی شاعری میں اجتماعی معاملات و مسائل کو بخوبی دیکھ سکتا ہے۔ غالب غزل کے مخصوص اشاروں اور کناہوں میں یہ باتیں کرتے ہیں۔ لیکن اس پردے کے

ایچھے معنویت کی جو اصلی روح ہے ، اس کو بنوی دیکھا جا سکتا ہے ۔ غالب جب دل کے سوز نہاں سے چلنے اور اپنے عدم سے بھی ابرے ہونے کا ذکر کرتے ہیں، جب ان کے یہاں تباہی اہل دنیا کا شکوہ ہوتا ہے اور وہ افسردگی کی آرزو کرتے ہیں ۔ جب ان کی تنہایی دل سے جگر تک ایک ساحل دریائے خون دیکھتی ہیں ۔ حالانکہ اس سے قبل اس رہ گزر میں جلوۂ کل بھی گرد نظر آتا تھا ۔ جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ خموشی میں نہاں لاکھوں خون گشتہ آرزوئیں ہیں اور جب انہیں اپنا وجود گور غریباں کا چراغ سرحد نظر آتا ہے ، جب وہ ہر موسم میں ماتم بال و پر کی صدائیں سنتے ہیں ، جب انہیں اپنی اسجری کا احساس ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو گرفتار الفت صیاد سمجھتے ہیں ۔ جب ان کی نظریں بادۂ شبانہ کی سرمسیوں کو ختم ہونے ہوئے دیکھتی ہیں ، جب انہیں داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی شمعیں خاموش نظر آتی ہیں تو درحقیقت ان کا زاویہٴ نظر اجتماعی ہی ہوتا ہے ۔ اور وہ اس اجتماعی زاویہٴ نظر سے اپنے زمانے کے عمرانی حقائق کو بے ثواب کرتے ہیں ۔ لیکن غالب ان عمرانی حالات کی حد درجہ ناسازگار کیفیت کو محسوس کرنے کے باوجود قنوطیت اور یاسیت کا شکار نہیں ہوتے ۔ زندگی سے روگردانی کا خیال ان کے یہاں پیدا نہیں ہوتا ۔ جولانی ان کے یہاں باقی رہتی ہے ۔ انہیں تھک کر بیٹھنا نہیں آتا بلکہ کہیں کہیں تو ایک ہلکی سی لٹکار کا سا آہنگ ان کے یہاں نمایاں ہو جاتا ہے ۔ بادۂ شبانہ کی سرمستیوں کو ختم ہوتا ہوا دیکھ کر جب وہ لنت خواب سحر سے اٹھنے اور بیدار ہونے کا بیغام دیتے ہیں تو اس خیال کی پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے ۔ غالب زندگی کے شاعر ہیں ۔ اس لیے ان حالات کی حد درجہ مایوس کن حالت دیکھ کر بھی وہ ان حالات سے مایوس نہیں ہوتے بلکہ نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے پر اکساتے ہیں ۔ زندگی اور اس کی قدروں کا خیال ہی ان سے یہ سب کچھ کراتا ہے ۔ انسانیت ہی انہیں یہ سب کچھ کرنے پر مجبور کرتی ہے ۔ یہاں بھی ایک تو تفکر کا پہلو ان کی شاعری میں غالب دکھائی دیتا ہے اور دوسرے ان خیالات کی نوعیت انسانی نظر آتی ہے ۔ اور اسی میں غالب کی ڈرائی ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ ان خیالات و نظریات نے غالب کو غنیم بنانے میں نمایاں حصہ لیا ہے ۔ معنوی گہرائی اور گہرائی ان کی عظمت کی

بہاد ہے۔ لیکن ان خیالات و نظریات کو جس طرح انہوں نے فن کا روپ دیا ہے، اور یہ معنویت جس طرح ان کے یہاں جاہلیاتی اقدار سے ہم آہنگ ہوئی ہے، اس کا بھی ان کو عظیم بدلے میں بڑا ہاتھ ہے۔ غالب کے یہاں موضوع اور فن، مواد اور ہئیت کی مکمل ہم آہنگی ملتی ہے۔ انہوں نے اظہار کے نئے حیلے تلاش کیے ہیں، فن کو نئی وسعتیں دی ہیں اور حسن و جمال کا ایک نیا عالم پیدا کیا ہے۔ ان کے اظہار میں اس تہذیب کی روح ہے جس میں انہوں نے آنکھ کھولی اور جس کے سامنے ان کا نشو و نما ہوا۔ ان کا فن اس معاشرے کا عکس ہے جس کے وہ ایک فرد تھے اور انہوں نے جن جاہلیاتی اقدار کو پیدا کیا ہے، ان میں اس زندگی کی گہری اور روشنی ہے جو خود ان کے اندر اور ان کے آس پاس اور گرد و پیش موجود تھی۔ غالب کے فن میں رجاؤں ہے، رنگینی ہے، ولولہ ہے، حوصلہ ہے۔ اس لیے وہ سجا سجا یا نظر آتا ہے اور زندگی کی شعاعیں اس میں سے بھوٹی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ غالب نے الفاظ سے بڑا کام لیا ہے۔ الفاظ جس طرح ان کے یہاں زندگی سے بھرپور نظر آتے ہیں، کسی اور اردو شاعر کے یہاں نظر نہیں آتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ غالب کے الفاظ میں معنویت کا خون ہوتا ہے، خیال کی گہری ہوتی ہے۔ اس لیے تو وہ جس شاعرانہ حسن کو پیدا کرتے ہیں، اس کی مثال ساری اردو شاعری کی روایت میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔ غالب نے ان الفاظ سے کل و کازار کھیلانے میں اور کچھ اس طرح چمن آرائی کی ہے کہ اس کی شاعری پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ ان الفاظ کو ملا کر جو ترکیبیں وہ تراشتے ہیں وہ ان کے فن میں ناکاریاں سی کرتی ہیں اور ساتھ ہی ان کی درویشی سے وہ جو ایک سوئی آہنگ پیدا ہوتا ہے اس پر سے ہزار ترم قربان کیے جا سکتے ہیں۔ غالب کے یہاں غضب کا ترم، موسیقیت اور تسک ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ غالب کی فکر ہی مترنم ہے۔ ان کے خیالات ہی اپنے اندر ایک آہنگ رکھتے ہیں۔ غالب کی تخیل بلا کی سحر کار ہے۔ اس لیے وہ تشبیہات و استعارات، علامات و اشارات کے روپ میں نئی دنیاؤں کو پیدا کرتی ہے۔ اس کی محرک تخیل کی وہ بے باکی ہے جو غالب میں بفرجہ ام موجود تھی۔ اور جس نے ان کے فن میں رنگا رنگ پھول کھیلانے میں۔ غالب کا فن مختلف رنگوں کا مرکب ہے۔ اس کا پہلا تو جذبات و سوز، تخیل کی

برواز ، ادراک کی ثبوت وجدان کے حسن ابد اور نا ابدی کی کشمکش ، جذب و مستی ، شوخی و شگفتگی ، لغالی اور جولانی ، طنز و مزاح ، جدت و ندرت اور نازہ خیالی و نازہ کاری سے تیار ہوا ہے ۔ غالب درحقیقت انہیں کا مرکب تھے ۔ اسی لیے ان کا عکس ان کے فن میں بھی نظر آتا ہے ۔ بہر حال اس میں بڑا حسن ہے ، بڑی رنگینی ہے ، بڑی رعنائی ہے ، بڑی ہی لمبے دے دینے والی کیفیت ہے ، بڑا وقار ہے ، بڑا رکھ رکھاؤ ہے ۔ وہ بڑا سہل فہم فن ہے ، وہ ایک عظیم تہذیب اور بڑی باوقار معاشرت کا عکس اور آئینہ دار ہے ۔ غالب کو عظیم بنانے میں اس فنی اور جہالیاتی پہلو کے بھی کچھ کم حصہ نہیں لیا ہے ۔ ان کو عظیم بنانے اور ان کی شاعری کو عظمت سے ہمکنار کرنے میں اس کا یہ جہالیاتی پہلو ہر امر کا شریک ہے ۔

غالب بڑے پہلو دار شاعر ہیں ۔ ان کی شاعری میں بڑا تنوع ہے ۔ بڑی ہی رنگا رنگی ہے ۔ بڑی ہی گہرائی اور گیرائی ہے ۔ وہ صرف جذبات ہی کو متاثر نہیں کرتی ، ذہن پر بھی اس کا گہرا اثر ہوتا ہے ۔ وہ خیال انگیز اور فکر خیز بھی ہے ۔ وہ انسان ، زندگی اور کائنات سے تعلق رکھتی ہے ۔ انہیں کے معاملات و مسائل کو اس نے اپنے دامن میں سمویا ہے ۔ وہ زندگی سے ایذا نہیں کرتی ، اس کو بسر کرنا سکھاتی ہے ۔ وہ کائنات سے روگردانی کا درس نہیں دیتی ، کائناتی حقیقتوں کے ادراک کی طرف منوجہ کرتی ہے ۔ ماحول سے چشم پوشی اس کا مقصد نہیں ۔ وہ تو اس کے مختلف پہلوؤں کا شعور پیدا کرتی ہے ۔ اس میں بڑی زندگی ہے ۔ وہ بڑی ہی ہمہ گیر ہے ۔ اس میں بڑا حسن ہے ، بڑی ہی دلآویزی ہے ۔ اس لیے اس میں عظمت کا احساس ہوتا ہے اور وہ خود غالب کو بھی عظیم بناتی ہے !

غالب کی شاعری
کا
آفاقی پہلو

اس میں شبہ نہیں کہ شاعری ، شاعر کے ذاتی احساسات اور انفرادی تجربات کا آئینہ ہے ۔ لیکن شاعر کی پڑائی اس میں ہے کہ وہ اپنے ان ذاتی احساسات اور تجربات میں عمومیت کا کچھ ایسا رنگ بھرتا ہے کہ وہ ایک عام انسان کے احساسات اور تجربات کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح اس کا ہر تجربہ انسانی زندگی کی ایک عام حقیقت بن کر سامنے آتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر آپ اپنی جگہ اپنی بن جاتی ہے اور ہر انفرادی خیال اور جذبے کا اطلاق عام اجتماعی اور انسانی خیال اور جذبے پر ہونے لگتا ہے ۔ بڑا شاعر صرف اس کو جذبات و احساسات ہی تک محدود نہیں رکھتا ، بلکہ اس کو فکر سے ہم آہنگ کر کے انسانی زندگی کے فلسفیانہ اور نفسیاتی حقائق کی تصویر بھی بنا دیتا ہے ۔ یہی شاعری کا آفاق پہلو ہے ۔ اسی پہلو کی بدولت شاعری عظمت سے ہم کنار ہوتی ہے اور اس کا تخلیق کرنے والا عظیم شاعر کہلاتا ہے ۔

غالب کی شاعری میں شروع سے آخر تک یہی صورت حال نظر آتی ہے ۔ وہ ایک عظیم شاعر ہیں ۔ ان کی شاعری میں عظمت ہے ۔ اس لیے کہ انہوں نے اس میں جن جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے ، ان میں ہر جگہ آفاقی پہلو اپنی جھلک دکھاتا ہے ۔ بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں وہ مقامات بھی آتے ہیں ، جہاں یہ آفاقیت اپنے معراج کمال پر نظر آتی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آفاقیت کے اس معراج کمال میں نے انہیں عظیم بنایا ہے۔ اس آفاقیت میں کا یہ اثر ہے کہ غالب کی شاعری میں تاثر کا سحر پیدا ہو جاتا ہے اور ان کے اشعار دلوں میں اترتے ہیں

اور روح پر سرخوشی بن کر چھا جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ انسان ان کی شاعری میں اپنے ہی جذبات و احساسات کا ارتعاش محسوس کرتا ہے اور اس آئینے میں اس کو اپنے ہی انکار و خیالات اور معاملات و مسائل کے خد و خال بے نقاب نظر آتے ہیں۔

یہ شاعری موضوع کے اعتبار سے وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ اس میں تنوع اور رنگا رنگی ہے۔ وہ ظرف تنگنائے غزل میں محدود ہونے کے باوجود اپنے دامن میں کشادگی رکھتی ہے۔ اس میں حسن کی رنگینیاں، محبوب کی رعنائیاں، عاشق کی الم سامانیاں، سب ہی کچھ موجود ہیں۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان موضوعات کے ان گنت پہلوؤں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ محبوب کے بیان حسن میں، اس کی سیرت و شطصیت کی ترجمانی میں، عشق و عاشقی کی بے شمار واردات و کیفیات کے تذکرے میں، زندگی کی مسرتوں اور شامعانیوں، محبوریوں اور محرومیوں کی شاعرانہ عکاسی میں، ہر انسان کو اپنی ہی تصویر دکھائی دیتی ہے۔

حسن و جمال اور اس کے مختلف پہلوؤں کا احساس غالب کی شاعری کا ایک اہم موضوع ہے اور ان سب کا بیان انہوں نے بڑے ہی دلیچسپی سے کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حسن و جمال سے دلچسپی غالب کی گھٹی میں بڑی تھی۔ اس دلچسپی کو پیدا کرنے میں ان کی لسانی خصوصیت اور خاندانی سزاج کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ ماحول کے اثرات بھی اس میں شامل تھے۔ کیونکہ جس ماحول میں غالب نے آنکھ کھولی اور جس تہذیبی روایت کے سائے میں ان کا نشو و نما ہوا، اس میں حسن اور حسن پرستی کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ ناسازگار سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات نے اس تہذیبی روایت کی بہت سی دوسری خصوصیات کو پس منظر میں ڈال دیا تھا۔ شجاعت اب صرف تصور میں باقی رہ گئی تھی۔ سپہ گری کا خیال صرف فخر کرنے کے لیے افراد کے دلوں میں پیدا ہو جاتا تھا لیکن احساس حسن اور ذوقِ جمال کی شمعیں ابھی تک اس تہذیبی روایت کی محرابوں میں فروزاں تھیں۔ اب یہ احساس حسن اور ذوقِ جمال باعث تسکین ہی نہیں تھا، اس کی حیثیت ایک پتہ گاہ اور وسیلہ فرار کی بھی ہو گئی تھی۔ وہ غم غلط کرنے کا ایک ذریعہ اور سنگین حقائق کو تھوڑی دیر کے لیے فراموش کر دینے کا ایک وسیلہ بھی تھا۔ لیکن بنیادی طور پر

یہ احساس حسن اور ذوقِ جمال، ایک عام انسان کی فطری کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ غالب نے اپنی شاعری میں جہاں حسن اور اس کے متعلقات کی توجہ کی ہے، وہاں عام انسان کی فطری کیفیت کو ظاہر کیا ہے۔ اور بات ہے کہ اس میں ایک تہذیب کی حسن پرستی بھی اپنی جہلک دکھائی ہے۔ غالب نے اس حسن اور حسن پرستی پر کیسے کیسے حسین اور دلنویز اشعار کی تخلیق کی ہے :

سادگی و ہرکاری ہے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آڑا پایا

شب ہوئی بھر انہم رخشندہ کا منظر کھلا
اس نکاف سے کہ گویا ہت کندے کا در کھلا
منہ نہ کھلتے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

رنگ شکستہ، صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتی گل پائے ناز کا

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

کوئی میرے دل سے بوجھے، ترے تیر نکش کو
یہ غلج کہاں سے ہوئی جو جگر کے ہار ہوتا

جلی اک کوئلہ گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتدلہ فتنہ، عشق نہ ہوا نہا

جہاں تیرا نقش قدم دیکھے ہیں
خیابان خیابان ارم دیکھتے ہیں

دل سے مٹا تری انگشت حنائی کا خیال
ہو گیا، گوشت سے ناعن کا جدا ہو جانا

جب وہ جال دل فروز، صورت مسر نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں

دیکھو تو دل فریبی "اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا کل کتر گئی

دل ہوائے خرامِ ناز سے بھر
عشرستان سے فراری ہے

جال جیسے کڑی کہاں کا تیر
دل میں اوسے کے جا کرے کوئی

ساقی یہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب یہ نغمہ ریزن تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہٴ بساط
داہان باغیان و کف کل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جُشتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے

نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تندِ خو کیا ہے

مانگے ہے بھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشان کیے ہوئے
جا ہے بھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرے سے تیز دشنہٴ مڑگل کیے ہوئے
اک نو بہاؤ ناز کو تاکے ہے بھر نگاہ
چہرہ فروغ سے ہے گلستان کیے ہوئے

بظاہر یہ اشعار غالب کے ذاتی اور انفرادی تجربات سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں ان کا ذاتی رد عمل بھی نمایاں نظر آتا ہے لیکن ان میں جو باتیں کہیں گئی ہیں ، ان کا اطلاق ہر انسان پر ہو سکتا ہے ۔ ان تجربات میں ہر انسان کو اپنے ہی تجربات کی جھلک نظر آتی ہے ۔

غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان تجربات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ ہر شخص کو اپنے تجربات معلوم ہوتے ہیں اور ان میں اپنے مخصوص انداز بیان سے یہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ وہ دل میں اتر جاتے ہیں ۔ ان کو دیکھ کر ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ تو میرے ہی دل کی بات ہے ۔ غالب کے جاں اس سلسلے میں ایک جدت اور اچھونا پن ہے ، جو دلوں میں اپنی جگہ بناتا ہے ۔ اس میں التہاب کی کیفیت ہے ، جو حواس کے تاروں میں ارتعاش کی سی کیفیت پیدا کرتی ہے اور ان تمام باتوں سے مجموعی طور پر ان کے اس قسم کے اشعار میں ایک آفاقی رنگ و آہنگ پیدا ہو جاتا ہے ۔

حسن اور حسن پرستی کے ساتھ غالب کی شاعری میں عشق و عاشقی کے معاسلات اور واردات و کیفیات کی توجہانی بھی ملتی ہے اور حسن پرستی کے موضوعات کے مقابلے میں عشق و عاشقی کے موضوعات کچھ زیادہ ہی نمایاں نظر آتے ہیں ۔ ان معاسلات اور واردات و کیفیات میں غالب نے بڑا تنوع پیدا کیا ہے ۔ وہ بہت وسیع اور پھیلے ہوئے ہیں ۔ کیونکہ ان میں انسانی زندگی کے رنگا رنگ تجربات کی تصویریں ملی ہیں ۔ ان تصویروں میں حقیقت پسندی کا رنگ بہ کھرا ہے ۔ ان میں روایت سے تھوڑا سا انحراف ضرور ملتا ہے ۔ جذبے کے ساتھ شعور کی ہم آہنگی بھی نظر آتی ہے ۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود غالب نے ان کو اس طرح شاعری کے سانچے میں ڈھالا ہے کہ وہ ان کے انفرادی معاسلات اور جذبات و احساسات ہونے ہوئے بھی عام انسانوں کے جذبات و احساسات معلوم ہوتے ہیں ۔ کیونکہ ان میں رومان حقیقت کے ساتھ اور جذبہ شعور کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے ۔ غالب نے ان کو اس طرح شاعری کے سانچے میں ڈھالا ہے کہ وہ ان کے انفرادی معاسلات اور جذبات و احساسات ہونے ہوئے بھی عام انسانوں کے معاسلات اور جذبات و احساسات

معلوم ہوتے ہیں اور ان میں انسانی زندگی کے نفسیاتی حقائق کی صحیح تصویریں نظر آتی ہیں۔ یہ اشعار ان کی شاعری کے اسی رجحان کے صحیح ترجمان اور عکس ہیں :

عشق سے طبیعت نے زیست کا سزا پایا
درد کی دوا ہائی ، درد ہے دوا پایا

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

وائے دیوانگیؔ شوق کہ ہر دم عجب کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود ہشیاں کا ہشیاں ہونا

مے نیازی حد سے گنری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا

کوئی میرے دل سے ہوجھے ، قرے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی ، جو جگر کے ہار ہونا

غم فراق میں تکلیف میری کل مت دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

گو میں رہا رہیں ستم ہائے روزگار
لیکن قرے خیال سے غافل نہیں رہا

درد دل لکھوں کیوں کر ، جاؤں ان کو دکھلاؤں
انکھیاں لگا رہی ، غامہ غوں چکی اپنا

وہ لڑ تاصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا ابھی تو آخر زور چلنا ہے گریباں پر

میں اور صد ہزار نوائے جنگر خیراں
تو اور ایک وہ وہ تنہا کہ کیا کہوں

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پہوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل! تیرا ہی سنگ آستان کہوں ہو

رہے اس شوخ سے آوردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف پر طرف تھا ایک انداز جنوں وہ ابھی

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
سبزی وحشت تری شہرت ہی سہی

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رنگ آ جائے
میں اے دیکھوں پہلا کب مجھ سے دیکھا جائے
گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار واز عشق
پر ہم ایسے کھوئے جائے ہیں کہ وہ ہا جائے ہے

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ ہمار کا حال اچھا ہے

جی ڈھونڈنا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بٹھتے رہیں تصور جاننا کیے ہوئے

یہ اسماع عشق و عاشقی کے مختلف پہلوؤں کی تصویریں پیش کرتے
ہیں۔ ان میں ایک خاص مزاج، ایک خاص افتاد طبع، ایک خاص زاویہ نظر،
ایک خاص تہذیبی فضا اور ایک خاص معاشرتی ماحول کے اثرات بہت نمایاں
ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان میں ایسے جذبات و احساسات کی
ترجائی ہے، جو تمام انسانوں میں مشترک ہیں۔ جو ازل سے ہیں اور جو
ابد تک رہیں گے۔ ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عشق انسان کا بنیادی جذبہ
ہے اور اس جذبے کے زیر اثر جو کیفیات اس پر طاری ہوتی ہیں، وہ بالکل

فطری ہیں۔ ہر انسان کو ان منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہی ان کا آفاق پہلو ہے اور غالب نے اس قسم کے اشعار میں اسی آفاق پہلو کو نمایاں کیا ہے۔

عشق اور اس کی واردات و کیفیات بھی عجیب عجیب صورتیں اختیار کرتی ہیں۔ کبھی تو انسان اس راہ پر حل کر اس کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے اور مسرتوں سے اپنے سینے کو بھر لیتا ہے۔ لیکن کبھی یہ مسرتیں ایسے نصیب ہی نہیں ہوتیں اور اس راہ کی ہر منزل اس کے لیے رنج و غم کا سامان پیدا کرتی ہے۔ انسانی زندگی میں یہ دونوں پہلو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ملے جلتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ہر مسرت پر غم کا سایہ ہوتا ہے۔ ہر شادمانی بالآخر المیائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ عشق کی رنگینیوں اور رعنائیوں کا خاتمہ محرومیوں اور ناکامیوں پر ہوتا ہے اور ان رنگینیوں اور رعنائیوں کے ہاتھوں پرنا ہونے والی مسرتیں اور شادمانیاں، مصائب و آلام میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں ذوق و صل و یاد یار تک باقی نہیں رہتی۔ وہ اندوہ و نا سے اپنے آپ کو جھڑانا چاہتا ہے لیکن اس کا محسوس ستم گر اس پر راضی نہیں ہوتا۔ نہر بھی محبوب سے محبت اور اس سے لطف اندوز ہونے کی آرزو بہر حال اس کے دل میں باقی رہتی ہے۔ وہ اس کے کوچے میں جاتا ہے، رہ گذر پر بیٹھتا ہے لیکن خواہش پوری نہیں ہوتی اور آرزو کی تکمیل کا سامان پیدا نہیں ہوتا۔ وہ زمانے کے ستم بھی اٹھاتا ہے۔ نامازگار حالات بھی اس کے راسخے میں حائل ہوتے اور سامان ستم بنتے ہیں۔ وہ وہیں ستم پائے روزگار رہتا ہے۔ لیکن محبوب کے خیال سے نہر ابھی غافل نہیں رہتا۔ اسی عالم میں وقت گذرتا جاتا ہے۔ رخصتی عمر کی رفتار نیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے اور وہ وقت کے ساتھ ساتھ فنا کے قریب ہوتا جاتا ہے۔ بالآخر شعلہ عشق سپہ بوش ہو جاتا ہے، تنہا کی شمع بجھ جاتی ہے، آرزو کا چراغ گل ہو جاتا ہے۔ یہی انسانی زندگی کا انجام ہے۔ یہی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ کسی انسان کو ان حالات سے منہ نہیں۔

غالب عشق و عاشقی کے معاملات اور واردات و کیفیات کی ترجمانی میں انسانی زندگی کے انہیں حقائق کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ غالب نے عشق و عاشقی کے مختلف پہلوؤں پر اپنی شاعری میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ اس میں شبہ نہیں، کہ آپ بیتی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن غالب کی انسان دوستی، انسانیت پرستی اور اقلیت پسندی نے ان سب میں ایک جگہ اپنی کارنگ و آہنگ ضرور پیدا کر دیا ہے۔ وہ جب انہی بات کرتے ہیں اور انہی انفرادی جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں، تو اس میں ایسی باتیں زیادہ ہوتی ہیں، جو تمام انسانوں میں مشترک ہیں۔ غالب کے ایسے ہی اشعار میں ان کا انسانی شعور اپنے شہب پر نظر آتا ہے اور نفسیاتی زوف یعنی اپنے معراج کمال پر دکھائی دیتی ہے۔

غالب کے اس انسانی شعور اور نفسیاتی زوف یعنی نے ان کی شاعری میں ایسے موضوعات کو بھی جگہ دی ہے، جو حیات و کائنات کے بنیادی معاملات و مسائل کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور ان کی شاعری میں ان موضوعات کو نمایاں جگہ حاصل ہے۔ اور یہی موضوعات ہیں، جن کی بدولت ان کی شاعری عظمت سے ہمکنار نظر آتی ہے۔ حسن و عشق کے معاملات و مسائل کو بھی، وہ حیات و کائنات کے معاملات و مسائل سے الگ کر کے نہیں دیکھتے۔ بلکہ ان کو انہی مسائل کا حصہ سمجھتے ہیں اور انسانی زندگی کے بنیادی معاملات و مسائل سمجھ کر ان کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر ان کی نگاہ ٹھہر و تحسین اس حقیقت کی بھی جستجو کرتی ہے کہ خود زندگی کیا ہے؟ اس زندگی میں انسان کی کیا حیثیت ہے؟ وہ زندگی کے تقاضوں کو کسی حد تک پورا کرتا ہے؟ اور پھر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ زندگی بے ثبات ہے۔ اس کی حیثیت خواب و خیال سے زیادہ نہیں۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ وہ عظیم ہے اور اس کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ وہ زندگی کے اس احساس بے ثباتی کے باوجود اس کو پس کرنا ہے اور اس کو برتنے میں پیش پیش رہتا ہے۔ اس سلسلے میں اپنی ذات کا احساس اور خودی کا خیال اس کے لیے تسخیر راہ ثابت ہوتا ہے اور وہ اسی کی روشنی میں ناسازگار حالات کی تاریکیوں کو جبرنا ہوا زندگی کے راسخے پر آگے کی طرف بڑھتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود زندگی کے تجربات اس کو قدم قدم پر یہ احساس دلاتے ہیں کہ وہ مجبور محض ہے اور اس کو خود اپنا وجود ان حالات کا شکوہ منج نظر آتا ہے۔

اسی لیے غالب کی نگاہ دور رس زندگی میں غم کو دیکھتی ہے اور وہ قہر حیات اور بند غم کو لازم و ملزوم سمجھنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ خواہش و آرزو اس غم میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ ہزاروں خواہشیں ایسی ہوتی ہیں کہ ہر خواہش پر اس کا دم نکلتا ہے۔ لیکن اس زندگی میں یہ خواہشیں ابھلا کب تکمیل سے پہنچنا ہوتی ہیں۔ یہ صورت حال تو انسان کو خود اپنا نوحہ خواں بنا دیتی ہے اور وہ داغ حسرت ہستی لیے ہوئے ایک شمع کشتہ کی طرح اس زندگی سے رخصت ہوتا ہے۔ انسان کی بڑائی اس میں ہے کہ ان تمام حالات کے باوجود زہمت کرنے کی شمع اس کے دل میں فروزاں رہتی ہے اور وہ زندہ رہنے کی جد و جہد کرتا ہے۔ ہر انسان کو زندگی کے سفر میں ان منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ غالب نے ان بنیادی انسانی حقائق کی ترجمانی بڑے ہی منکرالہ انداز میں کی ہے۔ یہ اشعار ان کے اس قسم کے انکار و خیالات کو پوری طرح پیش کرتے ہیں :

انقش فریادی ہے کس کی شوخی "تحریر کا
کاغذی ہے پیریں ہر لیکر تصویر کا

غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس کھر کو لگی ایسی کہ جو تھا، جل گیا
میں ہوں اور انسردگی کی آرزو، غالب! کہ دل
دیکھ کر طرؤں تباہ اہل دنیا، جل گیا

ہوئے گل، نالہ "دل، دود چراغ محفل،
جو نری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا

نہا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر یہی سرا رنگ زرد تھا
دل تا چکر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل، آگے گرد تھا

دہر میں نقشِ وفا ، وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا
کس سے ، محروسی ، قسمت کی شکست کچھے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں ، سو وہ بھی نہ ہوا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ ، تیرے جلوے نے
کمرے جو پرتو خورشید ، عالم شہنشاہ کا
مری تعمیر میں مضمحل ہے اک صورت خرابی کی
ہولی برفِ غم کا ہے ، غون گرم دھپان کا
نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ نقا غالب !
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشان کا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہونا
اگر اور جتنے رہے ، یہی انتظار ہوتا
غم اگرچہ جان گسل ہے ، یہ کہاں بھی کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا ، غم روزگار ہوتا

بندی میں بھی وہ آزاد و خود ہیں کہ ہم
اٹنے نہر آئے ، در کعبہ اگر وا نہ ہوا

میں اور بزم سے بے یوں نشہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

ہوں مدت کہ غالب مر گیا ، پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہتا کہ 'ہوں ہوتا تو کیا ہوتا ؟'

منظر اک بلندی پر اور ہم بتا سکتے
عرش سے ہرے ہوتا کاش کے ، مکان اپنا
ہم کہاں کے دانا تھے ؟ کس ہنر میں پکتا تھے ؟
سے حبیب ہوا غالب ! دشمن آسمان اپنا

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھمرائیں کیا

نہ کل نغمہ ہوں، نہ پردہ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

ایک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمیؔ بزم ہے اک رقص شر ہوئے نگ
غم ہستی کا امد کس سے ہو جز مرگ علاج
ضح پر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوئے اک

نغمہ ہائے غم کو ہی اے دل غنیمت جانے
بے صدا ہو جانے کا یہ ساز ہستی ایک دن

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آسان ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
ریخ سے خوگر ہوا انسان تو مٹے جاتا ہے ریخ
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آسان ہو گئیں

قید حیات و بند غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات ہائے کہوں

ہے آدمی بجائے خود اک محسر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

خیال مرگ کب تسکین دل آزدہ کو بخشے
مرے دام کتنا میں ہے اک صید زبوں وہ بھی

میں "عشرت کی خواہش ساقی" گردوں سے کیا کہے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگون وہ بھی

خزاں کیا ؟ فصل گل کہتے ہیں کس کو ؟ کوئی موسم ہو،
وہی ہم ہیں ، فلس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خون کرنے کی فرصت ہی یہی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
ہوں جن سے نفع ہستی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تلخ ستم نکلے

ان اشعار میں جو جذبات و احساسات اور افکار و خیالات پیش کئے گئے ہیں ، ان کا تعلق کسی نہ کسی طرح انسانی زندگی کے بنیادی حقائق سے ہے ۔ ازل سے انسان ان حقائق سے دوچار ہے ۔ زندگی کے سفر میں قدم قدم پر ایسی منزلیں آتی ہیں ، جب اس کو ان حقائق کا احساس ہوتا ہے کہ یہ زندگی بے اساس اور اس زندگی میں اس کی ہستی بے ثبات ہے ۔ اس کا وجود ہی فنا کی دلیل ہے ۔ زندگی ایک کرب مسلسل ہے اور وہ اس کرب مسلسل میں زندگی کے دن گزارتا ہے ۔ اس زندگی میں ہر چیز موت کی طرف دوڑ رہی ہے ۔ ہر خوشی ہر غم کا سایہ منڈلا رہا ہے ۔ اس لیے خوشی اگر انسان کو حاصل بھی ہو جائے ، تب بھی وہ اس سے خاطر خواہ لطف اندوز نہیں ہو سکتا ۔ بغیر کا احساس اور فنا کا خیال ہر لمحہ اس کو زندگی کی بے ثباتی کا احساس دلاتا رہتا ہے ۔ کائنات کی ایک ایک چیز میں اس کو یہی بے ثباتی نظر آتی ہے اور وہ اس کو دیکھ کر اپنے دل و جگر کو خون کرتا رہتا ہے ۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جیسے زندہ رہے ، زندگی کو برتنے اور بسر کرنے کی خواہش اس کے جہاں کم نہیں ہوتی ۔ اس لیے وہ ان حالات میں بھی ولولوں اور حوصلوں کی شمعوں کو فروزاں رکھتا ہے اور اسی میں اس کی ہڈائی ہے ۔ غالب نے انہیں حقائق پر مختلف زاویوں سے ان اشعار میں روشنی ڈالی ہے اور ان موضوعات نے ان کی شاعری کے آفاق رنگ و آہنگ کو اپنی انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے ۔

غالب کی شاعری کے بنیادی موضوعات حسن و عشق اور حیات و کائنات کے معاملات و مسائل ہیں۔ انہوں نے ان سب کو خالص انسانی زاویہٴ نظر سے دیکھا ہے اور ان سب کی ترجمانی میں ان کے یہاں انسان دوستی کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسان کو غالب کے پیش کیے ہوئے یہ مسائل اپنے مسائل معلوم ہوتے ہیں اور وہ ہر جگہ ان معاملات و مسائل کے پردے میں اپنی ہی تصویر دیکھتا ہے۔ اور یہی ان کے کلام کا آفاق پہلو ہے !

غالب کی شاعری
کے
نئے زاویے

غالب کے یہاں ایک انقلابی کی روح اور ایک باغی کا مزاج تھا ۔ یہ اور بات ہے کہ وہ عملی زندگی میں کوئی انقلاب اور بغاوت نہ کر سکے ۔ لیکن جہاں تک شعر و ادب کی دنیا کا تعلق ہے ، وہ اس میں ایک بہت بڑے انقلابی اور باغی نظر آتے ہیں ۔ ان کی بہت شکنی کا میلان بہت نمایاں ملتا ہے ۔ انہوں نے روایت پرست ہونے کے باوجود روایت کے بہت سے بت توڑے ہیں اور رسم و رواج کے بہت سے سوسنائوں کو ڈھایا ہے ۔ لیکن اس کی تہ میں ان کے یہاں ایک تعمیری رجحان کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے ۔ وہ نئی دنیاؤں کو تعمیر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ انہوں نے بہت سے بتوں کو توڑا ہے ۔ لیکن نئے شمار حسین بتوں کو بنایا بھی ہے ، اور اس اعتبار سے ان کی شاعری میں ایک نئی دنیا نظر آتی ہے ۔ وہ نئی ہے ۔ اس میں نئے حالات کی عکاسی ہے ۔ نئے ماحول کی ترجمانی ہے ۔ نئے احساس و شعور کی تصویر کشی ہے ۔ اس میں ایک نئے ذہن کا ہر تو صاف نظر آتا ہے ۔ اسی لیے وہ ذہن میں نئی تحریک پیدا کرتی ہے ۔ اس کو صحیح طور پر سمجھنا اور اس سے اثر قبول کرنا آسان نہیں ہے ۔ اس کے لیے ایک نئے ذہن کی ضرورت ہے ۔ یہ نیا ذہن بغیر ایک ذہنی تربیت کے پیدا نہیں ہو سکتا ۔ یہ ذہنی تربیت کلام غالب کے ان گنت زاویوں کو سامنے لا کر کھڑا کر دیتی ہے ۔ اور یہ نئے زاویے ان کے کلام کو بہت ہی وسیع و ہموار گیر اور بڑا ہی پہلو دار بنا دیتے ہیں ۔ یہاں تک کہ وہ ایک ناہید اکنار سمندر نظر آنے لگتا ہے ۔

اردو شعراء کے دیوان عام طور پر حمد و ثناء سے شروع ہوتے ہیں۔ لیکن دیوان غالبؒ کا آغاز حمد و ثناء سے نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ غالب توحید پر ایمان نہیں رکھتے تھے یا یہ کہ عشی رسول سے انہیں کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ بہت بڑے موجد تھے۔ ان کے عتی رسول سے سرشار ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے دیوان کو شکوہ و فریاد سے شروع کرتے ہیں اور یہ شکوہ ان کا ذاتی شکوہ نہیں ہے۔ یہ فریاد ان کی اپنی فریاد نہیں ہے۔ اس شکوہ و فریاد میں تو انسانیت کی لے کہاں ہے اور اس انسانیت کی لے میں شکوہ و فریاد ہے۔ غالب اس خیال کو زندگی کی سب سے بڑی حقیقت سمجھتے ہیں۔ ان کی آنکھ انسان کو گھائل دیکھتی ہے۔ انسانیت انہیں زخموں سے چور نظر آتی ہے۔ اس اعتبار سے وہ بڑی ہی مظلوم مخلوق ہے۔ انسان مجبور محض ہے۔ وہ کچھ کر نہیں سکتا۔ حالات کے سامنے اس کی پیش نہیں جاتی۔ وہ پیدا ہوتا ہے اس لیے کہ اسے مرنا ہے اور مرنے سے چلے بھی اسے نہ جانے کتنی بار موت آتی ہے۔ ہر لمحے اس کو موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی زندگی ایک مستقل کرب کے عالم میں گزرتی ہے۔ مسرت کے لمحے اس کو بس برائے نام ہی نصیب ہوتے ہیں اور ہر مسرت ایک غم کا پیغام ہوتی ہے۔ وہ اسی کشمکش میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کی زندگی کے ایک ایک پہلو سے بے بسی ٹپکتی ہے۔ ایک ایک بات سے بے ثباتی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ فطرت کی بڑی ہی حسین خلیق ہے لیکن اس کی ہستی کا خمیر بے بسی اور بے ثباتی سے اٹھا ہے۔ اس لیے وہ اس فطرت کی شکوہ سنج ہے، جس کے ہاتھوں اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ غالب نے اسی حقیقت کو اپنے اس شعر میں پیش کیا ہے :

نفس فریادی ہے کس کی شوخیؒ تحریر کا

کاغذی ہے پرہیز پر بیکو تصویر کا

غالب اس حقیقت کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اسی لیے یہ نقل انہیں فطرت کی شوخیؒ تحریر کا فریادی نظر آتا ہے۔ چاہے انہوں نے فن کار کی چابک دستی کی داد بھی دی ہے۔ اس قلبی عمل میں جو دل کشی اور دل آویزی ہے، اس کو سراہا بھی ہے۔ لیکن یہ نقل انہیں فانی نظر آیا ہے اور یہ ان کے نزدیک فطرت کی سب سے بڑی مہم ظریفی ہے۔ نقل کبھی فانی نہیں ہوتا۔

فن کے شاہکار میں تو ابدیت ہوتی ہے ۔ وہ تو بعیشہ بعیشہ باقی رہتا ہے ۔ لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ زندگی اور فطرت کا سب بڑا انہی شاہکار یعنی انسان فانی ہے ۔ انسان کو خود اس حقیقت کا احساس ہے ۔ اسی لیے تو اس کا وجود کاغذی نظر آتا ہے۔ کاغذی ہے غالب کی مراد بے ثباتی بھی ہے۔ لیکن اس میں اس کے فریادی ہونے کی طرف بھی ایک بہت واضح اشارہ ہے کیونکہ ایک زمانے میں ایران کی سرزمین پر یہ رواج عام تھا کہ فریادی کو کاغذ کے کپڑے چٹائے جاتے تھے ۔ انسان کے بے ثبات وجود کا خیال آتے ہی یہ سارا منظر غالب کے ذہن پر منڈلانے لگتا ہے ۔ ایک پھیلی سی کوندلی ہے اور یہ سمر غلیبی ہوتا ہے ۔ اس کی معنویت انسانی زندگی کی ایک نہایت ہی اہم اور بنیادی حقیقت کو اپنے دامن میں رکھتی ہے ۔ غالب اس حقیقت کو سمجھتے ہیں لیکن اس کو سمجھنے کے باوجود ذہنی طور پر اس سے مطابقت پیدا نہیں کر پاتے ۔ اس لیے اس حقیقت کا احساس ایک دکھ کی سی کیفیت ان پر طاری کر دیتا ہے ۔ وہ اس پر کڑھتے ہیں ۔ یہی سبب ہے کہ ان کی لیے فریادی ہو جاتی ہے اور اس فریادی نے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو ہر نقش فریادی اور ہر پیکر تصویر کا پیرہن کاغذی نظر آنے لگتا ہے ۔ اس معنویت کے شدید احساس نے غالب سے یہاں نقی فریادی ، شوخی ، تحریر ، پیرہن کاغذی اور پیکر تصویر کے نئے اشاروں کی تخلیق کرائی ہے ، اور ان سب نے اس کو جہالتی اعتبار سے چار چاند لگا دیے ہیں ۔

غالب کی انقلاب پسندی یہاں موضوع اور فن دونوں میں نمایاں ہے ۔ ایک بے چین روح ہی کو اس مضمون کا خیال پیدا ہو سکتا ہے اور اس کے ہاتھوں ان نئے اشاروں اور کتابوں میں اس کی وضاحت ہو سکتی ہے ۔ کلام غالب میں یہ اشارے اور کتابے بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ جہالتی اقدار کو پیدا کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے ۔ یہاں بھی سارا کھیل اشاروں اور کتابوں ہی کا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کی بدولت خود معنویت میں نئی جان بڑھ گئی ہے ۔

اردو شعراء نے نہائی اور ہجر و فراق کے مضمون کو طرح طرح سے بانٹھا ہے ۔ اسی لیے اردو کی شعری روایت میں یہ مضمون خاصا ہامال ہے ۔ اس میں کوئی نئی بات پیدا کرنا خاصا مشکل کام ہے ۔ لیکن غالب نے اپنے دیوان کی پہلی غزل کے دوسرے شعر میں نئی بات پیدا کی ہے ۔ یہاں ان کے

بیش نظر تنہائی اور بجر و فراق کی تکلیف کا بیان ہے ۔ یہ بیان انہوں نے کیا ہے اور بظاہر صرف اتنی بات کہیں ہے کہ تنہائی کی رات کاٹنا بڑا ہی مشکل کام ہے ۔ اس شام کی صبح نہیں ہوتی ۔ بڑے بڑوں کو جب اس سے ساہمہ پڑتا ہے تو وہ خون ٹھوکنے لگتے ہیں ۔ ان کی حالت غیر ہو جاتی ہے اور ہزاروں جنم کرنے کے باوجود بھی یہ رات ان سے کاٹے نہیں کٹتی ۔ اس مختصر ، سادہ اور پامال مضمون کو غالب نے اپنے اس شعر میں پیش کیا ہے :

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا ، لانا ہے جوئے شب کا

لیکن چند پہلو اس میں ایسے نمایاں ہیں ، جن کی بدولت یہ شعر بہت بلند ہو گیا ہے ۔ ان پہلوؤں میں سب سے زیادہ توجہ طلب تو اس کی چھپی ہوئی اور تہہ در تہہ معنویت ہے ، جو اس کو نہایت ہی وسیع اور پیمہ گیر بناتی ہے ۔ اور دوسرے اس کا مخصوص جاہلیاتی اظہار ، جو اس معنویت کو نئی زندگی سے ہمکنار کرتا ہے ۔ بظاہر تو اس میں تنہائی کی سختجانی کا ذکر ہے ۔ لیکن غالب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جو تکلیفیں عاشق کو بجر و فراق کے عالم میں الہائی بڑی ہیں ، ان کا بیان نہیں کیا جا سکتا یہ تکلیفیں اتنا طول کھینچتی ہیں اور ان کا سلسلہ اس قدر دراز ہوتا ہے کہ یہ رات کبھی کبھی کتنی ہی نہیں ۔ بے چارا عاشق مر مر کے جیتا ہے اور بالآخر اس کو جان بحق تسلیم ہونا پڑتا ہے ۔ لیکن غالب ایسی سیدھی سادی بات نہیں کرتے ۔ وہ بڑے پہلودار شاعر ہیں ۔ بظاہر ان کے شعر میں جو معنویت نظر آتی ہے ، اس کی تہہ میں کچھ اور ہی ہوتا ہے ۔ کون جانے کہ چاہا تنہائی کی سخت جانہاں اس عام انسان کی سخت جانیاں ہیں ، جو انسانیت اور انسانی زندگی کی علامت ہے ۔ جس کا نفس کسی کی شوخی تحریر کا فریادی ہے اور جس کا ہر اہن غالب کو کاغذی نظر آتا ہے ۔ غالب بڑے پہلو دار شاعر ہیں ۔ ان کی بات سیدھی سادی ہونے کی بجائے تہہ در تہہ ہوتی ہے ۔ وہ استعاروں ، اشاروں اور کنایوں میں باتیں کرتے ہیں ۔ مشاہدہ حق کی گفتگو بادۂ و ساغر میں اور ناز و غمزے کی بات دشمن و خنجر میں کرنا ان کا مخصوص انداز ہے ۔ اس پہلو کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو یہ

بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اس شعر میں غالب نے ، جہاں تک پیرایہٴ بیان کا تعلق ہے ، استعارے کا استعمال کیا ہے اور اس پردے میں اسی خیال کی وضاحت کی ہے کہ دلیا میں انسان کی زندگی ایک مستقل تنہائی اور ایک مسلسل ہجر و فراق ہے ۔ تنہائی اور ہجر و فراق کی یہ شب تار اس سے کائے نہیں کٹتی ۔ اس پر وار ہوئے رہتے ہیں ۔ وہ زخم کھانا رہتا ہے اور ان زخموں کی تکلیف کبھی کم نہیں ہوتی ۔ ان کے منفعل ہونے کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ غرض وہ اسی عالم میں زندگی کی رات کو گزارنا ہے ۔ لیکن یہ رات گزرتی نہیں ۔ تکلیفوں کی وجہ سے اس کا کلیجا منہ کو آتا ہے ۔ وقت گزارنے کی تمام تدبیریں ناکام ہو جاتی ہیں اور بالآخر وہ جان جان آفریں کے سرحد کر دیتا ہے ۔ یہی انسانی زندگی کا انجام ہے ۔ انسانی زندگی جو ایک مستقل سخت جانی اور ایک مسلسل کرب کی داستان ہے انسان کا سب سے بڑا محبوب مسرت کا خیال اور نشاط کا احساس ہے ۔ وہ زندگی پر جان دیتا ہے ۔ ان دونوں کو حاصل کرنے ہی میں اس کی زندگی گزرتی ہے ۔ لیکن اس کی یہ تمنا پوری نہیں ہوتی اور ساری زندگی اس پر ایک ہجر و فراق کا عالم طاری رہتا ہے ۔ تنہائی کسی حال میں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی ۔ یہ تنہائی تو درحقیقت وہ محرومی ہے ، جس سے انسانی زندگی عبارت ہے ۔ یہ محرومی فرہاد کی زندگی میں بھی تھی ، جس نے شعریں کو حاصل کرنے کے لیے جوئے شیر کو نکالنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا ۔

غالب نے جان سخت جانی ہائے تنہائی کے استعارے میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ دیا ہے ، انسانی زندگی کے نہ جانے کتنے مسائل و مسائل کی تصویر کھینچ دی ہے اور نہ جانے کتنے اُھوس اور سنگین حقائق بے نقاب کر دیے ہیں ۔ شام کو صبح کرنے کے لیے جوئے شیر کی مثال دے کر نہ صرف یہ کہ غالب نے جان بالکل ایک نیا شاعرانہ پیکر تراشا ہے بلکہ انسانی زندگی کی ایک اہم حقیقت کی وضاحت بھی کر دی ہے ۔ اسی لیے یہاں معنویت اور حسن کا امتزاج اپنے شباب پر نظر آتا ہے ۔ موضوع اور فن کی تکمیل اور ہم آہنگی کی معراج اسی کو کہتے ہیں ۔

اور پھر آگے چل کر غالب نے عاشق کے جذبہٴ بے اختیار شوق کا

ذکر کیا ہے جس سے شمشیر بھی متاثر ہوتی ہے اور جذبہٴ عشق کی بے اختیاری کو دیکھ کر اس کا بھی شوق فراوان جوش میں آ جاتا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قتل کرنے کے لیے ایک والہانہ انداز میں آگے بڑھتی ہے۔ عاشق کے قتل ہونے اور اس کو قتل کرنے میں مزہ آتا ہے اور اس طرح کاروبارِ شوق کی تکمیل ہوتی ہے ۔ یہ دونوں یہاں ایک بڑے مقصد کے لیے سرگرم کار ہیں ۔ ان دونوں کے سامنے ایک عظیم نصب العین ہے اور یہ مقصد اور نصب العین ہے، عشق کی آخری منزل نک رسائی اور کاروبارِ شوق کے بلند ترین مقامات کا حصول ۔ اس صورتِ حال کے بغیر عشق بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے ۔ غالب کے یہاں عشق سارے پاندھے کی چیز نہیں ہے ۔ وہ ایک اندرونی خواہش اور دلی جذبہ ہے ، جس میں عاشق کو ایک روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے ۔ اس میں جان دینے کو وہ اپنی زندگی کی معراج سمجھتا ہے ۔ محبوب اس کام میں کسی طرح بچھے نہیں رہتا ، بلکہ برابر کا شریک ہوتا ہے ۔ عاشق کے دل میں اس کے ہاتھوں قتل ہونے کی آرزو بیدار ہوتی ہے تو وہ اس آرزو کو بورا کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہے ۔ جی اس کا مقصد ہے ۔ غالب نے اس خیال کی تصویر کشی بڑے ہی دل موہ لینے والے انداز میں کی ہے :

جذبہٴ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے

سینہٴ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

جذبہٴ بے اختیارِ شوق یہاں محبت کرنے والے کے والہانہ جذب و شوق کو واضح کرتا ہے ۔ شمشیر محبوب کی علامت ہے اور سینہٴ شمشیر سے دم کا باہر آنا ، اس کیفیت کی عکاسی ہے ، جو محبوب کے دل میں عاشق کے جذبہٴ بے اختیارِ شوق کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے ۔ یہ ایک بڑا ہی مکمل اور بھرپور خیال ہے ۔ لیکن غالب کی نظر اتنی سطحی نہیں تھی ۔ وہ اپنے آپ کو صرف اسی خیال تک محدود نہیں کر سکتے تھے ۔ درحقیقت اس شعر میں بھی جو معنویت ہے ، وہ پچھلے دو شعروں ہی کی معنویت کا تسلسل ہے ۔ غالب یہاں بھی جذبہٴ بے اختیارِ شوق ، شمشیر اور سینہٴ شمشیر کے استعاروں میں یہ کہتا چاہتے ہیں کہ انسان اپنے اندر ایک والہانہ شوق اور جذبہ رکھتا ہے ، اسی کا نام زندگی ہے ۔ انسانیت کی تمام ترقی اسی جذب و شوق سے عبارت ہے ۔ انسانیت کی تکمیل اس کے بغیر خواب و

خیال ہے ۔ نصیب العین اور مقصد اس کے بغیر اپنے آپ کو نمایاں نہیں کرتے ۔ بلکہ انسان میں جذب و شوق نہ ہو تو وہ اس سے گریزاں رہتے ہیں ۔ لیکن اگر انسان کے جذب صادق کا انہیں یقین ہو جائے ، تو وہ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور اس سے ہم آغوش ہونے کی کمتا خود ان کے دل میں موجیں مارتے لگتی ہے ۔ انسانی زندگی کا ارتقا اسی طرح عمل میں آتا ہے ۔ اس کی ترقی ہی صورت اختیار کرتی ہے ۔

غالب کے اس شعر کو اگر اس انداز سے دیکھا جائے تو اس میں معنویت کا ایک نیا زاویہ پیدا ہوتا ہے اور اس معنویت سے شعر کی حریت بہت بلند ہو جاتی ہے ۔ بلکہ فنی اور خیالیاتی اعتبار سے بھی اس میں ایک ترقی نظر آنے لگا ہے ۔ کیونکہ یہ نیا زاویہ جذبہٴ اختیار و شوق کو صرف سینہٴ شمشیر ہی نہیں رہنے دیتا ۔ بلکہ یہ سب غلاسون اور اشاروں کا روپ اختیار کر لیتے ہیں اور اس طرح ان کا وجود بڑی اہمیت اختیار کر لیتا ہے ۔ کیونکہ وہ یہ یک وقت نئی معنویت کو بھی پیدا کرتے ہیں اور نئی خیالیاتی اقدار بھی ان کے ہاتھوں رونما ہوتی ہیں ۔

اس کے بعد جو شعر اس غزل میں آتا ہے ، وہ بظاہر معنوی اعتبار سے بہت تمام اشعار سے الگ معلوم ہوتا ہے ۔ غالب اس شعر میں تو بظاہر یہ کہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ عقل چاہے جتنے بھی جتن کرے لیکن دنیا میری بات کو سمجھ نہیں سکتی ۔ اس کے پاس جتنے بھی جال ہیں ، وہ سب بچھا دیے جالیں لیکن میری گفتگو اتنی بلند ہے اور میرا عالم تقریر اس قدر ارفع ہے کہ وہ میری گفتگو اور تقریر کے عناق کو امیر نہیں کر سکتی ۔ مطلب بظاہر یہ ہے کہ غالب کی بات کا سمجھنا آسان نہیں ۔ دنیا جہاں کے علوم اور ان علوم کے سائے میں پرورش پانے والی عقل ، اس کے اسرار و رموز تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی ۔ غالب نے بظاہر اسی خیال کو سامنے رکھ کر یہ شعر کہا ہے :

آگہی دلم شنیدن جس قدر چاہے بچھائے

مدعا عناق ہے اپنے عالم تقریر کا

لیکن اگر غالب اور ان کے فن کے غمخواروں کو دیکھا جائے ،

تو اس میں کچھ معنویت پیدا ہوتی ہے اور اس معنویت میں بھی اس سے قبل کے اشعار میں بھی کی جانے والی معنویت کا تسلسل نظر آتا ہے ۔ دراصل

غالب یہاں بھی کہنا چاہتے ہیں کہ انسان ایک عجیب و غریب مخلوق ہے ۔ اس کو سمجھنا آسان بات نہیں ہے ۔ وہ جو کچھ کہتا ہے ، جس خیال کا اظہار کرتا ہے ، اس میں بے شمار عوامل اور محرکات کا خون ہوتا ہے ۔ اس لیے اس کی باتوں کا سمجھنا علم اور عقل کے پس کی بات نہیں ۔ انسانوں کی باتوں میں احساس، جذبے، ادراک اور شعور کی تہہ در تہہ کیفیات ہوتی ہیں ۔ ان تہوں کو بھلا کون کھول سکتا ہے ؟ اسی لیے ترقی کی اتنی منزلیں طے کر لینے کے باوجود کوئی بھی انسان کو پوری طرح سمجھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا ۔

غالب نے اس شعر میں بظاہر اپنی بات کہہ کر انسان کی بلندی کو واضح کیا ہے ۔ اور دام شنیدن اور عنقا کے اشاروں سے کام لے کر اس میں نہ صرف معنوی وسعت اور بلندی پیدا کی ہے بلکہ انداز بیان کو حسن و جمال سے بھی معمور کر دیا ہے ۔

غزل کے آخری شعر میں غالب نے بظاہر عالم وحشت کی تصویر کھینچی ہے ۔ یہ عشق کی ایسی منزل ہے جہاں پہنچ کر عاشق کو کسی طرح چین نہیں ملتا ۔ اسیری اس کا مقدر بن جاتی ہے لیکن وہ ہر لمحے آتش زیر پا رہتا ہے اور یہ کیفیت زنجیروں کو بے کار کر دیتی ہے ۔ اس کے حلقے موئے آتش دیدہ ہو کر بے کار ہو جاتے ہیں ۔ عشق کی وحشت بہر صورت اپنا کام کرتی رہتی ہے ۔ اس کی گرمی کی تاب بھلا کون لا سکتا ہے ؛

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا

موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

لیکن کون جانے کہ غالب نے اس میں اسیری ، آتش زیر پا ، موئے آتش دیدہ اور زنجیر کے اشاروں میں اس کے علاوہ اور کیا کیا کچھ کہا ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ اسیر خود وہ انسان ہو جس کا تذکرہ انہوں نے اس غزل کے پہلے شعر میں کیا تھا ۔ اس کی اسیری اس منزل کی علامت ہو ، جس پر انسان کسی خاص نصب العین کو حاصل کرنے کی غرض سے پہنچنا چاہتا ہے اور اس کے آتش زیر پا ہونے والی کیفیت وہ قوت ارادی ہو ، جس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا ۔ جس کے سامنے زنجیریں کٹ کر گر جاتی ہیں اور اس کا ہر حلقہ ایک موئے آتش دیدہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ اور یہ معنویت بعد از قیاس نہیں ہے ۔ کہوں کہ غالب اپنے اس مخصوص

انداز میں کچھ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ ان کی شاعری اس قسم کے خیالات سے ابھری ہوئی ہے ۔

یہ معنویت نہ صرف یہ کہ بلند اور عظیم ہے بلکہ اس سے شعرا کا حسن بھی دوہالا ہو جاتا ہے ۔ اس معنویت کے ہاتھوں غالب کے اس شعر میں ایک بڑی ہی تہہ دار سی علامتی فضا پیدا ہوتی ہے ، جس سے اس کا حسن دوہالا ہو جاتا ہے ۔

غرض یہ کہ غالب کا کلام اپنے دامن میں معنویت اور فن دونوں کے کچھ ایسے نئے زاویے رکھتا ہے ، جن میں ان کی انسان دوستی اور انقلاب پسندی کی تصویر ابھری ہوئی نظر آتی ہے ۔

غالب
کی
شاعری میں
شوخی اور شگفتگی
کے عناصر

غالب ایک بڑی ہی رنگین ، ایک بڑی ہی پرکار اور ایک بڑی ہی پہلو دار شخصیت رکھتے تھے۔ زمانے نے انہیں یوں تو ان کو خود اپنی شکست کی آواز بنا دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان میں گل نقہ ، اور پردہ ساز ، ہونے والی خصوصیت موجود تھی۔ اردو میں ان کی سی باغ و بہار شخصیت کا شاعر کوئی اور پیدا نہیں ہوا۔ ویسے یہ بہت بڑا دعوئے ہے کیوں کہ سودا ، الشا اور اکبر کے بے شاعر بھی اردو میں پیدا ہوئے ہیں ، جن کی بنیاد ہی شوخی اور شگفتگی پر ہے۔ لیکن غالب کی شخصیت میں جو بات تھی، وہ ان شعراء میں بھی نہیں ہے۔ غالب کی طبیعت میں جو رچاؤ اور ان کے مزاج میں جو پرکاری تھی ، اس سے سودا ، انشا اور اکبر محروم تھے۔ ان سب کے ہاں شوخی ضرور ہے لیکن ان کی شوخی کی تہ میں کسی سے الجھنے ، کسی سے لڑنے ، کسی کی نفی کرنے کا ہاتھ ضرور کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ غالب کے ہاں یہ الجھنے والی بات نہیں تھی۔ وہ ہر چیز سے محفوظ ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ہر بات ان کے ہاں لطیف احساس کو بیدار کرتی تھی۔ وہ غلط باتوں پر بھی ہنسکرا سکتے تھے۔ منجیہہ معاملات پر بھی ان کی طبیعت رواں ہو سکتی تھی۔ اور یہ سب کچھ کرشمہ تھا مزاج کی اس خصوصیت کا جسے عام طور پر احساس مزاج یا (Sense of Humour) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ غالب کی شخصیت میں یہ خصوصیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور یہ اسی کا اثر ہے کہ ان کی شخصیت میں شوخی کا وہ رچاؤ ملتا ہے جس نے ان کی شاعری میں گل کاریاں کی ہیں اور اسے زعفران زار بنا دیا ہے۔

ہوں تو ان کی شخصیت میں غم بھی ہے لیکن اس غم نے ان کے ہاں تاریکی نہیں پیدا کی ۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اس غم کے باوجود زندگی سے دل چسپی لے سکتے ہیں ۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر ہنس سکتے ہیں ۔ مسکرا سکتے ہیں ۔ انہیں رونا نہیں آتا ۔ وہ روتے میں بھی ہنستے ہیں ۔ انہیں ہنسنے پر رونا نہیں آتا ، روتے پر ہنسا ضرور آتا ہے ۔ اور ان کی شخصیت کی یہ خصوصیت بڑی حد تک اس معاشرتی ، تہذیبی اور فکری ماحول کی بھی پیدا کردہ ہے ، جس میں انہوں نے آنکھ کھولی اور جس میں ان کے ذوق و شعور کا نشو و نما ہوا ۔ غالب نے اس وجہ ہونے تہذیب کے دور آخر کو دیکھا، جس کو مغلوں نے کئی صدیوں میں پیدا کیا تھا ۔ ان کے زمانے میں یہ تہذیب انحطاط پذیر ضرور تھی لیکن اس کی پختگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ اس پختگی نے اس زمانے کے افراد میں خود اعتمادی پیدا کی اور انہیں اپنے ہمواروں پر کھڑا ہونا سکھایا ۔ اس زمانے کی نیم مذہبی اور نیم سیاسی تحریکوں نے افراد کے دلوں میں ولولوں کے چراغ روشن کیے ، امنگوں کی شمعیں فروزاں کیں اور اس کا نتیجہ ایک عام جولانی کی صورت میں رونما ہوا ۔ غالب کی شخصیت اسی صورت حال کی ترجمان ، عکاس ، بلکہ علم بردار ہے ۔ اور ان کے کلام میں شوخی کی جو چاندنی سی چھٹکی ہونی نظر آتی ہے ، اس میں اس صورت حال کا بڑا ہاتھ ہے ۔

غالب کے مزاج کی یہ شوخی سب سے زیادہ ان کی شاعری پر اثر انداز ہوئی ہے ۔ اس شوخی نے اس میں زندگی اور جولانی پیدا کی ہے ، جدت اور ایج پیدا کی ہے رنگینی اور ہرکاری پیدا کی ہے ، اور ان سب نے مل کر اس کو ایک اچھا خاصا نگار خانہ بنا دیا ہے ۔ ایک ایسا نگار خانہ ، جہاں ہر تصویر اپنے رنگوں کی شوخی اور اپنے خطوط کے بالنگہن سے پہچانی جاتی ہے ۔ غالب کی شوخی نے ان تصویروں کو زندگی سے اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک منہ سے بولتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔

یہ شوخی غالب کی شاعری کا کوئی ایک پہلو نہیں ہے ۔ ان کی شاعری کے ہر پہلو میں یہ شوخی ہے ۔ اور غالب کی شاعری کسی ایک پہلو سے عبارت بھی نہیں ہے ۔ اس میں بڑا تنوع ہے ۔ بڑی رنگا رنگی ہے ۔ بڑی وسعت ہے ۔ بڑی ہمہ گیری ہے ۔ لیکن اس تنوع ، رنگا رنگی ، وسعت اور ہمہ گیری میں شوخی کا عنصر ضرور نمایاں نظر آتا ہے ۔ انہوں نے حسن و

عشق کے معاملات اور واردات و کیفیات کی تصویر کشی بھی کی ہے اور اس کے ان گنت پہلوؤں کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا ہے ۔ مصوف کے مسائل اور فلسفے کے نکات بھی انہوں نے اپنی غزلوں میں پیش کیے ہیں ۔ عمرانی اور تہذیبی معاملات کے اسرار و رموز کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ لیکن ان سب کے بیان میں ان کی طبیعت کی شوخی عجیب عجیب زاویوں سے اپنے آپ کو رونما کرتی رہی ہے ۔ یہ بہ ذات خود ہی اہم نہیں ہے ۔ اس اعتبار سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ اس نے ان کی شاعری میں ایک نئی فضا ، ایک نیا انداز اور ایک نیا آہنگ پیدا کر دیا ہے اور اس طرح ان کی غزلوں میں معنوی اور فنی اعتبار سے ایک نئی زندگی کی لہر سی دوڑا دی ہے ۔

غزل کی شاعری سوز و گداز کی شاعری ہے ۔ وہ شوخی کو گوارا نہیں کرتی ۔ لیکن غالب کا کہنا یہ ہے کہ انہوں نے اس شوخی کو غزل کے لیے گوارا بنا دیا ہے اور وہ ان کی غزلوں کا ایک لازمی جزو نظر آتی ہے ۔ اس شوخی کا پتہ ان کے بیان حسن کے بیان میں بھی چلتا ہے ، محبوب اور محبت کرنے والے کے جو روابط ہیں اور ان کے نتیجے میں جو حالات پیدا ہوتے ہیں ، ان میں بھی اس کی جھلک نظر آتی ہے ۔ عشق اور کاروبار شوق کی جو تفصیل انہوں نے پیش کی ہے ، اس میں بھی اس شوخی کا عنصر کار فرما دکھائی دیتا ہے ۔ اس عشق کے جو نتائج نکلتے ہیں اور جو اس کا انجام ہوتا ہے ، اس کی جزئیات میں بھی شوخی اپنا اثر دکھاتی ہے ۔ غرض غالب کسی جگہ بھی اس شوخی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ بلکہ اس سے خاطر خواہ کام لیتے ہیں ۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کے ایسا کرنے سے غزل کے کارگہ شیشہ گری کو ٹھیس نہیں لگتی ۔ یہ آپکینہ اس تندہی صہیا سے پگھلنا نہیں ۔ اس کی آب و تاب پوری طرح باقی رہتی ہے بلکہ اس میں جو شراب ہے ، اس کی مستی میں کچھ اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کے ظاہری رنگ میں کچھ اور بھی تیزی پیدا ہو جاتی ہے اور ان دونوں چیزوں سے دل کو سرور اور آنکھوں کو نور ملتا ہے ۔

اردو غزل کی روایت میں عشق کا آغاز دل دہنے سے ہوتا ہے ۔ عاشق کو محبوب سے محبت ہو جاتی ہے ۔ گویا وہ اپنے دل سے ہاتھ دھو لیتا ہے اور اس کا دل محبوب لے لیتا ہے ۔ غالب نے اس خیال کو پیش تو کیا ہے

لیکن اس کو پیش کرتے ہوئے صرف یہ بات ہی نہیں کہی ہے کہ عاشق نے دل محبوب کو دے دیا اور اس طرح عشق کا آغاز ہو گیا بلکہ اس خیال میں یوں ایک پہلو پیدا کیا ہے:

کہتے ہو نہ دیں گے ہم ، دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے ، ہم نے مدعا پایا

یہاں غالب کہتا یہ چاہتے ہیں کہ دل تو ان کے پاس موجود ہی نہیں ہے ۔ اس کے گم ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے ۔ ایسی صورت میں محبوب کا شوخی ہے یہ کہنا کہ اس کو دل پڑا ہوا مل گیا ، تو وہ نہیں دے گا کوئی معنی نہیں رکھتا ۔ یہاں محبوب کے بیان اور اس کے جواب دونوں میں شوخی ہے اور یہ شوخی ہی اس شعر کی بنیاد ہے ۔

غالب ایک عاشق شاعر کی خصوصیات اپنی شخصیت میں رکھتے ہیں ۔ وہ حسن پرست ہیں اور حسن پرستی ہی سے ان کے عشق کا سوتا پھوٹتا ہے ۔ لیکن اس رابطے کا خیال ان کے یہاں کیسے کیسے دلچسپ خیالات پیدا کرتا ہے ۔

ایک جگہ کہتے ہیں :

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد

آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

اور پھر دوسرے شعر میں کہتے ہیں :

خاف ان مہ طلعتوں کے واسطے

چاہتے والا بھی اچھا چاہیے

ان اشعار میں چاہے بڑی حقیقتوں کا بیان نہ ہو لیکن ان میں شوخی کا عنصر بڑی ہر لطف سی قضا پیدا کر دیتا ہے ۔

اپنی غزلوں میں غالب نے رندی اور شاہد بازی پر بہت زور دیا ہے اور عشق کی بنیاد شاید بازی ہی بنائی ہے ۔ ظاہر ہے ایک رند شاہد باز محبوب کو خاطر میں نہیں لاتا ۔ وہ اس کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر اپنا مطلب نکالتا ہے اور جب محبوب اس کے دام میں پھنس جاتا ہے تو اس کو خوشی حاصل ہوتی ہے ۔ لیکن جب اس کی طرف سے بیان وفا باندھنے کا اظہار ہوتا ہے تو وہ محبوب کی اس حرکت کو اس کی سادگی پر معمول کرتا ہے ۔ غالب نے کسی شوخی سے اس خیال کی ترجمانی کی ہے :

سادہ پرکار ہیں خویاں غالب

ہم سے بیان وفا باتیں ہیں

اس شوخی نے غالب کی غزلوں میں بعض ایسے مضامین بھی پیدا کیے ہیں۔ جو بالکل نئے ہیں اور جو ان سے قبل کی غزلوں میں نظر نہیں آتے۔ مثلاً حسرت دیدار کا موضوع ویسے تو تغزل میں بہت عام ہے۔ عاشق کو محبوب کے دیدار کی حسرت رہتی ہے۔ وہ اس تک اپنا پیام مختلف طریقوں سے پہنچاتا بھی ہے۔ لیکن غالب کی شوخی اس پیام کو محبوب تک بالکل ایک نئے طریقے سے پہنچاتی ہے۔ وہ سرناسے پر آنکھ کی تصویر کھینچتے ہیں تا کہ خط کو شروع کرنے ہی محبوب پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ عاشق حسرت دیدار کا شکار ہے :

آنکھ کی تصویر، سرناسے پہ کھینچی ہے کہ تا

تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرت دیدار ہے

سرناسے پر آنکھ کی تصویر کھینچنا ایک ایسا خیال ہے جس میں حد درجہ سادگی اور معصومیت ہے۔ لیکن اس میں شوخی کا رنگ بھی بہت ٹھیکھا ہے۔ اور یہی اس کی جان ہے۔

یہ شوخی ایک جگہ غالب کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ساری دنیا کو چھوڑ کر، سارے شہر میں کان پر قلم رکھ کر یہ آواز لگائے بھری کہ اگر کسی کو خط لکھوانا ہو تو لکھوائے۔ اس خیال سے کہ محبوب کو ان گنت خط لکھنے والے ہیں۔ بہت ممکن ہے اس سے لکھوائیں۔ اس طرح انہیں خط کے مضمون کا علم ہوتا رہے گا اور دلچسپی بھی رہے گی۔ چنانچہ وہ ہر صبح کان پر قلم رکھ کر لکھ جاتے ہیں۔ بس یہی ان کا مشغلہ ہے :

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے

ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

گویا عاشق کے لیے اب کوئی مشغلہ رہ ہی نہیں گیا ہے۔ - دوانے اس کے کہ وہ صبح سے شام تک خط لکھنا بھرے۔ اس خیال کے مضحکہ خیز ہونے ہی میں شوخی ہے۔ اور اس شوخی نے اس میں چلت اور ایچ پیدا کر دی ہے۔

محبوب کے ہوسے کا معنی پر عاشق ہوتا ہے اور اس تمنا کا اظہار وہ نہ جانے کس کس طرح کرتا ہے۔ غالب اس موضوع کو بالکل نئے انداز

میں پیش کرتے ہیں۔ ایک شعر میں حسن طاب کا اظہار یوں کیا ہے :

خندہ نا شکستہ کو ، دور سے مت دکھا کہ یوں
بوجھ کو بوجھتا ہوں میں منہ سے بھلے بتا کہ یوں

منہ سے بتائے میں حسن طاب موجود ہے اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ بوجھ کی صورت ہی میں نکل سکتا ہے۔ یہاں شوخی ہی اس اظہار تمنا کی جان ہے۔ ایک اور شعر میں غالب نے اس سے بھی زیادہ تیکھے انداز میں اس مضمون کو بانٹھا ہے۔ کہتے ہیں :

بوسہ دیتے نہیں اور دل بہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جہ میں کہتے ہیں کہ مفت آنے تو مال اچھا ہے

یہاں بھی اس شعر کی بنیاد غالب کی شوخی ہی ہے۔ اگر شوخی نہ ہوتی تو یقیناً اس شعر کو مبتذل کہا جاتا لیکن اس شعر میں شوخی نے بڑی حد تک اس ابتذال کو کم کر دیا ہے۔ جب ابتذال کا خیال آتا ہے۔ شوخی سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے اور اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ غالب دوسرے محزل گو شاعروں کی طرح محبوب کے کوچے میں جاتے ہیں ، اور اس کوچہ گردی میں انہیں عجیب عجیب واقعات سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ وہ بستر لے کے نکلتے ہیں ۔ اس خیال سے کہ محبوب کے در کے سامنے لگا دیں گے اور مزے سے لیٹے رہیں گے ۔ یہاں دیدار کا بھی امکان ہے اور وصال کا بھی ۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ محبوب پہلے تو اپنے در پر رہنے کی اجازت دیتا ہے مگر جیسے ہی بستر کھلتا ہے ، وہ اپنے قول سے بھر جاتا ہے اور نکال باہر کرتا ہے :

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کہنا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لیٹا ہوا بستر کھلا

یہ ایک مضحکہ خیز سا خیال ہے لیکن شوخی نے اس کی مضحکہ خیزی کو پس منظر میں ڈال دیا ہے اور اس طرح اس موضوع میں جان ڈال دی ہے ۔

غرض محبوب غالب کا بستر گول کرتا ہے لیکن اس بستر کے گول ہونے کے بعد بھی وہ چین سے نہیں بیٹھتے اور اس کوچے کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں ۔ جہاں ہاسبان ان کو آڑے ہاتھوں لیتا ہے ۔ دربان کے ہاتھوں

ان کی خوب مرست ہوتی ہے ۔ کبھی پاسباں ان کا آشنا بھی نکل آتا ہے ۔
اس لیے محبوب جو ذلت دیتا ہے ، وہ اچھے ہنسی میں لاتے ہیں :

دے وہ جس قدر ذلت ، ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ، ان کا پاسباں ، اپنا

لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انہیں اُلٹے کے پاسباں کے قدم لینے پڑنے
ہیں ، ورنہ ان کی شامت آنے میں کوئی کسر نہیں رہ جاتی :

کدا سمجھ کے وہ چب تھا ، مری حور شامت آئی
اٹھا اور اُلٹے کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

ورنہ ہوتا یہ کہ مار کھائی پڑتی ۔

لیکن وہ باز نہیں آتے ۔ ان کا جی بارہا چاہتا ہے کہ محبوب کے
کوچے میں صدا لکائی تاکہ اچھے خبر ہو جائے لیکن وہ سیاست درباں سے
ڈرتے ہیں ۔ اس لیے ان کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے :

دل ہی تو ہے ، سیاست درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے

وہ صدا تو نہیں لگائے لیکن دوسری حرکتیں چارتی رہتی ہیں ، جن کو
دیکھ کر محبوب گالیاں دیتا ہے ۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جتنی
دعائیں یاد کر کے جاتے ہیں ، وہ سب صرف درباں ہو جاتی ہیں :

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تویں جتنی دعائیں ، صرف درباں ہو گئیں

ان تینوں اشعار میں بھی اصل بنیاد شوخی ہے ۔ اس شوخی نے اچھے دلچسپ
بنایا ہے ، ورنہ یہ ذات خود ان اشعار کے موضوعات میں کوئی خاص بات
نہیں ۔ شوخی میں نے ان میں معنویت کی پھیلیاں بھر دی ہیں ۔

غزل کی روایت میں محبوب کی مجلس آرائی کو پیش کرنا یوں تو ایک
بہت عام سی بات ہے ۔ تقریباً ہر شاعر نے اس پر طبع آزمائی کی ہے ۔ لیکن
یا تو اس میں محبوب کی زیادتی کا احساس ہوتا ہے یا محبت کرنے والے کی
ناکامی اور ہلاکت پر جا کے تان ٹوٹتی ہے ۔ غالب اس مضمون کو
اس صرح پیش کرتے ہیں کہ ان دونوں میں سے کوئی بات بھی ضرورت سے
زیادہ نہیں ابھرتی ۔ بلکہ اس کے بجائے ان کا خیال ایک دلچسپ مزاحیہ سی

نضا فطم کر دیتا ہے ۔ چنانچہ اسی نضا کی طرف نظر زیادہ جاتی ہے ۔
یہ شعر دیکھیے :

میں نے کہا کہ 'بزم ناز' جاہیے 'غیر سے تھی'
من کے سمت ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ 'ہوں ؟'

یہاں حزن و یاس اور ذلت و رسوائی سے کہیں زیادہ محبوب کی سمت ظریفی کا احساس چھاپا ہوا معلوم ہوتا ہے اور غالب نے اپنی شوخی سے یہ صورت حال پیدا کی ہے ۔

ایک اور شعر میں فطرت محبت کرنے والے کی بے حیائی نک جا پہنچتی ہے ۔ محبوب کی محفل میں اس پر انگلیاں اٹھتی ہیں اور اشارے ہوتے رہتے ہیں لیکن وہ اپنی جگہ بیٹھا رہتا ہے ، اٹھنے کا نام لیتا :

اس بزم میں مجھے نہیں بننی حیا کئے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

بظاہر اس شعر کی نضا مجموعی طور پر ایسی کچھ زیادہ ہنسائے والی نہیں ہے ۔ کیونکہ یہاں محبت کرنے والے کی محرومی کا غم بھی اس میں شامل نظر آتا ہے، لیکن "اشارے ہوا کئے" کا فقرہ جیسے ہی آتا ہے، شوخی کی ایک بجلی سی کوندق ہے اور ماری نضا کو ایک لمحے کے لیے سنور کر دیتی ہے ۔ غالب کی غزلوں میں تنزل کے متعلق بعض اور اشعار بھی ایسے ملتے ہیں ، جن میں محبت کرنے والے کی ناکامی اور حسرت ، بھوری اور معذوری کا احساس ہوتا ہے لیکن ایسے اشعار میں بھی غالب اپنی شوخی سے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیتے ہیں ، جن میں ایک شگفتگی ہوتی ہے ۔ یہ اشعار اس صورت حال کے ترجمان ہیں :

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا ؟

ہے غیر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں ہو رہا نہ ہوا

ذکر اس بڑی وحی کا اور پھر یہاں اپنا
بن گیا رقیب آخر ، تھا جو راز داں اپنا

حیران ہوں دل کو روؤں کہ، ہینوں چگر کو میں
مقصود ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

مرے ہونے میں کیا ہے رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود ہشیاں کا ہشیاں ہونا

اور ایسے اشعار کی غالب کے کلام میں کمی نہیں ہے۔ ان کا دیوان ایسے
اشعار سے بھرا پڑا ہے۔ ان میں غالب کی شوخی بھر حال کام کرتی ہوئی
نثر آتی ہے۔

اردو غزل میں محبوب سے ملنے اور ملاقات کرنے کے جن طریقوں
اور وسیلوں کا ذکر ہے، ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ کہیں شاعر
دیوار کے سائے تلے بیٹھا ہے۔ کہیں اس کے ارد گرد چکر کاٹتا ہے اور
بہت ہوا تو اس کی غفل میں جا پہنچتا ہے، جہاں اس کی شامت ہی آ جاتی
ہے۔ لیکن غالب کی شوخ مزاجی نے اس کام کے لیے ایک بڑا ہی لطیف
ذریعہ اور وسیلہ تلاش کیا ہے۔ وہ مصوری سیکھتے ہیں :

سیکھیں ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بھر ملاقات چاہیے

ظاہر ہے کہ مصوری ایک لطیف فن ہے اور اس کو مہ رخوں کی ملاقات
کے لیے تقریب بنانا اس سے بھی لطیف بات ہے۔ اس کو غالب کی شوخی
ہی پیدا کر سکتی ہے۔

غالب کی شاعری میں روایت کا رجا ہوا شعور ملتا ہے لیکن وہ روایتی
شاعر نہیں ہیں۔ ان کے چار روایتی شاعری سے انحراف ہے۔ اور وہ اس کے
موضوعات سے اس حد تک برگشتہ ہیں کہ کہیں کہیں خود ان موضوعات
کو کچھ اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ اس کی تہ میں طنز کی ایک لہر
سے اٹھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے غالب
ہزاری شاعری کے روایتی موضوعات پر لفرے چست کر رہے ہیں۔ ان کے
اس قسم کے اشعار اسی صورت حال کے ترجمان ہیں :

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے ، اے خدا !
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ہے کیا جو کس کے باندھے ؟ میری ہلا لڑے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں ؟

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو یزم میں جا، دے مجھے
میرا دمہ دھکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

یہاں تلوار کے بغیر لڑنے ، محبوب کی کمر کے معدوم ہونے کے باعث
یزم محبوب میں نظر نہ آنے کے مضامین کو منجیدگی کے ساتھ پیش نہیں کیا
گیا ہے ۔ بلکہ ہوں محسوس ہوتا ہے ، جیسے وہ ان تمام باتوں کا مذاق اڑا
رہے ہیں ۔ اسی لیے یہاں ہلکی پھلکی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور طنز کا ہاتھ
کام کرتا ہوا نظر آتا ہے اور یہ سب کچھ ان کی شوخی ہی کا مظہر ہے ۔
غالب کی غزلیں شوخی کے عناصر سے بھری پڑی ہیں ۔ ان کی غزلوں
میں باعتبار مضامین جتنے چلو بھی نمایاں ہیں ، ان سب میں اس شوخی
کے اثرات نظر آتے ہیں ۔ ان کا تصوف اور فلسفہ تک اس سے خالی نہیں ہے ۔
لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کی اس شوخی کا شباب معاملات حسن و عشق
کی ترجمانی ہی میں ملتا ہے ۔

غالب
کی
شاعری میں
اجتماعی شعور

غالب انیسویں صدی کے ایک ایسے شاعر ہیں جنہیں ، اُس زمانے کے مسلمانوں کی زندگی میں برپا ہونے والے آسوب حشر کا بخوں علم تھا ۔ وہ اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے ۔ انہیں اس حقیقت کا احساس تھا کہ اُن کے اُس پاس کی زندگی کا سیرازہ منتشر ہو چکا ہے ۔ اس کی تیرازہ جدی اُن کے بس کی بات نہیں تھی ۔ لیکن اس انتشار کو شدت کے ساتھ محسوس کرنا اور اُس پر خون کے آنسو ہانا ، اُن کے اختیار میں ضرور تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی شاعری میں جگہ جگہ اس انتشار کی تصویر کشی کی ہے ۔ اس تصویر کشی کی تہ میں اپنی تہذیب کو زلزلہ رکھنے کا خیال ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے ۔ جب وہ اپنی زبانوں حالی پر کڑھتے ہیں اور اپنی پلمالی پر خون کے آنسو بہاتے ہیں تو در حقیقت اُس وقت کے مسلمانوں کی معاشق اور تہذیبی زبانوں حالی کا احساس کار فرما ہوتا ہے ۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس معاشرت اور تہذیب کی رسوائی ہو رہی ہے اور اُس کا چراغ آندھیوں کی زد پر ہے ۔

غالب نے جس زمانے میں آنکھ کھولی وہ سیاسی ، معاشرتی اور تہذیبی اعتبار سے ایک عجیب انتشار اور بد نظمی کی نشان دہی کرتا ہے ۔ اُس وقت اس پر عظیم میں مسلمانوں کا قائم کیا ہوا سیاسی نظام دم توڑ رہا تھا ۔ اُن کی معاشرت کی بنیادیں ہل چکی تھیں ۔ اُن کی تہذیب میں رخنے پڑ گئے تھے ۔ وہ مغل جو صدیوں تک اس سر زمین پر اسلامی اقدار کا پرچم لہراتے رہے تھے ، اب صرف نام کے حکمران رہ گئے تھے ۔ اُن کی طاقت ختم ہو چکی تھی ۔ اُن کے اقبال کا آفتاب گمنا گیا تھا ۔ اس انحطاط

و زوال کے باعث جو انتشار پیدا ہو سکتا ہے ، وہ اس ماحول میں نمایاں تھا ۔ افراد زندگی سے بیزار تھے ۔ انہیں اسے مستقبل کا علم نہیں تھا ۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے ۔ اُن کی زندگی میں ایک کھوکھلا پن پیدا ہو گیا تھا ۔ وہ اپنے اُس پاس اور گرد و پیش ایک خلا کا محسوس کرتے تھے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس ماحول میں نئی زندگی کی لہریں اُٹھ رہی تھیں ۔ نئی قدروں کا وجود بھی ہو رہا تھا ۔ یہ اور بات ہے کہ ان سے اُس وقت افراد نے ذہنی طور پر مطابقت پیدا نہیں کی تھی ۔ انہیں اپنا ماضی بہت عزیز تھا ۔ وہ اس کی عظیم روایات کو اپنے سینے سے چمٹائے اور کلیجے سے لگائے ہوئے تھے ۔ انہیں اس روایت کی ارتقائی کیفیت کے رگ جانے کا بڑا غم تھا ۔ اس غم کی وجہ سے اُن کی آنکھیں پریم تھیں ۔ ایک نئی زندگی کا آفتاب ضرور طلوع ہو چکا تھا لیکن ایک دھندلے سے اُس کو چاندروں طرف گھیرے ہوئے تھی ۔ مسلمانوں کی زندگی کو بدلنے اور اُس کو نئے حالات سے آشنا کرنے کے خیالات بھی کسی نہ کسی صورت میں پیدا ہونے لگے تھے ۔ ان خیالات نے اس زمانے میں بعض تحریکوں کا روپ بھی اختیار کر لیا تھا ۔ جہاد کے تصورات بھی عام ہونے لگے تھے ۔ عمل کا خیال بھی نمایاں ہونے لگا تھا ۔ افراد شعور سے بھی کام لینے لگے تھے ۔ غرض اُس وقت کا ماحول ، باوجود نامساوکار حالات کے ، ایک انقلابی تبدیلی سے ہمکنار تھا ۔

غالب اسی ماحول کی پیداوار ہیں اور اُن کی شخصیت اور شاعری اسی ماحول کی آئینہ دار ہے ۔ غالب صرف اپنی انفرادیت ہی میں گم نہیں تھے ، وہ اپنے آپ سے باہر نکل کر بھی دیکھتے تھے ۔ اُس زمانے کے مسلمانوں کی زندگی کا پورا نقشہ اُن کی آنکھوں کے سامنے تھا ۔ اُس وقت کے معاشرتی اور تہذیبی تشب و فراز کی تصویر اُن کی نظر میں تھی ۔ انہوں نے مسلمانوں کی ایک عظیم سلطنت کو دم توڑتے ہوئے دیکھا ۔ اُن کی بلند پایہ معاشرت اور تہذیب کی شہرت انہیں گرتی ہوئی نظر آئی ۔ وہ ان حالات سے متاثر ہوئے اور یہ تاثر اتنا گہرا ہوا کہ وہ اس کے مختلف پہلوؤں کی توجہ کی لیے مجبور ہوئے ۔ اُن کے خطوط میں تو ان حالات کی تفصیل کچھ اس طرح بکھری ہوئی ہے کہ اس کو دیکھ کر اس زمانے کے مسلمانوں کی زندگی کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے ۔ غیر ، غلطوں میں تو یہ سب کچھ ہونا ہی

حاجے تھا۔ کیونکہ وہ بہر حال اس زمانے میں لکھے گئے ہیں جب نامازگار حالات اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ اور غالب کی زندگی ان ہی حالات کے سائے میں گذر رہی تھی۔ لیکن انہوں نے اپنی غزلوں میں بھی ان حالات کی تصویر کشی کی ہے۔ وہ مشاہدہ حق کی گفتگو باد و ساغر میں اور ناز و غمزہ کی بات دشنہ و خنجر میں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے ان اجتماعی اور قومی فائزات کو غزل کے مخصوص اشعاروں اور کتاہوں میں پیش کیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ غالب کی غزل کا ایک اہم موضوع حسن و عشق ہے۔ لیکن انہوں نے اس حسن و عشق کے مختلف پہلوؤں کو اپنے زمانے کے مخصوص معاشرے میں منظر میں پیش کیا ہے۔ وہ اپنی عشقیہ شاعری میں اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ ان کے معاشرے میں بوائے دوس کی کوئی حیثیت نہیں۔ حسن پرستی تو اہل نظر کا شیوہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حسن پرستی کے کچھ معیار رکھتے تھے۔ یہ حسن پرستی ان کے خیال میں عشق کا منبع ہے اور عشق زندگی میں ایک مکمل نظام کی حیثیت رکھتا ہے۔ سماجی زندگی اس کو متاثر کرتی ہے اور خود وہ سماجی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ ان دونوں کو الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ان کے یہ اشعار اس حقیقت کو پوری طرح واضح کرتے ہیں :

ک گو میں رہا رہیں ہم ہائے روزگار

لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

✓ پیری و فاقہ کیا ہو تلال کہ دہر میں

تیرے سوا ابھی ہم یہ بہت سے ستم ہوئے

۱۔ لکھد کسب حوادث کا ٹھٹھل کسر نہیں سکتی

مری طاقت کہ طاس تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو ہر اب

دیکھا تو کم ہوئے ہم غم روزگار تھا

جہاں غالب نے غم عشق اور غم روزگار کے رشتے کی وضاحت کی ہے اور

دونوں کے باہمی ربط کو بے نقاب کیا ہے۔ ان سے باب ظاہر ہے کہ

ناسازگار حالات کے باعث عشق کے عام تقاضوں کو پورا کرنا اور اس کے اعلیٰ معیاروں کا برقرار رکھنا آسان نہیں تھا۔ یہ خیالات ان کے سماجی اور اجتماعی شعور پر دلالت کرتے ہیں۔

لیکن یہ اجتماعی شعور صرف ان کی عشقیہ شاعری ہی تک محدود نہیں۔ یہ شعور تو ان کے یہاں اس قدر بڑھا ہے کہ وہ اپنی غزلوں میں اس زمانے کی زندگی کا اچھا خاصا مرثیہ لکھنے لگے ہیں۔ غزلوں کے ان اشعار میں اسلوب تو غزل کا ہے لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو ان میں اس زمانے کی سماجی حالت، اس کے بنیادی معاملات اور اساسی مسائل بے قائب نظر آتے ہیں اور ان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کی سماجی زندگی کا کیا حال تھا؟ افراد پر کیا بیت رہی تھی اور وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہے تھے؟

غالب کو مسلمانوں کی تہذیبی عقلمت کا احساس تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ ان کی تہذیب نے جو روایت قائم کی ہے، اس پر یقیناً فخر کیا جا سکتا ہے۔ انسانی تاریخ میں اس نے جو کار پائے نمایاں انجام دے دیے، ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن اس روایت کو اپنے ارتقائی سفر میں ناسازگار حالات سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ اسی احساس کو غالب نے اس شعر میں ڈھالا ہے:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن بھر بھی کم نکلے

بظاہر تو یہ شعر ایک انفرادی جذبے کا ترجمان معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی تہ میں درحقیقت ایک اجتماعی احساس و شعور وجود ہے۔ اسی غزل کا ایک اور شعر ہے جس میں غالب نے اسی بنیادی خیال کو کچھ اور وضاحت سے پیش کیا ہے۔ غالب کو مغلوں کی تہذیبی بساط کے اٹھنے کا بڑا غم تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں وہ اس کو بہت بڑا سانحہ سمجھتے تھے۔ کیونکہ مسلمانوں کی اس عظیم سلطنت کی بنیادوں کے بل جانے کی وجہ سے انتشار اور افراقی کا دور دورہ ہوا اور ان کی عزت خاک میں مل گئی۔ غالب نے جب یہ شعر کہا تو اس کی تہ میں یہی خیال تھا:

نکلنا خلد ہے آدم کا سنے آئے تھے لیکن

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہاں آدم کے خلد سے نکلنے کی تلمیح کا سہارا لیے کر غالب نے اپنی تہذیبی روایات کے بارے میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ دیا ہے ۔ جتنا بھی غور کیجیے ، اس میں معنویت کی ذیلیں نظر آتی ہیں ۔

اس تہذیبی روایت کے انحطاط و زوال کی وجہ سے کساد بازاری کا دورہ دورہ ہوا ، معیار باقی نہ رہے ۔ قدریں منتشر ہو گئیں ۔ اصول ڈانوا ڈول ہو گئے ۔ اس انتشار اور ہنگامے میں کسی ایک کو بھی طہانیت نصیب نہ ہو سکی ۔ نفسی نفسی کا عالم پیدا ہوا ۔ ایک دوسرے سے توقعات اٹھ گئیں ۔ خستگی کی کوئی داد دینے والا نہ رہا کیونکہ خستگی تو ہر ایک کا مدبر بن گئی تھی ۔ غالب نے اس شعر میں اسی بنیادی خیال کی ترجمانی کی ہے :

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد ہانے کی

وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تبغ ستم نکلے

صاف ظاہر ہے کہ سماجی زندگی کے انحطاط و زوال کے باعث پیدا ہونے والی زبوں حالی اس شعر کی بنیاد ہے ۔

غالب کی ایک اور محزل ہے جس میں سوزِ نہاں سے بے محابا جلنے ، اس میں ذوق و وصل اور یاد یار تک کے باقی نہ رہنے ، گھر کو آگ لگے اور اس میں سب کچھ جل جانے ، اپنے عدم سے برے ہونے اور اس کی وجہ سے آہ آتشیں تک کے بے اثر ہو جانے کا تذکرہ ہے ۔ اس میں غالب نے افسردگی کی آرزو بھی کی ہے کیونکہ طرزِ تباہ اہل دنیا نے انہیں ایسا کرنے کے لیے مجبور کیا ہے ۔ اس کی تفصیل خود غالب کی زبانی سنئے :

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا

آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا

دل میں ذوق و وصل و یاد یار تک باقی نہیں

آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ چوٹھا جل گیا

میں عدم سے بھی برے ہوں ورنہ غافل بار ہا

میری آہ آتشیں سے بال عشقا جل گیا

ان اشعار میں ایک اجتماعی رنگ و آہنگ بہت نمایاں ہے ۔ غالب یہاں بھی

کہتا چاہتے ہیں کہ ان کے معاشرے میں ہر شخص کا دل سوزِ نہاں سے

جل گیا ہے ۔ ماری زندگی میں ایک سلگنے والی کیفیت ہے ۔ پوری تہذیب میں ایک آگ سی اندر ہی اندر پھیل رہی ہے ۔ دلوں کی ہستیاں ویران ہیں ۔ انسانوں اور حوصلوں پر اوس سی بڑکٹی ہے ۔ اور ہر طرف ایک ماتم سا برپا ہے ۔ غالب خود بھی اس ماتم میں شریک ہیں ۔ جب زندگی کا قافلہ اس موڑ پر آ جائے تو ظاہر ہے کہ اُس میں کوئی دل کشی باقی نہیں رہتی ۔ افراد زندگی کی ہر چیز سے بیزار ہو جاتے ہیں ۔ سیر کل تک ہے اُن کا جی گھبرائے لگتا ہے ۔ غالب کہتے ہیں :

عبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موج ہونے لگی ہے ناک میں آتا ہے دم میرا

غم فراق میں تکلیف سیر کل مت دو
عمرے دماغ نہیں خستہ ہائے بے جا کا
یہ اشعار اُس شکست خوردگی کو ظاہر کرتے ہیں جو اس زمانے کے مسلمانوں کی زندگی میں بہت عام تھی ۔ غالب نے یہاں اسی کا نقشہ کھینچا ہے ۔ اس انحطاط و زوال اور شکست خوردگی کے باعث پیدا ہوئے والی تباہی اور بربادی کے ان گنت مناظر غالب کی غزلوں کے اشعار میں ملتے ہیں ۔ یہ چند اشعار دیکھیے :

گریہ چاہے ہے غرابی مرے کاشانے کی
درو دیوار سے لپکے ہے بیابان ہونا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اُس شمع کی طرح جس کو کوئی بیجا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغ لا تھامی

ہونے کل نالہ دل ، دود چراغ محفل
جو قری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو غموش ہے

غیر لبی بھٹل میں ہوئے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

بہ سب اغطال و زوال ہی کے احساس کا نتیجہ ہے ۔ غالب کو ہر طرف
بیابان کی سی کیفیت نظر آتی ہے ۔ جگہ جگہ انہیں آگ میں بھڑکتی، سہلے
سے لپکتے اور دھواں سا اٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ وہ شمع کو خاموش ہاتے
ہیں اور ان مناظر کو دیکھ کر محروسی کا احساس اُن پر چھا جاتا ہے ۔
اس عالم میں وہ لہو روئے ہیں اور زندگی کی محروبیوں کا شکوہ کرتے
ہیں ۔ غالب کا دیوان اس قسم کے اشعار سے بھرا پڑا ہے ۔ یہ اشعار دیکھیے :

غنچہ بھر لگا کھلنے ، آج ہم نے اپنا دل
خون کیا ہوا دیکھا ، گم کیا ہوا پایا

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تہا، جل گیا
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو، غالب کہ دل
دیکھ کر طرز نہاک اہل دنیا ، جل گیا

ہوئے گل ، نالہ دل ، دود چراغ بھٹل
جو نری بزم سے نکلا ، سو پریشان نکلا

دل تا جگر کہ ساحل درہائے خون ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل ، آگے گرد تھا

خموشی میں نہاں ، خون گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغ مردہ ہوں ، میں بے زبان ، گور غریبان کا

گر یہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
درو دیوار سے ٹپکتے ہے بیابان ہوتا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ، ورنہ میرے حال پر
ہر گل تو ایک چشم خون نشان ، ہو جائے گا

۲۶۴

میں اور بزم سے ہے ، ہوں تشنہ کام آؤں
 گر میں نے کی تھی تویہ ، ساقی کو کیا ہوا تھا ؟
 مگر ہارا ، جو نہ روئے بھی ، تو ویراں ہوتا
 بحر اگر بحر نہ ہوتا تو یاباں ہوتا

مکھڑی ویرانی سی ویرانی ہے !
 دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

جانتا ہوں داغ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
 ہوں شمع کشتہ ، درخورِ محفل نہیں رہا
 بے داد عشق سے نہیں ڈرتا ، مگر اسد
 جس دل پہ ناز تھا مجھے ، وہ دل نہیں رہا

درد دل لکھوں کب تک ، جاؤں ، ان کو دکھلاؤں
 آنکھیاں نکار اپنی ، غاسمِ خوں چکن اپنا
 موجِ غوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
 آشیانِ بار ہے الہ جالیں کیا ؟

غم سے مرنے والوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
 کہ کرے تعزیتِ سحر و ونا ، میرے بعد
 آتشِ پرست کہتے ہیں ، اہل جہاں مجھے
 سرگرمِ نالہ ہائے شور بار دیکھ کر

ہے غوں جگر جوش میں ، دل کھول کے روتا
 ہونے جو کئی دیدہ خونناہ نشان اور

جوئے خوں آنکھوں سے جنے دو کہ ہے شامِ فراق
 میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں

کفن میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدام !
 کڑی ہے جس پہ کل بجل ، وہ میرا آشیانِ کیوں ہو

اُس شمع کی طرح ہے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں، ہوں داغِ نا کھاسی

غزان کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتمِ ہال و پرکا ہے

صغتی کشانِ عشق کی بوجھے ہے کیا خبر؟
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپاِ الم ہوئے
لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونِ چکان
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

غیر لیں غفل میں ہوئے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

قد و گیسو میں قفس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

ہے موجِ زن اک قلزمِ خون، کاش ہی ہو
آنا ہے، ابھی دیکھئے، کیا کیا مرے آگے

ان اشعار میں بظاہر تو انفرادی معاملات کی ترجمانی نظر آتی ہے لیکن
ذرا غور سے دیکھا جائے تو ان کی تہ میں اُس زمانے کے اجتماعی معاملات
کا احساس و شعور نظر آتا ہے اور غالب انفرادی رنگ و لہنگ کے پردے
میں انہیں اجتماعی معاملات کی ترجمانی کی ہے۔

ایک اور غزل کے چند مسلسل اشعار سے بھی اس کی وضاحت ہوتی

ہے :

وہ فراقی اور وہ وصال کہاں؟

وہ شب و روز و ماہِ سال کہاں؟

فرصتِ کار و ہارِ شوق کسے

ذوقِ نظارۂ جمال کہاں؟

ایسا آسان نہیں لہو رونا!

دل میں طاقت، چکر میں حال کہاں؟

فسکو دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہہ وال کہاں

یہاں بھی فراق و وصال ، فرصت کار و ہار شوق ، ذوقِ نظارۂ جہاں
وغیرہ کے اشاروں میں غالب نے اپنے زمانے کی اجتماعی صورت حال کی
ترجباتی کی ہے ۔

یہ حالات ، ظاہر ہے ، کہ طاقت ختم ہونے کے نتیجے میں پیدا ہوئے ۔
اس موقع سے نئی طاقتوں نے قائد اٹھایا اور وہ حکمران بن بیٹھیں ۔ انہوں
نے افراد کو سبز باغ دکھائے لیکن انہیں اپنے ہا بہ زنجیر ہونے کا احساس
بہر صورت باقی رہا ۔ اس شعر میں اسی صورت حال کی ترجمانی ہے کہتے ہیں :
✓ ہوں گرفتار الفت صیاد
دولہ باقی ہے طاقت پرواز

اس زمانے کے ہندوستان اور خصوصاً دلی کے سیاسی حالات کو سامنے رکھنا
جائے تو اس شعر میں بڑی معنوی وسعت پیدا ہو جاتی ہے ۔ یہ وہ زمانہ
تھا ، جب سیاست فرنگ نے اپنا کھیل کھیلنا شروع کر دیا تھا ۔ اس سر زمین
پر دام بچھا دیے گئے تھے اور بھولے بھالے لوگوں کو اس دام میں اسیر
کر لیا گیا تھا ۔ لیکن ایسی بٹی پڑھائی تھی کہ وہ اس دام کو دام بھی
نہیں سمجھتے تھے ۔ غالب نے اس شعر میں اسی حقیقت کو پیش کیا ہے ۔
غالب نے اپنے زمانے کے ان نامازگار حالات کا صرف رونا ہی نہیں
رویا ہے ، نئی زندگی سے مطابقت پیدا کرنے اور اس کو ہاتھوں ہاتھ لینے
کا پیام بھی دیا ہے ۔ جب وہ یہ کہتے ہیں :

ک ۔ وہ بادۂ شبانہ کی سر مستیاں کسجاں

آٹھیں بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ نئی زندگی کا استقبال کر رہے ہیں ۔ اس میں
عمل کا ایک پیام بھی موجود ہے ، جو روحانی زاویہٴ نظر کو یہی ظاہر کرنا
ہے ۔

یہ چند خیالات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ غالب صرف اپنی
شکست کی آواز ہی نہیں تھے ، انیسویں صدی کی آواز شکست بھی ان کی
آواز میں شامل تھی ۔ انہوں نے اس پر آنسو بہائے اور اپنے زمانے کی حکایت
خون چکاں کچھ اس طرح لکھتے رہے کہ ان کی شاعری میں ایک اور ہی
عالم نظر آتا ہے ۔

غالب
کی
شاعری میں
غم دوراں

غالب آدمی کو بجائے خود ایک عشر خیال سمجھے تھے۔ اس لیے خلوت میں انہیں انجمن نظر آتی تھی۔ لیکن جہاں تک اپنی ذات کا تعلق ہے انہوں نے انجمن میں ایک خلوت بھی دیکھی ہے۔ ہوں اس میں شک نہیں کہ انہی ذات سے وہ ایک انجمن تھے لیکن حالات نے اس انجمن کو خلوت بھی بنا دیا تھا کم از کم اس انجمن میں خلوت نظر ضرور آتی تھی۔ اسی لیے اُن کی شخصیت کی دنیا میں کبھی انجمن ایک خلوت بن جاتی ہے اور کبھی خلوت ایک انجمن !

اس اجمال کی تعمیل یہ ہے کہ غالب نے عشر خیال اور ایک انجمن ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اس زندگی میں تنہا پایا ہے۔ ایک علیحدگی سی محسوس کی ہے۔ انہوں نے وصل کی تمنا کی ہے لیکن وہ ہجر و فراق کا شکر رہے ہیں۔ جس چیز کو انہوں نے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے ، وہ اُن سے دور بھاگی ہے۔ جن عناصر سے انہوں نے انجمن آرائی کرنا چاہی ہے ، وہ اُن سے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ اسی لیے ایک انجمن ہونے کے باوجود اُن سے انجمن آرائی نہیں ہو سکی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آپ کو تنہا محسوس کیا ہے۔ بے یار و مددگار پایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ زندگی اُن کے لیے دلکشی اور دلاویز ہونے کے باوجود ایک وبال جان بن گئی ہے۔ پھر بھی انہوں نے اُس کو عزیز رکھا ہے۔ وہ اس کے پیچھے دوڑے ہیں۔ اس سے ہم کنار ہونے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس دوڑ بھاگ میں کتنی ہی منزلیں ایسی آتی ہیں ، جب زندگی نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ وہ اُن سے پھڑ گئی ہے اور اس طرح وہ تنہا رہ گئے ہیں۔ اس تنہائی کو انہوں نے

ہمیشہ شفت سے محسوس کیا ہے ۔ ان کا سارا غم اسی احساس محرومی کی پیداوار ہے ۔

اور غم عشق ہو یا غم روزگار ، دونوں کے چشمے ان کے ہاں اسی احساس تنہائی اور احساس تنہائی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے احساس محرومی سے بہوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

زندگی غالب کو بہت عزیز تھی ۔ زندگی اور زندگی کو بسر کرنا ہی ان کے نزدیک سب کچھ تھا ۔ وہ اس کی ایک ایک بات اور ایک ایک پہلو پر جان چھڑکتے تھے ۔ اور زندگی ان کے نزدیک مسرتوں کا نام تھی ۔ دلاویزیوں اور دلفریبیوں کا نام تھی ۔ ان مسرتوں ، دلاویزیوں اور دلفریبیوں سے وہ اپنے سینے کو بھر لینا چاہتے تھے ۔ لیکن زندگی کی یہ مسرتیں ، یہ دلفریبیاں ، یہ دلاویزیاں ابلا کسی کا ساتھ دیتی ہیں ؟ ان سے محرومی ہی ایک حقیقت ہے ۔ یہی زندگی کا قانون ہے ۔ لیکن انسان اس حقیقت کا شعور رکھنے ہوئے بھی ان سب کو حاصل کرنے کے لیے سرگرداں رہتا ہے ۔ بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ انہیں کے سہارے جیتا ہے ۔ لیکن ان سب کا احساس بھی ایک مخصوص ذہنی کیفیت کا تابع ہے ۔ یہ کیفیت نہ ہو تو ان کا احساس بھی مشکل ہے ۔ احساس کا انحصار بڑی حد تک حالات پر ہوتا ہے ۔ اگر حالات سازگور نہ ہوں تو یہ مسرتیں اپنے آپ کو رو پوش کر لیتی ہیں اور آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں ۔

اس عالم میں انسان چاہے بھی تو ان کو نہیں دیکھ سکتا ۔ وہ سامنے آ جائیں تب بھی ان سے محظوظ نہیں ہو سکتا ۔ اسی عالم میں انسان کو اپنی بے بسی کا احساس ہوتا ہے ۔

زندگی اسے ناسازگار نظر آتی ہے اور تاریکی میں وہ اس طرح محصور ہو جاتا ہے کہ روشنی کی کرن اسے دور تک بھی دکھائی نہیں دیتی ۔ اس کا تصور بھی اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے ۔ یہ زندگی کی بڑی ہی کٹھن منزل ہوتی ہے ۔

غالب کو اپنی زندگی میں یہی صورت حال پیش آتی ہے ۔ انہیں حالات سے دو چار ہونا پڑا ہے ۔ زندگی کو وہ اپنے لیے سمجھتے تھے لیکن زندگی انہیں اپنے لیے نہیں سمجھتی تھی ۔ وہ زندگی کے شیدائی تھے لیکن زندگی ان کی شیدائی نہیں تھی ۔ وہ اس کے پیچھے دوڑتے تھے ۔ اے اپنی گرفت

میں لینے کی کوشش کرتے تھے لیکن وہ خود ان سے دور بھاگتی تھی۔ زندگی کا عیش تو ان کے خیال میں جمال حسین خان کے لیے بنا تھا۔ حالانکہ غالب اس عیش کو اپنے لیے سمجھتے تھے۔ یہ عیش انہیں کسی قدر حاصل تو ہوا لیکن اس قدر حاصل نہ ہو سکا کہ ان کی طبیعت سیر ہو جاتی۔ وہ ساری زندگی اس عیش کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہے۔ ان کی زندگی اسی جد و جہد کی ایک کہانی ہے۔ یہ کہانی ایک المیہ ہے۔ اسی لیے اس میں ایک عظمت ہے۔ اس عظمت کو ان حسرتوں اور ناکامیوں نے پیدا کیا ہے جو مرنے دم تک غالب کے ساتھ رہی ہیں۔ یہ حسرتیں اور ناکامیاں کچھ تو غالب کی زندگی میں آئیں بھی اور کچھ ان کی مخصوص ذہنی اور جذباتی کیفیت نے ان حسرتوں اور ناکامیوں کو پیدا بھی کر لیا۔ معمولی بے غم کو ان کی یہ کیفیت ایک بہت بڑا غم بنا لیتی تھی۔ اسی لیے ان کی زندگی میں حسرتوں اور ناکامیوں کا ایک ہجوم ملتا ہے۔ وہ زندگی بھر کڑھنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس بات پر کڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ وہ جس چیز کی جتنی تمنا کرتے ہیں، وہ انہیں اتنی حاصل نہیں ہوتی۔ اسی لیے اس عالم میں ان پر ایک محرومی کا احساس طاری ہو جاتا ہے۔ ان کی زندگی اسی احساس محرومی سے عبارت ہے۔ لیکن اس احساس محرومی میں بھی زندگی کی خواہش ان کے دل سے نہیں نکلتی۔ کامیابی اور کامرانی کا خیال بہر حال ان کے دل میں باقی رہ جاتا ہے۔ ولولوں کے چراغ جلنے رہتے ہیں۔ ذوق و شوق کی شمعیں فروزاں رہتی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ خواب و خیال کی دنیا میں ہوتا ہے۔ غالب اسی خواب و خیال کی دنیا میں کھو جاتے ہیں، وادی خیال کو مسانہ طے کرنا ان کا شعار بن جاتا ہے۔ ناکہ اس کے بعد حسرت اور ناکامی کی اس دنیا میں باز گشت کی تمنا نہ رہے :

مسانہ طے کروں ہوں رہ وادی خیال

تا باز گشت سے نہ رہے مدعا مجھے

مرور صاحب نے اس کیفیت کو ان کی نسلی خصوصیت سے تعبیر

کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

”غالب کو اپنے حسب و نسب پر فخر تھا۔ مہمگری ان کا آبائی

پیشہ تھا۔ ان کے باپ دادا اس لیے نہیں لڑتے تھے کہ انہیں کوئی

مقدس جہاد یا بڑا مشن عزیز تھا۔ لڑنا اُن کا پیشہ تھا۔ مگر یہ ایک ترک صرف لڑتے ہی نہیں تھے ، خواب بھی دیکھتے تھے ۔ اُن خوابوں میں بڑے بڑے معرکوں کا جلال اور شاہد و شہاب کا جلال تھا ۔ یہ عیشِ امروز ہی کے قائل نہ تھے ، انہیں عیش کے خواب بھی ملتے تھے ۔ ترکوں کے بیانِ رزم و یزم ایک خواب کے دو پہلو تھے ۔ غالب کے وقت تک آنے آنے بلوار نشتر رہ گئی مگر یہ خواب دیکھنا نہ گیا ۔ غالب کو ایک تندرست ذہن ملا تھا ۔ چین میں بے فکری اور رنگ رلیوں سے ماہم رہا ۔ اُن کی جوانی خاصی دیوانی تھی مگر یہ ان کی ساری زندگی کی پیاس کو کبھی نہ بجھا سکی ۔ یہ اشعار اُن کے مزاج کی بڑی اچھی تفسیر ہیں :

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
جہت نکلتے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلتے

آنا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار ہمارا
مجھ سے مرے گدہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

نا کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب ! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

لیکن یہ اشعار صرف نسلی خصوصیت ہی کے زہر اثر تخلیق نہیں کرتے ہیں ۔ اُن کے پیچھے اور بھی جہت کچھ ہے۔ اُن کے پیچھے آرزوؤں اور تمنائوں کا وہ خون ہے جو غالب کی زندگی میں سب سے زیادہ نمایاں تھا ۔ اُن کی محرک وہ حسرتیں اور ناکامیاں بھی ہوتی ہیں جن سے غالب کی زندگی عبارت تھی اور جن کو غالب نے اپنے اوپر کچھ زیادہ ہی شدت سے طاری کر لیا تھا ۔ لیکن اس میں اُن کی شعوری کوشش شامل نہیں تھی ۔ خارجی حالات اس کے محرک ہوئے تھے ۔ غالب انہیں خارجی حالات کے زخمِ خوردہ تھے۔ اور اس کا انہیں بڑا غم تھا ۔ لیکن وہ عبور تھے ۔ مشیت کے آگے اُن کی کچھ بھی پیش نہیں جاتی تھی ۔ اسی لیے تو وہ چیخ اٹھتے تھے :

مارا زمانے نے اسدِ اللہ خان سمجھیں
وہ ولولے کہاں ، وہ جوانی کدھر گئی

یہ زمانے کی سفاکی غالب کی سب سے بڑی دشمن رہی ہے۔ اسی نے ولولوں کا خون کیا ہے۔ اسی نے جوانی کو خاک میں ملایا ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ ہزاروں خواہشیں ایسی ہیں کہ ہر خواہش پر ان کا دم نکلا ہے۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ ان کے ارمان اگرچہ بہت نکلتے ہیں لیکن پھر بھی کم نکلتے ہیں۔ اسی کا اثر ہے کہ انہیں خدا کے سامنے حساب دیتے وقت بھی داغ حسرت دل کا شاہر باد آتا ہے اور اسی کا اثر ہے کہ وہ ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی داد طلب کرتے ہیں۔ غالب کو زمانے کی اس سفاکی کا بڑا غم تھا۔ وہ زندگی بھر اسی غم میں پابجولاں رہے۔ اسی زمانے کے غم یا غم دوران نے ان کی ان ذہنی و جذباتی کیفیات کو پیدا کیا ہے جو ان کے فکر و فن میں قدم قدم پر اپنے آپ کو رونما کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی شاعری میں شروع سے آخر تک کم و بیش انہیں کیفیات کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔

یہ غم، جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا، کچھ تو غالب کے ماحول میں موجود تھا لیکن کچھ غالب کی اللہاد طبع نے بھی اس کو پیدا کیا ہے۔ زندگی کی مسرتوں کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کا خیال ان کی گھٹی میں بڑا تھا۔ ان مسرتوں سے سینہ بھر لینے کی تمنا ان کے مزاج کا بنیادی جزو تھی۔ ان مسرتوں کے جھرمٹ میں اکتساب لذت ہی کو وہ سب کچھ سمجھتے تھے۔ لیکن سماجی حالات اس کے لیے سازگار نہیں آئے۔ کیونکہ یہ سیاسی انتشار اور معاشی افراتفری کا زمانہ تھا۔ زمانے کی گردش نے قسمتوں پر بھی گردش طاری کر دی تھی۔ ان حالات میں جس چیز کی تمنا کی جائے، اس کا ملنا آسان نہیں ہوتا۔ غالب نے ایسی گردش کے دن اس سے قیل نہیں دیکھے تھے۔ اس لیے انہیں یہ گردش کچھ عجیب سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اس پر کڑھتے تھے، پریشان ہوتے تھے۔ لذت پرستی اور تعیش پرستی ان کی طبیعت میں داخل تھی۔ حالات کا اس لذت پرستی اور تعیش پرستی کی راہوں میں حائل ہونا ان کے لیے مصیبت کا سداں ہوا۔ چنانچہ یہی بات ان کے لیے غم کا باعث بن جاتی تھی۔ ان کا دل غم کھانے میں بہت بودا تھا۔ اسی لیے مے کفام کے کم ہونے کے رنج گو بھی وہ بہت محسوس کرتے تھے۔ مے کفام بالکل ہی نہ ہوتی تو خدا جانے ان کا کیا حال ہوتا :

غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مٹے گفام ، بہت ہے

غالب رئیس زادے تھے۔ انھوں نے امارت اور جاہ و ثروت کی آغوش میں آنکھ کھولی تھی۔ لیکن ان کی زندگی میں ایسی سازشیں بھی آئیں ، جب اس امارت کا خیال اور جاہ و ثروت کا احساس ہی ان کے لیے مصیبت بن گیا۔ زندگی بھر وہ اس امارت اور جاہ و ثروت کو برقرار رکھنے اور اس کو سنبھالنے میں زمین آسمان ایک کرتے رہے۔ اس راہ میں کسے کسے نازک سوڑ آئے۔ راستے کی ناپسواری کے باعث انہیں کیسی کیسی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ لیکن اس امارت اور جاہ و ثروت کے خیال کو انھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے آپ سے جدا نہیں ہونے دیا۔ کیونکہ اس کو وہ اپنا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے تھے۔ وہ ساری زندگی ٹھوکریں کھائے، گرتے اور سنبھلتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی زندگی ختم ہو گئی لیکن جاہ و ثروت کا خیال آخر دم تک باقی رہا۔ انھوں نے اس کو ٹھیس نہیں لگنے دی۔ لیکن اس سلسلے میں جن مصیبتوں اور پریشانیوں کا انھیں منہ دیکھنا پڑا ، وہ کبھی ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں آتی تھیں۔ انھوں نے ایک زمانے تک زندگی کو محض بھولوں کی سیج سمجھا تھا لیکن اب انھیں یہ معلوم ہوا کہ وہ تو کانٹوں کا بستر ہے۔ اسی صورت حال نے انھیں سہاجی اور معاشی حالات کی ناسازگار کیفیت کا احساس دلایا۔ اس زمانے کی ساری سہاجی زندگی انھیں ایک کرب کے عالم میں نظر آتی۔ لیکن زندگی کے اس کرب کو انھوں نے اپنی شخصیت کے آئینے میں دیکھا ہے۔ ان کے پاس کوئی اجتماعی زاویہ نظر نہیں تھا ، اس لیے انھیں اپنی ہی پریشانیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ لیکن جہاں بھی انھوں نے پریشانیوں کا تذکرہ کیا ہے ، وہاں زمانے کی ناسازگار کیفیت کو وہ محسوس کرتے ہوئے ضرور معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے خطوں میں اس کی ساری تفصیل ملتی ہے۔ چودھری عبدالغفور سرور کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

”میں ہانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا۔ نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عرصے میری اور میرے شرکاء حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے۔ انھوں نے نہ دیے، مگر تین ہزار روپے سال۔ اس میں سے خاص

میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سال ۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ عین ظاہر کیا ۔ گولبروک صاحب ۔ جادو ریڈیفنڈٹ دہلی اور اسٹرانگ صاحب ۔ جادو سکریٹری گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر ۔ ریڈیفنڈٹ معزول ہوئے ۔ سکریٹری گورنمنٹ ناگہ مر گئے ۔ بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے مجھ کو روپے سہ ہزار مقرر کیا ۔ ان کے ولی عہد نے چار سو روپے سال ۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے ۔ واجد علی شاہ کی سرکار سے بہ صلہ مدح گذشتہ پانچ سو روپے سال مقرر ہوئے ۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے ۔ یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی ۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی ۔ سات برس مجھ کو روٹی دے کر بکڑی ۔ ایسے طالع میری کٹھ اور عین سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں ۔ اب جو میں والی دکن کی طرف رجوع کروں ہاتھ رہے کہ متوسط یا مر جاوے گا یا معزول ہو جائے گا ۔ اور اگر یہ دونوں اس واقعہ نہ ہونے تو کوشش اس کی ضائع جائے گی اور والی شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور اچانک اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی ۔ اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے ۔ اے خداوند بندہ پرور ! یہ سب باتیں وقوعی اور واقعی ہیں ۔“

یہ ظاہر اس خط میں غالب نے اپنا رونا رویا ہے لیکن اس میں سلطنتوں کے مٹنے کا ذکر ہے ، بادشاہوں کے معزول ہونے کا بیان ہے ، جاگیروں کے ختم ہونے کا تذکرہ ہے ، جس کے نتیجے میں ایک عام افرائی پیدا ہوئی ہے اور اس افرائی کا شکار بہت سے افراد ہوئے ہیں ۔ غالب بھی ان میں شامل ہیں ۔ اس عام افرائی میں انہیں جن حالات سے دو چار ہونا پڑا ہے ، اس کی تفصیل و جزئیات کی منہ بولتی تصویر ان خطوں میں موجود ہے ۔

مرزا تقیہ کو لکھتے ہیں :

”یہ تمہارا دعا گو اگرچہ امور میں پایہ عالی نہیں رکھتا مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے ۔ یعنی بہت محتاج ہوں ۔ سو دو سو میری پیاس نہیں بجھتی ۔ تمہاری بہت پر سو ہزار آفریں ۔ جسے اور سے

مجھ کو دو ہزار آجاتے تو میرا فرض رفع ہو جاتا ۔ اور پھر اگر دو چار برس زندگی اور ہوئی تو اتنا ہی فرض اور مل جاتا ۔ یہ بائج سو تو، تمہاری جان کی قسم، منفقات میں جا کر سو ڈیڑھ سو بیج رہیں گے۔ سو میرے صرف میں آ جاتیں گے ۔ مہاجنوں کا جو سودی فرض ہے وہ بقدر ہفتہ سولہ کے باقی رہے گا ۔ اور وہ جو بابو صاحب سے منگوائے تھے ، قیمت اس چیز کی جو ہمارے مذہب میں حرام اور تمہارے مشرب میں حلال ہے ، سو وہ دے گئے ۔ یقین کہ آج کل میں بابو صاحب کا خط مع ہنڈوی آجاوے۔ بابو صاحب کے جو غلطو ضروری اور کوالحذ ضروری میرے پاس آئے ہوئے تھے ، وہ میں نے پنجشنبہ ۲۶ مئی کو ہارسل میں ان کے پاس روانہ کر دیے اور اس میں لکھ بھیجا کہ ہنڈوی اور ، میرے بھیجے ہوئے لفافے جلد بھیج دو ۔ پنجشنبہ کو آج پندرہ دن ہوئے ہوتے ۔“

مرزا علاؤالدین خان کو لکھتے ہیں :

”بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب ! وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے فرض لیا ، ادھر درباری مل کو مارا ۔ ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لولی ۔ ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود ۔ شہد لگاؤ چاٹو ۔ نہ مول نہ سود ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ ہوو بھی کے سر ۔ بائیس ہند کبھی خان نے کچھ دے دیا ۔ کبھی الور سے دلوایا ۔ کبھی ماں نے کچھ آگرہ سے بھیج دیا ۔ اب میں اور ہاشم روپے آٹھ آنے کلکٹری کے سو روپے رام پور کے ۔ فرض دینے والا ایک میرا مختار کار ، وہ سود ماہ بمانہ لیا چاہے ۔ دل میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا ، چوکیدار جدا ، مول جدا ، بی بی جدا ، بیجے جدا ، شاگرد پیشہ جدا ۔ آمد وہی ایک سو ہاشم ۔ تنک آ گیا ۔ گزارا مشکل ہو گیا ۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا ۔ سوچا کہ کیا کروں ، کہاں سے گنجائش نکالوں ۔ فہر درویش ہرجان درویش ۔ صبح کی تہرید متروک ، چاشت کا گوشت آدھا رات کی شراب و گلاب سوقوف ۔ بیس بائیس روپے سہجہ بچا ۔ روزمرہ کا خرچ چلا ۔ یاروں نے پوچھا تہرید و شراب کب تک نہ ہو گئے ۔“

کہا گیا جب تک وہ نہ ہلائیں گے ۔ پوچھا کہ نہ بیو گے تو کس طرح جیو گے ؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے ۔“
مرزا قربان علی بیگ کو لکھتے ہیں :

”سیری جان ! کن اوہام میں گرفتار ہو ۔ جہاں باپ کو بیٹ چکا اب چچا کو بھی رو ۔ خدا تجھ کو جیٹا رکھے اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورت و قوعی دے ۔ جہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں ۔ مخلوق کا کیا ذکر، کچھ بن نہیں آتی ۔ آپ اپنا ہماشائی بن گیا ہوں ۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں ۔ یعنی میں نے اپنے آپ کو غیر تصور کیا ہے ۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں : تو غالب کے ایک اور جونی لگی ۔ مہت اترانا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں ۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں ۔ لے اب تو فرض داروں کو جواب دے ۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا ، بڑا کافر مرا ۔ ہم نے از راہ تعظیم جب بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرامگاہ و عرش نشین خطاب دے دیں ۔ چونکہ یہ اپنے آپ کو شاہ قندرو سخن جانتا تھا ۔ سر منار اور ہادیہ زادیہ خطاب تجویز کر رکھا ہے ۔ آگے نجم الدولہ بہادر ! ایک فرض دار کا گریبان میں ہاتھ ۔ ایک فرض دار کو بھوک ستا رہا ہے ۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں ۔ اجی حضرت ! نواب صاحب ، نواب صاحب کیسے ۔ او خاں صاحب ! آپ سلجونی اور فراسیائی ہیں ، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے ۔ کچھ تو اکتسو ، کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا ، بے عزت ، کوٹھی سے شراب ، گندھی سے گلاب ، بزاز سے کپڑا ، سیوہ فروش سے آم ، صرف بے دام فرض لیے جاتا ہے ۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا کہ کہاں سے دیا جائے گا۔“

سیر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں :

”سیرن صاحب کو جب تک نہ کہو میں دلی نہ ہلاؤں۔ بھائی ہوش میں آؤ ، غور کرو ۔ یہ مقدور مجھ میں نہیں کہ ان کو جہاں ہلا کر ایک الگ مکان رہنے کو دوں ۔ اور اگر زیادہ نہ ہو تو تیس روپے سینہ مقرر کروں کہ بھائی ! یہ تو اور دروہہ اور چاؤڑی اور اجمیری دروازہ کا بازار اور لاہوری دروازہ کا بازار ثابتے پھرو ۔

اور اردو بازار اور خاص بازار اور بلاق بیگم کا کچھ اور خان دوران
خان کی حوالی کے کھنڈر گئے پھر۔ اے میر مہدی ! تو درمائدہ
و عاجز ہانی ہت میں پڑا رہے۔ - میرن صاحب وہاں بڑے ہوئے دلی
دیکھنے کو لڑسا کریں۔ سرفراز حسین نوکری ڈھونڈتا پھرے۔
اور میں ان غم ہائے جاں گداز کی تاب لاؤند مقدور ہوتا تو دکھا دیتا
کہ میں نے کیا کیا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔“

اور یوسف مرزا کے نام لکھتے ہیں :

”میری جان ! خدا تیرا نکمچان۔ جانتے ہو کہ علی کا بندہ ہوں۔
اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اس وقت کلو کے پاس ایک
روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ اس کے بعد نہ کہیں بے قرض کی امید ہے،
نہ کوئی جس رہن و بیع کے قابل۔ اگر رام پور سے کچھ آیا تو غیر
ورقہ انا اللہ و انا الیہ راجعون۔“

یہ خطوط، غالب ہی کا نہیں، اس پورے دور کا مرئیہ ہیں، جس میں
ہر فرد کی انفرادیت آندھیوں کی زد پر تھی۔ کیونکہ معاشی افراتفری کی
وجہ سے زندگی کی بنیادوں میں کھوکھلا پن پیدا ہو گیا تھا۔ جاہ و ثروت
اور عزت و آبرو کے جنازے نکل چکے تھے۔ عظمت رفتہ کی صرف یاد باقی
رہ گئی تھی۔ زیست کے لیے کوئی سامان نہیں تھا۔ افلاس نے قرض کی
دروازے کھول دیے تھے۔ کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ نفسی
نفسی کی کیفیت تھی۔ یہ گویا ایک میدان حشر تھا، جس میں ہر ایک کو
اپنی اپنی فکر تھی۔ سورج سوا نہیں پر آ گیا تھا اور لوگ اس عالم میں
بڑے تلخ رہے تھے۔ غالب پر ان حالات نے گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔
ان کی زندگی کا ہر لمحہ ان حالات پر خون کے آنسو چائے گذرا ہے۔ انہیں
صرف اس بات ہی کا غم نہیں ہے کہ ان کے لیے زندگی دوبار ہو گئی ہے
— بلکہ اس بات کا بھی غم ہے کہ ان حالات میں دوسروں کے لیے بھی
زیست مشکل ہے :

ہوئی جن سے توقع خوشی کی داد ہانے کی

وہ ہم سے ابھی زیادہ خستہ تیغ ستم تلکے

وہ اس پر کڑھتے ہیں، پریشان ہوتے ہیں — بہت کچھ کرنا چاہتے
ہیں لیکن کچھ کر نہیں سکتے — اس لیے بے بسی اور کس مہر سی کا شکر

ہوجاتے ہیں۔ غالب کی زندگی اس بے بسی اور کس پرہیز سے عبارت ہے۔
اسی بے بسی اور کس پرہیز کے مستند سے غم کے بادل اٹھتے ہیں اور
غالب کی زندگی کے افق پر منڈلانے لگتے ہیں، چھا گئے ہیں۔ اور اس طرح
برے ہیں کہ غالب کو شرابور کر دیا ہے۔

ظاہر ہے اس غم کو پیدا کرنے میں زمانے کا ہاتھ ہے۔ اسی لیے
غالب اس غم کو پیش کرتے ہوئے غم دوروں کے شکوہ منہج نظر آتے ہیں۔
اس غم کی نوعیت اگرچہ بظاہر انفرادی ہے لیکن در حقیقت وہ ایک بڑا
ہمس نظر دکھتی ہے اور اسی لیے وہ غالب کے چاہ ایک اجتماعی رنگ
اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ وہ غالب کے انفرادی غم کے بجائے ایک طبقے
کا غم، ایک معاشرت کا غم، ایک تہذیب کا غم اور ایک نظام کا غم
ہوجاتا ہے۔ غالب اس غم کو اسی طرح محسوس کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ غالب کے زمانے کے عام سماجی انتشار اور
معاشی افراتفری نے بڑی حد تک ان کے چاہ غم دوروں کے اس احساس
کو پیدا کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی میں کچھ اور
معاملات بھی ایسے ہیں، جو اس کو جگانے میں برابر کے شریک ہیں۔ غالب
کی زندگی میں سب سے پہلی ٹھوکر ان کی یتیمی تھی اور غالب اس زندگی
میں دو بار یتیم ہوئے۔ پہلے ان کے والد عبداللہ بیگ خاں کا انتقال—والد
کے انتقال کے بعد ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے ان کی پرورش اپنے
ذمے لی۔ لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہ بھی اس دنیا سے چل بسے۔
انہوں نے خود لکھا ہے "پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا۔ آٹھ برس کا تھا
چچا مر گیا۔" اس طرح غالب گویا دوسری بار یتیم ہوئے۔ کم از کم
الہوں نے محسوس ہی کیا۔ اور اگرچہ چچا کے انتقال کے بعد تنہیال میں
ان کی زندگی نسبتاً زیادہ آرام و آسائش سے گزری لیکن یہ خیال ان کے دل
میں بیٹھ گیا کہ وہ اس زندگی میں بے بار و مددگار ہیں۔ اگر شعوری طور
پر نہیں تو کم از کم غیر شعوری طور پر وہ اس اعتبار سے اپنے اندر اور
آس پاس ایک کمی سی ضرور محسوس کرتے رہے۔ یہ ایک بہت بڑا خلا
تھا، جو ان کی زندگی میں کبھی بھی پر نہ ہو سکا۔ لڑکپن میں ان کا لہو و
لعب میں پڑ جانا، درحقیقت اس غم کو غلط کرنے کے لیے ایک فراہ کا ذریعہ
بھی ہے۔ پھر سمند لاز یہ ایک اور قازیاء یہ ہوا کہ ۱۳ سال کی عمر میں

ان کی شادی کر دی گئی۔ اس شادی کو انہوں نے ساری زندگی ایک مصیبت ہی سمجھا کیوں کہ اس کی وجہ سے وہ بے یار و مددگار زندگی کے نا پیدا کنار سنٹر میں پھنس گئے۔ اور ساری زندگی انہیں کنارہ نہ ملا۔ — وہ خود اس کو 'حبس دوام' کہتے ہیں۔ لکھا ہے: 'سانویں رجب ۱۲۲۵ء کو میرے واسطے حکم دوام حبس (یعنی نکاح) صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ باہان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی حبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے نکلے، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مشقت مفری اور مشکل ہو گئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں۔ سال گزشتہ بیڑی کو زاویہ زندان میں چھوڑا۔ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو سہنے رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا۔ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو؟ — ایک ضعیف سا احتال ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعد لمبات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا۔' اس سے صاف ظاہر ہے کہ متاہل زندگی ان کے لیے تمام عمر ایک مصیبت بنی رہی۔ شادی شدہ زندگی کے معاملات و مسائل نے نہ جانے کیا کیا کچھ ان سے کرایا۔ بہر حال اس زندگی نے غالب کے یہاں 'لغنی' حیات کے احساس کو زیادہ شدید کیا۔ اور زیست کرن انہیں ہمیشہ دشوار نظر آئی۔ لحم دوروں کے احساس کو ان کی زندگی کے اس پہلو نے بھی شدید سے شدید تر کیا ہے۔ چنانچہ ساری زندگی میں انہیں اپنے اس ہلس اس کی حکمرانی نظر آتی ہے۔

غالب کو ان تمام حالات نے اس بات کا یقین دلایا کہ مشیت ان کے خلاف ہے اور اسی لیے زمانہ ان کے لیے سازگار نہیں ہے۔ یہ احساس کچھ اور بھی شدید ہوا، جب انہوں نے اپنوں اور بیگانوں کی سردسپری دیکھی۔ جب انہیں ایک زمانہ مخالفت پر آمادہ اور دشمنی پر کمر بستہ نظر آیا۔ لوگوں نے غلطوں میں انہیں گالیاں لکھیں اور طرح طرح سے ان کی پکڑی

اچانی۔ قسمت نے انہیں قید و بند کی صعوبتوں تک سے دو چار کیا۔
غرض وہ "اوضاع ابتائے زبان" کے ہمیشہ شکوہ منہج رہے۔ انہوں نے تو
ہمیشہ ان کے ساتھ نیکی کی لیکن اس کا بدلہ انہیں ہمیشہ بدی کی صورت
میں ملا :

کہوں کیا غویٰ اوضاع ابتائے زبان غالب

بدی کی اس نے، جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

اس کے ساتھ ہی ہے مہریٰ بازارِ وطن سے ابھی انہیں ہمیشہ شکوہ

رہا۔ اس کا اظہار انہوں نے واضح طور پر کیا ہے :

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب

غم کو ہے مہریٰ بازارِ وطن یاد نہیں ؟

اسی لیے تو وہ اپنے آپ کو مردم گزیدہ کہتے ہیں :

ہاں ہے شک گزیدہ ڈرے جس طرح اسد

ڈوتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

جس وجہ سے کہ ان کی نظریں دلی میں "قطع غم الفت" دیکھتی ہیں

۔ اور وہ سوچ کر پریشان ہو جاتے ہیں کہ اگر اس معمورے میں رہے تو

کہائیں گے کیا، کھانے کے لیے غم الفت بھی تو یہاں موجود نہیں :

ہے اب اس معمورے میں قطع غم الفت اسد

ہم نے یہ سنا کہ دلی میں رہیں، کھائیں گے کیا ؟

اور غالب ان حالات سے اس حد تک متاثر ہوئے کہ دہر میں انہیں

"نقشِ وفا" بدل ہوتا ہوا نظر نہ آیا۔ ان کے خیال میں تو یہ ایک ایسا

لفظ ہے ، جو کہیں بھی شرمندہ معنی نہ ہو سکا :

دہر میں نقشِ وفا ، وجہ تسلی نہ ہوا

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا

غرض غالب کو لوگوں کی ایک ایک بات اور ایک ایک انداز میں

زمانے کی سرد مہری نظر آتی۔ کہوں کہ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ یہ

تمام حالات زمانے کی افراتفری ہی کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں ۔

غالب کی زندگی اور شخصیت پر زمانے کا یہ غم اسی لیے چھایا ہوا

معلوم ہوتا ہے ۔ اس کو الگ کر لیا جائے تو ان کے یہاں کوئی اور اہم

بات باقی نہیں رہتی ۔ ان کے فکر و فن دونوں میں اس کی کارفرمائی ہے ۔ ان

کے سارے خیالات و نظریات اسی کے گرد گھومتے ہیں۔ جس خیال کا اظہار بھی انہوں نے کیا ہے، جو کیفیت بھی انہوں نے بیان کی ہے، جو تجربات بھی انہوں نے پیش کیے ہیں، ان میں غم دوراں کا اثر کسی نہ کسی صورت میں ضرور جھلکتا ہے۔ یہ اثر ان کے لیے مفید بھی ثابت ہوا ہے، مضر بھی۔ سفید تو اس طرح کہ اس کے سہارے انہیں زندگی کی سنگین اور ٹھوس حقیقتوں کا احساس ہوا ہے۔ غالب طبعاً رومانی تھے۔ اس اثر نے ان کی رومانیت میں اعتدال اور توازن کی کیفیت پیدا کی ہے، جس کے سہارے وہ حقیقت سے قریب ہوئے ہیں اور مضر اس طرح کہ اس غم نے غالب کو بڑی حد تک بچھایا ہے۔ یوں یہ بات صحیح ہے کہ غالب کے یہاں بڑی زندگی اور جولانی بھی۔ وہ تھک کر بیٹھنا نہیں جانتے تھے۔ انہیں جد و جہد سے منہ موڑنا نہیں آتا تھا۔ لیکن غم دوراں نے ان کی ان صلاحیتوں کو بڑی حد تک محدود کر دیا۔ زمانے کا غم نہ ہوتا تو ان کی یہ صلاحیتیں زندگی کے کسی میدان میں جولانیاں دکھا سکتی تھیں اور غالب نہ جانے کیا کچھ کر سکتے تھے۔ لیکن زمانے کے غم نے ان کا راستہ روک لیا۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتے تھے، نہ کر سکے۔ پھر بھی انہوں نے جد و جہد اور عمل کے خیال کو اپنے دل سے نہیں نکالا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہیں کہ زمانے کے غم نے انہیں زندگی بسر کرنا سکھایا ہے۔ وہ پریشانیوں سے گھبرائے نہیں ہیں کیوں کہ یہ پریشانیاں انہیں درسِ عمل دیتی رہی ہیں۔ اسی لیے تو وہ ان سے خوش ہوتے ہیں :

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرایا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو یش از تک نفس
برق سے کڑے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

ان اشعار میں زندگی بسر کرنے کی خواہش ہے، عمل کا جذبہ ہے۔ تھوڑی سی اذیت پرستی جان ضرور پیدا ہوتی ہے لیکن یہ اذیت پرستی درحقیقت ناسازگار حالات میں بھی ولولوں کے چراغوں کو جلانے رکھنے کی آرزو ہے۔ اس کیفیت نے غالب کو عظیم بنانے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ اور یہ عظمت سب سے زیادہ ان کی شاعری کے آئینے میں اپنے آپ کو رونما کرتی ہے۔

غالب کی شاعری حسن و عشق کے معاملات، حیات و کائنات کے مسائل اور عمرانی حالات کی ترجائی پر مشتمل ہے۔ ان سب کی لرجائی میں غم دوراں کے اثرات ملتے ہیں۔ اور اس حد تک ملتے ہیں کہ غالب کا پیش کیا ہوا کوئی خیال بھی اس سے الگ نہیں معلوم ہوتا۔ سب کی جڑیں غم دوراں کے احساس میں ہیست نظر آتی ہیں۔

جہاں تک عشقیہ شاعری کا تعلق ہے، غالب اس سلسلے میں خامس رومانی ہیں۔ لذت کا خیال اور تمیش کا احساس ان کے جہاں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے تصور عس کی بنیادیں تمام تر مادیت اور جنسیت پر استوار ہیں۔ لیکن اس کے باوجود حسن و عشق کی مختلف کیفیات کو پیش کرتے ہوئے غم دوراں کا خیال ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہوتا۔ غالب نے اس کے سہارے اپنی عشقیہ شاعری میں رومان اور حقیقت کا ایک سنگم بنایا ہے۔ ان کے جہاں لذت کے احساس اور نعتی کے خیال کے باوجود وہ جو ایک وقار اور رکھ رکھاؤ کی کیفیت ملتی ہے، وہ جو ایک لمبے دے دینے والا انداز نظر آتا ہے، اس میں اسی صورت حال کو دخل ہے :

گو میں رہا رہیں ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

سختی کشان عشق کی ہوچھپے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم یہ بہت سے مہم ہوئے
لکھنے رہے جنوں کی حکایات غوغا کی
پر چند اس میں ہانہ ہمارے قلم ہوئے

ہوئے ہیں باؤل پہلے ہی فرد عشق میں زخمی
نہیلا کاجائے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے مجھ سے
منہ ہونے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے
کہ دامن خیال یار چھوٹا جائے مجھ سے

قد و گیسو میں فیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

غم اگرچہ چانگسل ہے یہ کہاں بھی کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوا غم روزگار ہوا

خستگی کا غم سے کیا شکوہ کہ یہ
پتھکتے ہیں جرخ نیلی فام کے

ہے غبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں پوریا نہ ہوا

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا کلمہ
اس میں کچھ شائبہ 'خوبی' لقمہیر بھی تھا

دل میں ذوق وصل و یاد بار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

لگد کوپ حوادث کا محبت کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن بھی بتوں کے ناز اٹھائے کی

دل نا جگر کہ ساحل درہائے خون ہے اب
اس وہکڑ میں جلوۂ کل آگے گرد تھا

کب سے ہوں کیا بناؤں جہان خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

ان اشعار میں مختلف عشقیہ کیفیات و معاملات کا بیان ہے لیکن یہ بیان تمام تر جنابیاتی نہیں ہے۔ عقل و شعور بھی ان میں کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب نے معاملات و کیفیات عشق کو زندگی کی الجھنوں سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا ہے۔ ان کا عشق ایک پس منظر رکھتا ہے۔ اور اس پس منظر میں غم دوران کے خط و خال نمایاں نظر آتے ہیں۔ اسی لیے ان کا عشق محض اکسساب لذت کا نام نہیں ہے۔ وہ تو ایک میدان کارزار ہے جس میں بے دریغ ناسازگار حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور یہ ناسازگار حالات صرف عشق ہی کے پیدا کیے ہوئے نہیں ہوتے، زمانے کی ناسازگار کیفیت بھی اس میں برابر کی شریک

ہوتی ہے ۔ حناغہ غم عسی اکثر روزگار میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور اس غم روزگار کے ہاتھوں غم کے ایسے پہاڑ ٹوٹتے ہیں کہ محبوب کی وفا سے بھی جس کی تلافی نہیں ہو سکتی ۔ پھر حال غالب کے خیال میں غم عشق غم دوراں سے خالی نہیں ہوتا ۔ عاشق کی بڑائی تو اس میں ہے کہ وہ غم عشق اور غم دوراں دونوں پر قابو پالے کیوں کہ اسی عالم میں وہ رہیں مسم ہائے روزگار ہونے کے باوجود محبوب کے خیال سے غافل نہیں رہ سکتا۔ اور یہی ان کے خیال میں عسی کا کمال ہے ۔ لیکن یہ کام آسان نہیں ہے ۔ کیوں کہ ایسا کرنے کے لیے گرگر کر سنبھلنا پڑتا ہے۔ سرس کے جینے کے آداب سیکھنے پڑتے ہیں ۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک غم دوراں پر قابو نہ پا لیا جائے ۔ کیوں کہ غم دوراں غم عشق کو خدید سے شدید تر بنا دیتا ہے ۔ غالب غم عشق سے نہیں گھبرائے ، غم دوراں سے گھبرائے ہیں ۔ ان کی طاقت لنگد کو بے حواوت کا تحمل نہیں کر سکتی کیوں کہ وہ تو محض بتوں کے ناز اٹھانے کی ضامن ہے ۔ اسی لیے زمانے کا غم انہیں پوری طرح ستاتا ہے ۔ یہاں تک کہ ان کے دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں رہتی۔ دامان خیال یار ان سے چھوٹنے لگتا ہے۔ اور وہ پوری طرح غم دوراں کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ یہ غم دوراں غم عشق کو بھی اس منظر میں ڈال دیتا ہے۔ اسی لیے تو غالب اس سے گھبرائے ہیں ۔

غالب کی عشقیہ شاعری انہیں خیالات کی تفسیر ہے ۔

یہ ٹھیک ہے کہ غالب فلسفی نہیں ہیں لیکن ان کی شاعری میں فلسفہ ضرور ہے ۔ انہوں نے حیات و کائنات کے مسائل پر غور ضرور کیا ہے ۔ سوچنے کی کوشش ضرور کی ہے ، اس لیے ان کی شاعری میں فلسفیانہ آہنگ جگہ جگہ ملتا ہے ۔ اس غور و فکر کے بعد جو نتائج انہوں نے نکالے ہیں ، ان میں غم دوراں کے احساس کی جھلک بھی نظر آتی ہے ۔ ان کے بنیادی فلسفیانہ خیالات و نظریات کی تہ میں اس کے اثرات بڑی شدت سے کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ جب وہ سوچتے ہیں کہ قید حیات و بند غم ایک ہی چیز کے دو نام ہیں ، جب انہیں یہ خیال آتا ہے کہ کشا کس ہائے ہستی سے معنی آزادی ممکن نہیں ، جب انہیں یہ حقیقت نظر آتی ہے کہ ہستی فنا پر دلالت کرتی ہے ، جب ان کے یہاں یہ شعور بیدار ہوتا ہے کہ ساقی گردوں سے سنئے عشق کی خواہش ایک لاپرواہی سی بات ہے کیوں کہ خود

وہ ایک دو چار جام واژگون لیے بیٹھا ہے ، جب وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ رنج کا خوگر ہونا ، رنج کو مٹا دیتا ہے ، جب انہیں خموشی میں جہاں لاکھوں غموں گشتہ آرزوئیں تلر آتی ہیں، جب وہ شیشہ دل کو سیلی خارا سے لالہ رنگ دیکھتے ہیں ، تو در حقیقت اس کا بھرک زمانے کا غم ہی ہوتا ہے۔ غم دوران کا احساس ان کے جہاں اتنا شدید نہ ہوتا تو وہ اس طرح کے شعر پر گز نہیں کہہ سکتے تھے :

قد حیات و بند غم ، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

کشا کش ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی
ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت روانی کی

ہستی باری الہی فنا پر دلیل ہے
یاں تک بٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

منے عشرت کی خواہش مائی گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگون وہ بھی

رنج سے خوگر ہوا انسان ، تو مٹ جاتا ہے رنج
مسکائیں مجھ پر بڑیں اتنی کہ آسمان ہو گئیں

خموشی میں نہاں غموں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغ کشتہ ہوں میں ، بے زبان ، گور غریباں کا

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے جن
انسان ہوں ، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

حالان کہ ہے یہ سیلی خارا سے لالہ رنگ
غافل کو مہرے شیشے پہ منے کا گہاں ہے

حنائے ہائے غزاں ہے ، جہاں اگر ہے میں
دوام کفہ خاطر ہے عیش دنیا کا

ان اشعار میں غالب کا سارا فلسفہ نہیں ہے لیکن ان کے فلسفے کے جھٹ سے چلو ان میں ضرور موجود ہیں۔ انسانی زندگی میں موت اور فنا ، غم اور پریشانی ، بے بسی اور بھڑکی کے خیالات جہاں کہیں بھی پیدا ہوتے ہیں ، وہاں صاف نظر آتا ہے کہ غم دوران ہی ان سب کا محرک ہے۔ غالب اگر خود غم دوران سے رونا سناں نہ ہوتے اور اگر انسانی زندگی میں انہیں اس کا دروازہ کھٹکا دکھائی نہ دیتا تو وہ زندگی کو اس زاویے سے نہ دیکھتے۔ کیوں کہ وہ اس مزاج کے انسان نہیں تھے۔ اس کے بغیر تو انسانی زندگی ان کے نزدیک محض سرور و انبساط اور مسرت و شادمانی کا نام تھی۔

غم دوران کے شدید احساس نے غالب کے جہاں عمرانی معاملات کا شعور بھی پیدا کیا ہے۔ ان کی شاعری میں ایک تہذیب ، ایک معاشرت ، ایک نظام کے سرور و فتنہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس تہذیب اور معاشرت کے غم ہونے کا انہیں بڑا غم ہے۔ وہ اس پر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ کیوں کہ اس تہذیب اور معاشرت کے خاتمے نے ساری زندگی کو انتشار اور افراتفری کا شکار کر دیا تھا۔ غالب جب اس تہذیب کے غم ہونے کا تذکرہ کرتے ہیں ، تو گویا وہ اس انتشار اور افراتفری کا ماتم ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی انتشار اور افراتفری نے غالب کو تہذیب اور معاشرت کا ماتمی بنایا ہے۔ غم دوران کے بغیر غالب اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ باتیں انہوں نے دشت و خنجر ، اور باد و ساغر ، کے روپ میں ضرور کی ہیں لیکن تہذیب ، معاشرت اور عمرانی معاملات کے بارے میں انہوں نے جو کچھ کہنے کی کوشش کی ہے ، وہ اگرچہ بہت واضح نہیں ہے، لیکن دیکھنے والے اسے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ اشعار اس تہذیب ، معاشرت اور نظام کا مرثیہ ہی تو ہیں ، جس کو غالب اپنی آنکھوں کے سامنے فنا ہونے ہوئے دیکھ رہے تھے :

توڑ پھٹے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آہاں ہے بادۂ کفام کو ہرما کرے

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
انہی بس اب ؟ لذت خواب سحر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ غوغا لذت فراق
تکلیف بردہ داریؔ زخیم جگر گئی

میں اور بزمِ شے سے ہوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توادؔ ساقی کو کیا ہوا بھلا

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحرؔ سو غموش ہے

پنہاں تھا دامِ سختِ قریبِ آشیانے کے
اُلٹے نہ پائے تھے کہہ گرتنثار ہم ہوئے

بادِ تھیں ہم کو بھی رنگِ رنگِ بزمِ آراہاں
لیکن اب نکلی و نکار طاقِ نسیاں ہو گئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سجدوں کا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

یاضب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہٴ بساط
داسانِ ہالچسبان و کفِ کلیِ خسروش ہے
اور صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزمِ میں
نے وہ سرور و سوزؔ نہ جوش و خسروش ہے
داغِ فراقِ صحتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہےؔ سو وہ بھی غموش ہے

یہاں غالب نے جام و سیو کے ٹوٹ جانے کے بعد بادۂ کفام کے برسنے کا جو ذکر کیا ہےؔ بادۂ شبانہ کی سرمستیوں کے ختم ہونے کا جو پیام سنایا ہےؔ ظلمت کدے میں شبِ غم کے جوش کی جو کیفیت انہیں نظر آئی ہےؔ آشیانے کے قریبِ دامِ سخت کے پنہاں ہونے کو جس طرح انہوں نے محسوس کیا ہےؔ شامِ فراق میں جس طرح جوئے خوں انہوں نے آنکھوں سے بہتے ہوئے دیکھی ہے اور داغِ فراقِ صحتِ شب کی جلی ہوئی

شمع کو جو الہوں نے خموش پایا ہے ، اُن میں تہذیبی اور عمرانی شعور کی جھلک صاف نظر آتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ غم دوراں کے شدید احساس نے ان سے اس طرح کے اشعار کی تخلیق کرائی ہے ۔

غالب اس اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں !

اس ساری بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب زندگی کے شدائی تھے لیکن انہیں زندگی کا غم بھی تھا اور یہ غم ان کی ساری شخصیت پر محیط ہے ۔ زندگی کی شیفنگی نے ان کے یہاں حسرتوں کے احساس کو بیدار کیا ہے اور حسرتوں کے احساس نے ان کی شاعری کے بڑے حصے کو دامنِ باغباں اور کفِ کل فروش بنا دیا ہے ۔ لیکن اس کے باوجود اس میں ایک کسک سی محسوس ہوتی ہے اور اس کسک ہی کا یہ اثر ہے کہ وہ کلِ نعمہ اور پردہ ساز ہونے کے بجائے ان کی اپنی شکست کی آواز بن گئی ہے :

نے کلِ نعمہ ہوں ، نہ پردہ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

غالب
کی
عشقیہ شاعری

اردو شاعری کی روایت میں جذبہ عشق کی ترجائی کا پہلہ دوسرے موضوعات کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ بھاری نظر آتا ہے۔ مجذبی قطب شاہ کے زمانے سے لے کر موجودہ دور تک، مختلف زمانوں میں اردو شعراء نے جذبہ عشق کی ترجائی مختلف زاویوں سے کی ہے اور ماحول اور حالات کے زیر اثر مختلف تصورات عشق کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تصورات میں یکسانی اور یک رنگی نظر نہیں آتی، بلکہ رنگا رنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مختلف زمانوں کے معاشرتی اور تہذیبی حالات ان تصورات عشق کی تشکیل کا باعث بنے ہیں۔ اردو شاعری کی روایت میں کہیں عشق کے پرانے اور فرسودہ تصورات کو قیس اور فرہاد، لعلی اور مجنوں، شیریں اور فریاد کی داستانوں کے پردے میں پیش کیا گیا ہے، کہیں عشق کے خالص جنسی اور جسمانی تصورات کی ترجائی کی گئی ہے۔ کہیں عشق و عاشقی کے بعض تصورات کی حدیں تصوف اور معرفت و حلیف سے جا ملی ہیں اور کہیں عشق و عاشقی کے اس تصور میں وسعتیں پیدا کی گئی ہیں اور اس کے مختلف پہلوؤں کی فلسفیانہ تحلیل کا رجحان نظر آتا ہے۔ غرض اردو شاعری کی روایت نے مختلف اور متنوع تصورات عشق کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ ان تصورات کی رنگا رنگ پہلوؤں کا ایک گلدستہ نظر آتی ہے۔

غالب نے بھی اردو شاعری کی اس روایت میں اپنے تصورات عشق کو پیش کر کے بعض نئے پہلوؤں کی ترجائی کی ہے۔ غالب کا تصور عشق اردو شاعری کے روایتی تصورات عشق سے مختلف ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ

ان کے چہاں بعض جگہ روایتی تصورات عشق کی جھلک نظر آتی ہے لیکن اس سلسلے میں جن افکار و خیالات کی انہوں نے ترجیح دی ہے ، وہ ماورائی نہیں ہیں ۔ ان میں بھی حقیقت پسندی کا احساس ہوتا ہے اور عشق کے وہ تصورات نمایاں نظر آتے ہیں ، جن کی بنیاد صحت مندی پر استوار ہے ۔ وہ صرف عشق کا افلاطونی تصور پیش نہیں کرتے بلکہ روایتی عشق کی ترجیحی میں بھی بنیادی طور پر عشق کے جسمانی اور جنسی تصور کو اپنے سامنے رکھتے ہیں ۔ اس لیے کہ یہ ان کا مزاج ہے ۔ وہ جب پرستش کی نفی کرتے ہیں اور خواہش کو اپنے عشق کی بنیاد قرار دیتے ہیں ، تو گویا اس پہلو کو نمایاں کر کے پیش کرنا چاہتے ہیں ۔ ان کا مشہور شعر ہے :

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا بوجہا ہوں اس بت بیداد گر کو میں

اس شعر میں غالب نے صاف صاف اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ جو لوگ صرف عشق کو پرستش سے عبارت سمجھتے ہیں ، وہ احمق اور نادان ہیں کیوں کہ حسن اور محبوب کی پرستش ، بغیر کسی مقصد اور مدعا کے بے معنی چیز ہے ۔ اور پھر اس بات کی وضاحت کی ہے کہ خواہش عشق کی بنیاد ہے اور خواہش غالب کے خیال میں کسی بنیادی انسانی جذبے کی تسکین اور کسی جسمانی تقاضے کی تکمیل ہے ۔ غالب نے اس شعر میں اردو شاعری کے روایتی تصورات عشق سے انحراف کیا ہے ۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ہفاوت کی ہے کیوں کہ حسن اور محبوب کی پرستش بغیر کسی مدعا ، مقصد اور خواہش کے اردو شاعری کی روایت میں عام تھی ۔ غالب نے نہایت جرأت اور بے باکی کے ساتھ اس تصور سے اختلاف کیا اور حسن اور محبوب کی صرف بے مقصد پرستش کو بے معنی قرار دیا ۔ اس سے ان کے انقلابی اور باغیانہ مزاج کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسے نئے تصور عشق کو پیش کر رہے تھے ، جس کی بنیاد حقیقت پسندی پر استوار تھی ۔ ویسے یہ بات صحیح ہے کہ غالب کے چہاں عشق و عاشقی کے معاملات کی ترجیحی صرف اس تصور تک محدود نہیں ہے ۔ ان کے چہاں عشق کا وہ تصور بھی ملتا ہے جس کی بنیادیں روحانیت پر استوار ہیں اور جس کی تہ میں معرفت اور حقیقت تک رسانی حاصل کرنے کا خیال اور احساس بھی

موجود ہے۔ لیکن یہ ان کی شاعری کا وہ حصہ ہے جس کو ہم تصوف اور فلسفے کے تحت رکھ سکتے ہیں۔ اس حصے میں غالب کی شخصیت کا ایک اور پہلو ابھرتا ہے، جس میں نسبتاً زیادہ فکری گہرائی نظر آتی ہے۔

غالب سے قبل اردو شاعری کی روایت میں عشق کے جو تصورات موجود تھے، ان میں سے بیشتر کی بنیادیں روایتی تصورات پر استوار تھیں۔ بعض تصورات فارسی شاعری کی روایت سے اردو شاعری کی روایت میں آئے اور بعض شاعروں نے انہیں تصورات کو اپنا معیار تصور کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی شاعری میں پیش کیے جانے والے مختلف تصورات عشق کسی نہ کسی طرح اردو شاعری کی روایت میں داخل ہو گئے۔ لوگوں نے اس کی پیروی بھی کی۔ اس وجہ سے کہ اس کا اثر بہت وسیع اور ہمہ گیر تھا۔ وہ اس سے دامن نہیں جھڑا سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کی روایت کا مطالعہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ بیشتر شعراء ایسے تصورات عشق کی ترجمانی کرتے ہیں، جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً فارسی شاعری کی روایت کی طرح اردو شاعری کی روایت میں حسن پرستی بہت عام ہے۔ عشق کا منبع اور مخرج بھی حسن پرستی ہے۔ اسی کے گرد اس کے مختلف تصورات گھومتے ہیں۔ عشق کرنے والا حسن سے متاثر ہوتا ہے۔ جس سے عشق کیا جاتا ہے، وہ ایک ایسی مخلوق ہے، جو عشق کرنے والے کو درخور اعتنا نہیں سمجھتی۔ بلکہ عجیب و غریب صورت حالات یہ پیدا ہوتی ہے کہ وہ جذب صادق رکھنے والے عاشق سے کنارہ کشی اختیار کرکے یا اختلاف کرکے دوسروں سے بیان وفا باندھتا ہے۔ اس لیے رقابت اردو شاعری کی روایت میں بہت عام ہے اور اس میں رقیب ایک بہت نمایاں کردار ہے۔ عاشق اس کے مقابلے میں ایک ہمالی مخلوق ہے، جو معشوق کی بے اعتنائی کی تاب نہ لا کر اپنی پوری انفرادیت کو ختم کر دیتی ہے اور اس کی کوئی حیثیت اس پورے نظام میں باقی نہیں رہتی۔ ناچار وہ غم کھاتا ہے۔ صحراؤں کی خاک چھانتا ہے۔ محبوب کے کوچے میں مارا مارا پھرنا ہے۔ دربان و یاسیان اس کی خبر لیتے ہیں۔ غرض وہ ایک ایسی مخلوق بن جاتی ہے، جس میں تمام تر اعمال ہستندی نمایاں ہو جاتی ہے۔ بالآخر وہ مر جاتا ہے لیکن مر کر بھی اسے چین نہیں ملتا۔ اس کے مرقد کے نشانات مٹا دیے جاتے ہیں اور محبوب کی ستم رانیاں اسے مرنے کے بعد بھی چیں سے

نہیں بٹھنے دیتیں۔ تقریباً تمام اردو شاعروں کے ہاں اس قسم کے خیالات ضرور ملیں گے۔ اور شاید ہی وجہ ہے کہ بیشتر اردو شاعروں کے ہاں عشق کے جو تصورات ملتے ہیں، ان میں ایک عام اتفاقیہ پسندی کا احساس ہوتا ہے اور زندگی کی رفق، اس کی جولانی، احساس نشاط اور طریقہ خیالات اس میں دور دور تک نظر نہیں آتے۔ اگر اس قسم کے خیالات کی ترجیحی مہتی بھی ہے، تو اس میں اس صورت حالات کے رد عمل کی وجہ سے ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جس میں چھٹ چھاڑ، لاگ ڈانٹ اور، عاملہ بندی کے موضوعات زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ غالب سے قبل اردو شاعری کی روایت انہی دو میلانات سے عبارت نظر آتی ہے۔

غالب کی عقبہ شاعری نے اسی روایت کے سامنے میں آنکھ کھولی۔ اس نے جب ہوش شبہالا تو اپنے آس پاس اور گرد و پیش اس قسم کے تصورات عشق کو دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں بھی یہ تصورات بڑی حد تک نمایاں ہوئے۔ خاص طور پر غالب کے ابتدائی دور کی شاعری میں اس روایت کا اثر خاصا نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کا ایک سبب فارسی شاعری کی روایت ہے ان کی گہری دلچسپی بھی ہے۔ اس زمانے میں، جیسا کہ اردو کے بعض نقادوں نے تسلیم کیا ہے، ان کے ہاں جو عشقیہ مضامین نظر آتے ہیں، ان میں سے بیشتر رسمی اور روایتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی ذہانت ان مضامین میں بھی اپنا جوہر دکھاتی ہے اور ان کی صداقت اور اخلاص مندی کو ان اشعار میں بھی بڑی آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ان مضامین میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ غالب نے روایتی انداز کے پردے میں ایسی باتیں کہی ہیں، جن سے اس روایت کی توضیح کا پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ غالب نے ان تمام تصورات کو پوری طرح تسلیم نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ ان کو مضحکہ خیز بھی خیال کرتے تھے۔ چنانچہ ایسے اشعار ان کے دیوان میں جگہ جگہ مل جائیں گے، جن میں خالص روایتی انداز موجود ہے لیکن جن کو پیش کرتے ہوئے وہ ایسے پلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں، جن میں احساس مزاح کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ یہ چند اشعار دیکھیے :

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا، مگر، بہ لنگی چشم محمود تھا

قیسے بغیر مر نہ سکا کوئکن، اسد
سر گشتہ' غار رسوم و قیود تھا

کہنے ہو نہ دیں گے ہم، دل اگر بڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے، ہم نے مدعا پایا
حال دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر یعنی
ہم بے بارہا ڈھونڈنا، تم بے بارہا پایا
شور بند ناصح نے، زعم پر تنک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے، تم نے کیا مڑا پایا؟

شوق پر رنگ، رقیب سرو سامان نکار
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکار

سہرۂ خط ہے، ترا کا کل سرکش نہ دیا
یہ زمرہ بھی حریف دم الہی نہ ہوا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں، ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے ہنساں کا

مانع وحشت خراس ہائے لیلیٰ کون ہے
خالدہ' مجنون صحرا گورد بے دروازہ تھا

آج واں تیغ و کفن ہاندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا؟
حصرت ناصح گر آئیں، دیدہ و دل قرش راہ
کوئی بھوکو یہ تو سمجھنا دو کہ سمجھاویں گے کیا؟
گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا ہوں سہی
یہ جنوں عشق کے الداز چٹ جائیں گے کیا؟

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟
اک نماشا ہوا، گلا نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں میرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے سزا نہ ہوا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد !
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

عرض و لہاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا
ہو گئی ہے میر کی شیریں زبانی کارگر
عشق کا اُس کو گال ہم بے زبالوں پر نہیں

لیاست ہے کہ سن لیلیٰ کا دشت قیس میں آتا
تعجب ہے وہ بولا "یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں؟"

ہے کیا جو کسی کے ہاندھے؟ میری ہلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں ؟
"میر سے رات کیا بنی؟" یہ جو کہا تو دیکھئے
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ ہوں

کیا خوب ! تم نے میر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو، ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

آنکھ کی تصویر مرنا ہے کہ کہیں نہیں ہے کہ نا
نہیہ یہ کھل جاوے کہ اس کو حسرت دیدار ہے

دست گاہ دیدہ خونبار مجنوں دھکھتا
ہک بیاہاں جلوۂ گل فرض پا انداز ہے

اس بزم میں مجھے نہیں ہتی حیا کی
بیٹھا رہا، اگرچہ اشارے ہوا کیے

گدا سجدہ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹک کے قدم میں نے پاسبان کے لیے

اس میں شبہ نہیں کہ ان اشعار میں غالب کا مخصوص تصور عشق نہیں ملتا۔ اس میں روایتی فضا ہے۔ فارسی کے کچھ ایسے شاعروں کے اثرات ہیں جن کے یہاں روایتی تصور عشق کا پہلو بہت نمایاں تھا۔ اس میں کہیں کہیں ناسخ اور ذوق کے اثرات بھی ملتے ہیں جو غالب کے ہم عصر تھے لیکن جنہوں نے اس زمانے کی شعری روایت میں اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں بیدل کا اثر بھی نظر آتا ہے۔ بیدل جس طرح خالص انسانی زاویہٴ نظر سے حسن و مظاہر فطرت کو دیکھتے تھے، اس کی جھلک بھی ان اشعار میں کہیں کہیں دکھائی دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں غالب کے یہاں، جہاں تک ان کے تصورات عشق کا تعلق ہے، بھنگی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یہ وہ دور تھا، جب ہر چیز انہیں متاثر کرتی تھی اور وہ اس کی طرف لپکتے تھے۔ اس لیے ان کے اس قسم کے اشعار کو معیاری سمجھنا اور ان کے صحیح تصورات عشق کا ترجمان تصور کرنا، شاید زیادہ صحیح نہیں ہے۔

غالب کے صحیح تصورات عشق کے ترجمان تو وہ اشعار ہیں، جن میں ان کی نسلی خصوصیت، ان کے مخصوص ذہنی رجحانات، ان کے زمانے کے مخصوص تہذیبی اور اخلاقی معیار اور ایک انسانی اور آفاق زاویہٴ نظر کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان اشعار میں غالب کہیں حسن اور کہیں حسن پرستی کو معیار تصور کر کے ان کے مختلف مظاہر کی تصویر کشی کرتے ہیں اور کہیں انسانی زاویہٴ نظر سے ان جذبات و احساسات کا نقشہ کھینچتے ہیں، جو تمام انسانوں میں مشترک ہیں اور کہیں ان مخصوص معیاروں کی وضاحت کرتے ہیں۔ جو اس زمانے کے افراد کو بہت عزیز تھے۔

یہ صورت حال غالب کے یہاں اس وقت پیدا ہوئی ہے، جب وہ روایت سے بوری طرح بغاوت کر کے ایک نئی دنیا میں سانس لینے لگے ہیں۔ جب انہوں نے اپنے اوپر خود اپنے آپ کو، اپنی شخصیت کو اور اپنی ذات کو غالب کر لیا ہے۔ اس عالم میں انہوں نے جن اشعار کی تخلیق کی ہے، وہ ان کے دیران میں بہت نمایاں ہیں۔ ان کو دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے عشق کا جو تصور پیش کیا ہے، وہ روایتی تصورات عشق سے مختلف ہے۔ اس میں ایک نیا انسانی رنگ و آہنگ ملتا ہے اور ہر جگہ ایک آفاق زاویہٴ نظر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ

ان کے اس قسم کے اشعار میں زندگی اور جولانی کا احساس ہوتا ہے، گرمی اور روشنی دکھائی دیتی ہے اور رنگینی اور رجاؤ کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔

غالب کی عشقہ شاعری کے ان پہلوؤں کے عوامل اور محرکات کو سمجھنے کے لیے ان کی نسل اور خاندان، ان کی شخصیت اور کردار، ان کے زمانے کی فضا اور ماحول، ان کے عہد کے ذہنی اور فکری رجحانات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ کیوں کہ ان کی عشقہ شاعری اور عقیدہ، نصورات کی تشکیل و تعبیر میں ان تمام پہلوؤں نے نمایاں حصہ لیا ہے۔

غالب مغلوں کی نسل سے تعلق رکھتے تھے—وہ مغل جو جنگ جو اور بہادر ہونے کے باوجود لطیف اور حسین و جمیل چیزوں کے شیدائی تھے۔ سو پشت سے جن کا پیشہ سپہ گری تھا اور بظاہر شعر و شاعری جن کے نزدیک ذریعہ عزت نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود جو شب و روز شعر و شاعری کی دنیا میں زندگی بسر کرتے تھے۔ جنہوں نے فن تعمیر، مصوری اور شاعری کو اپنے تخلیقی کارناموں سے انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ مغلوں کی نسل سے تعلق رکھنے کے باعث غالب کو یہ تمام خصوصیات ورثے میں ملیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ خود فن سپہ گری میں کوئی کار ہائے نمایاں انجام نہ دے سکے، لیکن سپہ گروں کی خصوصیات مرتے دم تک ان کے ساتھ رہیں۔ ان کی جرأت مندی اور دلاوری، بے پائی اور بے نیازی کے رنگ ہمیشہ ان کی شخصیت میں نمایاں رہے۔ حد درجہ ناسازگار حالات بھی ان کے مزاج کی ان خصوصیات کو ڈانوا ڈول نہ کر سکے۔ ان کی زندگی کا قافلہ ان ناسازگار حالات میں سے گزرتا رہا۔ لیکن ان کے باوجود حسن و جمال کا احساس اور ادب و فن کا مذاق، ہمیشہ ان کے ساتھ رہا۔ وہ مرتے دم تک ان سے دلچسپی لیتے رہے۔ حسن و جمال جس حال میں جس جگہ بھی ہوں، ان کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتا رہا۔ ہر حال انہیں یہ دونوں چیزیں وراثت میں ملیں اور وہ ہمیشہ انہیں سونے سے لگانے اور کلیجے سے چماتے رہے۔

اس نسلی خصوصیت کے ساتھ ساتھ، خاندانی حالات بھی ان کی طبیعت اور مزاج پر اثر انداز ہوئے اور انہوں نے ان کی شخصیت میں ایک پہلو دار

کیفیت پیدا کی۔ غالب نے ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی، جہاں ریاست اور امارت تھی ان کے آباؤ اجداد ہندوستان آنے سے قبل، وسط ایشیا میں اور ہندوستان آنے کے بعد یہاں بھی، اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ غالب کا بچپن ریاست اور امارت کے سامنے میں بسر ہوا۔ اور اگرچہ آگرے سے دلی منتقل ہونے کے بعد، ان کی زندگی کے انداز میں فرق ہوا، لیکن وہ ناساعد حالات سے دوچار ہونے کے باوجود، زندگی کی ان امیرانہ خصوصیات کو غیر یاد نہ کہہ سکے، جو انہیں اپنے آباؤ اجداد کی طرف سے ملی تھیں۔ وہی جاہ و چال کا خیال اور باندی و برتری کا احساس ان کی زندگی کا جزو بنا رہا۔ وہ خود زیر نہیں رہ سکتے تھے، دوسروں کو زیر دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ دنیا کی تمام چیزیں صرف ان کے لیے ہیں۔ ان سب کو ان کے دام کھانا کا امیر ہونا چاہیے۔ غالب کو زندگی میں حد درجہ ناسازگار حالات سے دو چار ہونا پڑا لیکن ان کے طبع کی یہ خصوصیات ان حالات میں بھی ان کا دامن نہ چھوڑ سکیں۔ ان کی زندگی کا ایک ایک واقعہ اس خیال پر صداقت کی سہر لگاتا ہے۔

غالب کے مزاج کی یہ خصوصیات ان کی عشقہ شاعری اور ان کے تصورات عشق پر بھی اثر انداز ہوئی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان کے عشقہ تصورات کا تار و پود انہیں خصوصیات سے تیار ہوا ہے۔ حسن اور حسن پرستی کا خیال غالب کی شخصیت اور شاعری دونوں میں بہت نمایاں ہے۔ اس کو کسی حد تک ان کی انفرادیت کا نتیجہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس میں ان کی نسل، خاندان، ماحول اور گرد و پیش کے اثرات کو بھی بہت دخل ہے۔ مغلوں کی روایتی حسن پرستی، امیرانہ ماحول کی تعمیل پسندی اور بچپن کی لائیلی اور آزاد زندگی نے اس احساس کی تشکیل کی اور اس کو غالب کی شخصیت اور کردار کا بنیادی جزو بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اثرات غالب کی زندگی اور شاعری دونوں میں اس قدر نمایاں نظر آتے ہیں۔ غالب نے حسن کا بیان بڑی نفاست اور لطافت، لیکن بڑی جرأت اور بے باکی سے کیا ہے۔ اس بیان سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ اس میں ڈوب ڈوب گئے ہیں اور انہوں نے اس کے ایک ایک انداز اور ایک ایک پہلو میں اپنے آپ کو گم کر کر دیا ہے۔

اس حسن کے شدید احساس ہی نے انہیں صنف لطیف کا شیدائی بنا دیا ہے۔ نسوانی حسن کہیں بھی ہو، وہ اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ یوں تو وہ مظاہر فطرت سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ سبزہ زار ہائے مطرا بھی ان کے دل کو لپھاتا ہے۔ لیکن بالآخر اس کی تان نازنین بتان خود آرا، ان کی صبر آزما نگاہوں اور طاقت ربا اشاروں پر جا کر ٹوٹتی ہے۔ کلکتہ میں انہوں نے جو کچھ دیکھا، اس میں انہیں اسی صورت حال سے دو چار ہونا پڑا۔ چنانچہ اس کی یاد ہمیشہ ان کے سینے پر ایک تیر مارتی رہی :

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشی !
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنین بتان خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ شیریں کہ واہ ! واہ !
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

اس صورت حال کی بہترین ترجمان ان کی فارسی مثنوی 'ہیراغ دیر' ہے جو انہوں نے بتارس کی تعریف میں لکھی ہے۔ اس کے چند اشعار ان کے مزاج کی اس کیفیت کو بوری طرح ظاہر کرتے ہیں۔ اس لیے ان کا یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے :

یا اے محافل از کیفیت ناز
نکلے بر ہر یزادانش انداز

ہمہ جانتائے بے تن کن سمانشا
ندارد آب و خاک این جلوہ حاشا

نہاد شان چو بوئے گل گراں نیست
ہمہ جائفند جسے درمیان نیست

خس و غاشی گلستان است گوئی
غبارش جوہر جان است گوئی

دورس دیرینہ دیرستان نیرنگ
چارش این است از گردش رنگ

چہ فروزین چہ ماہ و ماہ چہ مرداد
چہ موسم لغزشش جنت آباد

بہ تسلیم ہوائے آن چمن زار
 ز موج گل بہاروں ہستہ زار
 فلک را قسطہ گر ہر جبین نیست
 بس این رنگینی* موج شفق چیست
 کف ہر خاکش از سنی گشتہ
 سر ہر خارش از سبزی پستہ
 سوادش ہائے تخت بت ہرستان
 سراپایش زیارت گاہ مستان
 عبادت خانہ* ناقوسیان ست
 بہانا کعبہ* ہنرستان ست

تباہی را بیولا شعلہ* طور
 سراپا نور ایزد چشم بد دور
 مسانہا تارک و دلہا توانا
 ز نادانی بکار خویش دانا
 تبسم ہر کہ در لبہا طبعی ست
 دہن ہا رشک گل ہائے ربعی ست
 اداے یک گلستان جلوہ سرشار
 خراسے صد قیامت فتنہ در ہار
 بہ لطف از موج گوہر نرم و تر
 بہ ناز از خون عاشق گرم و تر
 ز انکیز قد الداز خراسے
 بہائے کلینے گسترده داسے
 ز رنگیں جلوہ ہا عارت گر ہوش
 چار بستر و نوروز آغوش
 ز تاب جلوہ خویش آتش افروز
 بتان بت ہرست و ہرمن سوز
 بہ سامان دو عالم گلستان رنگ
 ز تاب رخ چراغان بر لب گنگ

رماندہ از ادائے شست و شوئے
پھر سوچے نہوید آبروئے

قیامت قامتان مڑکان درازان
ز مڑکان بر صف دل نیزہ بازان
بہ تن سرمایہ افزائش دل
سراپا مزدہ آسائش دل

بہ سستی موج را فرمودہ آرام
ز تفرے آب را بخشیدہ اندام
فتادہ شورش در قالب آب
ز ماہی حد دلش در سینہ بے تاب

ز بس عرض بمکتا می کند گنگ
ز موج آغوش ہا و می کند گنگ
ز تاب جلوہ ہا بے تاب کششہ
کھر ہا در صف ہا آب گنشہ

مگر گوئی بنارس شاہدے ہست
ز گنگش صبح و شام آئینہ دو دست

ان اشعار میں بنارس، اس کے مناظر و مظاہر اس کی آب و ہوا، اس کی عبارات و مکانات سے کہیں زیادہ ان بتان بہت پرست و پرہمن سوز کا ذکر رنگیں ہے، جن کا وجود غالب کے خیال میں چار ہست و نوروز آغوش ہے۔ صنف لطیف کی تعریف میں ایسے حسین اور دلانگیز اشعار ذرا مشکل ہی سے کسی اور شاعر کے ہاں ملیں گے۔

ایک اور قطعہ میں بنارس کے ساتھ کانکتہ کا بھی ذکر کیا ہے اور تان مغربان کشور لندن کے ذکر لطیف پر جا کر ٹوٹی ہے :

گنگش جیست این بنارس، گفت
شاہدے مست بحر کلی چیدن

گنگش چوں بود عظیم آباد
گفت رنگین تر از نظائے چمن

گنگش سلسبیل خوش باشد
گفت خوشتر نیباشد از سون

حال کلکتہ باز جسم ، گفت
باید اقلیم ہشتمش گفتن

گفتم آدم ہمرسد در وے
گفت از ہر دیار و از ہر فن

گفتم این جا چہ شغل سود دہد
گفت از ہر کہ ہست ترمیدن

گفتم این جا چہ کار باید کرد
گفت قطع نظر ز شعر و سخن

گفتم این ماہ ہیکراں چہ کسی اند
گفت خوبان کشور لندن

گفتم ایشان مگر دلے دارند
گفت دارند لہک از آہن

گفتم از بہر داد آمدہ ام
گفت ہگزیز و سر بہ سنگ مزن

غالب کے کلیات فارسی سے یہ اشعار جہاں صرف اس خیال سے نقل کیے گئے ہیں کہ ان سے غالب کے احساس حسن اور ذوق جہال کا اندازہ ہونا ہے اور خصوصیت کے ساتھ صنف لطیف کے حسن و جہال سے ان کی والہانہ دلچسپی کی وضاحت ہوتی ہے ۔

غرض غالب کے ہاں صنف لطیف کے حسن و جہال سے اکتساب لذت کا رجحان کسی نہ کسی صورت میں ضرور نمایاں ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں وہ مددِ رخنوں کے لیے مصوری سیکھتے ہیں تاکہ ملاقات کے لیے کوئی تقریب پیدا ہو اور خوبیاں سے چھوڑ چھاڑ کو بھی جاری رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کا وسیلہ نصیب نہ ہونے کی صورت میں ، اس کی حسرت بھی ان کے لیے عزیز ہے ۔ حسن غالب کو نہ صرف مدهوش اور مرشاز کر دیتا ہے بلکہ وہ اس کو دیکھ کر مبہوت ہو جاتے ہیں ۔ جب انہیں اپنے اس پاس اور گرد و پیش حسن کی فروانی اور اس کے جلووں کی بلا سامانی نظر آتی ہے ، تو وہ حیرت سے ہوجھتے ہیں :

یہ ہری چہرہ لوگ کیسے ہیں ؟
عمرہ و عشوہ و ادا کیا ہے ؟

شکن زلف عنبریں کیوں ہے؟—

نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے؟—

اور یہ کیفیت ایسی ہے کہ ہر انسان کے دل میں ان مناظر کو دیکھ کر اس کی ایک لہر سی اٹھتی ہے — اور یہ کیفیت تمام انسانوں میں مشترک ہے ۔ یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی ۔ غالب نے حسن کے ان عطف پہاڑوں کا ذکر کر کے صرف اپنی ہی کیفیت کی ترجمانی نہیں کی ہے ، بلکہ انسانی فطرت کو بے نقاب کیا ہے اور عالم انسان کی ایک بنیادی کیفیت کی عکاسی کی ہے ۔

حسن و جمال کا یہ خیال اور اُس کی اہمیت کا احساس غالب کے ہاں اس قدر بڑھا ہے کہ اُنہوں نے بعض اوقات اپنی ذات کی اہمیت کے احساس کو بھی خیر باد کہہ دیا ہے اور صرف یہ ایک ایسی منزل ہے ، جہاں پہنچ کر غالب اپنی انانیت کو مجروح کرتے ہیں اور حسن کے مقابلے میں اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا خیال ان پر غالب آ جاتا ہے ۔ جب وہ یہ کہتے ہیں :

غافل ! ان سے طلعتوں کے واسطے

چاہئے والا بھی اچھا چاہئے

چاہئے ہیں خوب رویوں کو ، اس

آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے

نو اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ غالب سے طلعتوں کے واسطے چاہئے والا بھی ایسا چاہئے ہیں ، جو اچھا ہو—اور پھر مزاح لطیف کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی کی وجہ سے وہ خود اس قابل نہیں کہ خوب رویوں کو چاہئے کے قابل ہوں ۔ یہاں غالب کی انانیت اور خود پسندی خاصی حد تک مجروح ہو جاتی ہے—اور اس کی وجہ صرف حسن کی اہمیت کا احساس اور اُس کی برتری کا خیال ہے ۔

حسن کی اہمیت کا یہ شدید احساس غالب کے تخیل کی پرواز کو اس دنیا سے بھی آگے لے جاتا ہے اور وہ صرف اس دنیا کے لوگوں ہی کے حسن کا احساس نہیں رکھتے ، بلکہ اُن لوگوں کے حسن کا احساس بھی رکھتے ہیں ، جو اس دنیا میں موجود نہیں ہیں ۔ نہ جانے کتنے ایسے حسین خاک میں مل چکے ہیں اور اُن میں سے بعضوں کا حسن کہیں کہیں لالہ و گل کی صورت میں رو نما ہوتا ہے :

سب کہناں ، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کہا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ایک ایسا شاعر جو نہ صرف اپنے آس پاس اور گرد و پیش کے حسن کا احساس رکھتا ہو بلکہ جی کو دنیا میں پیدا ہونے والی بے شمار حسین صورتیں خاک میں پنہاں ہو جانے کے بعد بھی لالہ و گل کی صورت میں نمایاں ہوتی ہوں نظر آئیں : اس کی حسن پرستی کا بھلا کہا ٹھکانا ہے ۔

غالب کے چاں یہ حسن پرستی بے مقصد نہیں ہے ۔ وہ حسینوں کو صرف دیکھنے ہی کے قائل نہیں ہیں ۔ وہ تو ان سے قربت حاصل کرنے کی تمنا کرتے اور ان کی محفلوں میں باریب ہونے کی خواہش رکھتے ہیں ۔ انہیں ان سے ملنے کی آرزو ہوتی ہے اور وہ ان کے وصل کو زندگی کی بنیاد سمجھتے ہیں :

اسد چہار نمائشائے گلستان حیات
وصال لالہ عذاران سرو قامت ہے

اور ان کی حسن پرستی کی تان ہیں ہر جا کر ٹوٹتی ہے ۔ اور یہ صورت حال غالب کو حقیقت پسندی سے قریب کرتی ہے ۔

غالب کے عشق کی بنیاد ان کی ہی حسن پرستی ہے ۔ ان کے عشق کا چہرہ اسی حسن پرستی سے بھوٹتا ہے ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے عشق میں جذباتیت نہیں ہے ۔ وہ کوئی مقصد رکھتا ہے ۔ اور اس کا سب سے بڑا مقصد حسن و جمال سے اکتساب لذت اور بعض بنیادی انسانی جذبات کی تسکین اور جسمانی تقاضوں کی تکمیل ہے ۔

لذت کا احساس انسان میں بالکل فطری ہے اور اس کا عمل اسی لذت پسندی سے عبارت ہے ۔ غالب کے عشق کی نوعیت بھی انسانی ہے ۔ اسی لیے اس کی بنیادیں بھی لذت پسندی پر استوار نظر آتی ہیں لیکن غالب کی یہ لذت پسندی نشاط و طرب ہی تک محدود نہیں ہے ۔ وہ غم عشق سے بھی لطف اندوز ہوتے اور لذت حاصل کرتے ہیں :

عشق سے طبیعت نے ، زیست کا مزا پایا
درد کی دوا ہائی ، درد سے دوا پایا

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ عشق میں صحیح لذت انہیں حسن ہی کے سہارے حاصل ہوتی ہے ۔ لذت کا شدید احساس ہی انہیں حسن کی طرف راغب کرتا ہے

اور وہ پوری طرح اُس کے شہدائی ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ معشوق کے حسن کا بیان، اُس کے عشوہ و ناز و ادا کی تصویریں، اُن حالات کے نقشے جن سے لذت حاصل کی جا سکتی ہے، اُن کی شاعری میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ اُن کی شاعری کا بہت بڑا حصہ اسی حسن، اُس کے متعلقات اور اُن کے رد عمل پر مشتمل ہے، جن میں زندگی سے لطف اندوز ہونے کا خیال بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اُن کے بیانات میں معاملہ بندی کی خصوصیت پیدا نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے بڑے ہی لطیف معاملات، بڑے ہی لطیف جذبات اور بڑے ہی لطیف حالات کی تصویریں سامنے آتی ہیں۔ یہ چند اشعار اس صورت حال کی پوری طرح عکس کرتے ہیں:

اگر وہ سرو قد، گرم خرام ناز آ جاوے
کف پر خاک گلشن، شکل قمری، نالہ فرسا ہو

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد ہار کا عالم
میں معتقد فتنہ، محشر نہ ہوا تھا

دیکھ اُس کے ساعد سپین و دست پر نگار
شاخ گل جاتی تھی مثل شمع، گل پروانہ تھا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
ذلف سے بڑھ کر، نقاب اُس شوخ کے رخ پر کھلا

کوئی میرے دل سے بوجھے، ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے ہار ہوتا

بلائے جاں ہے غالب اُس کی ہر بات
عبادت کیا، انارت کیا، ادا کیا،

بیل اک کوئہ گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب نشہ، تقریر بھی تھا

دل سے مٹا تیری انگشت حنائی کا خیال
ہو کیا گوشت سے قلعن کا جدا ہو جانا

کتنے شہریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
کالیاں کھیا کے بے مزا نہ ہوا

دل ہوائے غرام ناز سے بھر
عشرت ان بے قراری ہے

چال جیسے کڑی کہاں کا تیر
دل میں اسے کے جا کرے کوئی

آ اے بہار ناز! کہ تیرے غرام سے
دستار گرو شاخ گل نقش پا کروں

دیکھو تو دل لرینی انداز نقش پا
موج غرام یار بھی کیا گل کتر گئی

غنجہ' نا شگفتہ کو، دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو ہوجھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ یوں

سلطوت سے تیرے جلوۂ حسن غیور کی
خون ہے مری نگاہ میں رنگ ادا نے گل

ہے لہوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

صد رنگ گل کترنا، در پردہ قتل کرنا
تیغ ادا نہیں ہے، ہابند بے نیاسی

اسد بند قہائے یار ہے فردوس کا لہجہ
اگر وہ ہو تو دکھلا دوں کہ اک عالم گستاں ہے

جو کچھ ہے عو شوخیؔ ابروئے یار ہے
آنکھوں کو رکھ کے طاق پہ دیکھا کرے کوئی

اس نزاکت کا برا ہو ، وہ پہلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ آئے

کل کھلے ، لہجے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سر خوش خواب ہے وہ لڑکسی غمور ابھی

وہ لیٹر سی ، ہر دل میں جب اتر جاوے
نکہ ناز کو بھر کیوں نہ آشنا کھجے

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیابان خیابان اوم دیکھتے ہیں

غالب کا دیوان اس قسم کے اشعار سے بھرا پڑا ہے ۔ ان اشعار
سے یہ حقیقت واضح ہوئی ہے کہ وہ حسن ہے ، حسن کی اداؤں سے ،
اس کی شوخیوں سے ، اس کی سچ دھج سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں ۔ وہ
معاملہ بند شاعروں کی طرح حسن سے صرف ہوس کو پورا کرنا نہیں چاہتے
بلکہ اس سے لطف اندوز ہونے اور لذت حاصل کرتے ہیں۔ وہ پہلے معذوق
سرو قد ہے ، اسی کی ساعد میں ، چشم میگوں اور اس کی زلفوں سے کھیتے
ہیں ۔ اس کی تقریر ، اس کے غرام ناز ، اس کے نقش پا ، اس کی عبارت ،
اشارات اور ادا سے متاثر ہوتے ہیں ، جھومنے لگتے ہیں ، مست ہو جاتے ہیں
اور اس اثر حسن بار سے نہ صرف ان کے عشق بلکہ اس کے اظہار میں بھی
رعنائی آ جاتی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب نے اس حسن کو محض
نمادہائی کی حیثیت سے بیان ہی نہیں کر دیا ہے ، بلکہ اپنی ذات ،
اپنی شخصیت ، اپنی افتاد طبع اور اپنے ذہنی رجحانات کو پیش کرنے کی

کوشش کی ہے ۔ وہ اپنے انفرادی تاثرات اور جذبات و احساسات کو سامنے لانے ہیں ۔ در اصل بات یہ ہے کہ غالب کا احساس سطحی نہیں تھا ۔ وہ صرف خارجی حسن یا حسن کے خارجی پہلو ہی کو پیش کرنے کے قائل نہیں تھے ۔ کیونکہ خارجی حسن یا حسن کا خارجی پہلو بہ ذات خود اُن کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا ۔ انہوں نے تو اس حسن کے حسیاتی پہلو اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ذہنی رد عمل کو پیش کیا ہے ۔ اُن کے بیان ہے معشوق ہی کا حسن ہے نقد نہیں ہوتا ، اُس کی اداؤں اور اشاروں ہی کی تصویریں ہی سامنے نہیں آتیں ، بلکہ غالب کا حسیاتی تاثر یہی سامنے آتا ہے ۔

غالب کا معشوق حسین ہے ، شعلہ خو ہے ، آتش نفس ہے ، سرو قد ہے ، بری مثال ہے ۔ گویا مثالی حسن کی تمام خصوصیات اُس میں موجود ہیں ۔ لیکن وہ اُن سب باتوں کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص کردار بھی رکھتا ہے ۔ غالب نے اُس کے حسن کے ساتھ ساتھ اُس کے کردار کو بھی نمایاں کیا ہے ۔ اُس کے عادات و اطوار کی تصویریں بھی کھینچی ہیں ۔ وہ ستم شعار اور جفا پیشہ ضرور ہے لیکن کبھی کبھی اُس کے جی میں نیکی بھی آ جاتی ہے ۔ اس عالم میں وہ اپنی جفاؤں کو یاد کر کے شرماتا بھی ہے :

کبھی نیکی بھی اُس کے جس میں گرا جائے ہے مجھ سے
جفا میں کر کے اپنی یاد شرماتا جائے ہے مجھ سے

وہ اُردو شاعروں کے معشوقوں کی طرح ایسی مخلوق نہیں ہے جو اس دنیا کی مخلوق نہ معلوم ہو ۔ وہ اُسی دنیا کا انسان معلوم ہوتا ہے ۔ اسی لیے اس کے عمل میں ایک متوازن کیفیت نظر آتی ہے ۔ وہ خدی ضرور ہے لیکن بد مزاج نہیں ہے ۔ اس میں معصومیت ہے اور وہ بھولے سے سیکڑوں وعدے وفا کرتا ہے :

خدی کی ہے اور بات مگر بخوبی نہیں
بھولے سے اُس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

غرض غالب نے اپنے معشوق کو انسانی اقدار کا علم بردار ثابت کیا ہے اور جگہ جگہ اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ وہ اس کو اس کی اسی خصوصیت کی وجہ سے جانتے ہیں ۔

کا بیان اُن کے یہاں ایسے ہی مواقع پر ملتا ہے ۔ یہ غزل اس صورت کی بہترین مثال ہے :

شب کہ برق سوز دل سے زبرۂ ہر آب تھا
شعلہٴ جوانمہ ، ہر اک حلقہٴ گرداب تھا
جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں تب جو
یاں روانہ سڑگان چشم تر سے خون قلب تھا
یاں سر پر شورےٴ خواہی سے تھا دیوار جو
واں وہ لرق ناز ، محو بالشی کم خواب تھا
یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزم بے خودی
جلوۂ گل ، واں ، بساط صحبت احباب تھا
فرش سے تا عرش واں ، طوفان تھا موج رنگ کا
یاں زمیں سے آباں تک ، سوختن کا باب تھا
ناگہاں اس رنگ سے خونناہ ، ٹپکنے لگا
دل کہ ذوق کاوش ناخن سے لذت یاب تھا
مقدم سیلاب سے ، دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانہٴ عاشق ، مگر ساز صدائے آب تھا

ظاہر ہے کہ اس ہجر کی کیفیت کا پیدا کرنے والا وہ اس منظر ہے ، جس کی مصوری غالب نے اس غزل کے اشعار میں کی ہے ۔ اس کیفیت کو لذت کے خیال ہی نے پیدا کیا ہے اور محبوب سے قربت کی خواہش اس کی تخلیق کا باعث بنی ہے ۔

غالب کے یہاں اکتساب لذت کی یہ خواہش اتنی شدید ہے کہ جب اس کا سامان موجود نہ ہو تو وہ اپنے تخیل سے کام لے کر اس فضا کو پیدا کر لیتے ہیں جو اکتساب لذت کے لیے ضروری ہوتی ہے ۔ یہ میلان اُن کی رومانی مزاجی کا نتیجہ ہے ۔ وہ خود کہتے ہیں :

مستانہ طے کروں ہوں رہ وادیٴ خیال
تا باز گشت سے نہ رہے مدعا مجھے

یہ وادیٴ خیال کو مستانہ طے کرنے کا خیال دراصل اکتساب لذت ہی کے لیے ہے ۔ غرض تخیل غالب کے یہاں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور وہ اس کے سہارے اکتساب لذت کے لیے بڑی ہی رنگین اور پرکار سی فضا پیدا

کو لیتے ہیں۔ غالب کی تخلیل رنگین کار اس نضا کو نہایت ہی حسین اور
دلآویز، رنگین اور پرکار بنا دیتی ہے۔ اُن کی یہ غزل اس کیفیت کی بہترین
مثال ہے :

سدت ہوئی ہے ، یار کو مہیاں کیے ہوئے
جوش قدح سے ، یزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع بھر ، جگر لخت لخت کو
مرصہ ہوا ہے ، دعوت مژگاں کیے ہوئے
بہر وضع احتیاط سے ، رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں ، چاکہ گریباں کیے ہوئے
بہر گرم نالہ ہائے شرر یار ہے نفس
سدت ہوئی ہے ، سپر چراغاں کیے ہوئے
بہر برسن جراثیم دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار شکداں کیے ہوئے
بہر بہر رہا ہے خامہ مژگاں بخون دل
ساز جسمن طرازی داساں کیے ہوئے
باہم دگر ہوئے ہیں ، دل و دیدہ بہر رقیب
نظارہ و خیال کا سامان کیے ہوئے
دل بہر طواف کوئے ملاحت کو جائے ہے
ہندار کا صنم کدہ ، ویراں کیے ہوئے
بہر شوق کمر رہا ہے خریدار کی طلب
عرض متاع عقل و دل و جان کیے ہوئے
بہر چاہتا ہوں ، ناسمہ دلداز کھولنا
جان نذر دل فریبی غمخوار کیے ہوئے
چاہے ہے بہر ، کسی کو مقابل میں آرزو
سر سے تیر ، دشنہ مژگاں کیے ہوئے
اک لو پہار لار کو تاکے ہے بہر نکاح
چہرہ فروغ سے ہے ، گلستان کیے ہوئے
بہر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زہر بار سنت دریاں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے، پھر وہی فرصت کے رات دن

بٹھنے رہیں، تصور جاننا کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھوڑ کہ ہم جوشِ عشق سے

بٹھنے ہیں پھر ہمیشہ طوفان کیے ہوئے

جو شخص ایک نو چار ناز کو تار کوٹا ہوا، جس کو آرزو ہو کہ کوئی فروغ سے
 سے چہرہ گلستاں کیے ہوئے اس کے پاس آئے۔ جو سر سے سے تیز دشتِ مرگان
 کو اپنے سینے میں اُتار لینے کا متمنی ہو، جس کو کسی کے در پر
 سر زور پر منت دریاں کیے ہوئے بڑے رہنے کی خواہش ہو، اس کی لذت پرستی
 میں شک و شبہ کی کس کو گنجائش ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ
 سب کچھ اکتسابِ لذت کے خیال ہی سے کرنا چاہتا ہے۔ غالب نے آگے
 بڑھ کر اس کا اظہار اس طرح بھی کیا ہے :

نماشائے کلشن کمنائے چیدن

بہار آفرینا گندکار ہیں ہم

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو

ہوئی غالب نہ اگر عمرِ طبعی نہ سہی

گندِ کاری کا یہ اعتراف اور عشرتِ صحبتِ خوباں کو عمرِ طبعی کے مقابلے
 میں غنیمت جاننے کا اظہار، حسنِ پرستی اور عشق و عاشقی میں غالب کی
 حد درجہ بڑھی ہوئی لذتِ پرستی کے ثبوت کے لیے کال ہے۔

غالب حسنِ پرستی اور عشق و عاشقی کی دنیا میں صرف حسن و شباب
 اور ناز و غمزہ ہی سے اکتسابِ لذت نہیں کرتے، صرف مسرت و شادمانی
 ہی ان کے لطف کا باعث نہیں بنتی، حسنِ پرستی اور عشقِ عاشقی کی راہ
 میں جو ہر رخِ مقاصد آتے ہیں، ان سے بھی ان کا جی خوش ہوتا ہے۔
 اس میں بھی ان کو لذت ملتی ہے۔ گویا غالب حسن و عشق کے ہاتھوں
 پیدا ہونے والی اذیت میں بھی لذت محسوس کرتے ہیں۔ یہ لذت کبھی ان
 کے معشوق کے ہاتھوں اس کی کجِ ادائیگیوں اور بے نیازوں سے ان تک
 پہنچتی ہے۔ اور کبھی گردشِ روزگار کی ناخوش گوار صورت حال اس کو
 پیدا کرتی ہے۔ کبھی مطلوبہ چیز کو نہ ملنے کی صورت میں اپنے آپ کو
 اداں کر کے، شگین بنا کر، اذیتِ پرستی کا شکار ہو کر، زندگی، ماحول

اور معاشرے اور خود اپنے اوپر احسان کرنے کا احساس ان کے اندر پیدا ہوتا ہے ۔ غرض غالب کے یہاں اس اذیت پسندی کی کئی صورتیں ملتی ہیں :
ان آباؤں سے پاؤں کے گھیرا گیا تھا میں
جس خوش ہوا ہے ، راہ کو پر خار دیکھ کر

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
مینہ جویائے زخم کاری ہے

متم کنسی کا کیا دل سے حوصلہ پیدا
اب اس سے ربط رکھوں جو بہت متم گر ہو

ہم کو متم عزیز، متم گر کو ہم عزیز
نا مہرباں نہیں ہے ، اگر مہرباں نہیں

نالہ جز حسن طلب ، اے متم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا ، شکوایے داد نہیں

شن ہو گیا ہے سینہ ، غوشا لذت فراغ!
تکلیف بردہ داری زخم جگر گئی

حالانکہ غم بہ ذات خود انہیں عزیز نہیں ۔ وہ اپنے دل کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ وہ غم اٹھا سکے :

غم کھانے میں بودا ، دل ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے منے کفام ، بہت ہے

یہی احساس انہیں یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور کر دیتا ہے :

نہد حیات و بند غم ، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی ، غم سے نجات پائے کیوں

عشق و عاشقی کی دایا میں غالب اس غم کو لذت بنا لیتے ہیں اور وہ اس لذت سے مست و سرشار رہتے ہیں ۔

جیسا کہ اس سے قبل بھی کہا جا چکا ہے ، اکتساب لذت کے یہ مختلف پہلو ان کی نسلی خصوصیات ، خاندانی حالات ، ماحول کے اثرات اور

ان سب کے زیر اثر تشکیل پائی ہوئی ان کی اقیاد طبع اور کردار کے پابہوں پیدا ہوا ہے۔ غالب جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے، لذت پسندی اس کے افراد کی گھنٹی میں بڑی تھی اور وہ اس کو اپنا نصب العین تصور کرتے تھے۔ بات یہ ہے کہ زندگی کے ایک خاص معیار نے اس طبقے کے افراد میں لطافت اور نفاست کے ساتھ وابستگی کے خیالات کو ان کی زندگی کا لازمی جزو بنا دیا تھا۔ ان کے پاس وقت بہت تھا۔ کرنے کے لیے بہت کم کام تھے۔ یہ افراد اپنے وقت کا زیادہ حصہ زندگی کی رنگ رلیوں میں گزاریں تھے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں لذت کا احساس اور لذت پرستی کا خیال نو پیدا ہونا ہی چاہیے تھا۔ غالب اسی طبقے کے ایک فرد تھے۔ اسی لیے اس کی ان خصوصیات کا ان کے کردار میں پیدا ہونا لازمی تھا۔ ان کی حد درجہ بڑھی ہوئی لذت پسندی کا ایک سبب ان کا یہ طبقاتی مزاج بھی ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ لذت پسندی ان کے لیے کسی حد تک ایک فرار کی حیثیت بھی رکھتی تھی۔ نامساو کار حالات کے باعث وہ اسی لذت کے خیال سے دل جھلاتے تھے۔ یہ ان کے لیے جینے اور غم غلط کرنے کا ایک سہارا تھا۔ یہی تمام اسباب ہیں، جنہوں نے غالب کے جہاں لذت کے خیال کو پیدا کیا ہے۔

غالب کے تصور عشق میں اس لذت پسندی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے ان کے تصور عشق کو جدید دور کے نفسیاتی نظریات عشق کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ کیوں کہ اسی پس منظر میں اس کی اصلیت کو پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ مابعد الطبیعیات کے زمانے سے لے کر اس وقت تک، عشق کے متعلق مختلف نظریات پیش کیے جاتے رہے ہیں اور آج بھی اس کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں عشق کے جس مادی اور جنسی تصور کو اہمیت حاصل ہے، وہ اپنی جگہ ان تمام نظریات سے اہم ہے۔ کیوں کہ ان کی بنیادیں نفسیاتی حقائق پر استوار ہیں۔ افلاطون نے عشق کا جو تصور پیش کیا تھا اور جس کے اثرات ایک زمانے تک اس دنیا میں رائج رہے، وہ تمام تر رومانی اور خیالی تھا۔ اس کی بنیادیں حقیقت پر استوار نہیں تھیں۔ اس کے عشق کی تان جذباتی حسن پرستی پر ٹوٹی ہے۔ بغیر کسی خواہش اور بنیادی انسانی جذبے کے عشق پروان چڑھتا ہے۔ اتصال جسمانی کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں

رکھتا۔ اس کا عشق تو صرف اتصال روحانی ہے اور حسن میں اپنے آپ کو بغیر کسی جسمانی اور مادی مقصد کے فنا کر دینے کا نام ہے۔ مغرب و مشرق دونوں میں، چونکہ افلاطون کا اثر خاصا گہرا رہا، اس لیے صدیوں تک عشق کے اسی تصور کو لوگ سب کچھ سمجھتے رہے۔ مشرق کی روحانیت ہرستی نے اس نظریے کو قبول کرنے میں کچھ اور بھی مدد کی۔ ادھر مغرب میں عیسائیت نے اس تصور کو پروان چڑھایا۔ چنانچہ یہ نتیجہ ہوا کہ عشق کو بعض مخصوص اخلاقی قدروں کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا، جس کا اثر یہ ہوا کہ اس کی صورت کچھ سے کچھ ہو گئی۔ اس زمانے میں جنسی تصور موجود ضرور تھا۔ لوگ اس کی اہمیت سے ضرور واقف تھے لیکن اس کے اظہار کو ہیبت اور مجنونانہ کیفیت پر محمول کیا جاتا تھا۔ عاشق کی معراج یہ سمجھی جاتی تھی کہ اس میں کسی جنسی یا جسمانی خواہش کو دخل نہ ہو۔ چنانچہ ایسے عاشق کی مثالیں مشرق و مغرب دونوں جگہ نظر آتی ہیں۔ لوگ کسی انسان سے نہیں، بلکہ 'عشق' سے محبت کرتے ہیں۔ معشوق کے خیال کو سینے سے لگائے رکھنا اور اسی میں جان دے دینا ہی ان کے نزدیک سب کچھ تھا۔ اور یہ سب افلاطونی عشق کی کارفرمائیاں نہیں۔ لیکن اب بعض فلسفیوں اور ماہرین نفسیات کا یہ خیال لوگوں کے دلوں میں گہر کرنا جا رہا ہے کہ عشق کی نوعیت حقیقتاً جنسی ہوتی ہے۔ اس کی تہ میں جنس کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ کیوں کہ جنسی عشق میں طرفین ہر اعتبار سے ایک دوسرے کے اتنا قریب ہو جاتے ہیں، جس کو ایک روح دو قالب ہوئے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ عشق کا جنسی تصور ہی ایک ایسا تصور ہے، جس میں عشق کے دوسرے تصورات گہل مل جاتے ہیں۔ ہا اس عوور کے گرد گھومنے رہتے ہیں۔

عشق کا یہ تصور مغرب میں تو خیر یوموں سے ایک مخصوص طبقے میں رائج رہا ہے۔ ہمارے یہاں یہ تصور موجودہ دور میں پہنچا ہے لیکن اس وقت بھی مخصوص معاشرتی اور تہذیبی روایات اور مخصوص اخلاقی اقدار نے اس کو عام نہیں ہونے دیا ہے۔ چاہے لوگ اس کو صحیح سمجھتے ہوں لیکن معاشرتی و تہذیبی انہی اس کا اظہار نہیں کرنے دیتے۔ غالب کا زمانہ آج سے تقریباً سو سال پہلے کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں تو اخلاق کی

گرفت اتنی سہولت تھی کہ اس کا اظہار کرنا تو درکنار ، کوئی اس کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا ۔

حالانکہ جاگیردارانہ ماحول نے ہر فرد کے دل میں لذت پرستی کی خواہشات چھپا رکھی تھیں ۔ لیکن چونکہ زلدگی میں ایک دورنگی کا دور دورہ تھا ، اس لیے لوگ اس کا اظہار نہیں کرتے تھے ۔ بلکہ اس معاملے میں بھی ان کی طرف سے دورنگی کا اظہار ہوتا تھا ۔

غالب اپنے ماحول کی پیداوار تھے ۔ ان پر اپنے گرد و پیش کے اثرات بھی پڑے تھے ۔ مروجہ روایات اور اخلاقی انداز سے بھی ان کا پیچھا چھڑانا مشکل تھا ۔ لیکن ان کی شخصیت میں دورنگی کی خصوصیت قائم کو نہیں تھی ۔ وہ جو کچھ سوچتے تھے ، اس کو جہالتے نہیں تھے ۔ بلکہ اس کا اظہار کر دیتے تھے ۔ چنانچہ ان کی عشقیہ شاعری کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ انہوں نے جو کچھ جذبہٴ عشق کے متعلق سوچا ہے ، اس کا اظہار بغیر کسی جھجک کے کر دیا ہے ۔ غالب کا نقطہٴ نظر ہر معاملے میں جذباتی ہونے کے بجائے عقلی ہوتا تھا ۔ وہ چیزوں پر غور کرنے کے عادی تھے ۔ چنانچہ اپنے نظریہٴ عشق کو پیش کرنے کے سلسلے میں بھی انہوں نے یہی کیا ہے ۔ وہ جنسی نظریہٴ عشق کے قائل تھے ، کیوں کہ وہ عقلی تھا ۔ اس لیے روایتی تصور عشق کی ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں تھی ۔ ان کا خلوص انہیں اس پر ایمان لانے سے باز رکھتا تھا ۔ صداقت اور صاف گوئی ، جو ان کی شخصیت کا حصہ تھی ، انہیں اس روایتی تصور عشق کو اپنانے کی اجازت نہیں دیتی تھی ۔ چنانچہ جب وہ یہ کہتے ہیں :

بلبل کے کاروبار یہ ہیں خندہ ہائے گل

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہر نظریہٴ عشق کے متعلق ان کا یہ خیال ہے ۔ بلکہ مروجہ روایتی تصور عشق ان کو ’دماغ کا خلل‘ معلوم ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس عشق میں جو عجیب غریب باتیں ہوتی ہیں ، ان کو اگر عقل و شعور کی روشنی میں جذبات سے الگ ہو کر دیکھا جائے ، تو ان کا خلل دماغ معلوم ہونا یقینی ہے ۔ ان پر تو بے اختیار ہنسے کو جی چاہتا ہے ۔ غالب پر بھی اس کا یہی رد عمل ہوا ہے ۔

حالانکہ ویسے جہاں تک عشق کے عقلی تصور کا تعلق ہے ، وہ اس کی اہمیت کے قائل ہیں ۔ ان کے خیال میں عشق خانہ ویران ساز کی وجہ سے زندگی میں ایک رونق رہتی ہے :

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویران سارے
انہیں بے شمع ہے گویا غریب غریب میں نہیں

وہ اس بات کا احساس بھی رکھتے ہیں کہ بغیر عشق کے زندگی بے کار ہے ۔ اس کی تکلیفوں کے باوجود وہ اس کے وجود کو زندگی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں ۔ ان کے خیال میں بغیر اس کے عمر کٹ ہی نہیں سکتی ۔ بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور ہاں طلاق بے درد لذت آزار بھی نہیں

عشق میں آزار کے قائل ہیں ۔ اس کا ہونا ان کے نزدیک لازمی ہے "اندوہ عشق" کی کشمکش ہے ، ان کے خیال میں عاشق کو کسی وقت بھی عبات نہیں مل سکتی ۔

جانی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ عشق ہر کسی کا زور نہیں ۔ اس دنیا میں آکر انسان بے بس ہو جاتا ہے ۔ یہ آگ نہ لگائے لگتی ہے اور نہ بجھائے بجھتی ہے :

عشق ہر زور نہیں ہے یہ وہ آتشِ غالب
کہہ لگائے نہ لگئے اور بجھائے نہ بسے

وہ اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ عشق ہی زندگی میں سب کچھ ہے ۔ اس سے طبیعت کو جو مزا ملتا ہے اس کی مثال دنیا کے پردے پر موجود نہیں ۔ وہ "درد کی دوا" بھی ہے اور "درد لادوا" بھی ۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا ہائی ، درد لا دوا پایا

غالب کے خیال میں عشق کی منزل میں قدم رکھنا معمولی انسان کے بس کی بات نہیں ۔ اس کے لیے تو پتھر کا کلیجا رکھنے کی ضرورت ہے ۔ ایک ایسا انسان محبت کر سکتا ہے ، جس میں اس کی تمام مصیبتوں کو اٹھانے

کی سکت ہو۔ کیوں کہ عشق 'نبرد ہیشہ' ہوتا ہے۔ اس کو 'مرد کی طلب' ہوتی ہے۔ ورنہ معمولی انسان کو تو صرف اس کی 'دھمکی' ہی فنا کی نیند سلا دیتی ہے :

دھمکی میں مر گیا جو نہ باب ابرد تھا

عشق نبرد ہیشہ طلب کار مرد تھا

اور اس عشق کے لیے وہ صرف اپنے آب کو مناسب سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ان میں اس کا مقابلہ کرنے کی وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جن کا مطالبہ عشق کرتا ہے :

کون ہوتا ہے حریف مے مرد الکن عشق

ہے مکتور لب ساقی ہمہ صلاح میرے بعد

غرض یہ کہ غالب عشق کی اہمیت ، اور اس کی بڑائی کے قائل ہیں۔ اور انہیں اس بات کا احساس ہے کہ عشق کے ان تمام مطالبات کو ان کی شخصیت ہی پورا کرتی ہے۔ ویسی اس پر پورے اتارتے ہیں۔

ہر حال ان کے عشق کا یہ تصور ایک مخصوص تصور ہے۔ اس میں جذباتیت سے زیادہ عقلیت ہے ، روحانیت سے زیادہ مادیت ہے۔ روایت سے زیادہ حقیقت ہے ، عینیت سے زیادہ واقفیت ہے۔ غالب کے نزدیک عشق کا ایک منصف ہوتا ہے۔ اس کی نان ایک خواہش پر ٹوٹتی ہے۔ وہ معشوق اور اس کے حسن کو صرف ہوجنے کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ ایک خواہش انہیں اس کی طرف راغب کرتی ہے اور وہ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے عشق نبرد ہیشہ کے ہاتھوں مقابلہ کرتے ہوئے فنا ہو جانا تک پسند کرتے ہیں۔ جو لوگ ان کی اس خواہش کو پریشانی شمار کرتے ہیں ، وہ ان کے خیال میں احمق ہیں :

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار

کیا ہوجنا ہوں اس بت یدار گرو کو میں

یہ 'خواہش' کیا ہے؟—ظاہر ہے کہ یہ معشوق کے ساتھ لذت حاصل کرنے کی خواہش ہے۔ غالب اپنے عشق میں اس خواہش کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے سارے عشق کی بنیاد اسی پر استوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کا تصور عشق روایتی نہیں رہا ہے۔ اس میں 'وجدت پائی جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج اس کو حقیقت سے ہم آہنگ کہا جاتا ہے۔

غالب کے اس تصور عشق کی تشکیل ، جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے ، ان کی سادیت اور جنسیت، خود پرستی اور انایت، دوسروں کو زیر اور اپنے آپ کو زیر رکھنے کی خواہش ، عیش و نشاط کی تلاش اور لذت کے شدید احساس کے ہاتھوں ہوئی ہے ۔ یہی ان کے اس تصور عشق کے محرکات ہیں اور ان خصوصیات کو ان کے نسلی و خاندانی امتیاز کے احساس اور ماحول و گرد و پیش کے اثرات نے پیدا کیا ہے ۔ لیکن اس کے علاوہ عقل پرستی اور شعور کی بیداری نے سادگی اور صاف گوئی اور روایت سے بغاوت کے خیال اور اپنے آپ کو اپنے اصلی روپ میں پیش کرنے کی آرزو کو ان کی زندگی کا حصہ بنا دیا تھا ۔ چنانچہ غالب کی شخصیت کی یہ خصوصیات ان کے تصور عشق کی تشکیل میں مدد و معاون ثابت ہوئی ہیں اور عشق کے معاملے میں پیش کیے ہوئے تمام خیالات میں ان کے اثرات کا پتہ چلتا ہے ۔

غالب کی شخصیت میں انایت اور خود پسندی کا رنگ سب سے زیادہ نمایاں تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اثرات ان کے تصور عشق میں بھی اپنی جھلک دکھاتے ہیں ۔ وہ اپنی ذات کے سامنے معشوق ٹک کو کچھ نہیں سمجھتے ۔ حالانکہ معشوق سے زیادہ انہیں کوئی اور چیز عزیز نہیں تھی ۔ معشوق کا وصل ان کے نزدیک زندگی کی معراج ہے ۔ لیکن 'حجاب پاس وضع' ان کو معشوق تک پہنچنے سے باز رکھتا ہے ۔ اور معشوق کا ضرور عجز و ناز اس کو ان کے پاس لے نہیں دیتا ۔

وہ اپنی خوفہ چھوڑیں گے ، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیوں ہو چھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

واں وہ ضرور عجز و ناز ، یاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں ، بسزم میں وہ ہلائیں کیوں

اسی قسم کے حالات ان کی شاعری میں کہیں کہیں پھر و فراق کی کیفیت کے بیان کو جگہ دیتے ہیں ، ورنہ ان کی ساری شاعری اس قسم کے بیانات سے خالی ہے ۔ اور ان کی انایت کیوں پر اس نہیں کرتی بلکہ اس کے زیر اثر وہ بہت آگے جاتے ہیں ۔ وہ انہیں 'عشق' میں سر بھوڑنے سے باز رکھتی ہے اور اگر سر بھوڑنا ہی عشق میں ضروری ہو جائے تو پھر

وہ کسی ایک کے 'سنگ در' پر سر پھوڑنے کو ضروری خیال نہیں کرتے !

وفا کیسی ؟ کہاں کا عشق ؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا

تو پھر اے سنگ دل! تیرا ہی سنگ آستان کیوں ہو ؟

اس شعر کے انداز بیان میں ان کی انانیت کے اثرات صاف نظر آتے

ہیں۔ اور نہ صرف اس شعر میں بلکہ ان کے کلام میں جگہ جگہ ان کی انانیت اپنا اثر دکھاتی ہے :

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے

یہ جاشا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی

میری وحشت تری شہرت ہی سہی

تمنا کر اے عفو آئینہ داری

مجھے کس گستاخ سے ہم دیکھتے ہیں

کیا آبروئے عشق چہاں عام ہو چنا

رکھتا ہوں تجھ کو بے سبب آزار دیکھ کر

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں

سیک سارین کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

غرض یہ کہ غالب کی عشقہ شاعری میں ان کی انانیت کے اثرات

خاصے گہرے نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ نہ صرف عشق اور

شاعری میں بلکہ زندگی میں خود شناسی اور خود پرستی کو بڑی اہمیت

دیتے تھے۔ ایک جگہ کہتے ہیں :

بازجہ اطفال ہے دلیا مرے آگے

ہوتا ہے شب و روز تمنا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگ سلیاں مرے نزدیک

اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

جز عام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جیسے خاک یہ دریا مرے آگے

غرض عشق میں اپنی ذات کی اہمیت کا احساس بھی ان کے یہاں ان
کی اسی خصوصیت نے پیدا کیا ہے ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عشق کا بہرہ ان
کے دم سے قائم ہے ۔ معشوق ، اس کی ادائیں اور عتبوں ، ناز اور غمزے
سب کچھ ان کی وجہ سے ہیں ۔ ان کے لیے ہیں ۔ ان کے بعد یہ سب کچھ
ختم ہو جائے گا ۔ یہ غزل ان کے اس میلان کی صحیح عکاسی کرتی ہے :

عشق غمزے کی کشاکش سے جھٹا ، میرے بعد
بارے ، آرام سے ہیں اہل جفا ، میرے بعد

منصب شہتگی کے کیوں قابل نہ رہا
ہوئی معزولیٰ انداز و ادا ، میرے بعد

شمع بجتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلہ عشق سبھ ہوش ہوا ، میرے بعد

خون ہے دل خاک میں احوال بتاں پر ، یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا ، میرے بعد
در خور عرض نہیں ، جوہر بیداد کو جا
نکہہ ناز ہے سرمے سے خفا ، میرے بعد

ہے جنوں اہل جنوں کے لیے آغوش وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا ، میرے بعد
کون ہوتا ہے حریف منے مرد افکن عشق
ہے مکتور لب ساقی یہ صلا ، میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہہ کرے تعزیت سہر و وفا ، میرے بعد
تھی نکمہ میری نہاں خانہ دل کی نقاب
بے خطر جتنے ہیں ارباب ریا ، میرے بعد

آئے ہے بے کسی عشق یہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب ہلا ، میرے بعد

اور عشق کی دنیا میں اپنی اہمیت کے اسی احساس نے غالب کے یہاں جذبہٴ رشک کو سب سے زیادہ بیدار کیا ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری کا ایک خاصہ حصہ عشق میں جذبہٴ رشک کی ترجمانی سے بھرا پڑا ہے۔ اردو شاعری میں جذبہٴ رشک کی ترجمانی یوں تو تقریباً ہر دور کے ہر شاعر کے یہاں نظر آتی ہے، لیکن اس کا انداز کچھ روایتی ہی سا رہا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے ان میں اکثر جگہ ابتذال کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن غالب کے یہاں یہ جذبہٴ رشک کی ترجمانی روایتی انداز میں نہیں ہے۔ بلکہ اس کی محرک ان کے کردار کی بعض بنیادی خصوصیات ہوتی ہیں۔ غالب کے یہاں خاندانی وجاہت کا جو شدید احساس تھا، اپنے آپ کو ہر اعتبار سے بلند رکھنے کی جو خواہش تھی اور جس کے نتیجے میں انسانیت نے جنم لیا تھا، ان تمام باتوں کے اثرات ان پر یہ ہوئے تھے کہ وہ دنیا کی ہر چیز کو اپنے لیے سمجھتے تھے۔ ان کو یہ گوارا نہیں تھا کہ کوئی دوسرا بھی اس میں شریک ہو۔ چنانچہ معاملات حسن و عشق میں بھی ان کے یہاں یہی جذبہٴ کام کرتا تھا۔ ان معاملات میں ایک حد تک تو یہ جذبہٴ نفسیاتی حقیقت پر مبنی ہے۔ لیکن غالب کے یہاں آگے بڑھ کر یہ خود پسندی بلکہ خود غرضی کے حدود میں داخل ہو گیا ہے اور اس طرح اس نے ان کے یہاں کہیں کہیں ایک مرض کی صورت اختیار کر لی ہے۔ لیکن غالب کے کردار اور افتاد طبع کے پس منظر میں رشک کا یہ بیان حقیقت نظر آتا ہے۔ وہ صرف و قیہ ہی پر رشک نہیں کرتے، خود معسوف اور اپنی ذات تک پر رشک کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں:

دیکھنا قسمت گم آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرنے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

رشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ مجھے سہر کسی کا آشنا

قیامت ہے کہ ہر دے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

چھوڑا نہ رشک نے کہ تیرے گھر کا نام اون
پر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

ہم نشینی* رلیاں گرچہ ہے سامان رشک
لیکن اس سے ناگوارا تر ہے بد فاس تری

رہا بلا میں ابھی میں مبتلائے آفت رشک
بلانے جان ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے

نفرت کا گہاں گزرے ہے ، میں رشک سے گزرا
کیوں کر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے

ابھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کی ایک نار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
نہ گیا رلیب آخر ، تھا جو واژ داں اپنا

بس کہ وہ چشم و چراغ محفل اشیاو ہے
چمکے چمکے جلنے ہیں جوں شمع ماتم غالب ہم

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا کہ
ہر چند ہر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اشعار ، اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ
غالب کے یہاں معاملات عشقی میں یہ رشک کتنی شدت اختیار کر گیا تھا ۔
غور سے دیکھا جائے تو یہ رشک کے معاملات بھی بنیادی طور پر ان کے اس
تصور عشق کی پیداوار ہیں ، جس کی بنیادیں لذت پسندی پر استوار ہیں اور
جس کی تہ میں جنسی جذبے کا ہاتھ تھا ۔

غالب کے تصور عشق کی نوعیت ، اس میں شبہ نہیں کہ جنسی ہے
لیکن یہ جرأت ، انشاء اور رنگین کے تصور عشق سے مختلف ہے ۔ غالب

کے بیان یہ نظریہٴ عشق کہیں بھی ایک ذہنی تلمیح کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ ابتدائے عناصر بھی اُس میں پیدا نہیں ہوتے۔ وہ جرات کی طرح معاملہ بندی کے قائل نہیں ہیں۔ وہ جنسی معاملات کی ترجیحی ضرورت کرتے ہیں لیکن اس میں بڑی لطافت کا احساس ہوتا ہے اور لیے دیے رہنے والی کیفیت نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عشق و ہوس میں امتیاز کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک عشق و ہوس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ غالب عشق کے قائل ہیں اور ہوس کو نری چیز سمجھتے ہیں :

ہر ہوائیوس نے حسن یرمئی شعاع کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

اہل ہوس کی فتح ہے، ترک نبرد عشق
جو پاؤں اٹھ گئے، وہی اُن کے علم ہوئے

فروغ شعاع، خس یک نفس ہے
ہوس کو پاس تاسوس وفا کیا

اُن اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ عشق و ہوس غالب کے نزدیک دو مختلف چیزیں ہیں۔ عشق کی سطح بلند ہے اور ہوس کی سطح پست۔ یہ دونوں کبھی ایک جگہ پر جمع نہیں ہو سکتے۔ ہوس اُن کے نزدیک عشق کی موت ہے۔

یہ خیالات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ غالب کے تصور عشق میں ایک امتیازی شان تھی۔ اُس کی نوعیت جنسی ضرور ہے لیکن اس کے باوجود ہوس سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے پیش نظر کچھ اخلاقی اقدار ضرور ہیں، جن کو وہ نظر انداز کرنا نہیں چاہتے۔

اس صورت حال ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ غالب کی شاعری میں عشق کے اس مادی اور جنسی تصور کی ترجیحی کے باوجود عشق اور اُس کی مختلف اور متنوع واردات و کیفیات کی رنگارنگ تصویریں ملتی ہیں۔ عاشق جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، اُس کے دل پر جو کچھ گزرتی ہے، جن معاملات سے اُسے دو چار ہونا پڑتا ہے، جتنی منزلیں بھی واہ عشق میں اُسے طے کرنی پڑتی ہیں، اُن سب کی ترجیحی غالب نے اپنی شاعری میں

بڑے سلیقے سے کی ہے ۔ اور اس صورت حال نے اُن کی عشقیہ شاعری کو عشقیہ معاملات اور واردات و کیفیات کا ایک نہایت ہی حسین اور دلاویز مرتع بنا دیا ہے ۔ غالب نے عشق کے کسی پہلو کو چھوڑا نہیں ہے ، ایک ایک جذبے اور ایک ایک کیفیت کی ترجمانی کی ہے :

جذبہؔ ہے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینہؔ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

سادگی و ہرکاری ، بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

جانی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ والا سے چہوتوں
وہ سہم گر مرے مرے یہ بھی راضی نہ ہوا

کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو ہر اب
دیکھا تو کم ہوئے یہ غم روزگار تھا

غم فراق میں تکلیف سیر گل مت دو
مجھے دماغ نہیں ، غندہ ہائے بے جا کا

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتن گل ہائے ناز کا

وائے دیوانگیؔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہوتا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود ہشیاں کا ہشیاں ہوتا

تو نے وعدے پر جیسے ہم ، تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جانے ، اگر اختیار ہوتا

کونے سیرے دل سے ہو چھوے، ترے اُپر ہم کش کو
 یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے بار ہوتا
 غم اگرچہ جاں گسل ہے، یہ کہاں بھیں کہہ دل ہے
 غم عشق اگر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا

نوازش ہائے جا دیکھتا ہوں
 شکست ہائے رنگیں کا گلا کیا

بہر ترے کوچے کو جانا ہے خیال
 دل کم گشتہ، مگر، یاد آیا

نم سے ہے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلا
 اس میں کچھ شائبہ، عوں، تقدیر بھی تھا

گو میں رہا رہیں ستم ہائے روزگار
 لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

یے داد عشق سے نہیں ڈرتا مگر اس
 جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

درد دل لکھوں کیوں کر، جاؤں اُن کو دکھلاؤں
 انگلیاں فگار اپنی، غاسہ، غوں چکن اپنا

گہوں میں میری نعل کو کھینچے بہر وہ
 جان دادہ ہوائے سر ریگزار تھا

تو اور آرائش غم کا کل
 میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

م کیا پہوڑ کے سر غالب وحشی ہے ہے
 بیٹھنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

وہ فراق اور وہ وسال کہاں
 وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

ہم پر وفا ہے ترک وفا کا کہاں نہیں
اک چھوڑ ہے وگر نہ مراد امتحاں نہیں

راز معشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

نظر لکھے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم چگر کو دیکھتے ہیں

جوتے غول آنکھوں سے جنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سبھیوں کا کہ شعیں دو فروزاں ہو گئیں

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر بھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اسے سنگدل! تیرا ہی سنگ آستان کیوں ہو

شرم اک ادا نے ناز ہے، انے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کہیں میرے گریباں کو، کہیں جاناں کے دامن کو

خدا یا جذبہ دل کی مگر تاثیر الٰہی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھینچتا جائے ہے مجھ سے

عجز و نیاز ہے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچے

وہ شوخ انے حسن بہ مقرر ہے اسد
دکھلا کے اس کو آئینہ توڑا کرے کوفی

رہے اس شوخ سے آزدہ ہم چندے تکلف سے
تکلف ہر طرف تھا ایک انداز چنوں وہ بھی

شوربدری کے ہاتھ سے سر ہے وہاں دوش
صحرا میں اے خدا ! کوئی دیوار بھی نہیں

مجھ سے مت کہہ، تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

کر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنوں عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

بیکاری، جنوں کو ہے سریشٹے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

روئے سے اے ندیم ! سلامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو دیدہ دل وا کرے کوئی

خوں ہو کے جگر آنکھ سے لپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے پاں کہ ابھی کام بہت ہے

ان اشعار سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ غالب کی زندگی اور شخصیت میں عشق و عاشقی کا رنگ پوری طرح رچا ہوا تھا۔ اس راہ میں جو منزلیں آئی ہیں، وہ ان سب سے گزرتے تھے۔ اس راہ کے مسافر کو جو تجربات بھی ہوتے ہیں، ان سب کا وہ گہرا احساس و شعور رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اشعار میں ان تجربات کی تمام تفصیلات موجود ہیں اور ان میں سے ہر تجربہ انسانی نفسیات کے کسی نہ کسی پہلو کی تصویر بنی کرتا ہے۔ اسی لیے اس کی بے باک حقیقت و واقعیت پر استوار نظر آتی ہے اور اس میں انسانی اور آفاقی رنگ و آہنگ کا احساس بھی ہوتا۔

غالب کی عتیقہ شاعری اس اعتبار سے اردو شاعری کی روایت میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے !

غالب کی شاعری
کا
جمالیاتی پہلو

غالب ایک عظیم شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں انسانی زندگی کے جذباتی معاملات کی بڑی ہی حسین مصوری ہے۔ ان معاملات کو انہوں نے فکری اور فلسفیانہ، لیکن انسانی زاویہٴ نظر سے دیکھا ہے۔ ان کے یہاں فلسفیانہ خیالات زندگی سے الگ نہیں ہیں۔ انہوں نے مابعد الطبیعیاتی، اخلاقی اور چالپائی معاملات کے اسرار و رموز کی بڑی خوبیوں سے نقاب کشائی کی ہے۔ لیکن ان سب کو زندگی سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا ہے۔ ان کی فکر ماورائی نہیں ہے۔ وہ اس پاس اور گرد و پیش کی زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ وہ انسان کی عظمت کے قائل ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے خیال میں وہ مجبور محض ہے اور اس کو کائنات کی کسی چیز پر کوئی اختیار حاصل نہیں۔ وہ محبت اور اخوت کے علم بردار ہیں۔ وہ سوجھ ہیں اور ترک رسوم ان کا مسلک ہے۔ مثنوی کے سٹ جانے کو وہ اجڑائے ایمان سمجھتے ہیں۔ ان کے پاس انسانی زندگی کے اجتماعی پہلو کا گہرا شعور موجود ہے اور انہوں نے اپنی شاعری میں اس کے نشیب و فراز کی حقیقت سے بڑی ہی بھرپور تصویر کشی کی ہے۔ ان تمام پہلوؤں نے مل کر ان کی شاعری کو عظیم بنایا ہے لیکن ان پہلوؤں کو حسین اور دل آویز بنا کر پیش کرنے میں بھی وہ ہمیشہ بیش بیش رہے ہیں اور اس صورت حال نے بھی ان کی شاعری کو عظمت سے ہم کنار کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان کا بنیادی سبب تو یہ ہے کہ غالب کے یہاں ہر شاعرانہ خیال نے ایک تجربے کی صورت اختیار کی ہے۔ وہ محض قافیہ پیمائی کی پیداوار

نہیں ہے ۔ اس میں آورد کا شائبہ تک نہیں ہوتا ۔ اسی لیے اس میں ان کی پوری شخصیت کسی نہ کسی زاویے سے اپنی جھلک دکھاتی ہے ۔ یہ شخصیت بڑی پہلو دار ہے ۔ اس میں بڑی ہی رنگینی اور ہرکاری ہے ۔ اس میں روایت کا رنگ رچا ہوا ہے ۔ ماحول کے اثرات بھی اس پر بڑے گہرے ہیں ۔ ان کی شخصیت کی یہ خصوصیات ان کے شاعرانہ تجربات میں بھی نمایاں نظر آتی ہیں ۔ غالب پر فارسی کا اثر بہت گہرا ہے ۔ وہ فارسی کی روایت میں پوری طرح رنگے ہوئے ہیں ۔ یہ فارسی ہی کی روایت کا اثر ہے کہ ان کی شاعری میں جگہ جگہ کل کاریاں سی ملتی ہیں ۔ فارسی کے مزاج کو انہوں نے اردو کے ساتھ کچھ اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ اس میں بڑی ہی شاداب اور شگفتہ سی فضا پیدا ہو گئی ہے ۔ ان کی شاعری میں ہر جگہ جنگمکھاٹ کا احساس ہوتا ہے ۔ بڑی ہی تابندگی نظر آتی ہے ۔ فارسی کی جو ان گنت ترکیبیں انہوں نے تراشی ہیں، ان کو دیکھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جھاڑ فالوس سے روشن ہیں یا جگہ جگہ پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی ہیں ۔ بات یہ ہے کہ ان کی تراشی ہوئی فارسی کی یہ ان گنت ترکیبیں محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہیں ۔ ان میں لہر رنگین و پرکار تہذیب کا لبو ہے ، جس نے غالب کو پیدا کیا تھا اور جس کی رنگینی و ہرکاری ان کے ایک ایک انداز سے بھرتی ہے ۔ یہ اشعار اس صورت حال کے صحیح ترجمان اور عکس ہیں :

ہوائے سیر گل ، آئینہ بے مہری قائل
کہ انداز بہ خون غلطیدن بسمل پسند آہا

رنگ شکستہ ، صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شکفتن گل ہائے لہاز کا

ہیں بس کہ جوش بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشہ بساط ہے سر شیشہ باز کا

شب ہوئے پھر انجم رخسارہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بت کدے کا در کھلا

شعبہ غبارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورتِ خدائے خمیازہ تھا

نوازش پائے ہے جا ، دیکھتا ہوں
شکست پائے رنگیں کا گلا کیا ؟

کم نہیں تازش ہم ناسی چشمِ خوبان
تیرا بھار برا گیا ہے ، گر اچھا نہ ہوا

ہے نلو کرم تھنہ ہے شرم نارساقی کا
ہے خون غلیظہ صد رنگ دعویٰ پارساقی کا

وہی اک بات ہے جو پاں نفس، واں لکھت کل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں لوائی کا
تہ دے ناسے کو اتنا طول، غالب مختصر لکھ دے
کہ حسرت منج ہوں عرض منہ پائے جدائی کا

باغ میں بھ کو نہ لے جا ، ورنہ میرے حال پر
ہر گل تر ایک چنم خونِ فشاں ہو جائے گا

ربط یک شیرازہ وحشت ہیں اجزائے بہار
میزہ یکانہ ، صبا آوارہ ، کل نا آشنا

عاقلی ، بہ وہم تاز خود آرا ہے ، ورنہ بان
ہے شانہ صبا نہیں ، طرہ گیام کا

بضے ہے جلوہ گل ، ذوقِ نمائشا غالب
چنم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

ثابت ہوا ہے گردن مہنا بہ خونِ خدای
لوزے ہے ، موج سے تری رفتار دیکھ کر

حفلیں ہر دم کرے ہے گنجفہ باز خیال
ہیں ورق گردانی' بیرنگ ہنک بت خانہ ہم

لے گئی ساق کی غنوت ، قلم آشناسی مری
موج مے کی آج رگہ سینا کی گردن میں نہیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آواہیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق تسمیاں ہو گئیں

یہ کس ہشت شائل کی آمد آمد ہے ؟
کہ غیر جلوۂ گل رہگذر میں خاک نہیں

جب وہ جال دل فروز ، صورت مہر نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوزہ پردے میرستہ چھپائے کیوں

ہوش طرز دلیری کیجیے کیا ؟ کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

چشم خویاں خامشی میں بھی فوا پرواز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دود شعلہ' آواز ہے

ڈھونڈے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا جھمے

جلوۂ زار آتش دوزخ ہمارا دل میں
لحمہ شور قیامت کس کی آب و گل میں ہے

دیکھو تو دل لریں' انداز نقش ہا
موج خرام بار بھی کیا گل کٹر گئی

دل ہوائے خرام ناز ہے بھر
عشرتان ہے قراری ہے

ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی
مضطرب بہ نغمہ ریزن تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط
داسان باغبان و کف گل فروش ہے
لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گشوی ہے

مانگے ہے بھر کسی کو لب بام بر ہوس
زلف سیاہ رخ بہ پریشانی کیے ہوئے
چاہے ہے بھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنہ مرکان کیے ہوئے
اک نو بہار ناز کو تاکے ہے بھر نگاہ
چہرہ قدروغ سے سے گلستاں کیے ہوئے

یہ حقیقت ہے کہ غالب کی شاعری میں ابہام کا رنگ خاصا گہرا ہے ۔
لیکن اس کا سبب صرف ان کی مشکل پسندی نہیں ہے ۔ یہ رنگ تو ان کے
نچرے کی تہہ در تہہ کیفیت کو ظاہر کرتا ہے ۔ اس میں تو ان کے فکر کی
گہرائی اپنے آپ کو رونما کرتی ہے ۔ بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا ہے کہ
بیدل کے اثر سے انہوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ایسے انعار
زیادہ کیے ، جن میں ابہام کا پہلو نمایاں ہے ۔ اس میں کسی حد تک صداقت
ضرور ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غالب نے ابہام کو پیدا کرنے
میں صرف تقلید سے کام لیا ہے ۔ دراصل یہ ان کا مزاج ہے اور اس کا منبع
ان کے احساس کی شدت ، جذبے کی پریچ کیفیت ، ان کے شعور کی گہرائی
اور فکر کی بلند پروازی ہے ۔ بیدل کا اثر اس حد تک تو اس میں ہے
کہ اس کی انسان دوستی کے نظریے سے متاثر ہو کر وہ انسان کی عظمت
اور کائنات میں اس کی حیثیت پر غور و فکر کرنے لگے ہیں اور جب انہوں
نے اس کا شاعرانہ اظہار کیا ہے تو ان کے یہاں ابہام کی خصوصیت نمایاں
ہو گئی ہے ۔ کیوں کہ اس ابہام کو انہوں نے اپنے حدود میں رکھا ہے ۔
اس کی حدیں اشاریت سے ملی ہوئی ہیں اور ان کا یہ ابہام درحقیقت
اشاریت ہی کا دوسرا روپ ہے ۔ غالب چونکہ بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں ۔

اس لیے انہوں نے اپنی باتیں اشاروں کتابوں میں کہی ہیں اور اس طرح بہت کم کہہ کر بہت کچھ مراد لیا ہے۔ انہوں نے مشاہدہ حق کی گفتگو بادہ و ساغر میں اور ناز و غمزہ کی گفتگو دشتہ و خنجر میں کی ہے اور اس انداز نے ان کی شاعری میں حسن و جلال کا ایک نیا عالم پیدا کر دیا ہے۔ یہ اشعار ان کے اس میلان فن کی صحیح نمائندگی کرتے ہیں :

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ ، والے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشتہ و خنجر کہے بغیر

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زہر ہا
سوئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زہیر کا

غنچہ بھر لکا کھائے ، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دھکھا ، کم کیا ہوا پایا

دل تا جگر کے ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہگذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

دل گزرگاہ خیال سے و ساغر ہی سمی
گر نفس جادۂ سر منزل تقویٰ نہ ہوا

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے
بد وقت ہے شکستن گل ہائے ناز کا

رگ سنگ سے ٹپکتا ، وہ لہو کہ پھر نہ تھکتا
جیسے خم مسجد رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

وہی اک بات ہے جو ہاں نفس ، واں نکبت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

جٹائے پائے خزان ہے ہزار اگر ہے ہیں
دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
بہر ترا وقت سفر یاد آیا

غافل بہ وہم تاز خود آرا ہے ورنہ پاں
بے شانہ صبا نہیں طسره گیہ کا

بخشنے ہے جلوہ گل ، ذوق بھاشا غالب !
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

ہوں گرفتار الفت سیاد
ورنہ باقی ہے طاقت پرواز

عاشقی صبر طلب اور بھنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں ؟ خون جگر ہونے تک

ہک نظر ایش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

خزان کیا ، فصل گل کہتے ہیں کس کو ، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں ، نفس ہے اور ماتم ہال و ہر کا ہے

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر ، سو خاموش ہے

غیر لیں محفل میں اوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب ہیقام کے

ہے سوجزن اک قلم خون دیکھیے کیا ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوت چمن و غویں ادا کچھ

مدعا ہو بھاشائے شکست دل ہے
آئینہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے

غالب علامتوں اور اشاروں کے شاعر ہیں۔ انہوں نے روایتی علامتوں اور اشاروں سے بڑا کام لیا ہے۔ اور ان کو استعمال کر کے اپنی شاعری میں بڑی مبالغہ سے فضا پیدا کی ہے۔ انہوں نے گل، بلب، قفس، آشیانہ، صیاد، گلچیں، شمع، پروانہ، محفل، مجلس، صحرا، جنوں، باغیان، گل فروش اور اس طرح کی بے شمار علامتیں استعمال کی ہیں اور ان کے ذریعے سے اپنے شاعرانہ تجربے کے نشوب و فراز کو واضح کیا ہے، اور اس طرح ان کے چاہ بڑی حسین اور دل آویز سی فضا پیدا ہوئی ہے لیکن انہوں نے اپنے آپ کو صرف انہیں علامتوں اور اشاروں تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ بعض نئی علامتوں اور اشاروں کی داغ بیل بھی ڈالی ہے۔ ان کے چاہ بحر، رات، زنجیر، آگ، دھواں، شعلہ، شرر اور اس قسم کی بے شمار علامتیں ملتی ہیں۔ ان اشاروں اور علامتوں کے ذریعے ان کی معنویت اپنے آپ کو اس طرح ظاہر کرتی ہے کہ اس میں حسن و جمال کی اقدار بھی رونما ہو جاتی ہیں۔ ان کا اثر براہ راست حواس پر ہوتا ہے اور یہ احساس جمال اور ذوق حسن کی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ غالب طرف نگنائے غزل کے شکوہ سنج تھے اور اپنے بیان کے لیے کچھ اور وسعتوں کی تمنا رکھتے تھے۔ یہ وسعتیں ان کے لیے رمزیت اور ایمائیت نے فراہم کیں۔ غالب کی شاعری میں رمز و ایما کی فراوانی نظر آتی ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ غزل کے مزاج سے واقف ہیں اور اس کے جہانباتی پہلو کا صحیح شعور رکھتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے غزل کے رمز و ایما کو بڑے سلیفے سے برتا ہے۔ اس کام میں علامتوں، اشاروں اور تلمیحوں نے ان کی بڑی مدد کی ہے۔ لیکن اس رمزیت اور ایمائیت کو انہوں نے اپنی شاعری میں صرف اس طرح پیدا نہیں کیا ہے بلکہ کہیں ایک مخصوص لمحے نے اس کی تشکیل کی ہے، کہیں ایک مخصوص انداز بیان نے اس کا پہولا تیار کیا ہے، کہیں

بعض خاص تیروں نے اس کی عبارت تعمیر کی ہے اور اس طرح اس رمزیت اور ایمائیت نے ان کی شاعری میں جالیاتی پہلو کو ابھارا ہے ۔

غالب کی شاعری اپنی ایک شگفتہ اور شاداب فضا سے پہچانی جاتی ہے ۔ وہ غزل کے شاعریں اور انہوں نے غزل کی شاعری کے بنیادی مقتضیات کو پورا کیا ہے ۔ غزل کی ایک اہم خصوصیت سوز و گداز بھی ہے ، غالب کے یہاں غزل کا یہ سوز و گداز بھی موجود ہے لیکن اس سوز و گداز کے ساتھ ساتھ انہوں نے انسانی زندگی کے نشاطیہ پہلو کو نمایاں کر کے اپنی شاعری میں بڑی شگفتگی اور شادابی پیدا کی ہے ۔ شوخی اور ظرافت ، طنز اور مزاح نے شگفتگی اور شادابی کے رنگ کو کچھ اور گہرا کر دیا ہے ۔ غالب زندگی کی مسرتوں کے شاعریں اور ان مسرتوں سے متعلق مختلف پہلوؤں کی ترجمانی وہ بڑی خوبی سے کرتے ہیں ۔ اس ترجمانی میں کامیاب اثر ہے کہ ان کی شاعری میں جگہ جگہ رنگ و نور کے فوارے سے چھوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں اور حد نظر تک چاندنی سی چھٹکی ہوئی دکھائی دیتی ہے ۔ غالب ایک رنگین اور ہرکار تہذیب کے علم بردار ہیں ۔ وہ اس تہذیب کی جالیاتی اقدار کا گہرا شعور رکھتے ہیں ۔ انہیں ان اقدار کے ساتھ ایک جذباتی وابستگی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس تہذیب کی تمام رنگینی اور ہرکاری سمٹ کر ان کی شاعری میں آ گئی ہے ۔ اس تہذیب کی جالیاتی اقدار کا عکس ان کی شاعری کے آئینے میں دکھائی دیتا ہے ۔ غالب کے مزاج میں ایک حساس مزاج بھی موجود تھا ۔ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر دل کھول کر ہنس سکتے تھے ۔ انہیں ناسازگار حالات کا مذاق اڑانا بھی آتا تھا ۔ اسی لیے ان کے یہاں رونے اور منہ بسورنے کے بجائے مسکرائے اور ہنسنے کی فضا خاصی نمایاں نظر آتی ہے اور اس فضا نے بھی ان کی شاعری میں شگفتگی اور شادابی کے رنگ کو نمایاں کیا ہے ۔ غالب اس فضا کے بڑے ہی چابک دست مصور ہیں ۔

غالب
کی
تصویر کاری

انیسویں صدی میں ہندوستانی مسلمانوں کی ثقافتی روایت نے جو صورت اختیار کی تھی ، غالب کی شخصیت اس کی صحیح آئینہ داری کرتی ہے ۔ اس ثقافتی روایت میں باوجود اضطراب و زوال کے ، وہ جو ایک جولانی اور تابانی تھی ، اس کے اثرات غالب کی شخصیت میں بھی نظر آتے ہیں ۔ غالب کے یہاں غم کے باوجود زندہ رہنے کی جو خواہش ہے اور روانِ دوان رہنے کی جو آرزو ہے ، وہ اسی ثقافتی روایت کا پرتو ہے۔ اور ان کی اس شخصیت کے اثرات ان کی شاعری میں بھی اپنی جھلک دکھاتے ہیں ۔ بلکہ شاید یہ کہنا بے جا نہیں کہ ان کی ساری شاعری اسی ثقافتی روایت اور اس کے زیر اثر تشکیل پانے والی ان کی شخصیت کی عکاسی کرتی ہے ۔ معنوی اور فنی دونوں اعتبار سے ان کی شاعری اس ثقافتی روایت کی صحیح آئینہ دار ہے ۔ اس زمانے کے خارجی حالات ، داخلی تجربات ، ذہنی واردات اور جذباتی کیفیات۔ ان سب کا مجموعی امتزاج ان کی شاعری میں مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو رونما کرتا ہے ۔

شاعری معنوی اور فنی دونوں اعتبار سے ، جیسا کہ بعض اہم نقادوں نے کہا ہے ، تصویروں اور پیکروں کے مجموعے کا نام ہے ۔ شاعر کا تجربہ تصویروں اور پیکروں سے عبارت ہے ۔ وہ جب ان تہہ در تہہ اور پیچیدہ تجربات کو ظاہر کرتا ہے ، تو اس کا اظہار ان تصویروں اور پیکروں کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ خاص طور پر شاعری کے فنی اور جہالتی پہلو میں تو یہ تصویر کاری اور پیکر گراشی بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا ہر شاعر کے ذاتی تجربات اور اجتماعی احساسات کے ہاتھوں تیار ہوتا ہے ۔

غالب کی شاعری میں جو اسجٹری یا تصویرکاری اور پیکر تراشی ملتی ہے، وہ بھی ان کے ذاتی تجربات اور اجتماعی احساسات کی صحیح آئینہ دار ہے اور اس میں ان کی شخصیت اور ماحول کی ایسی رنگا رنگ تصویریں نظر آتی ہیں، جو حقیقت سے بھرپور ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب زندگی پر انحطاط و زوال کے بادل منڈلا رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ثقافتی زندگی اس زمانے میں اپنے معراج کمال پر پہنچ گئی تھی۔ کئی سو سال میں مغلوں کی تہذیب نے ایک ایسی ثقافتی روایت کو پروان چڑھایا تھا، جس کی اہمیت کا خیال اور عظمت کا احساس، افراد کے مزاجوں کا جزو بن گیا تھا۔ اس انحطاط و زوال کے زمانے میں بھی اس احساس و خیال کے نقوش دھندلے نہیں ہوئے تھے، بلکہ اس عالم میں تو یہ احساس و خیال کچھ زیادہ ہی شدید ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ رنگینی اور رعنائی، جو مغلوں کی تہذیب اور ثقافتی روایت میں بنیادی حیثیت رکھتی تھی، اس کو اس زمانے کے افراد نے اپنے لیے معیار بنا لیا تھا۔ شمشیر و سناں کو اولیت حاصل نہیں رہی تھی۔ طاؤس و رہاب کا خیال زندگی پر سرخوشی بن کر چھا گیا تھا۔ ریش و رنگ کی دلپائیں آباد تھیں۔ رقص و سرور کی بزم آرائیوں نے جنت نگاہ اور فردوس گوش بن جانے کے تمام سامان فراہم کر دیے تھے۔

غالب کی تصویرکاری اور شاعرانہ پیکر تراشی میں بھی اس صورت حال کا اثر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں بزمِ مئے، گردشِ بہانہ، ساغر، عجل رقص و سرود، مہنی آتشِ نفس اور اس قبیل کی جو بے شمار تصویریں ملتی ہیں، اس کی بھرپور بھی صورت حال ہے۔ یہ اشعار زندگی کی اس کیفیت کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں :

دل گزر نگہ خیال سے و ساغر ہی سہی
گر نفسِ جاہدہؔ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا

ہیں پس کہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
پر گوشہؔ بساط ہے سر شیشہ باز کا

نفس موجِ محیطؔ بے خودی ہے
تغافلِ ہائے ساق کا گلا کیا ؟

میں اور بزم سے ہے ، یوں تشنہ کام آؤں !
گر میں نے کی تھی توبہ ، ساقی کو کیا ہوا تھا؟

مے منے کسے ہے طاقت آشوب آگئی؟
کہنچا ہے عجز حوصلہ نے خط ابلاغ کا

شب کہ وہ مجلس فروز خلوت ناموس تھا
رشتہ پر شمع ، خار کسوت فانوس تھا

بر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کھمے بغیر

مخملیں برہم کرے ہے گجندہ باز خیال
ہیں ورق گردانی "نیرنگ یک بت خانہ ہم

ہم سے کھل جاؤ بہ وقت مئے برسنی ، ایک دن
ورنہ ہم چھوڑیں گے ، رکھ کر عذر مستی ، ایک دن
لورس کی پیتے تھے مئے ، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لانے کی پہاری فائدہ مستی ، ایک دن

لے گئی ساقی کی لغوت قلزم آشاسی مری
سوج سے کی آج رگ سینا کی گردن میں نہیں

غالب جھٹی شراب پر اب ابھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روز ابھر و شب ماہتاب میں

جان نزا ہے بادہ ، جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی ، گویا ، رگ جان ہو گئی

یاد نہیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاقی تسیاں ہو گئی

جب سے کدہ چھٹا ، تو ابھر اب کیا چمک کی قید
مسجد ہو ، مدرسہ ہو ، کوئی خستہ گاہ ہو

مے سے غرض نشاط ہے ، کس روسیاء کو
اک گونہ ہے غودی مجھے دن رات چاہیے

وہاں درمے کہہ ، گستاخ ہیں زاہد !
وَنہار نہ ہوتا طرف ان ہے ادبوں کے

میں نے کہا کہ : 'بزم ناز چاہیے مجھ سے نہیں'
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ : 'ہوں؟'

اس بزم میں مجھے نہیں ہتی حیا کسے
بیٹھا رہا ، اگرچہ اشارے ہوا کسے

گرچہ ہے کس کس برائی سے ، ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

یوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سیو کیا ہے ؟

با شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط
دامان باغبان و کف کل فروش ہے
لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ ، وہ فردوس گوش ہے

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوش ہے ، باد ہوائی

کہنے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورثہ
ہے یوں کہ مجھے درد تہہ جام بہت ہے
لہو نلے ہے اس مفتی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

مے پرستاں خم سے منہ سے لگانے ہی رہے
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

ان اشعار میں غالب نے ، ساغر ، جام ، مینا ، خم ، جوش ، پادہ ۔
 گوشہ ، بساط ، محل ، شمع ، فانوس ، دایان باغبان ، کف کل قروش ، مغنی
 آتش نس ، وغیرہ کی جو تصویریں بنائی ہیں اور پیکر تراشے ہیں ، ان کی
 چٹریں ان کی ثقافتی روایت میں دور تک بھٹی ہوئی ہیں ۔ اور یہی وجہ ہے
 کہ ان میں نہ صرف معنوی گہرائی کا پتہ چلتا ہے بلکہ صوری گہرائی کی
 بے وجہ مالوس اور دل سوہ لینے والی فضا نظر آتی ہے ۔

غالب اس فضا کے شہدائی ہی نہیں ہیں ۔ یہ فضا تو ان کے مزاج اور
 شخصیت کا بنیادی جزو ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعرانہ تصویر کاری
 اور پیکر تراشی میں اس کا رنگ اتنا گہرا اور رچا ہوا نظر آتا ہے ۔ اس
 کا ایک سبب تو ، جیسا کہ چلے بھی کہا جا چکا ہے ، یہ ہے کہ غالب
 نے اس تہذیبی اور ثقافتی روایت کی آغوش میں آنکھ کھولی تھی اور اسی کے
 سائے میں ان کی ذہنی ، جذباتی اور جہالبانی نشو و نما ہوئی تھی ۔ دوسرا سبب
 یہ ہے کہ سیاسی اضطباط اور معاشی معاشرتی زوال کے باعث اس تہذیبی اور
 ثقافتی روایت کی اہمیت کا احساس افراد میں شدید سے شدید تر ہو گیا تھا ۔
 غالب کے یہاں بھی یہی صورت حال ملتی ہے ۔ غالب کو چونکہ اس بات
 کا احساس تھا کہ یہ قدریں اضطباط و زوال کی وجہ سے آندھیوں کی زد پر
 ہیں، اس لیے وہ انہیں غیر شعوری طور پر کچھ زیادہ ہی عزیز رکھتے تھے ۔
 یہی وجہ ہے کہ ان کا شاعرانہ تجربہ جب جہالبانی اظہار کی صورت
 اختیار کرتا ہے ، تو اس تہذیبی روایت کا رنگ ان تصویروں اور پیکروں
 میں بہت گہرا ہو جاتا ہے ۔

یہ تہذیبی روایت غالب کو بہت عزیز تھی اور ان کی شخصیت اسی
 سے عبارت تھی ۔ لیکن انہوں نے اس روایت کو مٹے ہوئے بھی دیکھا ہے ۔
 انہیں یہ روایت آندھیوں کی زد پر بھی نظر آتی ہے اور اس کو انہوں نے
 نہ صرف اپنی انفرادی زندگی بلکہ اس وقت کی اجتماعی زندگی کو بھی ایک
 بہت بڑا المیہ تصور کیا ہے ۔ معنوی اعتبار سے دیکھا جائے ، تو انہوں نے
 اس صورت حال پر خون کے آنسو جھائے ہیں اور فنی اعتبار سے اس کیفیت
 کے اظہار کے لیے ایسی تصویریں بنائی ہیں اور اس قسم کے پیکر تراشے ہیں،
 جن میں آگ ، شرر ، شعلہ ، دھواں ، شمع ، برق ، بجلی وغیرہ کے نمایاں پیکر
 نظر آتے ہیں ۔ غالب نے ان سب سے اپنے شاعرانہ اظہار و ابلاغ میں بڑا کام

لیا ہے ۔ ان اشعار میں دیکھیے ، کہ آگ اور اس کے متعلقات نے کیا کیا روپ اختیار کیے ہیں اور کیسی کیسی عجیب تصویریں بنائی ہیں :

اس کہ ہوں غالب ! اسیری میں بھی آتش زیر پا
 ہوئے آتش دیدہ ہے ، حلقہ سری زنجیر کا

آشتکی نے نقش سویدا کیا درست
 ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

دل مرا سوزِ نہاں سے ہے بھابھا جل گیا
 آتش خاموش کی مانند گویا ، جل گیا

ہوئے گل ، نالہ ، دل ، دود چراغ بھفل
 جو تری ازم سے نکلا ، سو پریشاں نکلا

سری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خراں کی
 پیولا برق خرسن کا ہے ، خون گرم دہقان کا

خاموشی میں نہاں ، خون گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
 چراغ مردہ ہوں ، میں بے زباں ، گور غرباں کا

سراپا رہن عشق و لاگزیرِ اُلفت ہستی
 عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

رگ سنگ سے ٹپکتا ، وہ لہو کہ پھر نہ ٹھٹھا
 جیسے غم سمجھ رہے ہو ، یہ اکو شرار ہوتا

بجلی اک کووند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
 بات کرتے کہ میں لب تشعہ تقریر بھی تھا

جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لیے ہوئے
 ہوں شمع گشتہ ، درخور بھفل نہیں رہا

شمع جلتی ہے تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
 شعلہ عشق سبہ ہوش ہوا ، میرے بعد

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر
 چلتا ہوں اپنی طاقت گفتار دیکھ کر
 آتش پرست کہتے ہیں ، اہل جہاں مجھے
 سر گرم قائلہ ہائے شرر یار دیکھ کر

مجھے اب دیکھ کر ابر سفق آلودہ ، یاد آیا
 کہ لوقت میں تری، آتش پرستی تھی گلستاں پر

پک نظر بیش نہیں فرصت ہستی ، غافل !
 کرسی بزم ہے اک رقص شرر ہوئے تنگ
 غم ہستی کا اسد ! کس سے ہو جز مرگ علاج ؟
 شمع ہر رنگ میں جلتی ہے ، سحر ہوئے تنگ

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو، بیش از یک نفس
 برق سے کرتے ہیں روشن ، شمع مانع خاتم ہم

اک شرر دل میں ہے ، اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
 آگ مطلوب ہے ہم کو، جو ہوا کہتے ہیں

رواق ہستی ہے ، عشق حائد ویراں ساز سے
 انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

غالب کچھ اپنی سعی سے لہتا نہیں مجھے
 خرمن جلے ، اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

نفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر بدم !
 گری ہے جس پہ کل بیل ، وہ میرا آشیانہ کیوں ہو ؟

اس شمع کی طرح ہے ، جس کو کوئی بجھا دے
 میں ابھی جلے ہوقن میں ، ہوں داغ نا تمامی

رحم کر ظالم کہ کیا ہوا چراغ کشتہ ہے
 قبض بہار وفا ، دود چراغ کشتہ ہے

سایہ میرا مجھ سے مٹل دود بھاگے ہے اسد !
 پاس مجھ آئیں جہاں کے کس سے لہہرا جائے ہے

جلوہ زار آتش دوزخ ہمارا دل سہی
 لہتہ شور قیامت کس کی آب و گل میں ہے ؟

ظلمت گلے میں سہرے شب غم کا جوش ہے
 اک شمع ہے دلیل سحر ، - و خموش ہے

بھر گرم قالہ پائے شرر ہار ہے نفس
 مدت ہوتی ہے سیر چراغان کیے ہوئے

ظاہر ہے کہ ان اشعار میں آگ ہی آگ ہے ۔ جہاں آگ نہیں ہے وہاں آگ کا کوئی اور روپ ہے ۔ یعنی شعلہ ہے ، شرر ہے ، دھواں ہے ، شمع ہے ، شمع کشتہ ہے ، برق ہے ، بجلی ہے ۔ غرض یہ کہ اس طرح کی بہت سے چیزیں جن سے غالب نے شاعرانہ پیکر تراشے ہیں لیکن ان کی معنویت محدود نہیں ہے ۔ ان کے پردے میں تو غالب نے نہ جانے کیا کیا کچھ کہنے کی کوشش کی ہے ۔ آتش زہر پا ، موئے آتش دیدہ ، دود چراغ محمل ، سوز نہاں ، آتش خاموش ، برق خرمن ، خون گرم دبقاں ، چراغ مرده ، برق ، شرار ، شمع کشتہ ، وغیرہ محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہیں ۔ یہ تو باقاعدہ بنائی ہوئی تصویریں ہیں جن کو غالب کے شاعرانہ تجربے نے تخلیق کیا ہے اور یہ تصویریں زندگی سے بھرپور اور منہ سے بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں کیوں کہ ان میں غالب کے انفرادی اور اجتماعی تجربات کا لہو ہے ۔

یہ تصویریں غالب کی شاعری میں بہت عام ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے زندگی بھر خود اپنے آپ کو اور اپنے آس پاس اور گرد و پیش کی پوری زندگی کو آگ میں جک ہوا دیکھا ہے ۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ایک ایک چلو میں انہیں شعلے سے بھڑکنے نظر آتے ہیں اور ایک ایک گوشے سے دھواں سا اڑتا ہوا دکھائی دیا ہے ۔ اور اس صورت حال نے خود انہیں ایک شمع کشتہ اور چراغ مرده بنا دیا ہے ۔ آگ اور اس کے متعلقات کی تصویروں کے ساتھ ساتھ غالب کی شاعری

میں خون اور خون کی سرخی کی تصویریں بھی نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان تصویروں اور پیکروں کی تخلیق بھی غالب کی مخصوص ذہنی کیفیت نے کی ہے۔ غالب مزاج اور اُفتاد طبع کے اعتبار سے رومانی تھے۔ مثالیت پسندی کا خیال اُن کی گوشتی میں پڑا تھا۔ دنیا کی تمام نعمتوں سے بھی اُن کا مطمئن ہونا ناممکن تھا۔ اُن کی زندگی میں ہزاروں خواہستیں ایسی تھیں کہ ہر خواہش پر اُن کا دم ٹکنا تھا اور بے شمار ارمانوں کے ٹکڑے کے بعد بھی وہ جی سمجھتے تھے کہ اُن کے ارمان کم ٹکڑے ہیں۔ وہ طرہ تھاک اہل دنیا کو دیکھ کر افسردگی کی آرزو کرتے تھے۔ زندگی کا ہر نقش انہیں فریادی نظر آتا تھا اور اُن کی نظریں ہر پیکر تصویر کے پیرہن کو کاغذی دیکھتی تھیں۔ نا آسودگی ایسے شخص کا مقتدر ہوتی ہے اور یہ سب کچھ رومانیت پسندی کا کرشمہ ہے۔ غالب کے مزاج میں اس رومانیت پسندی کا رنگ رہا ہوا تھا اور اس رومانیت پسندی کا یہ نتیجہ ہے کہ انہوں نے انسانی زندگی اور خصوصاً اپنے زمانے کی انسانی زندگی میں خون کے دریاؤں کو موجزن دیکھا ہے۔ خصوصاً اپنے آس پاس اور گرد و پیش کی زندگی تو انہیں سر سے پاؤں تک لہو لہان نظر آتی ہے۔ جی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں بھی خون کی تصویریں اتنی نمایاں ہیں۔ ان اشعار میں اسی صورت حال کی ترجمانی ہے :

دل تا جگر کہ ساحل درہائے خون ہے اب
اس وہ گذر میں جلوۂ گل ، آگے گرد لہا

غنچہ بھر لکا کھانے ، آج ہم نے اپنا دل
خون کیا ہوا دیکھا ، گم کیا ہوا پایا

نہیں معلوم ، کس کس کا لہو ہائی ہوا ہو گا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مڑکوں کا
سری تعبیر میں مضمر ہے اک صورت خراہی کی
پھولولی برق خرمین کا ہے ، خون گرم دہقان کا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ، ورنہ میرے حال پر
ہر گل تر ایک چشم خون فشاں ، ہو جائے گا

درد دل لکھوں کب تک، جاؤں، اُن کو دکھلاؤں
آنکھیاں نکار اپنی، غاسمِ خوں چکاں اپنا

خوں ہے دل خاک میں احوال بتاں ہر، یعنی
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا، میرے بعد

ثابت ہوا ہے گردن مینا یہ خونِ خلی
لرزے ہے موج سے تری رفتار دیکھ کر

ہے خون جگر جوش میں، دل کھول کے روتا
ہوئے جو کئی دہدہ خونناہدِ قشائی اور

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں، اسد
جاتے ہیں سینہ" ہر خون کو زنداں خانہ ہم

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں در فروزاں ہو گئیں

نہ اتنا بشرِ اینج جفا ہر تازِ حرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں، وہ بھی

عمر ہر چند کہ ہے برقِ عِدام
دل کے حوں کرنے کی فرصت ہی نہیں

کارگاہِ ہستی میں، لالہ داغِ سامان ہے
برقِ خرمنِ راحت، خوں گرمِ دہقان ہے

خلشِ شمعزہ خوں ریز نہ ہوچہ
دیکھ خونناہدِ قشائی میری

اچھا ہے مرا نکشتِ حنائی کا نصیور
دل میں نظر آتی تو ہے اک، بوندِ لہو کی

خون ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں ، اے مرگ !
 رہنے دے مجھے یاں کہ الہی کام بہت ہے

بالا سے گر مرزا ہمارے تشنہٴ خون ہے
 رکھوں کچھ اپنی بھی مرکان خون فشاں کے لیے

غالب نے چاں ساحل دریائے خون ، خون کیا ہوا دیکھا ، سر شک
 آلود ہوتا ، خون گرم دھقاں ، چشم خون فشاں ، خامہ خون چکان ، خون غلی ،
 دیدہ خونابہ فشاں ، سینہٴ ہر خون ، جوئے خون ، موج خون ، تشنہٴ خون
 اور مرکان خون فشاں وغیرہ کی جو تصویریں بنائی ہیں ، ان میں خون کا
 رنگ بہت گہرا ہے ۔ ان اشعار میں انہوں نے جو پیکر تراشے ہیں ، ان
 میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بعض خون چکان حقائق کو پیش کیا
 ہے ۔ خون کی ان تصویروں نے ان کے شاعرانہ اظہار و ابلاغ میں شدت
 پیدا کی ہے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کا تاثر نسبتاً گہرا ہوتا ہے ۔ ناسازگار
 حالات کے نتیجے میں غالب نے اپنی انفرادی زندگی اور اپنے زمانے کی
 اجتماعی زندگی، دونوں میں دریائے خون کو موجزن دیکھا ہے ۔ اور اس کے
 ایک ایک پہلو سے انہیں جوئے خون بہتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ یہی وجہ ہے
 کہ خون کا تصور ان کے احساس و شعور میں کچھ اس طرح رس بس گیا
 ہے کہ وہ جب بھی کوئی بات کرتے ہیں تو خون کا پیکر کسی نہ کسی
 روپ میں ان کے سامنے آجاتا ہے ۔ اور زندگی کے مختلف اور متنوع حقائق کے
 اظہار کے لیے اس سے کام لیتے ہیں ۔ غالب نے خون کی تصویروں سے
 شاعرانہ اظہار و ابلاغ میں جو کام لیا ہے ، وہ انہیں کے ساتھ مخصوص ہے
 اور اردو غزل کی روایت میں کہیں اور اس کی یہ صورت نظر نہیں آتی ۔

جہاں تک شاعرانہ فن کاری اور اس میں تصویر کاری اور پیکر تراشی
 کا تعلق ہے ، غالب نے اس میں بڑی حد تک روایت سے بغاوت کی ہے ۔
 اور اس طرح اردو غزل کی روایت کو بعض نئے تجربات سے آشنا کیا ہے ۔
 لیکن وہ اس روایت کو پوری طرح نظر انداز نہیں کر سکے ہیں ۔ انہوں
 نے غزل کی روایتی تصویروں اور پیکروں سے بھی اظہار و ابلاغ میں بڑا
 کام لیا ہے ۔ لیکن انہوں نے اپنے نئے احساس اور نئے شعور سے کام لے کر
 ان روایتی تصویروں اور پیکروں میں نیا خون دوڑا دیا ہے ۔ اور اس طرح

ان میں ایک نئی زندگی پیدا کی ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ ان کا بہت بڑا فنی کارنامہ ہے۔ انہوں نے غزل کے پورے نئی نظام کو اس طرح برتنے کی کوشش کی ہے، جس طرح ان کے ہستروں نے اس کو برتا ہے۔ لیکن ان کے چار غزل کی روایت کا یہ پورا نظام زندگی اور جولانی ہے۔ محسوس نظر آتا ہے۔ اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس میں زندگی کے احساس و شعور کا لہو ہے۔ یہ اشعار اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہیں :

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن ، اسد
سرگشتہ خار رسوم و قہود تھا

شور بند ناصح نے ، زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے ”تم نے کیا مزا پایا ؟“

احباب چارہ سازی و عشق نہ کر سکے
زندانی میں بھی خیال ، یہاں نور تھا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر ، نقاب اس شوخ کے رخ پر کھلا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا ، کوئی غم گسار ہوتا

شوق پر رنگ ، رقیب سر و سامان نکلا
فیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

بغل میں غبر کی ، آپ آج سوئے ہیں کہیں ، ورنہ
سب کہا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

محبت تھی چمن سے ، لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ سوچ ہوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

بقدر طرف ہے ساقی ! خار تشنہ کلی بھی
جو تو دریائے سے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

دو پہ پہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا بھر گیا
 جیسے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا
 گلیوں میں میری نعش کو کھینچے بہرہ و کہ میں
 جاں دادہ ہوائے سر رہ گزار تھا

گرہ چاہے ہے خرابی مرے گلشن کی
 در و دیوار سے ٹپکے ہے یہاں ہونا
 عشرت قتل گم اہل گمنا مت بوجھ
 عہد نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
 مانع وحشت خراسی ہائے لیلیٰ کون ہے ؟
 خانہ جنون صحرا گرد ، ہے دروازہ تھا

حضرت ناصح گر آئیں ، دیدہ و دل فرش واہ
 کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا ؟
 آج وال تیغ و کفن بالندھے ہوئے جاتا ہوں میں
 عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا ؟
 گر کیا ناصح نے ہم کو قہد ، اچھا ایوں سہی
 یہ جنوں عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا ؟
 خانہ زاد زلف ہیں ، زنجیر سے بھاگیں گے کہوں ؟
 ہیں گرفتار وفا ، زندان سے گھبرائیں گے کیا ؟

کوئی میرے دل سے اوجھے ، ترے نیر نیم کش کو
 یہ خلش کہاں سے ہوتی ، جو جگر کے پاؤ ہوتا
 یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح ؟
 کوئی چارہ ساز ہوتا ، کوئی غم گسار ہوتا
 ہوئے مر کے ہم جو رسوا ، ہوئے کیوں نہ غرق دریا
 نہ کبھی جنازہ اٹھتا ، نہ کہیں سزار ہوتا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس ، واں نکبت کل ہے
 چمن کا جلوہ ، باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟
اک نمائشا ہوا ، گلا نہ ہوا

گھر ہارا ، جونہ روئے بھی ، تو ویران ہوتا
بہر اکر بہر نہ ہوتا تو بیابان ہوتا

کدوئی ویرانی سی ویرانی ہے !
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ریشک کہتا ہے کہ 'اُس کا غیر ہے اخلاص حیف'
عقل کہتی ہے کہ 'وہ بے سہر کس کا آشنا'

رہط یک شیرازۂ وحشت ہی اجزائے ہمار
صبرِ نہ ہرکانہ ، صبا آوارہ ، گل نا آشنا

نہ لڑنا صبح سے غالب کیا ہوا مگر اُس نے شدت کی
ہارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

ہوں گرفتارِ اُلفت صیاد
ورنہ باقی ہے طاقت پرواز

مر گیا بھوڑ کے سر غالب وحشی ، ہے ، ہے
بیٹھنا اُس کا وہ آکر تری دہوار کے پاس

آبرو کیا خاک، اُس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں رنگِ پیراہن ، جو دامن میں نہیں

مائع دشتِ نورِ دی کدوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں ، زغیر نہیں

قاصد کے آنے آئے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں ، جو وہ لکھیں گے جواب میں

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی بد کہ پتھر نہیں ہوں میں

وفا کیسی ، کہاں کا عشق ؟ جب سر پھوڑنا لہیرا
تو پھرے سنگدل ! تیرا ہی سنگ آستان کیوں ہو؟
فنس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ، ہدم !
گری تھی جس پہ کل پیلی ، وہ میرا آشیان کیوں ہو؟

مے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجے
لیجے بیٹھا ہے اک ، دو ، چار ، جام واژگون وہ بھی

غزاں کیا؟ فصل گل کہتے ہیں کوکس؟ کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں فنس ہے اور ماتم بال و ہر کا ہے

عشق مجھ کو نہیں ، وحشت ہی مہی
میری وحشت ، تری شہرت ہی مہی

اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوس بال و ہر کئی

اے ساکینان کوچہ دلدار ! دیکھنا
تم کو کہیں جو غالب آشفہ سر ملے

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمد فصل لالہ کاری ہے

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں ، مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے گریباں ، مجھ سے

قد و کسو میں ایس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں ، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

نہیں بہار کو فرصت ، نہ ہو ، بہار تو ہے
طراوت چمن و غریب ہوا کہے

اے عندلیب ! یک کف غس بہر آشیان
طوفان آمد آمد فصل بہار ہے

ان اشعار میں جو تصویریں غالب نے پیش کی ہیں ، وہ غزل اور غزل کی روایت سے تعلق رکھتی ہیں اور ان تصویروں کو کتنی سو سال تک فارسی اور اردو کے شاعروں نے اپنے اظہار و ابلاغ کے لیے استعمال کیا ہے ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ تصویریں دوسرے شعراء کے یہاں کچھ فرسودہ سی نظر آتی ہیں لیکن غالب نے ان تصویروں میں ایک تازگی اور تازہ کاری پیدا کی ہے ۔ اسی لیے ان میں یہ نیا احساس اور نیا شعور جب جالباتی اظہار کا روپ اختیار کرتا ہے تو ان پرانی تصویروں میں بھی نئی زندگی پیدا کر کے انہیں جدت سے ہم کنار کر دیتا ہے ۔ ان اشعار میں لہراد کوہکن ، محنوں صحرا گرد ، لاصح ، رقیب ، محبوب ، کوچہ پار ، یابان ، زلداں ، زنجیر ، تیغ ، کفن ، دار و رسن ، در و دیوار ، عیاد ، گلشن ، دلم ، قفس ، آشیانہ ، بجلی ، بال و پر ، عندلیب ، فصل بہار وغیرہ کی جو تصویریں ہیں ، وہ اس حقیقت کو صاف طور پر واضح کرتی ہیں کہ ان میں ایک جدت اور اچھوتاہن ہے اور وہ ایک نئے احساس اور نئے شعور کی وجہ سے ایک نئی معنویت سے مالا مال ہیں ۔

یہ غالب کے فنی اجتہاد کی ماحری ہے کہ انہوں نے ان سب کو نیا رنگ دیا ہے اور ان کو نئے ساتھوں میں ڈھال دیا ہے ۔

غرض غالب کی شاعرانہ تصویر کشی اور پیکر تراشی اردو غزل کی روایت میں ایک نئی شان سے جلوہ گر نظر آتی ہے ۔ ان کے نئے احساس و شعور اور نئے فکر و خیال نے غزل کی روایتی تصویروں میں نئی زندگی کی لہر دوڑائی ہے اور بعض ایسی تصویریں بھی بنائی ہیں اور ایسے بہکروں کو بھی تراشا ہے ، جو اردو غزل کی روایت میں بالکل اچھوٹے اور نئے ہیں ۔

غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان سب کو غزل کی روایت کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کر دیا ہے کہ ان کے جنسی اور فانیانوس ہونے کا احساس نہیں ہوتا اور اس کا سبب تجربے کی وہ صداقت اور اخلاص مندی ہے ، جو غالب کی شاعری کی جان اور ان کی شاعرانہ فن کاری کا ایمان ہے !

غالب
کے
فنی اضافے

غالب کے فن کی تحلیل اور اس کے مختلف چھاؤں کے تجزیے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے خالقِ جہاں اور ایک بہت بڑے فن کار تھے۔ انہوں نے فن کی اہمیت کو سمجھا تھا اور اس کے بنیادی اصولوں کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ ان اصولوں کو برتنا ان کے ہم عصر نظر تھا۔ چنانچہ انہوں نے ان بنیادی اصولوں کو عملی طور پر بڑے سلیٹے سے برنا ہے۔ وہ فن کی روایت کے ہر سطر تھے، لیکن اس روایت کو تجربے کے ساتھ ہم آہنگ کرنا بھی اُن کے بھی نظر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں روایت اور تجربے کا ایک حسین اور متوازن استراچ ملتا ہے۔ وہ حسن و جمال کے شیدائی تھے اور زندگی اور فن دونوں میں اس حسن کی تلاش و مستجو اُن کے دہن نظر تھی۔ چنانچہ وہ اس حسن و جمال کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہے ہیں اور انہوں نے اس کی تخلیق کو بھی اپنا شعار بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے فن میں حسن و جمال کی ضیق مختلف طریقوں سے ہوتی ہے اور وہ اس میں مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو رونما کرتا ہے۔ وہ ایک تہذیب کی پیداوار ہیں اور اس تہذیب کا جمال ان کے فن میں اپنی تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ بے نقاب نظر آتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ غالب کے مزاج میں بغاوت کے عناصر بوری طرح موجود تھے اور طبیعت اور اقتاد طبع کے اعتبار سے وہ ایک انقلابی تھے۔ اس کی ایک بڑی وجہ ان کی رومانیت اور رومان پسندی بھی تھی۔ ہر رومانی مزاج فن کار اپنے ماضی سے مطمئن نہیں ہوتا۔ خیال سے معایق پیدا کرنا بھی اس کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ وہ تو مستقبل میں حسین

دنیا میں بساتا ہے اور ان دلیاؤں کو اپنے تخیل کے رنگوں سے سجانا ہے ۔ وہ صرف سہانے خواب دیکھنا ہے اور انہیں خوابوں کے سہارے اس کی زندگی بسر ہوتی ہے ۔ غالب نے بھی اپنی رومانیت ہندی کی وجہ سے یہی سب کچھ کیا ہے ۔ وہ کسی چیز سے مطمئن نہیں ہونے خوب سے خوب تر کی تلاش میں انہوں نے زندگی اور فن کے ان گنت صحراؤں کی خاک چھانی ہے ۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انہوں نے ماضی اور حال سے اپنا رشتہ توڑا نہیں ہے ۔ انہوں نے روایت سے بغاوت ضرور کی ہے لیکن وہ روایت کے بعض پہلوؤں کی پرستش میں بھی پیش پیش رہے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ رومانیت اور رومان ہندی کے باوجود، روایت کا رچاؤ اور اس کی رنگینی ان کے فن میں اپنی تمام تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے ۔ غالب کے فن کا یہ بڑا کمال ہے کہ اس میں روایت کے اثرات صحت ہندی کے ساتھ اپنے آپ کو روپما کرتے ہیں ۔

روایت کے اثرات میں جو چیز سب سے زیادہ ان کے چہان نمایاں نظر آتی ہے ، وہ فارسی شاعری کی روایت اور خاص طور پر اس روایت کے ان علم برداروں کے اثرات ہیں ، جن کی شاعری نے خود اس روایت کو رنگین اور پرکار بنانے میں نمایاں حصہ لیا ہے ۔ پیدل ، عرفی ، نظیری اور ظہوری کے اثرات ان کے فن میں بہت نمایاں ہیں ۔ ان شاعروں نے فارسی شاعری کی روایت کو جس رنگینی اور پرکاری سے آشنا کیا ہے ، وہ مجموعی طور پر سمٹ کر غالب کے فن میں کچھ اس طرح سرایت کر گئی ہے ، جیسے کسی صعب سند اور توانا جسم میں تازہ اور رخشاں لہو دوڑتا ہے ۔ غالب نے فارسی شاعری کی روایت سے رنگینی اور رچاؤ کی خصوصیات حاصل کی ہیں اور انہیں اردو شاعری کی فنی روایت کا جزو بنا دیا ہے ۔ ان سے قبل اردو شاعری میں معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے وہ شگفتگی اور شادابی نہیں تھی ، جو ان کے ہاتھوں پیدا ہوئی ۔ غالب کے فن کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے اردو شاعری کی روایت کو ان خصوصیات سے آشنا کیا ۔

غالب کے فن میں ایک شامیہ رنگ اور طریہ آہنگ بھی خاصا نمایاں نظر آتا ہے ۔ بظاہر تو یہ رنگ و آہنگ ان کی شخصیت اور اقتاد طبع کا ترجمان اور عکاس ہے ، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فارسی شاعری کی روایت کے اثرات بھی ان کے فن میں اس رنگ و آہنگ کو

نمایاں کرنے میں برابر کے شریک ہیں۔ غالب سے قبل اس رنگ و آہنگ کی روایت اردو شاعری میں موجود نہیں تھی۔ البتہ فارسی شاعری میں اس کا ایک سلسلہ ملتا ہے اور خاصی تعداد میں شاعر اس رجحان کے عالم بردار نظر آئے ہیں۔ غالب کا لی اس رجحان سے متاثر ہوا ہے اور اس میں نشاط و طرب کی وہ جو ایک چاندنی سی مسکراتی ہوئی نظر آتی ہے، اس کا سبب فارسی کی یہی روایت ہے، جس کو غالب نے اپنے فن میں کچھ اس طرح داخل کیا ہے کہ اس نے اردو شاعری کی دنیا میں بدل دی ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اردو شاعری کی روایت سے غالب کا کوئی رشتہ نہیں ہے اور یہ کہ صرف فارسی شاعری کی روایت ہی ان پر اثر انداز ہوئی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ غالب نے اردو شاعری کی روایت سے بھی اثر قبول کیا ہے اور یہ اقراں بھی ان کے فن میں اتنے رشتے روپ اختیار کرتے ہوئے نظر آئے ہیں۔ سب سے اہم بات جو اس سلسلے میں نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے فارسی اور اردو کی روایات کے باہمی امتزاج سے ایک تیسری روایت کو پیدا کیا ہے، جو ان کا ایک اہم فنی کارنامہ ہے۔ اس امتزاج نے ان کے فن میں نشاط اور العید رنگ کی دھوپ جھاڑی کو جنم دیا ہے۔ غالب نے ان دونوں کو اس طرح ہم آہنگ کرنے کی کلاب کوشش کی ہے کہ ان کے فن میں سماء و عینم ایک دوسرے سے گلے ملنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غالب کے فن میں روایت کے اثر سے شوخی کا چلو بھی نمایاں ہوا ہے۔ یہ شوخی ظاہر ہے کہ صرف غزل کے مزاج کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی، لیکن غالب کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس شوخی کو اور اس شوخی کے اثر سے پیدا ہونے والے ایک مزاحیہ اور طنزیہ انداز کو غزل کے مزاج میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کو غزل کے مزاج کا جزو بنا دیا ہے۔ اس شوخی اور طنز و مزاح کے عناصر، غزل کی روایت میں شیخ، واعظ اور زاہد کے بیان میں تو ملتے تھے لیکن حسن و عشق اور عاشق و معشوق کے معاملات کے بیان میں یہ رنگ ذرا مشکل ہی سے نظر آتا تھا۔ غالب پہلے شاعر ہیں، جنہوں نے ان معاملات کے بیان میں بھی اس رنگ کو پیدا کر دکھایا۔ وہ اس طرح کہ غزل کی روایت میں عاشق اور معشوق کے معاملات سے متعلق ایسے مضامین، جو لرسودہ ہو چکے تھے اور مضحکہ خیز معلوم ہوئے تھے، غالب نے ان کو اپنی غزل میں جگہ تو دی لیکن

اس طرح جسے وہ ان کا خاکہ اڑا رہے ہیں۔ غالب کے اس انداز سے جو شاعری پیدا ہوئی ہے، وہ یہ ذات خود بھی اہم ہے۔ کیونکہ اس میں بڑی شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس انداز سے غزل کی روایت کو ایک نیا میدان ملا ہے اور اس میدان میں اس کو ایک اہم صنف سخن کی حیثیت سے اپنے جوہر دکھانے کے مواقع نصیب ہوئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ غالب کے بعد آنے والے غزل کے فن کار غالب کے اس انداز فن کو پوری طرح برتنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ لیکن غالب نے انہیں وہ راستے ضرور دکھا دیے ہیں، جن پر چل کر غزل کی صنف اپنے آپ کو فنی اعتبار سے نئی وسعتوں سے ہم کنار کر سکتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ غالب نے روایت سے بہت استفادہ کیا ہے۔ اور اس کے اثر سے اپنے فن میں نہ صرف رنگینی اور رچاؤ کی خصوصیات پیدا کی ہیں بلکہ بعض ایسے پہلو بھی اس میں نمایاں ہو گئے ہیں، جن کی وجہ سے نہ صرف غالب کے فن میں بلکہ خود صنف غزل کے فن میں ایک نئے رنگ و آہنگ نے اپنی جگہ بنا لی ہے۔ لیکن غالب اس روایت کے پرستار نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے فن کو اس روایت کی لکیر کا بغیر نہیں بنایا ہے۔ وہ تو اس روایت کے بندھنوں کو توڑ کر اس کے حدود سے باہر بھی نکلے ہیں اور انہوں نے اپنے فن کو بعض نئے تجربات سے بھی آشنا کیا ہے۔ ان تجربات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں آوازن ہے اور ان کی جڑیں روایت کی زبیں میں پوری طرح پھوست ہیں۔ تجربہ جب روایت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے، اسی وقت فن کی دنیا میں اُسے حیات جاوداں ملتی ہے۔ غالب نے اپنے تجربے کو روایت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ کیا ہے۔ اسی لیے اس کے فن میں اس کی ایک مستقل حریت نظر آتی ہے۔

بات یہ ہے کہ غالب نے اپنے فن میں تجربے کے یہ چراغ صرف تجربے ہی کی خاطر روشن نہیں کیے، ان کے پیچھے تو ان کے نئے احساسات اور نئے شعور کا ہاتھ ہے اور ان نئے احساسات و شعور کی وجہ سے ان کے یہاں موضوعات و مضامین پیدا ہوئے ہیں، جن کے اظہار و ابلاغ کے لیے انہیں ان تجربات سے کام لینا پڑا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان تجربات میں اختراع کا رنگ نظر نہیں آتا اور صرف صناعت کی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اپنی ایک بنیاد رکھتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کو شاعر کے خیال،

مواد اور موضوع اور اس کے صحیح جہانی اظہار کے شعور نے پیدا کیا ہے۔ غالب نے بدلتے ہوئے حالات، نئے افکار و خیالات اور نئے جہانی تصورات سے ان تجربات کا خمیر اُٹایا ہے۔ اسی لیے ان کے ہاں ایک استواری نظر آتی ہے اور ایک سوانست کا احساس ہوتا ہے۔

غالب کے ان تجربات کی جھلک سب سے پہلے تو ان کی شاعری کے وزن و آہنگ میں دکھائی دیتی ہے۔ غالب نے اپنے موضوعات کی مناسبت سے وزن و آہنگ کو استعمال کیا اور ان میں ایک مکمل ہم آہنگی پیدا کی۔ ان کی شاعری میں بہروں کا انتخاب، بعض خاص زمینوں کا استعمال، الفاظ کی مخصوص در و بست، ترکیبوں کی تراش ان سب میں قربانی مزاج اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ غالب نے یہ سب کچھ اپنے موضوع کے اظہار و ابلاغ کے لیے کیا ہے۔ غالب نے اپنے وزن و آہنگ میں جو شگفتگی، شادابی اور بلند آہنگی پیدا کی، اپنی شاعری کو جس قسم کی اور موسیقیت سے روشناس کیا ہے، اس کی مثال اردو شاعری میں ان سے قبل نہیں ملتی۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے فن میں ترنم کے چشمے سے پھوٹ رہے ہیں اور لقموں کے دریا سے سوجزن ہیں۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں اس صورت حال کو پیدا کر کے، اس تجربے کے صوتی آہنگ کو سامنے لا کر کھڑا کر دیتے ہیں، جس کی گہرائی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے موضوع کی مکمل تصویر، مع ایک وسیع پس منظر کے، آنکھوں کے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

وزن و آہنگ کے اس نئے تجربے کے ساتھ ساتھ، غالب نے اپنے فن میں علامتوں اور اشاروں کے استعمال کا بھی ایک اہم تجربہ کیا ہے۔ علامتوں اور اشاروں کا استعمال تو غالب سے قبل بھی اردو شاعری کی روایت میں عام تھا۔ خصوصیت کے ساتھ غزل کے فن میں اس کی ایک روایت موجود تھی لیکن غالب نے اس روایت کو کچھ اور بھی استوار کیا۔ انہوں نے غزل کی روایتی علامتوں اور اشاروں میں نیا خون زندگی دوڑایا اور اپنے وسیع اور ہمہ گیر موضوعات کو ان کے ذریعے سے ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح یہ روایتی علامات و اشارات نئی معنویت سے آشنا ہوئے اور ان کے دامن میں نئی وسعتیں پیدا ہوئیں۔ لیکن غالب اپنے

موضوعات کی گہرائی اور گیرائی کے پیش نظر اپنے اظہار و ابلاغ کو صرف ان علامتوں اور اشاروں ہی تک محدود نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں تو اپنے اظہار و ابلاغ کے لیے کچھ نئے اشاروں اور علامتوں کی ضرورت بھی تھی۔ چنانچہ انہوں نے نئی علامتوں اور اشاروں کو تخلیق بھی کیا۔ لیکن اس میں بھی ان کی متاعی اور ایجاد پسندی کو دخل نہیں تھا۔ اس کا منبع بھی ان کے موضوعات کا اظہار و ابلاغ اور اس اظہار و ابلاغ کا جاہلیاتی احساس و شعور تھا۔ اسی احساس و شعور کے زیر اثر، انہوں نے بعض ایسی علامتوں سے کام لیا، جو ان کی جذباتی اور ذہنی کیفیت کے ساتھ مناسبت رکھتی تھیں۔ غالب زمانے کے رُغمِ غورده تھے۔ ان کی زندگی میں باوجود شگفتگی اور شادابی، تیزی اور تندہی، جولانی اور طراری کے ایک سنگینے والی کیفیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس صورتِ حالات کی مناسبت سے خون، آگ، دھواں اور شر وغیرہ کے نئے اشاروں اور علامتوں سے کام لیا اور ان کے ذریعے سے اپنے فن میں اظہار و ابلاغ کا ایک نیا عالم پیدا کیا۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اپنی اس ذہنی کیفیت کے باوجود وہ زندگی سے مایوس نہیں تھے۔ ان کی نگاہیں تو ایک نئی دنیا کے پیدا ہونے کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ چنانچہ اس صورتِ حال نے انہیں سحر، زنجیر، خواب، بیداری، ستارے، ماہتاب اور اسی طرح کے بہت سے اشاروں اور علامتوں کی تخلیق کی طرف راغب کیا اور ان علامتوں اور اشاروں میں ایسا جادو تھا کہ غالب کے بعد اردو شاعری میں ان کے استعمال کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور موجودہ دور میں جدید سے جدید اردو شاعروں نے ان سے اظہار و ابلاغ کے سلسلے میں بڑے بڑے کام لیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری کی دنیا ہی بدل گئی۔

یہ سب کچھ غالب کا نشی کارنامہ تھا۔ انہوں نے اردو شاعری میں علامت نگاری کو ایک اسلوب کی حیثیت سے مستقل حیثیت دی اور نہ صرف ابلاغ بلکہ جاہلیاتی اظہار کے لیے بھی اس کو اس طرح استعمال کیا کہ اردو شاعری میں اس نے ایک رجحان کی حیثیت اختیار کر لی۔ اور غالب جاہلیاتی اظہار کے لیے اس رجحان کو برتنے اور عام کرنے میں اس وجہ سے کامیاب ہوئے کہ وہ اس کی اہمیت کا گہرا شعور رکھتے تھے اور ان کے خیال میں ناز و غمزہ کی بات دشنہ و غنچہ میں اور مشاہدہ حق کی گفتگو بادۂ و ساغر میں کرنا شاعر کے لیے ناگزیر ہے۔

غالب نے اپنے فن میں رمزیت اور ایمائیت کے ایک نئے انداز کو وجود میں لانے کا تجربہ بھی کیا ہے۔ غالب سے قبل اردو شاعری میں رمز و ایما کی روایت تو موجود تھی لیکن اس میں یہ بانگین نہیں تھا، جو ان کے ہاتھوں پیدا ہوا۔ وہ ہمہ داری کی کیفیت نہیں تھی، جو ان کے ہاتھوں وجود میں آئی۔ غالب نے اپنے فکر کی نسبت سے اس رمز و ایما کو زیادہ ہمہ دار بلکہ کسی حد تک بیچ دار بنا دیا اور اس طرح اس کی حدیں ابھام سے جا ملیں۔ یہ ابھام آج کی شاعری کے لئے ایک اسلوب کی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب نے آج سے سو سال قبل اس ابھام کو ایک اسلوب بنا دیا۔ لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ ابھام کو انھوں نے اپنے حدود میں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ابھام سے زیادہ اس کی لطافت کا احساس ہوتا ہے۔ اور جو ابھام ان کے یہاں نظر آتا ہے، اس کو ایک لطیف ابھام کہنا چاہیے۔ یہ لطیف ابھام اس رمزیت اور ایمائیت ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے، جس کو غالب نے بڑی چابکدستی کے ساتھ اپنے فن میں برتا ہے۔ اس رمزیت، ایمائیت اور لطیف ابھام کی وجہ سے اردو شاعری کو ایک نیا اسلوب ملا۔ یہ اسلوب غالب کے ساتھ مخصوص ہے اور ان کا فن اس اسلوب ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ اس اسلوب نے انھیں اپنے زمانے میں بڑی حد تک اجنبی بنا دیا اور اسی لئے وہ اس زمانے میں عام نہ ہو سکا۔ شاید اس وجہ سے کہ غالب ایک عظیم شاعر اور فن کار کی حیثیت سے اپنے زمانے سے تقریباً سو سال قبل پیدا ہوئے۔ وہ اپنے زمانے میں شاعر فردا تھے۔ انھیں تو موجودہ دور میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ ان کا احساس و شعور اور جہالتی اظہار، موجودہ دور سے مناسبت رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ موجودہ دور میں اس اسلوب نے تقریباً تمام جدید شاعروں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی اور ان کے فن کا عام معیار بھی اسلوب قرار پایا۔ اس اعتبار سے غالب کی حیثیت ایک ایسے پہاڑی سلسلے کی ہے، جس کے دامن میں پرورش پانے والی ہر چیز اس کی مخصوص آب و ہوا سے متاثر ہوتی ہے۔

زبان و بیان کو غالب نے بہ ذات خود ایک فن بنا دیا ہے۔ زبان، اس میں شبہ نہیں، کہ اظہار کا ذریعہ ہے۔ لیکن ایک عظیم شاعر کے ہاتھ میں اس کی حیثیت ایک فن کی ہو جاتی ہے۔ ایک ایسا فن، جو اظہار و ابلاغ کے ساتھ حسن و جمال کے نور کو بکھیرتا ہے اور شاعری میں ایک

چراغوں کی سی کیفیت کو پیدا کر دیتا ہے۔ غالب نے زبان میں ایک اجتہادی شان پیدا کی ہے۔ اس کو رنگین اور ہرکار بنایا ہے۔ اس میں کل ہوئے سے کھلائے ہیں۔ اس میں ایک عجب طرح کی جگمگاہٹ اور تابانی سی پیدا کی ہے۔ اس کو ہرے کی طرح ترانا ہے۔ اس میں نئے رنگ بکھرے ہیں۔ نئے پہلو پیدا کیے ہیں۔ الفاظ کو آہان پر بکھرے ہوئے ستاروں کی طرح یک جا کیا ہے۔ اس میں تزئین و آرائش نہیں ہے، فطرت کا حسن زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حسن کی فطرت اس میں قدم قدم پر اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ غالب نے زبان کی اصلاح نہیں کی ہے لیکن ایک نئی زبان کو پیدا کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی یہ زبان عام لوگوں کی زبان نہیں، اس میں تو ایک ادبی رنگ و آہنگ ہے اور اس کو صحیح معنوں میں شاعری کی زبان کہا جا سکتا ہے۔ غالب سے قبل شاعری کی زبان میں یہ ادبی رنگ و آہنگ کم تھا۔ وہ بولنے کی زبان سے زیادہ قریب تھی۔ فارسی کے اثرات غالب کی پیدا کی ہوئی زبان میں غالب ہیں لیکن ان اثرات کو پیدا کرنے میں ان کی کسی شعوری کوشش کو دخل نہیں تھا۔ فارسی تو ان کے مزاج کا جزو تھی۔ اس کا رنگ تو ان کی شخصیت میں رجا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی کا رنگ و آہنگ ان کی زبان میں اجنبی اور نا مانوس نہیں معلوم ہوتا۔ بر خلاف اس کے وہ تو اس تہذیب کی تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کو سامنے لا کر کھڑا کر دیتا ہے، جس نے غالب کو پیدا کیا تھا اور جس کی رنگینیاں اور رعنائیاں ان سے قبل کئی سو سال تک اس سر زمین پر رنگ بکھرتی رہی تھیں۔

غالب نے اردو شاعری کو ایک ایسی زبان دی، جو صرف رنگین اور ہرکار ہی نہیں تھی۔ اس میں احساس کی شدت، جذبے کی صداقت، شعور کی گہرائی، فکر کی گیرائی اور نظریے کی پختگی کے مکمل اظہار و ابلاغ کی بڑی صلاحیتیں تھیں۔ غالب کی شاعری انہیں تمام عناصر سے عبارت تھی۔ چنانچہ یہی عناصر اس مخصوص زبان کی تخلیق کے محرک ہوئے، جو غالب کا ایک اجتہادی کارنامہ ہے۔ گذشتہ سو سال میں اردو کے ان تمام شاعروں کے جان یہ زبان اپنی جھلک دکھاتی ہے، جن کی شاعری میں احساس کی شدت، جذبے کی صداقت، شعور کی گہرائی، فکر کی گیرائی اور نظریے کی پختگی کا استزاج صحیح چالیلی اظہار کا تقاضا کرتا ہے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو غالب جدید شاعری اور اس کے مختلف نئی رجحانات اور جالباتی میلانات کے پیش رو نظر آتے ہیں اور ان کے قبی اور جالباتی اجتہاد کے اثرات کا رنگ و آہنگ نہ صرف جدید شاعروں کی شاعری ، بلکہ اعلیٰ درجے کے نثر نگاروں کی نثری تخلیقات میں بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے ۔

غرض غالب بڑے ہی پہلو دار فن کار تھے ۔ اردو شاعری میں وہ ایک ادائے خاص سے نکتہ سرا ہوئے اور ان کا فن ہزاروں نکتہ دان کے لیے میلانے عام کا مقام ثابت ہوا ۔ انہوں نے اپنے فن سے جالباتی انداز کی نئی دنیا میں پیدا نہیں کیں ، ان انداز کو موجودہ دور کے مزاج کا جزو بنا دیا ۔ چنانچہ موجودہ زمانے میں غالب کے فن کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ، وہ کسی دوسرے شاعر کے فن کو حاصل نہ ہو سکی ۔ دور جدید میں مختلف خیالات و نظریات اور مختلف اسالیب و انداز بیان رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کو جس طرح غالب کے فن نے متاثر کیا ہے ، شاید کسی دور میں کسی دوسرے فن کار نے اس طرح متاثر کیا ہو ۔

اس لیے شاید یہ کہنا بے جا نہیں کہ اردو شاعری کی روایت میں غالب کے فن کی حیثیت وہی ہے ، جو جغرافیائی اعتبار سے کسی ملک میں ایک سر بہ فلک پہاڑ کی ہوتی ہے ۔

غالب
اور
آن کے خطوط

مغلوں کا دور آخر اگرچہ سیاسی ، ، معاشرتی اور معاشی اعتبار سے انحطاط و زوال کا زمانہ ہے لیکن اس کے باوجود دلی کی سر زمین پر ایک دفعہ پھر اس زمانے میں علم و ادب کی محفلیں جم جاتی ہیں ۔ میر و سودا جس دلی کو ناسازگار حالات کے باعث چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے ، اب اس نے ایک بار پھر غالب ، سومن ، ذوق ، ظفر اور شیفتہ کے نغموں سے اپنی محفلوں میں گرمی پیدا کر لی تھی ۔ علم و ادب کے چرچے بھی نظر آنے لگے ۔ بہت سے پاکستانوں کا ان دنوں دلی میں مجمع تھا ۔ مولانا سید احمد بریلوی ، مولانا اسماعیل شہید ، مولانا فضل حق غیر آبادی ، نواب صدر الدین خان آرزو ، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ اور امام بخش صہبائی وغیرہ نے علم و عمل کی ایک قضا بھی پیدا کر دی تھی ۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے میدانوں میں اس طرح کمال حاصل کیا کہ ہر ایک کی شخصیت میں اجتہادی شان نظر آتی ہے ۔ غالب بھی ان میں سے ایک تھے ۔ انہوں نے نہ صرف اردو شاعری کو نئے انداز سے آشنا کیا بلکہ اردو نثر کو بھی ایک نیا اسلوب دیا ۔ اس اعتبار سے وہ ہماری قلم و نثر دونوں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں ۔

غالب ۸ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو اکبر آباد میں پیدا ہوئے ۔ ان کا نام اسد اللہ بیگ خان اور عرف سرزا نوشہ تھا ۔ نجم الدولہ ، دبیر الملک ، نظام جنگ خطابات تھے ۔ انہوں نے جس خاندان میں آنکھ کھولی ، وہ ایک ترکوں کا مشہور خاندان تھا ۔ اس خاندان کا

ہمیشہ سہ گری تھا اور وہ ہمیشہ سے جی کام کرنے آئے تھے۔ غالب نے خود ایک جگہ اس کا اظہار کیا ہے :

سو پشت سے ہے ہمیشہ آہا سہ گری

کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

لیکن عجب اتفاق ہے کہ غالب سہ گری اختیار نہ کر سکے اور شاعری ان کے لیے ذریعہ عزت بن گئی۔ البتہ سہ گری کی جو بنیادی خصوصیات ہوتی ہیں، وہ ہمیشہ غالب کے دم کے ساتھ رہیں۔

غالب کے دادا، چد شاہ کے زمانے میں ہندوستان آئے اور لاہور میں معین الملک میر منٹو کی ملازمت اختیار کی۔ لاہور سے وہ دلی گئے اور وہاں ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خان کی سرکار میں انہیں ایک معقول ملازمت مل گئی اور بیہانسو کا برگٹہ بطور جاگیر کے عطا ہوا۔ انہیں کی اولاد میں مرزا غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ خان عرف مرزا دولہا تھے۔ مرزا عبداللہ بیگ خان کی شادی خواجہ غلام حسین خان کمیدان کی بیٹی سے ہوئی اور ان کے دو بیٹے ہوئے۔ ایک تو مرزا احمد اللہ خان غالب، جنہوں نے فارسی اور اردو نظم و نثر میں نام پیدا کیا اور دوسرے مرزا یوسف خان، جو جوانی میں دیوانے ہو گئے اور اسی عالم دیوانگی میں ایام غدر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مرزا غالب ابھی کم سن ہی تھے کہ ان کے والد عبداللہ بیگ خان کا انتقال ہو گیا اور ان کے چچا نصر اللہ بیگ خان نے انہیں پالا۔ نصر اللہ بیگ خان مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد میں صوبہ دار تھے، لیکن بعد میں انہوں نے انگریزوں کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ۱۸۰۶ء میں ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ غالب اس وقت نو برس کے تھے۔

چچا کے انتقال کے بعد غالب کی پرورش تنہال میں ہوئی۔ ان کی تنہال خاصی فارغ البال تھی، اس لیے بچپن اور عنوان شباب میں غالب کو جو ماحول ملا، وہ امیرانہ ماحول تھا۔ اس ماحول کی جو خصوصیات ہوتی ہیں، غالب ان سے دو چار ہوئے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کی زندگی کا ابتدائی زمانہ رنگینیوں اور سرمستیوں میں گزرا۔ اس زمانے کے متعلق غالب ایک جگہ خود لکھتے ہیں کہ: ”میں لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور اور عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا۔“ یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ امارت اور ریاست کے ماحول میں اس صورت حال کو پیدا ہونا ہی چاہیے تھا۔

کسی حد تک غالب کی یتمی کو بھی اس میں دخل ہے ۔ ہر حال اس زمانے کے نقوش غالب کی شخصیت پر بڑے گہرے ہیں ۔ زندگی بھر ان کا اثر باقی رہا ہے ۔ بے فکری ، شراب نوشی ، یار باشی ، تمیش پسندی اور خود پرستی کی خصوصیات ان کی شخصیت میں اسی ماحول نے پیدا کی ہیں ۔ غالب کا بچپن اور ہفتواں شباب اگرچہ لہو و لعب اور عیش و عشرت میں گذرا لیکن ان کی تعلیم کسی قدر باقاعدگی کے ساتھ ہوئی ۔ آگرے میں انہوں نے شیخ معظم سے ابتدائی تعلیم حاصل کی ۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ نظیر اکبر آبادی سے بھی انہیں تلمذ حاصل تھا ۔ ملا عبدالصمد سے بھی انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا ۔ ملا عبدالصمد پارسی تھا اور اس کا اصلی نا ہرزد تھا لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد وہ عبدالصمد کے نام سے مشہور ہوا ۔ وہ ۱۸۱۰ع میں سیاحت کی غرض سے آگرے آیا ۔ غالب دو سال اس کے ساتھ رہے اور انہوں نے اس سے بہت کچھ حاصل کیا ۔ اپنے خطوط میں غالب نے اس بات کی کئی جگہ وضاحت کی ہے ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی علمی استعداد خاصی تھی ۔ وہ فارسی زبان سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے اور انہیں فارسی ادب کے مطالعے کا شوق تھا ۔ عربی کی استعداد اگرچہ فارسی کے برابر نہیں تھی لیکن بھر بھی اس کے متعلق خاصی معلومات رکھتے تھے ۔ اس کے علاوہ فلسفہ ، تصوف ، طب ، منطق معانی و بیان سے بھی انہیں دلچسپی تھی ۔

مرزا غالب کی شخصیت میں ان کی شادی شدہ زندگی کو بھی خاصا دخل ہے ۔ ان کی شادی ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ع میں الہی بخش خان معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوئی ۔ اس وقت غالب کی عمر تیرہ سال تھی ۔ غالب نے اس نسبت کے بعد مستقل طور پر دلی میں سکونت اختیار کر لی ۔ دلی میں غالب کو ادب و شعر کا ماحول ملا ۔ نواب الہی بخش خان معروف خود اچھے شاعر تھے ۔ تصوف سے بھی انہیں دلچسپی تھی ۔ غالب پر ان کا اثر ہوا ۔ اس کے علاوہ دلی کے دوران قیام میں وہ مولانا فضل حق خیر آبادی کے زیر اثر بھی آئے ۔ مولانا فضل حق خیر آبادی اپنے زمانے کے مشہور عالم تھے اور شعر و سخن کا بھی نہایت ستھرا ذوق رکھتے تھے ۔ غالب پر ان کی شخصیت کا بھی اثر ہوا ، اور ان تمام اثرات نے مل کر

غالب کو بے راہ روی سے روکا اور ان کی شخصیت میں ایک سنبھلا ہوا انداز پیدا کیا ۔

دلی کے دوران قیام میں مالی مشکلات ہمیشہ غالب کے دم کے ساتھ رہیں ۔ پنشن بند ہوئی اور اس سلسلے میں انہیں کلکتے کا سفر کرنا پڑا ۔ ۱۸۲۲ع میں وہ دلی سے کلکتے روانہ ہوئے اور لکھنؤ میں سال بھر قیام کرنے کے بعد کان پور، بنارس، پٹنہ اور مرشد آباد ہوئے، ہوئے ۱۸۲۸ع میں دلی واپس آئے ۔ جہاں تک پنشن کا تعلق ہے ، کلکتے کے سفر کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا ۔ کیوں کہ انہیں اس معاملے میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی لیکن اس سفر سے ایک قائدہ غالب کو ضرور ہوا وہ یہ کہ الہیں مختلف مقامات کو دیکھنے اور مختلف قسم کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا ، اور اس سے ان کی شخصیت میں وسعت نظر کی خصوصیت پیدا ہوئی ۔

غالب کی مالی حالت جب زیادہ خراب ہوئی تو انہوں نے ملازمت کرنے کی لہائی ۔ ۱۸۳۲ع میں دلی کالج میں تارسی کی مدرسے خاں ہوئی ۔ غالب بھی فنی میں سوار ہو کر اس سلسلے میں پرنسپل سے ملنے گئے ۔ لیکن کوئی ان کی پذیرائی کو نہیں آیا ۔ اس لیے کہ وہ ملازمت کے لیے آئے تھے ۔ مسٹر ٹامسن جو ان دنوں دلی کالج کے پرنسپل تھے ، انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ چونکہ مرزا غالب رسمی ملاقات کے لیے نہیں آئے، بلکہ ملازمت کے لیے آئے ہیں، اس لیے پذیرائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ مرزا غالب نے اس پر یہ کہا کہ : ”خیال تھا ملازمت سے عتزو وقار میں اضافہ ہوگا ۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ جو وقار رہا سہا ہے، اس میں بھی کمی آ جائے گی ۔ اس لیے اس ملازمت کو میرا دور ہی سے سلام ہے ۔“ اور یہ کہہ کر واپس چلے آئے ۔

اس کے بعد مالی مشکلات کا سلسلہ برابر جاری رہا ۔ اسی دوران میں مرزا غالب پر ایک بلائے ناگہانی بھی آئی ۔ یعنی وہ قمار بازی کے الزام میں گرفتار کر لیے گئے اور انہیں کچھ عرصے قید خانے میں رہنا پڑا ۔ جھوٹ کر آئے تو مالی حالت اور بھی خراب ہو گئی ۔ کل ہاشو روپے مہینے کی پنشن میں گیا ہو سکتا تھا ۔

جب یہ مالی مشکلات اتنا کو پہنچ گئیں ، تو غالب کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہ رہا کہ وہ قلعے سے متعلق ہو جائیں ۔ چنانچہ

یہ تعلق انہوں نے پیدا کیا۔ لیکن ابتدا میں مستقل ملازمت اختیار نہیں کی۔ گاہے گاہے قصیدے پڑھ دیتے تھے اور وظیفہ انہیں ملتا تھا۔ ذوق کے انتقال کے بعد وہ بادشاہ کی غزلیں بھی بنانے لگے اور اس طرح باقاعدہ قلمی سے منسلک ہو گئے۔ غدر سے کچھ عرصہ قبل دوبار رام پور سے بھی انہوں نے وابستگی پیدا کر لی تھی۔ اور وہاں سے بھی انہیں وظیفہ ملتا رہا۔ غدر کا ہنگامہ غالب کے سامنے ہوا۔ اس نے سارے نظام کو درہم برہم کر دیا۔ غالب اس زمانے میں اپنے مکان کے اندر مقید رہے۔ اس زمانے میں ان کا قیام بلی مارون کے محلے میں تھا۔ جب ہنگامہ زیادہ بڑھا تو صریف خانی حکیموں کی حفاظت کے لیے مہاراجہ پٹالہ نے کچھ فوجی دستے بھیجا دیے۔ اور ان کی وجہ سے یہ محلہ بچ گیا۔ لیکن غالب کو سب کے ساتھ بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ ان کے بیانی مرزا یوسف کا انتقال بھی انہیں حالات میں ہوا۔ غالب نے غدر کے مفصل حالات اپنی کتاب ’دستبوس‘ میں لکھے ہیں۔

غدر کے بعد غالب کی ہنسن بھی بند کر دی گئی۔ کیونکہ ان پر بھی انگریزوں کو شبہ تھا۔ لیکن ۱۸۵۹ء میں پھر ہنسن جاری کر دی گئی۔ غدر کے بعد دوبار رام پور سے ان کے تعلقات بہت بڑھ گئے اور وہاں ان کی آمد و رفت برابر جاری رہی۔ غالب نے وہاں کچھ عرصہ قیام بھی کیا۔ وظیفہ بھی وہاں سے ملتا رہا۔

غالب کی وفات ۱۸۶۹ء میں ہوئی۔

یہ حالات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ غالب کی زندگی ایک کشمکش کی کہانی ہے۔ زندگی ان کا ساتھ نہ دے سکے لیکن انہوں نے ہمیشہ زندگی کا ساتھ دیا۔ وہ زندگی کے حالات سے خوش نہیں تھے لیکن اسے بسر کرنا جانتے تھے۔ چنانچہ ان کی زندگی کے تمام حالات سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی اور اس کے بدلنے ہوئے حالات سے بڑی حد تک مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان حالات کو سمجھا بھی ہے اور ان کو سمجھ کر برتا بھی ہے۔ وہ زندگی کے گہرے فیضان تھے۔ اس کے ہر پہلو پر ان کی نظر گہرائی کے ساتھ پڑی تھی اور وہ اس میں نئے پہلو نکالتے بھی تھے۔ ان کے مزاج میں گہرائی کے ساتھ جدت پسندی بھی شامل تھی۔ حرکت اور عمل کی خصوصیات بھی ان کی شخصیت میں

خاصی نمایاں تھیں۔ کسی چیز کا نہ ہونا انہیں اداس اور غمگین ضرور کر دیتا تھا لیکن وہ اس کے حاصل کرنے میں تھک کر نہیں بیٹھ جاتے تھے۔ اس کو حاصل کرنے کی دھن میں لگے رہتے تھے۔

غالب نے ایک امیرانہ ماحول میں پرورش پائی۔ اس لیے اس امیرانہ ماحول کی خصوصیات ان کی شخصیت میں بھی اپنی جھلک دکھاتی ہیں۔ اس امیرانہ ماحول کے افراد میں برتری کا احساس تھا، جس کی حدیں خود پرستی سے جا ملتی ہیں۔ یہ احساس خود پرستی غالب کے چاں بھی نظر آتا ہے۔ انحطاط و زوال کے زمانے میں یہ احساس اس طبقے کے افراد میں کچھ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ یا ہوں کہنا چاہیے کہ افراد اس بڑھے ہوئے احساس کی نمائش زیادہ کرتے ہیں۔ غالب کے چاں بھی یہ صورت حال ملتی ہے۔ غالب کو اپنی خاندانی برتری کا گہرا احساس تھا۔ وہ بار بار اس کا اظہار کرتے ہیں لیکن یہ اظہار غالب سے بہت کچھ کراٹا بھی ہے۔ وہ اس کی نمائش ہی نہیں کرتے، اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے عمل بھی کرتے ہیں۔ یہی اس ماحول میں پرورش پانے کا ایک اچھا پلو ہے۔ ورنہ اس ماحول سے انہیں بہت سی ایسی باتیں بھی ملی ہیں، جن کو کسی حال میں بھی مستحسن نہیں کہا جاسکتا۔

امیرانہ ماحول میں پرورش پانے کے باوجود یہ حرکت اور عمل کی خصوصیات، جو غالب کی شخصیت میں ملتی ہیں اور جن کا مظاہرہ برابر ان کی زندگی میں ہوتا رہا ہے، اس میں اس عام فضا کو بھی دخل ہے، جو ان دنوں ہندوستان اور خصوصاً دلی میں مولانا سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد نے پیدا کر دی تھی۔ غالب اس تحریک کے ساتھ نہیں تھے۔ وہ تو مولانا فضل حق خیر آبادی کے ہم مشرب اور ہم نوا تھے، جن کو مولانا سید احمد بریلوی سے نظریاتی اختلاف تھا۔ لیکن غیر شعوری طور پر یہ علم و عمل کی فضا ان پر اثر انداز ہوئی۔ ان کی شخصیت میں حرکت اور عمل کی جو خصوصیت ملتی ہے، وہ اسی اثر کا نتیجہ ہے۔

غالب کا زمانہ اگرچہ انحطاط و زوال کا زمانہ تھا لیکن یہ انحطاط و زوال میر و سودا کے زمانے کے انحطاط و زوال سے مختلف ہے۔ غالب کے زمانے میں انحطاطی کیفیت تھی لیکن الکرہڑوں کے حکمران ہو جانے سے اثرات فوری باقی نہیں رہی تھی۔ اب نسبتاً زیادہ تسلط تھا۔ اس صورت حال

نے اس زمانے کی دلی میں ایک علمی فضا بھی پیدا کر دی تھی۔ بڑے بڑے علماء اور شعراء ان دنوں دلی میں جمع تھے۔ علماء میں شاہ عبدالعزیز، شاہ اسماعیل شہید، مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا فضل حق خیرآبادی نے ایک علمی ماحول پیدا کر دیا تھا۔ مومن، ذوق اور شیفہ وغیرہ نے شعر و ادب کی ایک فضا پیدا کی تھی۔ غالب اس علمی ماحول سے بھی متاثر ہوئے۔ علمی مسائل سے ان کی دلچسپی بڑھی اور مختلف علمی و ادبی مسائل پر گہرائی کے ساتھ غور کرنے کا شعور ان کے یہاں عام ہوا۔ انہوں نے ان معاملات میں اجتہادی شان پیدا کی۔ اجتہاد کے ساتھ جدت اور ایچ تو وجود میں آئی ہی چاہیے۔ چنانچہ غالب کے یہاں جدت اور ایچ اسی صورت حال کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔

علم و عمل کے اس ماحول نے غالب کی شخصیت میں شگفتگی اور جولانی کی خصوصیات کو بھی پیدا کیا ہے۔ اور اسی شگفتگی اور جولانی کا یہ اثر ہے کہ غالب کے یہاں لطیفہ سنجی بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی بات بات میں لطف ملتا ہے۔ غالب فطرتاً ہی بذلہ مسیح اور شگفتہ مزاج تھے۔ ماحول کی اس کیفیت نے اس بذلہ مسیحی اور شگفتہ مزاجی کو کچھ اور بھی لکھارا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی شخصیت میں اس شگفتگی اور جولانی کا رنگ بچا ہوا نظر آتا ہے۔

ادیب اور شاعر کی شخصیت اس کی تخلیقات میں یوری طرح بے نقاب ہوتی ہے۔ غالب پر بھی یہ کلمہ صادق آتا ہے۔ ان کی تصانیف ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہیں۔ ہر جگہ اس شخصیت کی بنیادی خصوصیت کے اثرات ان کی نظم و نثر دونوں میں جھلکتے ہیں۔ نظم میں یہ اثر بالواسطہ طور پر نمایاں ہوتا ہے کیوں کہ غالب نے غزل کی صنف کو اپنایا۔ اور غزل کی صنف میں بات براہ راست نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے ان کی نثر میں ان کی شخصیت براہ راست اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اس شخصیت کے نفوش ان کی نثر میں اس قدر نمایاں ہیں کہ ان کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی کے حالات، ان کے اخلاق و عادات، ان کے افکار و خیالات کو بڑی خوبی سے ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

غالب کی اردو نثر اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ نثر ان خطوط پر مشتمل ہے، جو غالب نے وقتاً فوقتاً اپنے مختلف احباب کو لکھے۔

غالب کی زندگی کا ہر چلو اور ان کے مزاج کی ہر خصوصیت ان خطوط میں موجود ہے۔ جس وجہ سے کہ بعض اعتبار سے یہ خطوط ان کی شاعری کے مقابلے میں بھی بلند مرتبہ ہیں۔ مولانا حالی نے ٹھیک لکھا ہے کہ : ”مرزا کی عام شہرت جس قدر ان کی اردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ، ویسی نظم اردو اور فارسی سے نہیں ہوئی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان خطوط میں غالب چلتے بھرتے ، ہنستے بولتے ، ملتے چلتے ، شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتے ، علمی و ادبی بحثوں میں شریک ہوتے اور زمانے کو دیکھتے اور سمجھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ان خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

خطوط غالب کا پہلا مجموعہ ، ’عود بندی‘ کے نام سے شائع ہوا۔ ان کے اردو خطوط کو جمع کرنے کا خیال سب سے پہلے ممتاز علی خان میرٹھی کو پیدا ہوا۔ چنانچہ انھوں نے چودھری عبدالغفور سرور اور خواجہ غلام محوٹ بے خبر کے توسط سے کچھ خطوط جمع کیے۔ ان کے ساتھ چند تقریظیں بھی جمع کیں اور ان سب کا مجموعہ ’عود بندی‘ کے نام سے مطبع مجتہائی میرٹھ سے ۱۸۶۸ء میں شائع کر دیا۔ مرزا کے خطوط کا دوسرا مجموعہ ’اردو معلّیٰ‘ کے نام سے ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔ یہ ’اردوئے معلّیٰ‘ کا پہلا حصہ تھا۔ ۱۸۶۹ء میں مولانا حالی کی فرمائش پر مطبع مجتہائی سے پہلا اور دوسرا حصہ یک جا کر کے شائع کیا گیا۔ ایک اور مجموعہ ’مکتب غالب‘ کے نام سے امتیاز علی خان صاحب عرشی ناظم کتب خانہ رام پور نے ۱۸۹۷ء میں شائع کیا۔ ’مکتب غالب‘ میں مرزا کے وہ خطوط ہیں، جو انھوں نے والیان رام پور کو لکھے تھے۔ مرزا کے خطوط کا ایک اور مجموعہ ’نادرات غالب‘ کے نام سے ۱۹۰۹ء میں بھی شائع ہوا ہے۔ اس میں آفاق حسین صاحب دہلوی نے وہ خطوط جمع کیے ہیں ، جو غالب نے منشی نبی بخش حنیف اکبر آبادی کے نام لکھے تھے۔ منشی سہیل برشاد کو بھی غالب کے ان تمام خطوط کو پکچا کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ ان کی مرتب کی ہوئی پہلی جلد ’خطوط غالب‘ کے نام سے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے شائع ہوئی۔ دوسری جلد شائع نہ ہو سکی۔

حالی کے خیال کے مطابق : ”مرزا غالب ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ مگر سنہ مذکور میں جب کہ وہ تاریخ نویسی

کی خلعت پر مامور کیے گئے اور بعد تن "سہر نیم روز" کے لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ اس وقت ان کو یہ ضرورت اُردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثریں اور اکثر خطوط، جن میں قوت مستحیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے، نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب ان کی ہمت "سہر نیم روز" کی ترتیب و انشاء میں مصروف تھی، ضرور ہے کہ اس وقت ان کو فارسی زبان میں خط و کتابت کرنی اور وہ بھی اپنی طرز خاص میں، شاق معلوم ہوتی ہوگی۔ اس لیے قیاس کہتا ہے کہ انہوں نے غالباً ۵۷۷ھ کے بعد سے اُردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے ہیں۔ لیکن شیخ محمد اکرام اور مولانا غلام رسول سہر کو اس سے اختلاف ہے۔ اکرام صاحب کا خیال ہے کہ: "غالب کے خطوط کی نسبت عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ سب کے سب بے تکلف دوستانہ خطوط ہیں اور انہیں لکھتے وقت مرزا کو وہ سان گمان نہ تھا کہ کبھی ان کی اشاعت کی نوبت آنے کی۔ اوسپر ۱۸۵۸ء سے پہلے جو خطوط مرزا نے لکھے، ان کے بارے میں تو یہ خیال صحیح ہے لیکن بعد کے خطوط کے بارے میں نہیں۔" اور اس سلسلے میں انہوں نے غالب کے اس خط کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے منشی ہرگوپال فتنہ کو لکھا تھا اور جس میں اس بات کی وضاحت کی تھی کہ: "رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی خد نہ کرو۔ اور اگر تمہاری اسی میں خوشی ہے، تو مجھ سے نہ پوچھو۔ تم کو اختیار ہے۔" اکرام صاحب نے اس خط کی روشنی میں یہ خیال قائم کیا ہے کہ: "اس کے بعد جو رقعات مرزا نے لکھے ہوں گے، ان کی اشاعت کو وہ ضرور ممکن الوقوع سمجھتے ہوں گے۔ اور اس وقت سے پہلے اور بعد کے خطوط میں فرق ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے پہلے کی نسبت بعد میں بہت زیادہ رقعات قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھے۔"

مولانا غلام رسول سہر نے مولانا حالی کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے: "مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں اس لیے کہ اول "سہر نیم روز" کوئی بڑی کتاب نہیں، جس کی ترتیب میں غالب کے بیشتر حصہ صرف ہوتا ہوگا۔ یہ کتاب انہوں نے کم از کم دو برس میں مرتب کی۔ موجودہ مطبوعہ صورت میں اس کے کل ۱۱۸ صفحے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ

باعثِ اوسط وہ سال بھر میں زیادہ سے زیادہ پچپن ساٹھ صفحات لکھتے رہے۔ اور یہ غالب جیسے قادرِ الکلام اور مشاق نثر نگار کے لیے کوئی بہت بڑا کام نہیں تھا، جس کی تکمیل کے سلسلے میں انہیں فارسی خط و کتابت ترک کرنی پڑی ہو۔ ہارا خیال یہی ہے کہ غالب ۱۸۵۰ء سے قبل اردو خط و کتابت کر چکے تھے لیکن چونکہ اس زمانے میں اردو نثر کو اہل علم چندان وقع نہیں سمجھتے تھے، اس لیے وہ خط محفوظ نہ رہ سکے۔ بعد میں جیسے جیسے اردو کا رواج بڑھنا گیا اور فارسی کا تداول کم ہوتا گیا، غالب فارسی کے بجائے زیادہ تر اردو میں خط لکھتے رہے۔“

ان میں سے کون سا خیال صحیح ہے، ہمیں اس سے بحث نہیں۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ غالب نے اردو میں خطوط لکھے اور ۱۸۵۰ء کے بعد تو مستقل طور پر اردو خط و کتابت کی۔ لیکن ان خطوط کو چھپوانے کا خیال ان کے دل میں کبھی بھی پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ جن احباب نے ان کو چھاپنے کی کوشش کی، غالب نے انہیں منع کیا۔ منشی شیو نرائن چلے شخص ہیں جنہوں نے غالب کے خطوط شائع کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں ان سے اجازت مانگی۔ اس کے جواب میں غالب نے لکھا :

”اردو خطوط جو آپ چھاپنا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے، کوئی رقمہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم منہال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سختوری کے متانی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ اس کا چھاپنا میرے خلاف طبع ہے۔“

لیکن بعض دوسرے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعد میں وہ ان کو چھپوانے کے لیے تیار ہو گئے تھے اور جب انہیں یقین ہو گیا تھا کہ خطوط شائع ہوں گے تو وہ خطوط دل لگا کر اور قلم منہال کر لکھنے لگے تھے۔ لیکن اس خیال نے ان کے خطوط کو ان خصوصیات سے محروم نہیں رکھا جو انہیں خطوط میں پائی جاتی ہیں۔ یعنی بے تکلفی اور بے باکی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ غالب کی شخصیت میں دو رنگ نہیں تھی۔ ان کی شخصیت میں ایک خلوص تھا۔ ایک صداقت تھی، ایک بے تکلفی تھی، ایک بے باکی تھی، ایک برجستگی تھی۔ چنانچہ یہ خصوصیات ان خطوط میں بھی پائی جاتی ہیں، جو انہیں ضرور تھے۔ لیکن جن کو لکھتے وقت یہ خیال ان کے پیش نظر تھا کہ وہ چھپیں گے ضرور !

غالب کے خطوط کی یہ بنیادی اور سب سے اہم خصوصیت ہے کہ ان میں بے پناہ خلوص اور بے اندازہ صداقت ہے ۔ وہ ایک ایسے انسان کے قلم سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ، جو کسی بات کو چھپا نہیں سکتا تھا ۔ جس میں مبالغہ آرائی نام کو نہیں تھی ۔ تکلف جسے چھو بھی نہیں گیا تھا ۔ تصنع سے جس کو کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ ان خطوط میں ایک مانوس قضا ملتی ہے ، ایک دلکش ماحول نظر آتا ہے اور غالب نے جو باتیں کی ہیں ، وہ کسی نہ کسی نسبت سے ہمیں اپنی باتیں معلوم ہوتی ہیں ۔ جن خیالات کا اظہار کیا ہے ، وہ انہی خیالات نظر آتے ہیں ۔ ماحول کی جو تصویریں بھی پیش کی ہیں ، وہ اپنی تصویریں دکھائی دیتی ہیں ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ غالب جن لوگوں کو خطوط لکھتے ہیں ، ان سے اس درجہ قریب ہو جاتے ہیں اور ان کی شخصیت میں اس درجہ گہل مل جاتے ہیں کہ ان کی یہ بات دلوں کو بہت بھاتی ہے اور ہر شخص ان سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ اس آئینے میں اسے اپنی صورت نظر آنے لگتی ہے ۔

خطوط غالب کے موضوعات متنوع اور مختلف ہیں ۔ ان خطوں میں ان کی شخصیت سے متعلق عام باتیں ، وجود ہیں ۔ ہدائش کے وقت سے لے کر وفات تک کے واقعات کا ان خطوں سے اندازہ ہوتا ہے ۔ بچپن کے حالات ، تعلیم و تربیت ، شادی اور اس کے اثرات ، لعاب اور مشعلیں ، مالی الجھنیں اور پریشانیاں اور پھر اس سلسلے میں دور دراز علاقوں کا سفر ، پنشن اور اس کی ساری تفصیل ، دلی کی حالت ، قید کا واقعہ ، شعر اور اس کے مفصل حالات ، ان تمام موضوعات پر ان خطوط سے روشنی پڑتی ہے ۔ لیکن ان موضوعات کی صرف تفصیل ہی ان خطوط میں درج نہیں ہے ، غالب نے ان سب پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے ذہنی رجحان اور اقتاد طبع کو بھی سامنے رکھا ہے ۔ ہر چیز کے بارے میں وہ ایک صائب رائے رکھتے ہیں اور اسی کا اظہار ان خطوط سے ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی شخصیت اور ان کا نظریہٴ حیات ، ان خطوط میں پوری طرح بے نقاب ہے ۔

غالب کے ان خطوط سے اس زمانے کے سیاسی ، معاشرتی اور معاشی ماحول کی بھی وضاحت ہوتی ہے ۔ انیسویں صدی کی دلی میں لوگ کس طرح رہتے تھے ؟ ان کے آداب اور طور طریقے کیا تھے ؟ ان کی الجھنیں اور پریشانیاں کس قسم کی تھیں ؟ پرانی روایات کے ساتھ ساتھ نئی روایات کا اثر معاشرت

ہر کس طرح چھانے لگا تھا ؟ افراد زندگی کے بارے میں کیا سوچتے تھے ؟ ماحول نے انہیں کس طرح اسیر کر لیا تھا ؟ مختلف طبقوں اور فرقوں کے تعلقات آپس میں کیسے تھے ؟ ان کا نظریہٴ حیات کیا تھا ؟ معاشی بد حالی اخلاق کو کس طرح بگاڑ رہی تھی ؟ — بے عملی نے کس طرح معاشرت میں گھر کر لیا تھا ؟ اسراء اور شرفاء کی زندگی کس طرح وبال جان بن گئی تھی ؟ — لوگ کس طرح ایک دوسرے سے ملتے تھے ؟ درباروں کی حالت کیا تھی ؟ — درباروں نے زندگی کو کس طرح بگاڑا تھا ؟ مغلوں کی کمزوری اور اتکریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے کیا صورت پیدا کی تھی ؟ سیاسی تبدیلیوں نے معاشی، معاشرتی زندگی کو کن واہوں پر لا کر کھڑا کر دیا تھا ؟ کون سے حالات اور افکار و خیالات زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھال رہے تھے ؟ — کون سی علمی، ادبی اور سیاسی تحریکیں تھیں، جن کا اثر زندگی اور معاشرت پر ہو رہا تھا ؟ — کون سے ادبی مباحث تھے ، جن کا ان دنوں چرچا تھا ؟ — شاعرانہ ماحول کی کیا خصوصیات تھیں ؟ — کون کون سے شاعر تھے ، جن کا اثر ماحول قبول کر رہا تھا ؟ — یہ اور اسی طرح کے سیکڑوں معاملات و مسائل ہیں، جن کی صحیح تصویریں، غالب کے یہ خطوط پیش کرتے ہیں ۔

یہ خطوط جس انداز سے لکھے گئے ہیں ، اس کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہے ۔ ان خطوط سے اردو میں خطوط نویسی کا ایک نیا معیار قائم ہوتا ہے اور ایک اچھوتے طرز کی ابتدا ہوتی ہے ۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ : ”مرزا کی اردو خط و کتابت کا طریقہ فالواقع سب سے نرالا ہے ۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط و کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے پوری پوری تقلید ہو سکی ۔“ اور یہ خیال بالکل صحیح ہے ۔ کیوں کہ جس وقت مرزا غالب نے یہ خطوط لکھے ہیں ، اس وقت عام طور پر فارسی میں خطوط لکھے جاتے تھے ۔ اردو بولنے کا رواج عام تھا لیکن لکھنے کی زبان فارسی تھی ۔ فارسی میں جو خطوط لکھے جاتے تھے ، وہ ”رقعات بیدل“ اور ”انشائے مادھو رام“ کو معیار بنا کر لکھے جاتے تھے ۔ اس لیے فارسی خطوط نویسی میں کسی نمایاں تبدیلی کی توقع کم تھی ۔ مرزا نے نہ صرف فارسی میں خطوط لکھنے کی روایت کو توڑا ، بلکہ اردو خطوط کو نئے اور نرالی انداز سے بھی آشنا کیا ۔ غالب کی بڑائی کا راز اسی میں مضمر ہے ۔

غالب کے زمانے میں خطوط نویسی کا جو معیار تھا، اس میں القاب و آداب کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ خط کا ایک اچھا خاصا حصہ، القاب و آداب پر مشتمل ہوتا تھا۔ لیکن یہ بڑے بڑے اور لمبے لمبے القاب و آداب بے مقصد معلوم پڑتے تھے اور ان کو استعمال کرنے کے لیے خاصی عبارت آرائی کرنی پڑتی تھی۔ غالب نے اس کو چھوڑا اور ایک زیادہ نظری اور زیادہ حقیقی طریقہ اختیار کیا۔ بقول حالی : ”انہوں نے القاب و آداب کا ہواہوا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں جس کو مثنویاں نے لوازم نامہ نگاری میں بے قرار دے رکھا تھا مگر درحقیقت فضول اور دور ازکار تھیں اڑا دیں۔ وہ خط کو کبھی میاں، کبھی برخور دار، کبھی بھائی، کبھی سہاراج، کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں۔ اس کے بعد مطلب لکھتے ہیں اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔“ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے خطوط سے یکسر القاب و آداب کو خارج کر دیا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ وہ القاب کبھی کبھی استعمال ضرور کرتے ہیں لیکن وہاں جہاں ان کو استعمال کیے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔

غالب نے ان القاب و آداب کو مرتبے کی مناسبت سے استعمال کیا ہے۔ بلکہ یہی خیال القاب و آداب کے استعمال کرنے کا باعث بنا ہے۔ جب وہ اپنے سے بڑے کو خط لکھتے ہیں تو القاب و آداب ضرور استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً نوابان رام پور کے خطوط کو انہوں نے ہمیشہ ”حضرت ولی نعمت آباء“ رحمت سلامت“ سے شروع کیا ہے اور نواب میر غلام بابا خان کو ”جلیل العناقب عمیم الاحسان“ لکھ کر مخاطب کیا ہے۔ لیکن ویسے ان کا عام انداز یہی ہے کہ بغیر کسی القاب کے خط شروع کر دیتے ہیں۔ بہر حال اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے روایتی القاب و آداب کے استعمال سے احتراز کیا اور جو القاب و آداب استعمال کیے، ان میں کچھ جدتیں پیدا کیں اور اسی وجہ سے ان کے القاب و آداب ہذات خود بھی دلچسپ بن گئے۔

القاب و آداب کو زیادہ اہمیت نہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ غالب خط لکھنے کو بات کرنے کے مترادف سمجھتے تھے۔ چنانچہ کئی جگہ انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں : ”بیر و مرشد! یہ

خط لکھنا نہیں ہے، باتیں کرنی ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا۔“ —ایک اور جگہ اسی خیال کا اظہار اس طرح کیا ہے :
 ”مرزا صاحب ! میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے ہزار قلم بائیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھا لی ہے۔ اتنا تو کہو کہ یہ کیا بات تمہارے جی میں آئی ہے۔“ —اور یہ بات کرنے کا انداز انہوں نے اپنے خطوط میں شعوری طور پر پیدا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خطوط میں بات کرنے کی ایک فضا ملتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مکتوب الہ کے سامنے موجود ہے اور غالب اس کے سامنے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ یہ باتیں کرنے کی فضا غالب کے خطوط کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔

جدت اور ایچ گویا غالب کی گھنٹی میں بڑی تھی۔ اس کا اظہار ان کے خطوط میں جگہ جگہ ہوتا ہے۔ خصوصاً خطوط شروع کرنے میں انہوں نے بڑی جدتوں سے کام لیا ہے۔ ہر خط کے آغاز میں ایک ڈرامائی کیفیت نظر آتی ہے بلکہ جہاں القاب و آداب نہیں ہوتا، اور جہاں وہ براہ راست مکتوب الہ کو مخاطب نہیں کرتے، وہاں یہ خصوصیت کچھ اور بھی نمایاں ہوتی ہے۔ مثلاً یوسف مرزا کے نام ایک خط کو اس طرح شروع کرتے ہیں : ”کوئی ہے ذرا یوسف مرزا کو بلائیو۔ لو صاحب وہ آئے۔ یہاں ! میں نے خط تم کو بھیجا ہے مگر تمہارے ایک سوال کا جواب رہ گیا ہے“ —اسی طرح میر سہدی کو ایک خط میں لکھنا چاہتے ہیں کہ میرن صاحب آئے اور ان سے یہ باتیں ہوئیں۔ اس کو اس طرح شروع کرتے ہیں : ”اے میرن صاحب ! السلام و علیکم۔ حضرت ! آداب، کہو صاحب آج اجازت ہے میر سہدی کے خط کا جواب لکھنے کی ؟ حضور میں کیا منع کرتا ہوں۔ مگر میں انہیں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ پھر آپ کیوں تکلیف کریں۔ نہیں میرن صاحب ! اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت ! وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے کیا خفا ہوں گے۔ بھائی آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو ؟ سبحان اللہ ! اے لو حضرت ! آ۔ خط نہیں لکھے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔

اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ کہو تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میرمہدی کو خط لکھوں۔ کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور پڑھا جاتا تو میں سستا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں اب پنج شبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھتے گا۔ میان! بیشہ ہوش کی خبر لو۔ تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ۔ میں بوڑھا آدمی بھولا آدمی، تمہاری باتوں میں آگیا اور آج تک اسے خط نہ لکھا۔ لاجول ولا قوۃ۔ اور اس تمہید کے بعد جو باتیں لکھنی چاہتے ہیں لکھتے ہیں۔ اس خط کی اصل خوبی اس کے ڈرامائی انداز میں ہے۔ اس ڈرامائی انداز سے غالب کے خطوط بھرے پڑے ہیں۔

غالب کے مزاج میں ہلاکی شوخی اور شگفتگی تھی۔ بات میں بات پیدا کرنا وہ خوب جانتے تھے۔ بلکہ بغیر شوخی اور شگفتگی کے وہ بات کر ہی نہیں سکتے تھے۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ: ”مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری تھی، جسے ستار کے تار میں سر بھرے ہوتے ہیں اور قوت متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاف ہے، اس کو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی، جو قوت پرواز کو طائر کے ساتھ۔“ یہ شوخی اور شگفتگی کی خصوصیات ان کے خطوط میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ لیکن ہر جگہ اس شوخی اور شگفتگی سے کوئی نہ کوئی ٹکٹہ پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح ان کی یہ شوخی اور شگفتگی، ان کے خطوط میں لطیفہ سنجی کی خصوصیت پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن غالب کی بڑائی اس میں ہے کہ اس لطیفہ سنجی میں بھی وہ حفظ مراتب کا خیال رکھتے ہیں اور ان خطوط میں لطیفہ سنجی سے جو مزاج پیدا ہوتا ہے، اس میں بڑی لطافت ہوتی ہے۔ ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے ان کی لڑکی کو جو بچپن میں مرزا کے سامنے آئی تھی اور اب جوان ہو گئی ہے، اس طرح غالب کرتے ہیں:

”کیوں بھئی! اگر ہم کول آئے بھی تو تم کو کھپوں کو دیکھیں گے؟“

کیا تمہارے ملک میں پوتہ بچیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟“

ایک اور دوست کو رمضان کے بارے میں لکھا ہے:

”دعویٰ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں۔ مگر روزے کو چلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا۔ کبھی حلقہ پی لیا۔ کبھی کوئی ٹکڑا

روٹی کا کھانا لیا۔ یہاں کے لوگ عجیب قسم کا فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ چلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ نوروزہ نہیں رکھنا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز اور روزہ چلاتا اور بات ہے۔“

مرزا حاتم علی بیگ سہر کو ایک تعزیتی خط اس انداز میں لکھتے ہیں :

”مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پیشہ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم ساح نسق و فحور نہیں، بہو کھاؤ مزے اڑاؤ۔ مگر یاد رہے کہ بحری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے کسی کے مرے کا غم وہ کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک نشاں؟ کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزادی کا شکر بھلاؤ۔ غم نہ کھاؤ، اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چشماں جان نہ سہی منٹا جان سہی۔ میں جب پشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور حور ملی اقامت جاوداتی ہے۔ اور اسی نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھیرانا ہے اور کلیجہ مند کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی وہیں زمردیں کاغ اور وہیں طوبی کی ایک شاخ۔ چشم بد دور وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لکڑ۔“

ایک اور خط میں اس موضوع پر یوں قلم اٹھاتے ہیں :

”عاشق کی نمود یہ ہے کہ بھنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی۔ تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری۔ بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوتے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ اپنی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں، اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی زخم دوست کھائے ہوئے مغفرت کرے۔“

ان خطوط میں جو شوخی اور شگفتگی ہے، وہ مزاح کو پیدا کرتی ہے، اور لطافت اس مزاح کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ

تفریت نازک موقع پر بھی وہ مزاح کو پیدا کرتے ہیں اور اس لطافت کو برقرار رکھتے ہیں۔ تعزیت کے ایسے نازک موضوع پر خط لکھتے ہوئے بھی انہوں نے اپنے اس مخصوص رنگ کو قائم کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خطوط دنوں میں گور کر لیتے ہیں اور ان کا لطیف انداز ظرافت روح میں بالیدگی پیدا کرتا ہے۔

غالب کے فکر و خیال کی پرواز بہت اونچی تھی۔ وادی خیال کو مستانہ وارڑے کرنا، ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ لیکن وہ زندگی کو بہت قریب سے دیکھتے بھی تھے۔ اس کی گہرائیوں تک پہنچنا اور اصل حقیقت کو معلوم کرنا، ان کی شخصیت کا جزو تھا۔ لیکن مشاہدہ حق کی گفتگو، وہ بادہ و ساغر کے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔ یہ خصوصیت ان کے خطوط میں بھی نمایاں ہے۔ ان میں جگہ جگہ تخیل کی بلند پروازی نظر آتی ہے اور تخیل کی اس بلند پروازی کے سہارے وہ زندگی کے بنیادی حقائق تک پہنچتے ہیں۔ لیکن ان حقائق کو بادہ و ساغر کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ ایسے مقامات پر ان کے خطوط میں حد درجہ شاعرانہ انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اس خط کو دیکھئے جس میں انہوں نے اپنی زندگی کے مد و جذر کو پیش کیا ہے اور خانہ داری کے موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

”ستو! عالم دو ہیں ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔
حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ہے، جو خود فرماتا ہے: ”لن ملک
الیوم“ اور پھر آپ ہی جواب دیتا ہے ”لقد الواعد الفجار۔“ ہر چند
قاعدہ عام یہ ہے کہ آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔
لیکن ہوں بھی ہوا کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا
دینے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روہڑی کے واسطے
بھیجا گیا (یعنی پیدا ہوا) میرے برسرِ حوالات میں رہا۔ ساتویں رجب
۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام جیسی (یعنی نکاح) صادر ہوا۔
ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا۔
اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔
برسوں کے بعد جب جیل خانے سے بھاگا، تین بلادِ شرقیہ میں پھرتا
رہا۔ باہان کار مجھے نہ کہتے تھے پکڑ لائے اور پھر اس مجلس میں بٹھا دیا

جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے ، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں ۔
 ہاؤں بیڑی سے نکار ، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار ، مشقت مقرری اور
 مشکل ہو گئی ۔ طاقت یک فلم زائل ہو گئی ، بے حیا ہوں ۔ سال گزشتہ
 بیڑی کو زاویہ زنداں میں جھوڑا ، مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا ۔
 میراث ، مراد آباد ہوتا ہوا ، رام پور پہنچا ۔ کچھ دن کم دو مہینے
 وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا ۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا ۔
 بھاگوں کیا بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی ۔ حکم رہائی دیکھیے کہ
 کب صادر ہو ؟ ایک ضعیف ما احتال ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ میں
 چھوٹ جاؤں ۔ پھر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی - وائے اپنے گھر کے
 اور کہیں نہیں جاتا ۔ میں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو
 چلا جاؤں گا ۔“

یا پھر یہ خط جس میں اپنے آخری وقت کی حالت کا بیان اور زندگی
 کی بے ثباتی کا تذکرہ ہے :

”ناتوانی زور پر ہے ، بڑھاپے نے لکھا کر دیا ہے ۔ صغ ، کاہل ،
 سستی ، گراں جانی ، رکاب میں ہاؤں ہے ۔ باگ پر ہاتھ ہے ۔ بڑا سفر
 دور و دراز در پٹی ہے ۔ زاد راہ موجود نہیں ۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں
 اگر نا پرسیدہ جٹی دیا تو خیر ۔ اگر باز پرس ہوئی تو سفر مقرر ہے اور
 ہاویہ زاویہ ہے۔“

اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ غالب کے تخیل کی پرواز بہت
 بلند تھی ، اور اس تخیل کی پرواز کے ذریعے ان کے انداز تمثیل نگاری کی
 خصوصیت بھی پیدا ہو جاتی تھی ۔ جیسے کہ ان خطوط میں موجود ہے اور
 یہ کہ وہ زندگی کا شعور رکھتے تھے ۔ زندگی کے بنیادی حقائق پر ان کی
 نظر رہتی تھی ۔ لیکن وہ اس کو بڑے ہی دلکش انداز میں پیش کرتے تھے ۔
 غالب کی زندگی کی تصویر اس بیان سے جب ابھر کر سامنے آتی ہے ، اس کی
 مثال کہیں اور نہیں مل سکتی ۔ غالب کو اس میں کمال حاصل تھا ۔ ان کے
 خطوط میں اکثر جگہ اس خصوصیت کے اثرات جھلکتے ہیں ۔ اور اسی کا
 اثر ہے کہ ان کے خطوط میں ایک رفعت ملتی ہے ۔ ایک گہرائی کا احساس
 ہوتا ہے اور ایک رچی ہوئی کیفیت نظر آتی ہے ۔

اردو نثر کی روایت میں غالب کے خطوط امتیازی حیثیت رکھتے ہیں ۔

ان خطوط نے اردو نثر کو ایک نیا انداز دیا ہے ، اس کو نئی راہیں دکھائی ہیں اور ان راہوں پر اس کو گھڑن بھی کیا ہے ۔

غالب کے زمانے میں اردو نثر کا رواج عام نہیں تھا ۔ عام طور پر لکھنے کی زبان فارسی تھی ۔ اس لیے فارسی نثر کے اثرات ہر طرف جھائے ہوئے تھے ۔ اور جب کبھی کوئی اردو نثر لکھتا بھی تھا ، تو وہ فارسی نثر کی نقل ہوتی تھی ۔ مستحج ، مقفلی اور ہر تکلف عبارت کا رواج عام تھا ۔ اگرچہ فورٹ ولیم کالج نے اردو میں سادہ اور آسان نثر کے اچھے نمونے پیش کیے تھے ، لیکن ابھی تک فارسی کا اثر اتنا گہرا تھا کہ آسان اور سادہ نثر اپنے اثرات کو عام نہیں کر سکتی تھی ۔ فورٹ ولیم کالج نے میر امن دہلوی ، سرشیر علی انصاری ، سید حیدر بخش حیدری ، خلیل علی خان اشک ، سرزا کاظم علی جوان اور بیٹی نازائن جہاں وغیرہ کو پیدا کیا ۔ لیکن ان کے اثرات ابھی تک محدود تھے ۔ بلکہ بعضوں نے تو اس آسان نثر کا مضحکہ اڑانا شروع کر دیا تھا اور ان پر ہیشیاں کستا شروع کر دی تھیں ۔ رجب علی بیگ سروری کی 'فسانہ عجائب' اس کی ایک مثال ہے ۔ غرض یہ کہ غالب سے قبل اردو نثر میں قدانت اور جدت ، تصنع اور سادگی ، تکلف اور سلاست میں ایک کشمکش کا سلسلہ جاری تھا ۔ غالب نے اپنے خطوط لکھ کر سادگی اور سلاست کی تحریک کو سہارا دیا اور اسی کا یہ اثر ہے کہ اردو نثر میں اس تحریک نے ترقی کی ، یہ رجحان عام ہوا اور اس نے ایک مستقل روایت کی صورت اختیار کر لی ۔

خطوط غالب اردو نثر کے بہت اچھے نمونے پیش کرتے ہیں ۔ اس نثر میں سادگی اور سلاست ہے ۔ لیکن اس سادگی اور سلاست کے باوجود وہ ہرکار بھی ہے ، جو غالب کی شخصیت کا حصہ تھی ۔ غالب فارسی زبان کا رچا ہوا مذاق رکھتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی کے اثرات ان کی اردو نثر میں بھی نظر آتے ہیں ۔ لیکن فارسی کے یہ اثرات غالب کی اردو نثر کو بھی بوجھل نہیں بناتے ۔ برخلاف اس کے اس میں ایک رنگین اور ہرکار لفظ کو پیدا کرتے ہیں ۔ اس لفظ میں ایک پانکپن اور طرحداری ملتی ہے ۔ غالب فارسی کی نئی نئی ترکیبیں تراشتے ہیں ۔ لیکن یہ ترکیبیں نامانوس نہیں ہوتیں ۔ ان ترکیبوں میں ایک شان و شکوہ ہوتا ہے ۔ غالب کی نثر میں یہ شان و شکوہ ، یہ پانکپن اور طرحداری موجود ہے ۔ لیکن یہ شعوری

کوشش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ فطری معلوم ہوتا ہے ۔ ان کی نثر میں کہیں کہیں عبارت آرائی کی خصوصیت ملتی ضرور ہے، کیونکہ وہ کہیں کہیں مرصع نثر بھی لکھتے ہیں لیکن یہ خصوصیت موضوع سے ہم آہنگی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے ۔ جہاں وہ شدت کے ساتھ کوئی بات کہنا چاہتے ہیں ، وہاں اس صورت حال کا وجود ہوتا ہے ۔ لیکن غالب کے خطوط میں ایسے موافق کم ہی آتے ہیں ۔ البتہ ان کے غیل کی بلند پروازی ، ان کی نثر میں ایک شاعرانہ انداز کو ضرور پیدا کرتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جگہ جگہ ان کی نثر میں ایسے مقامات آتے ہیں ، جن میں ایسی چونکا دہنے والی کیفیت ہوتی ہے جو اپنی رنگینی اور رعنائی کے باعث دلوں میں اتر جاتے ہیں ۔ غالب کی اردو نثر میں ایسا اسلوب نہیں ملتا جو محنت سے پیدا ہوتا ہے ۔ برخلاف اس کے ایک فطری روائی نظر آتی ہے ۔ ایک فطری ہماؤ کا احساس ہوتا ہے ۔ لیکن اس روائی اور ہماؤ میں ہر شور کیفیت نہیں پائی جاتی ۔ بلکہ ایک نغمگی اور غنائی کیفیت کا احساس ہوتا ہے ۔ اور یہ سب چیزیں مل کر غالب کی اردو نثر کو ایک نئے اسلوب سے آشنا کرتی ہیں ۔ یہ اسلوب غالب ہی کے ساتھ مخصوص ہے ۔ ان سے قبل تو غیر اس کا وجود ہی نہیں تھا لیکن ان کے بعد بھی کوئی اسے اپنا نہ سکا ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی جگہ منفرد ہے ۔

اردو ادب میں غالب کے خطوط کی ایک نمایاں حیثیت ہے ۔ ان سے غالب کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ اس ماحول کے تمام پہلوؤں کی تصویریں نظر آتی ہیں ، جس میں غالب نے پرورش پائی اور جس نے ان کے اسلوب کو پیدا کیا ۔ یہ اسلوب بھی ان خطوں میں اپنے شباب پر نظر آتا ہے ۔

غالب کے خطوط
کی
ادبی اہمیت

غالب ایک عظیم شاعر ہیں نہیں تھے، ایک نثر نگار کی حیثیت سے بھی ان کی عظمت مسلم ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے نثر کی طرف کسی باقاعدگی کے ساتھ توجہ نہیں کی۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا بہت کم وقت اس پر صرف کیا۔ لیکن اس کے باوجود نثر کی جو روایت انہوں نے قائم کی اور جو مخصوص لہجہ اس میں پیدا کیا، وہ اپنی جگہ ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں غالب کی شاعری ہی کی طرح دل کشی اور دل آویزی نظر آتی ہے۔ اور اس دل کشی اور دل آویزی کو پیدا کرنے میں صرف فنی اور جمالیاتی پہلو ہی کا ہاتھ نہیں ہے۔ موضوع اور مواد کا پہلو بھی اس میں برابر کا شریک ہے۔ جیسی طرح ان کی شاعری میں ان پہلوؤں کا ایک حسین اور متوازن امتزاج ملتا ہے، اسی طرح ان کی نثر میں بھی یہ دونوں پہلو ایک دوسرے کے ساتھ کئے ملتے ہوئے نظر آنے ہیں۔ اور یہی صورت حال اس کو دل کش اور دل آویز بناتی ہے۔

اردو نثر میں غالب نے جو سرمایہ چھوڑا ہے، وہ صرف ان کے خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ خطوط بھی کسی منصوبے کے ماتحت نہیں لکھے گئے ہیں اور کوئی واضح ادبی تجربہ بھی ان کی تخلیق کا باعث نہیں بنا ہے۔ وہ تو بھی خطوط ہیں اور ان میں صرف بھی اور ذاتی باتیں دوسروں تک پہنچائی گئی ہیں۔ اس لیے بظاہر ان خطوط میں وہ خصوصیات پیدا نہیں ہو سکتی تھیں، جن کی بدولت نثر میں ایک ادبی اسلوب رونما ہوتا ہے۔ لیکن غالب کی عظیم اور پہلو دار، رنگا رنگ اور ہرکار شخصیت نے

ان نجی خطوط میں ادبی نثر کی وہ شان پیدا کر دی ہے ، جس کی حیثیت اپنی جگہ منفرد ہے۔۔۔۔۔ یہ خطوط اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ ان میں جگہ جگہ ادبی تجربے کی بہت اچھی مثالیں ملتی ہیں۔۔۔۔۔ اور اس تجربے کو غالب کے مخصوص مزاج نے پیدا کیا ہے۔۔۔۔۔ ان کے مزاج کی نمایاں ترین خصوصیت یہ تھی کہ وہ عام زندگی کی معمولی معمولی باتوں کو ادبی تجربے میں ڈھال دیتے تھے ۔ بات یہ ہے کہ غالب کی شخصیت صحیح معنوں میں ایک ادبی شخصیت تھی ۔ اسی لیے ان کا احساس ہمیشہ ایک ادبی تجربے کا روپ اختیار کر لیتا تھا۔۔۔۔۔ اس کے لیے الہیں کوئی کاوش نہیں کرنی پڑتی تھی۔۔۔۔۔ کسی قسم کا منصوبہ نہیں بنانا پڑتا تھا ۔۔۔۔۔ ان کی ذہنی کیفیت ہی کچھ ایسی تھی کہ جو کچھ وہ محسوس کرتے اور سوچتے تھے ، اس کا اظہار کچھ اس طرح ہوتا تھا کہ اس میں ادبی تجربے کے تمام عناصر کی جھلک نظر آنے لگتی تھی۔۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہ خطوط بھی ہونے کے باوجود ایک ادبی رنگ و آہنگ رکھتے ہیں۔۔۔۔۔ غالب کی ادبی شخصیت نے انہیں ادبی تخیل کا اعلیٰ نمونہ بنا دیا ہے ۔

یہ خطوط چونکہ نجی اور ذاتی ہیں اور انہیں اس احساس کے ساتھ نہیں لکھا گیا ہے کہ ان کا شمار ادبی تخلیق کے تحت ہو گا ۔ پڑھنے والے الہیں ادبی تخلیق کے معیاروں کو سامنے رکھ کر دیکھیں گے اور ان سے نثر کی روایت میں کوئی اضافہ ہو گا ، اس لیے ان میں تکلف اور تصنع کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ برخلاف اس کے بڑی بے ساختگی اور برجستگی نظر آتی ہے۔۔۔۔۔ ان میں تو اس حسن کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں ، جو زندگی میں بغیر کسی کوشش اور کاوش کے از خود پیدا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ ظاہر ہے کہ اس حسن میں انسان کی صناعی اور دست کاری شامل نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ بلکہ فطرت کا ہاتھ اسے سنوارتا اور نکھارتا ہے اور زندگی خود اس کی مشاطگی میں پیش پیش رہتی ہے۔۔۔۔۔ غالب کے یہ خطوط ، اسی حسن کی دولت سے مالا مال ہیں۔۔۔۔۔ ان میں بڑی وسعت اور کشادگی ہے ۔ بڑی ہی شکستگی اور شادابی ہے ۔ بڑی ہی سادگی اور صفا ہے ۔ بڑی ہی رنگینی اور ہرکاری ہے۔۔۔۔۔ یہ زندگی سے بھرپور ہیں۔۔۔۔۔ ان میں بڑی جولانی کا احساس ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں صناعی نام کو بھی نہیں ہے ۔۔۔۔۔ ان کی تخلیق میں تو صرف فطرت کا ہاتھ ہے۔۔۔۔۔ یہ صرف خطوں کی

طرح لکھنے گئے ہیں ، لیکن انہوں نے اعلیٰ درجے کی ادبی تخلیق کا روپ اختیار کر لیا ہے — اور اس طرح اردو کی ادبی نثر میں یسٹری پا اٹھانے کا باعث بنے ہیں ۔

ان سے قبل نہ تو اردو میں خطوط ہی لکھے جاتے تھے اور نہ اس میں نثر لکھنے ہی کی کوئی عظیم روایت موجود تھی ۔ غالب کے خطوط سے ایک تو اردو میں خطوط نویسی کے فن کا آغاز ہوا اور دوسرے اردو میں باقاعدہ آسان اور سادہ ادبی نثر لکھنے کی ایک روایت قائم ہوئی — لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں ان تمام پہلوؤں کا نہایت حسین آئینہ نظر آتا ہے ، جو ادبی تخلیق کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں — موضوع اور مواد ، اسلوب اور فن ، دونوں اعتبار سے ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے — ادبی تخلیق مجموعی طور پر الہی دونوں پہلوؤں کے امتزاج کا نام ہے — انہی دونوں سے اس کی تشکیل ہوتی ہے — غالب کے خطوط میں انہی دونوں پہلوؤں نے مل کر ادبی تخلیق کا رنگ و آہنگ پیدا کیا ہے ۔

غالب کے ان خطوں کا سب سے اہم موضوع تو غالب کی رنگا رنگ اور پہلو دار شخصیت کے مختلف گوشوں کی ترجمانی اور عکاسی ہے — ان خطوں میں غالب نہ صرف چلتے پھرتے اور ہنسنے ہلنے نظر آتے ہیں بلکہ جو کچھ انہوں نے محسوس کیا ہے ، جو کچھ ان پر بیٹھا ہے ، جو کچھ وہ سوچتے رہے ہیں ، جن معاملات پر انہوں نے غور کیا ہے ، جو نتائج نکالے ہیں اور جن خیالات و نظریات کی توضیح و تشریح کی ہے ، ان سب کی تفصیل و جزئیات ان خطوں میں موجود ہے — یہ گویا غالب کی انفرادی داخلی زندگی اور ان کے آس پاس کی اجتماعی خارجی زندگی کے نشیب و فراز کے مرقعے ہیں — غالب نے زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو شدت کے ساتھ محسوس کر کے پیش کیا ہے — اس لیے ان میں چلبے کی اخلاص مندی نظر آتی ہے اور ساتھ ہی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنے اور جاننے کا شعور بھی کایر فرما دکھائی دیتا ہے — پھر ان میں اس بات کی وضاحت بھی موجود ہے کہ غالب نے زندگی کے ان پہلوؤں کو کس زاویہ نظر سے دیکھا اور ان پر اس کے کیا اثرات ہوئے — اس کے علاوہ غالب کی جو دلچسپیاں تھیں ، ان کا جو مذاق تھا ، جو معیار انہیں عزیز تھے ، جن

قدروں کی ان کے نزدیک اہمیت تھی ، ان سب کی تفصیل بھی ان غطوں میں جگہ جگہ مل جاتی ہے۔ غالب نے ان غطوں میں اپنا ذکر کیا ہے۔ اپنے عزیزوں ، رشتے داروں اور دوستوں کی زندگیوں کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی ہے۔ اپنے زمانے کی عام سیاسی اور معاشرتی ، معاشی اور اقتصادی اور ثقافتی زندگی کے مختلف معاملات و مسائل کو پیش کیا ہے۔ ان میں انسان اور اس کی جذباتی زندگی کے ان گنت پہلوؤں کی تصویر کشی بھی ہے ۔ اس کی مسرتوں اور شادمانیوں ، محرومیوں اور نا کامیوں کا بیان بھی جگہ جگہ ملتا ہے۔ ایسے ہی مقامات پر ان غطوں میں آفاقیت کا رنگ و آہنگ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ باتیں جو غالب نے صرف اپنے اور اپنے بعض عزیزوں اور دوستوں کے بارے میں کہی ہیں ، ان کا اطلاق تمام انسانوں پر ہو سکتا ہے۔ اسی لیے ان کی یہ باتیں ہر انسان کو اپنی باتیں باتیں معلوم ہوتی ہیں اور وہ اس آئینے میں اپنی ہی صورت دیکھتا ہے ۔

ایک خط غالب نے چودھری عبدالغفور کو لکھا ہے ، جس میں اپنی زندگی کے نشیب و فراز کی وضاحت کی ہے اور اپنی پریشانی اور زبوں حالی کا نقشہ کھینچا ہے لیکن اس میں اس زمانے کی اجتماعی زندگی کی زبوں حالی کی تفصیل نسبتاً زیادہ نمایاں ہوتی ہے ۔ لکھتے ہیں :

میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا ۔ نو برس کا تھا کہ چچا مرا ۔ اس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکاء کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خان دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے ، انہوں نے نہ دیے ، مگر تین سال ۔ اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سال ، میں نے سرکار انگریزی میں یہ عین ظاہر کیا ۔ کول بروک صاحب بہادر رینڈلٹ دہلی اور اسٹرنلنگ صاحب بہادر سکریٹری گورنمنٹ متفق ہوئے ، میرا حق دلانے پر ۔ رینڈلٹ معزول ہوئے ۔ سکریٹری گورنمنٹ ناگام مر گئے ۔ بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپے ماہانہ مقرر کیا ۔ ان کے ولی عہد نے چار سو روپے سال دیے ۔ ولی عہد اس مقرر کے دو برس بعد مر گئے ، واجد علی شاہ کی سرکار سے یہ صلہ مدح گسٹری ، پانچ سو روپے سال مقرر ہوئے ۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ چلے ، یعنی اگرچہ ابھی تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی

رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی، سات برس چھ کو روٹی دے کر ہکڑی۔ ایسے طالع مری کش اور محسن سوز کھان پیدا ہوتے ہیں۔ اب جو میں والی دکن کی طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسط یا تو سر جائے گا یا معزول ہو جائے گا۔ اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور والی شہر چھ کو کچھ نہ دے گا اور لہجائاً اس نے یہ سلوک کیا تو رہاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے پل بھر جائیں گے۔ اے خدا ولد، بندہ پرور! — یہ سب باتیں وقوعی اور واقعی ہیں۔“

ایک اور خط میں یوسف مرزا کو اپنا حال لکھا ہے۔ اس سے بھی

اس زمانے کی عام معاشی افراتفری پر روشنی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں :

”میری جان! خدا تیرا نکمپان — جانتے ہو کہ علی کا بندہ ہوں — اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا — اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ اس کے بعد نہ کہیں سے قرض کی امید ہے اور نہ کوئی چیز رہن و بیع کے قابل ہے۔ اگر رام پور سے کچھ آیا تو خبر، ورنہ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔“

غالب کے بیشتر خطوط کا یہی انداز ہے۔ — بظاہر ان میں انہوں نے

اپنا رونا روپا ہے لیکن ان میں سلطنتوں کے مٹنے کا ذکر بھی ہے۔ شاہان وقت کے معزول ہونے کا بیان بھی ہے۔ جاگیروں کے ختم ہونے کی تفصیل بھی ہے۔ — ان سب باتوں کو پیش کر کے غالب نے درحقیقت اس زمانے کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اس تمام افراتفری اور انتشار کو پیش کیا ہے، جس کے محرک یہ حالات تھے۔ یہ خطوط صرف غالب ہی کا نہیں، اس پورے دور کا مرثیہ ہیں، کیوں کہ اس وقت صرف غالب ہی ان حالات سے دو چار نہیں تھے۔ — ساری زندگی کا یہی حال تھا۔ غالب کے سر سے یہاں جو موج خوں گذرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، وہ ان کے زمانے میں ہر انسان کے سر سے گزر رہی تھی۔ — غرض ان خطوط میں گہرے سماجی شعور کے ساتھ وہ آفاتیت بھی نظر آتی ہے، جس کو ایک انسانی زاویہٴ نظر ہی پیدا کر سکتا ہے۔ غالب انسانی زندگی کے بہت بڑے نباض اور اس کے مختلف پہلوؤں کے بہت بڑے مزاج دان تھے۔ — ان کے پاس

ذہن تھا۔ وہ محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ سوج بھی سکتے تھے۔ اسی لیے ان خطوط میں ایک ذہن بھی ملتا ہے۔ غالب کی بڑی اس میں ہے کہ انہوں نے اس ذہنی اور لکری پہلو کو احساس اور جذبے کے ساتھ کچھ اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ ان میں ادبی موضوع کی شان پیدا ہو گئی ہے۔

یہ خطوط جالیاتی اور فنی اعتبار سے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں نہ صرف خطوط نویسی کے فن کا ایک نیا اور اچھوتا انداز ملتا ہے، بلکہ ادبی نثر کی بھی ان میں ایک نئی صورت شکل نظر آتی ہے۔ یہ خطوط سیدھے سادے انداز میں لکھے گئے ہیں، اسی لیے ان میں ایک اچھوتا فن نظر آتا ہے۔ غالب کے سامنے صرف فارسی خطوط نویسی کی روایت تھی اور اس میں تکلف اور تصنع کا پہلو غالب تھا۔ وہ ہندے لکھے اصولوں کے ماتحت لکھے جاتے تھے۔ ان کے القاب و آداب تک معین تھے۔ خط لکھنے والے کے لیے ان کا توڑنا یا ان حدود سے باہر نکلنا مشکل تھا۔ عبارت آرائی کو اس روایت میں حسن سمجھا جاتا تھا۔ صناعتی کو لوگ اس کا زبور خیال کرتے تھے اور ایک عام تصور یہ تھا کہ اس سے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ غالب نے اس روایت سے بغاوت کی اور سب سے پہلے سیدھے سادے انداز میں خطوط لکھنے کی داغ بیل ڈالی۔ القاب و آداب تک کو انہوں نے غیر یاد کہہ دیا۔ عبارت آرائی ختم کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے خطوط میں سادگی کا حسن پیدا ہو گیا۔ یہ حسن تکلف سے بری ہے اور اس قبائے گل میں گل بوٹا نہیں ہے۔ لیکن اس سادگی کے خیال نے غالب کے احساس و فکر میں آزادی کا احساس پیدا کیا ہے اور ان کے تخیل کو جولانیاں دکھانے کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ اسی لیے ان خطوط میں ایسی گل کاریاں نظر آتی ہیں، جن کو احساس اور تخیل کے مولفم نے بنایا ہے۔ ان میں بڑی شکستگی اور شادابی ہے۔ یہ زندگی سے بھرپور ہیں اور ان میں بڑی ہی رنگینی اور رعنائی کا احساس ہوتا ہے۔ ان میں جگہ جگہ ڈولہائی شان بھی ملتی ہے لیکن یہ ڈولہائی شان صرف مکالمہ نگاری ہی کے ہاتھوں پیدا نہیں ہوئی۔ غالب کا حسیاتی مزاج اس پہلو کو ان خطوط میں پیدا کرتا ہے۔ ویسے مکالمہ نگاری بذات خود ان خطوط کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

اور اس پہلو نے انہیں زندگی سے زیادہ قریب کیا ہے اور ان میں جولانی کی لہر ڈوڑائی ہے۔ غالب نے ان خطوط میں آسان اور سادہ ادبی نثر لکھنے کا ایک اہم اور قابل قدر تجربہ کیا ہے۔ اس نثر میں سادگی اور صفائی ہے۔ روانی اور ہلکاپن ہے۔ اس میں مجموعی طور پر بڑی شکستگی اور شادابی کا احساس ہوتا ہے۔ اس میں سادگی کا حسن بھی ہے اور حسن کی سادگی بھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ رنگین اور پرکار نظر آتی ہے۔ یہ کوشش اور کوش کی پیداوار نہیں ہے۔ اسی لیے اس میں کاریگری کا پہلو نمایاں نہیں ہوتا۔ اس کی تشکیل تو خیال اور موضوع کے پاتھوں ہوتی ہے۔ اسی لیے اس میں فطرت کا حسن نظر آتا ہے۔ اور حسن کی فطرت بھی۔

غالب ایک عظیم ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ یہ خطوط ان کی اسی ادبی شخصیت کا آئینہ ہیں اور ان میں اس شخصیت کے خد و خال اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ، بے نقاب نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی شاعری کی طرح، ان کی ادبی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے اور غالب کو ایک عظیم ادبی شخصیت بنانے میں ان کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

غالب

کا

ایک اہم خط

نامہ غالب

’نامہ‘ غالب‘ اگرچہ غالب کا ایک طویل خط ہے لیکن اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خط غالب نے ۱۸۶۵ء میں مرزا رحیم بیگ کے نام لکھا اور دلی کے مطبع ہندی میں اس کے تین سو نسخے اپنے خرچ پر چھپوا کر احباب کو تقسیم کئے۔ یہ ’نامہ‘ غالب‘ کا پہلا ایڈیشن تھا۔ اس کے آخر میں مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے :

’الحمد لله کم نعيم الدوله ، امد الله خان ، غالب کا خط موسومہ مرزا رحیم بخش صاحب کا مطبع ہندی مرزا خان میں بیچ کنپ دہلی اندرون کوچہ‘ چلہ گذر فیض حد چھائی کے اہتمام عبدالرزاق بیگ سے چھپا ، ۱۸۶۵ء‘۔

اس ایڈیشن میں کل سولہ صفحے تھے۔ اس وقت اس کی اشاعت بھی محدود رہی۔ یہ عام اس وقت ہوا جب ۱۸۶۹ء میں اس کا متن ’اودہ اخبار‘ میں بالالفاظ شائع ہوا۔ پہلی قسط ۱۰ اکتوبر ۱۸۶۹ء کے اخبار میں اور دوسری قسط ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۹ء کے اخبار میں شائع ہوئی۔ بعد میں اس کو ’عود ہندی‘ میں شامل کر لیا گیا اور ’عود ہندی‘ میں شامل ہونے کی وجہ سے لوگ اس کو ایک مستقل تصنیف کی حیثیت سے فراموش کر بیٹھے۔ اس مجموعے میں یہ خط دب کر رہ گیا اور لوگ اس کی اہمیت سے

۱۔ غالب : ’نامہ‘ غالب (پہلا ایڈیشن) : صفحہ ۱۶

۲۔ غلام رسول مہر : خطوط غالب : صفحہ ۶۱۳

بے خبر ہو گئے ۔ حالانکہ جہاں تک اس کے موضوع کا تعلق ہے ، یہ خط اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے غالب کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور ان کے کچھ خیالات و نظریات کی وضاحت بھی ہوتی ہے ۔

دو اصل یہ خط 'برہان قاطع' اور 'قاطع برہان' کے قضیے کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے ۔ غالب کی زندگی کے آخری ایام میں اس قضیے نے بڑی اہمیت اختیار کر لی تھی اور اس سلسلے میں کئی کتابیں چھپ کر شائع ہوئی تھیں ۔ غالب کا 'قاطع برہان' لکھنا گویا بیڑوں کے چھتے گو چھوڑنا تھا ۔ یہ کتاب انہوں نے 'برہان قاطع' کی رد میں لکھی تھی اور اس میں اس کے مؤلف پد حسین دکنی پر اعتراضات کیے تھے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۶۲ء میں مطبع نول کشور سے شائع ہوا تھا ۔ اس کے شائع ہونے کے بعد غالب پر مختلف لوگوں نے اعتراضات کیے اور ان کو کتنا صورت میں شائع کیا ۔ بقول غالب : "قاطع برہان کا لکھنا کہا ہوا گویا باسی کڑھی میں اہال آیا ۔ لکھنا کیا تھا کہ سهام سلامت کا ہدف ہوا۔ معتقدان 'برہان قاطع' پر چھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں ۔ غرض خاصا ہنگامہ برپا ہوا اور اس کے نتیجے میں کئی کتابیں چھپ کر منظر عام پر آئیں ۔ ان میں 'محرق قاطع برہان' ، 'قاطع برہان' ، 'مؤید برہان' ، 'قاطع القاطع' وغیرہ خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں ۔

'محرق قاطع برہان' منشی سعادت علی دہلوی نے لکھی ۔ یہ کتاب ۱۸۶۳ء میں مطبع احمدی شاہدرہ میں چھپی ۔ 'مؤید برہان' مولوی احمد علی مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ کی تالیف ہے اور یہ کلکتہ کے مظہر العجائب پریس میں ۱۸۶۶ء میں چھپ کر شائع ہوئی ۔ 'قاطع القاطع' مولوی پد اسین نے لکھی ۔ یہ ۱۸۶۹ء میں مطبع مصطفائی میں چھپی تھی ۔ اس میں ۲۶۸ صفحات تھے ۔ 'قاطع برہان' مولوی رحیم بیگ کی تصنیف تھی ، جو ۱۸۶۵ء میں مطبع ہاشمی میں چھپ کر شائع ہوئی تھی ۔ یہ تمام کتابیں 'برہان قاطع' کی

۱۔ سبھی پرشاد 'برہان قاطع' اور 'قاطع برہان' کا مقدمہ : (علی گڑھ میگزین غالب نمبر : صفحہ ۱۲۱)

حیات میں لکھی گئی تھیں۔ اور ان میں غالب کے اعترافات کے جواب دے گئے تھے۔

جب یہ کتابیں شائع ہوئیں، تو غالب اور ان کے احباب کی طرف سے بھی ان کا جواب دیا گیا۔ اور اس کے نتیجے میں 'لطائف غیبی'، 'دائع ہذیان'، 'سوالات عبدالکریم'، 'عمرق قاطع برہان'، 'تلیخ تیز'، 'شمشیر تیز تر'، 'ہنگامہ دل آشوب'، 'مؤید برہان'، 'نامہ غالب' وغیرہ منظر عام پر آئیں۔

'لطائف غیبی' ۳۳ صفحے پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب دہلی کے اکمل المطابع میں ۱۸۶۵ء میں چھپی۔ اس میں منشی سعادت علی کی کتاب 'عمرق قاطع برہان' کے جواب دے گئے ہیں۔ یہ کتاب میان داد خان سیاح کی تصنیف ہے۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کتاب خود غالب نے لکھی تھی اور میان داد خان سیاح کے نام سے اس کو چھپوایا تھا۔ اگر غالب نے خود یہ کتاب نہیں لکھی تو کم از کم ان کے اشارے سے ضرور لکھی گئی ہے اور انہوں نے اس کا مواد بھی مہیا کیا ہے۔ 'دائع ہذیان' مولوی نجف علی کی تصنیف ہے اور ۱۸۶۴ء میں اکمل المطابع سے چھپ کر شائع ہوئی۔ اس میں کل ۲۸ صفحات ہیں۔ 'سوالات عبدالکریم' ایک طالب علم کی تصنیف ہے۔ اس میں سترہ سوالات ہیں جو 'عمرق قاطع برہان' کی تردید میں ہیں۔ یہ کتاب ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ 'تلیخ تیز'، 'مؤید برہان' کے جواب میں ہے۔ یہ کتاب ۱۸۶۶ء میں اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوئی۔ اس میں کل ۴۴ صفحات ہیں 'شمشیر تیز تر' مولوی نبی بخش کے مطبع نبوی کلکتہ میں ۱۸۶۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں 'تلیخ تیز' کا جواب دیا گیا ہے۔ ضخامت ۱۸۲ صفحات ہے۔ 'نامہ غالب' خود غالب کی تصنیف ہے، اور جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے، یہ کتاب انہوں نے خود مطبع چھپی میں چھپوائی تھی۔ غالب، میان داد خان سیاح کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

'نامہ غالب' صاحب مطبع نے اپنی ہکری کے واسطے نہیں چھاپی

۱۔ سہیش پرشاد : 'برہان طالع' اور 'قاطع برہان' کا مقدمہ : (علی گڑھ

میگزین ، غالب مجلہ : صفحہ ۱۳۲

جو میں سول نے کر بھیجوں اور تم سے اس کی رقم مانگ لوں۔ میں نے آپ تین سو جلدیں چھپوائیں۔ دور و نزدیک بانٹ دیں۔ آج یک شنبہ ہے۔ ہارسل روانہ نہ ہوگا جتنے یہ نسخے اب میرے پاس باقی ہیں، کل تمہیں بھیج دوں گا۔“

’برہان قاطع‘ اور ’قاطع برہان‘ کے قضیے سے متعلق موافقت اور مخالفت میں جو کتابیں شائع ہوئیں، ان کی تفصیل اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اس قضیے نے اس وقت کے ادبی ماحول میں اچھا خاصا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ غالب کو اس ہنگامے سے گہری دلچسپی تھی، اور وہ اپنی شعبی کے باوجود، اس ہنگامے میں پیش پیش تھے۔ ان کے بعض خطوں سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اس قضیے سے کتنی دلچسپی تھی اور وہ ان مطبوعات کو کتنی اہمیت دیتے تھے، جو اس کے متعلق شائع ہوں توہیں، لکھتے ہیں :

”صاحب ! یہ تم نے پانچ روپے کے ٹکٹ کیوں بھیجے ؟ میں نہ کتب فروش، نہ دلال۔ یہ حرکت مجھے پسند نہ آئی۔ اور تم نے برا کیا۔ حضرت ! سولہ جلدیں ’لطائف عمی‘ کی بھیج کر، اس کے پان سات دن کے بعد بیس ’نامہ‘ غالب‘ کا ہارسل ارسال کیا ہے۔ ’لطائف‘ کی رسید تم نے بھیج دی۔ یقین ہے کہ ’نامہ‘ غالب‘ کا ہارسل بھی پہنچ جائے گا۔“

(خط بہ نام میان داد خان سیاح)

’آہا ہا ہا ! ’عرق قاطع‘ کا تمہارے پاس پہنچنا :

کلمے کہ خواہم ز خدا شد مستمر

میں اس غرافات کا جواب کیا لکھتا۔ مگر ہاں سخن فہم دوستوں کو غصہ آ گیا۔ ایک صاحب نے فارسی عبارت میں اس کے عیوب ظاہر کیے۔ دو طالب علموں نے اردو زبان میں دو رسالے جدا جدا لکھے دانا ہو اور منصف ہو۔ ’عرق‘ کو دیکھ کر جانو گے کہ مؤلف اس کا احسن ہے اور جب وہ احسن ’دافع ہذیان‘ و ’سوالات عبدالکریم‘ اور

”لطائف غیبی“ کو پڑھ کر متنبہ نہ ہوا اور ”عرق“ کو دھو نہ ڈالا تو معلوم ہوا کہ بے حیا بھی ہے۔ ”دافع برہان“ ”سوالات“ ”لطائف غیبی“ قیدوں لسنخے ایک ہارسل میں اس خط کے ساتھ روانہ ہوئے ہیں۔ یہی ہے کہ ہم ندیم و تاخیر ایک دو روز نظر الوداع سے گذریں گے“ (خط بہ نام منشی حبیب اللہ خان)

”صاحب! میں بعین عنایت الہی کثیر الاحیاب ہوں۔ ایک دوست نے کلکتہ سے مجھے اطلاع دی ہے کہ مولوی احمد علی مدرس مدرسہ کلکتہ نے ایک رسالہ لکھا ہے۔ نام اس کا ’مؤید برہان‘ ہے۔ اس رسالہ میں دفع کیے ہیں تیرے وہ اعتراض جو تو نے دکنی پر کیے ہیں اور تحریر پر کچھ اعتراضات وارد کیے ہیں اور اہل مدرسہ اور شعرائے کلکتہ نے تفریبات اور تارغین بڑی دھوم سے لکھی ہیں۔ اس بیانی! میں نے اتنے علم پر ایک قطعہ لکھ کر چھپوایا اور کئی ورق اس دوست کو اور دو چار جلدیں ’درفش کاویانی‘ علاوہ اوراق مذکور بھیج دیے۔ اسی زمانے میں تین چار ورق، خوب یاد ہے کہ ’درفش‘ کی جلد میں رکھ کر تم کو بھیجے ہیں۔ یا تو مجھ کو غلط یاد ہے یا تم نے ’درفش‘ کو کھول کر دیکھا نہیں۔ وہ اوراق مع ’درفش‘ زینت طاق نمایاں ہیں۔ وہ ورق اس لفافے میں مکتور بھیجتا ہوں۔ تم بھی دیکھو اور صاحب زادہ بھی دیکھے اور یہ جانے کہ فی الحال نظم فارسی بھی ہے اور بس۔“

(خط بہ نام منشی حبیب اللہ خان)

”ایمرو! آداب، غلط نامہ، قاطع برہان“ کو بھیجے ہوئے ہیں اور آپ کی خبر و عاقبت مولوی حافظ عزیزالدین کی زبانی سنے ہوئے دو دن ہوئے تھے کہ کل آپ کا نوازش نامہ پہنچا۔ ’قاطع برہان‘ کے پہنچنے سے اطلاع پائی۔ معتقدان ’برہان قاطع‘ برجھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور ہنوز دو اعتراض مجھ تک پہنچے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ’قاطع برہان‘ غلط ہے، یعنی ترکوب خلاف قاعدہ ہے۔

کلام قطع کیا جاتا ہے ۔ برہان قطع نہیں ہو سکتی ہے ۔ لو صاحب !
 'برہان قاطع' صحیح اور 'قاطع برہان' غلط مگر برہان قطع کی قائل
 ہو سکتی ہے اور قطع کا فعل آپ نہیں قبول کرتی ۔ 'قاطع برہان' میں
 جو برہان کا لفظ ہے ، یہ محض 'برہان قاطع' ہے ۔ 'برہان قاطع' کے رد
 کو قطع کر سمجھ 'قاطع برہان' نام رکھا گیا تو کیا گناہ ہوا ؟"
 (خط بہ نام انوار الدولہ شفیق)

ظاہر ہے کہ اس قضیے کی نوعیت علمی ، ادبی اور لسانی تھی غالب
 کو ان تینوں پہلوؤں سے گہرا لگاؤ تھا ، اس لگاؤ نے ان سے "نامہ" غالب
 لکھوائی ۔ ان کی یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن اس اعتبار سے اہم ہے کہ
 اس کو بڑھ کر اس ادبی بحث کی ایک تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے ۔
 "نامہ" غالب جیسا کہ اس سے قبل بھی لکھا جا چکا ہے ، مولوی
 رحیم بیگ کی کتاب 'قاطع برہان' کے جواب میں لکھی گئی ہے ۔ مولوی
 رحیم بیگ کا وطن تو دلی تھا لیکن ان کے والد مرزا پیر بیگ دلی کو
 چھوڑ کر سردھنہ میں آباد ہو گئے تھے ۔ مرزا رحیم بیگ کی ولادت سردھنہ
 میں ہوئی لیکن ان کی تعلیم و تربیت میرٹھ میں ہوئی ۔ حکیم ابو علی سے
 انہوں نے مختلف علوم حاصل کیے ۔ شاعری کا شوق تھا ۔ مولوی محمد بخش
 نادان کے شاگرد ہوئے ۔ چلے سرور تخلص تھا ، بعد میں رحیم تخلص
 اختیار کیا ۔ حکیم احسن اللہ خاں کی فرمائی پر انہوں نے "قصص الا انبیاء"
 کو نظم کا جامہ پہنایا تھا ۔ "دعوت حاتم" کے نام سے ایک مثنوی کہیں
 لکھی تھی ۔ بیشہ معلی تھا ، میرٹھ میں لڑکوں کو پڑھاتے تھے ۔ 'قاطع برہان'
 لکھ کر 'قاطع برہان' کے قضیے میں انہوں نے بھی شرکت کی ۔ غالب نے
 "نامہ" غالب میں تو ان کے متعلق سخت لہجہ اختیار نہیں کیا لیکن اپنے
 ایک اور خط میں ان کے "متعلق خاصے سخت الفاظ استعمال کیے ہیں ۔
 میان داد خاں سیاح کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

"وہ جو ایک کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے ، وہ ایک لڑکے پڑھانے

والے ملائے مکتب کا غبط ہے ۔ رحیم بیگ اس کا نام ، میرٹھ کا رہنے والا ، کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے ۔ باوجود نابینائی کے احمد بھی ہے ۔ اس کی تحریر میں نے دیکھی ۔ تم کو بھی بھیجوں گا ۔ مگر ایک بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ اس میں بیشتر وہ باتیں ہیں ، جن کو ’لطائف غیبی‘ میں رد کر چکے ہو ۔ یہ ہر حال اس کے جواب کی فکر نہ کرنا“ ۔

غالب کے اس لب و لہجہ سے صاف ظاہر ہے ۔ کہ مرزا رحیم بیگ ہر ان کو غصہ تھا اور وہ ان سے ناراض تھے ۔ اس عبارت کے ایک ایک لفظ سے غصہ لپکتا ہے ۔

اگرچہ غالب کے خیال کے مطابق مرزا رحیم بیگ کے اعتراضات کے جواب ’لطائف غیبی‘ میں دئے جا چکے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے ان کی ’سالم برہان‘ کے جواب میں ’نامہ‘ غالب‘ لکھا ۔ لیکن اس میں اور ’لطائف غیبی‘ کے انداز اور لب و لہجہ میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ ’لطائف غیبی‘ کے انداز میں سنجیدگی کم ہے بلکہ کہیں کہیں تو اس کی حدیں پھٹک رہی ہیں ۔ لیکن ’نامہ غالب‘ کا انداز اور لب و لہجہ شروع سے آخر تک سنجیدہ ہے اور اس میں ایک عالمانہ شان پائی جاتی ہے ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ’لطائف غیبی‘ غالب کے ایک شاگرد کے نام سے شائع ہوئی ہے ۔ اس میں انہیں غیر سنجیدہ لب و لہجہ اختیار کرنے کی پوری آزادی تھی ۔ لیکن ’نامہ غالب‘ چونکہ خود ان کے نام سے شائع ہوئی ، اس لیے ظاہر ہے کہ وہ اس میں غیر سنجیدہ لہجہ اختیار نہیں کر سکتے تھے ۔ بعض لکھنے والوں کا خیال ہے کہ ’لطائف غیبی‘ غالب نے خود لکھ کر میان داد خان سیاح کے نام سے چھپوائی تھی ۔ ہو سکتا ہے اس میں پوری طرح صداقت نہ ہو ۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انہوں نے اس میں خاصی دلچسپی لی تھی ۔ بلکہ چھپنے سے قبل اس کو بہ غور دیکھا تھا اور چھپنے کے بعد بھی اس کی تصحیح کی تھی۔ میان داد خان سیاح کو لکھتے ہیں: ”سعادت و اقبال نشان ، سیف الحق منشی میان داد خان سیاح کو فقیر غالب کی دعا پہنچے ۔ خط میں آپ نے بہت سے مطالب لکھے مگر ایسی کتابوں کے دو پارسلوں کی رسید نہیں لکھی ۔ یہ ایک پارسل جو بعد دو پارسلوں کے بھیجا گیا ہے ، اس میں وہی ’لطائف غیبی‘

ہے ، جس کو میں نے اپنے مطالعے میں رکھ کر صحیح کیا ہے ۔ اس کے بیچنے سے یہ مدعا ہے کہ تم ان تیس رسالوں کو اس کے مطابق صحیح کر لو اور اگر چھوٹے صاحب نے رکھ لیا ہے تو ان سے مستعار لے کر انہی سب کتابیں صحیح کر لو ، اور وہ نسخہ ان کی نذر کر دو ۔

صاحب ! میں نے اپنے صرف زر سے 'لطائف غریبی' کی جلدیں نویں چھپوائیں ۔ مالک مطبع نے اپنی بکری کو چھاپیں ۔ یس میں نے سولی لیں ، تیس تم کو دلوا دیں ۔ یس بھائی ضیاء الدین نے لیں ۔ دس مصطفیٰ خان صاحب نے لیں ۔ باقی کا حال مجھے معلوم نہیں ۔“

بہر حال 'لطائف غریبی' اگر غالب نے نہیں لکھی ، تو ان کے ایسا ہو ضرور لکھی گئی اور انہوں نے اس کی تیاری میں خامیا حصہ لیا ۔ اس کا انداز اور لب و لہجہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے صاف ظاہر ہے :

”اہل نظر 'قاطع' و 'عرق' کو جب باہم دیکھیں گے تو 'قاطع' کی عبارتیں موت کی لڑیاں نظر آئیں گی۔ اور 'عرق' کی نثریں ماش کی بڑیاں نظر آئیں گی۔ ہمارے منشی صاحب از روئے علم و فن منشی نہیں ہیں۔ از روئے پیشہ و حرفت منشی ہیں۔ جسے منشی بھیروں ناتھ اور منشی گنٹھل۔ اے صاحب فہم و انصاف ! عبارت 'عرق قاطع برہان' کو دیکھنا چاہیے۔ غلط بیعت ، اظناہ مبہمل ، سوء ترکیب ، تباہی روز مرہ ، غلطی فہم ۔ اس سے مجھے کچھ کام نہیں ۔ بھلا حایان مفلوج الدین کی نثر اور کیسی ہوگی۔ خالصاً کہ یہ بتاؤ کہ یہ متاخرہ ہے یا پھتکڑ ۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک پیچڑا تالیاں بجا بجا کر نکالیاں دیتا ہے ۔ یا ایک سڑی کو کسی نے چھیڑ دیا ہے ۔ وہ انہی تک رہا ہے“

ظاہراً صاحب تب عرق نے یہ بحث بحران کے دن لکھی ہے کہ بے تکلف و بےبالغہ سراسر ہڈیاں ہے ۔ منشی جی خود نہ سمجھے ہوں گے کہ میں کیا تک رہا ہوں ۔ آیات و احادیث عبارت میں درج

۱۔ مہر : خطوط غالب : صفحہ ۳۹

۲۔ لطائف غریبی (علی گڑھ میگزین غالب) صفحہ ۱۰۳

کہتے ہیں ۔ حالانکہ ان کے اندراج کا نہ موقع نہ محل ، نہ فائدہ ۔
معہذا عبارت بھونڈی ۔ روز مرہ فارسی نصیب اعدا ۔ روابط ایسے
مفقود ، جیسے گدھے کے سر سے سینک ۔ ایک فقرے کا مفہوم ، دوسرے
فقرے کے نفیض^{۱۱} ۔

ظاہر ہے کہ اس انداز اور لب و لہجہ میں سنجیدگی نہیں ہے اور
اس میں وہ خاص طرز بھی مفقود ہے ، جو علمی مباحث کے لیے ضروری
ہوتا ہے ۔ اسی لیے ”لطائف شبی“ اپنے علمی نکات کے باوجود مجموعی
طور پر علمی انداز سے عاری ہے ۔

”نامہ“ غالب“ اس کے برخلاف ہر لحاظ سے ایک عالمانہ تصنیف ہے
اور اس میں شروع سے آخر تک ایک عالمانہ سنجیدگی کی لہر سی دوڑی
ہوئی نظر آتی ہے ۔ اس میں معاندانہ انداز نہیں ہے ۔ برخلاف اس کے
دوستانہ انداز میں چند لکھنؤ کی وضاحت ہے ۔ چنانچہ اس کا آغاز اس طرح
ہوا ہے :

خدمت مشفق مکرمی مرزا رحیم بیگ صاحب نور اللہ علیہ بالاسرار و
عینہ بالانوار سخنیں چند گشتہ می شود ؛
فسدہ در منطق پارسی و ذری
ہمیں ہندی“ سادہ و سرسری

جس طرح توحید میں حق ماسوائے اللہ دستور ہے ، مجھ کو تھرہر میں
حذف زوائد منظور ہے ۔ عزم مقابلہ نہیں ، قصد مجاہدہ نہیں ، سر تا سر
دوستانہ حکایت ہے ۔ خانے میں ایک شکایت ہے ۔ شکوۂ درد مندانہ
سیوہ ادب نہیں ۔ معہذا درد دل مراد ہے ۔ کوئی بات جواب طلب
نہیں ۔ احسان مند ہوں آپ کا کہ آپ نے منشی سعادت علی کی طرح
آدھا نام میرا نہ لکھا ۔ ان کے حسن ظن کے مطابق مجھ کو معشوق
میرے استاد کا نہ لکھا ، اور اگر ایک جگہ یہ الفاظ کہ بد قول
غالب ، باکدام خرم در جوال شدہ ام ، ہم کہیں ، یا اور چار جگہ
کلمہ“ توہین رقم کہیں ، میں نے اپنے لطیف طبع اور حسن عقیدت سے
چلے فقرے کا مفہوم یوں اپنے دلنشین کیا کہ حضرت نے محمد حسین

دکنی جامع برہان کے موافق میرے قول کے خرس یقین کیا ہاد خرس در جوال شدن ، عبارت ہے صحبت ہے ۔ خواہی مدافعت کے واسطے ہو خواہی محبت ہے ۔ مجھ کو اس کا قرب بہ سبیل آمیزش ہے ، تم کو اس کا قرب از روئے آمیزش ہے ۔ دوسرے فقرے کے یہ معنی ٹھہرائے بلکہ بے تکلف میرے ضمیر میں آئے کہ خرس کو مدد دینے سے کوفت حاصل ہوئی اور وہ کوفت باعث درد دل ہوئی ۔ شدید درد میں آدمی چپٹتا ہے ۔ چلاتا ہے ، ہائے وائے کرتا ہے ، غل بجاتا ہے ۔ جیسا کہ سعدی 'ہوستان' کی اس حکایت میں، جس کا پہلا مصرع یہ ہے : فرماتا ہے :

شے زبیت فکرت ہی سو ختم
کہ ناچار قرباد خیزد ز درد

اس عبارت میں تلخی نہیں ہے بلکہ شفقت کے ساتھ شائستگی کے انداز میں اپنی بات کہنے کی کوشش ہے ۔ یہاں غالب نے بڑے لطیفے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور بڑے منطقی انداز میں اپنے نظریات کی وضاحت کی ہے ۔

اس کے بعد غالب نے اس نقطے کو واضح کیا ہے کہ دینی معاملات اور ادب و لسانی مسائل دونوں میں اختلاف ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے ۔ بلکہ یہ اختلاف ہمیشہ ہوتا رہا ہے ۔ اس لیے اگر انہوں نے 'برہان قاطع' کی غلطیوں پر قلم اٹھایا تو کون سا گناہ کیا ۔ اس خیال کی وضاحت غالب نے کیسے سیدھے لیکن دل کش انداز میں کی ہے ۔ لکھتے ہیں :

”جناب مرزا صاحب ! کیا تم نہیں جانتے ؟ بے شبہ جانتے ہو گئے کہ اکابر امت کو امور دینی میں کیا کیا منازعتیں باہم واقع ہوتی ہیں کہ نویت بہ تکذیر یک دگر پہنچی ہے ۔ اگر فن لغت میں ایک شخص دوسرے شخص کا معتقد نہ ہوا ۔ یہاں تک کہ اس کی تحقیق بھی کی تو اور مدعیان علم و عقل اس مسکن کے جگر نشنہ خون کیوں ہو جالیں ۔ اور جب تک اس کا نقش ہستی صفحہ دہر سے نہ مٹائیں ، آرام نہ پالیں ۔ ظلم تو یہ ہے کہ جو کچھ میں نے

’قاطع برہان‘ میں لکھا ہے کہ اس کو سمجھتے ہیں اور جو کچھ آپ لکھتے ہیں، نہ اس کے معنی سمجھتے ہیں۔ ’سوال دہکر جواب دیگر‘ پر مدار ہے۔ خارج از بحث اقوال کی تکرار ہے۔ ’برہان قاطع‘ والے کی محبت سے دل بے قرار ہے۔ لوط غیظ و غضب سے بدن وعشہ دار ہے۔ منشی معاذت علی نہ ناظم ہے، نہ قنار ہے۔ یہ موجب اس مصرع کے :

مقتضائے طبیعتی این است

ناچار ہم کو معرض تحریر میں تاسل چاہیے، نہ سخن پروری و جانب داری میں توغل چاہیے۔ یہ حسب اختلاف طبائع مانو یا نہ مانو مگر پہلے یہ تو جانو کہ غالب سوختہ اختر کا فرہنگ نویسوں کے باب میں عقیدہ کیا ہے۔“

اور پھر فارسی کے فرہنگ نویسوں کے بارے میں اپنے خیالات کی وضاحت اس طرح کی ہے :

”اگرچہ ’قاطع برہان‘ میں جا بجا لکھتا آیا ہوں، مگر اب ہندی کی چندی کر کے لکھتا ہوں کہ یہ عقیدہ میرا ہے کہ فرہنگ لکھنے والے جتنے گزرے ہیں، سب ہندی نژاد ہیں۔ ہاں علم صرف و نحو عربی میں بقدر تحصیل مستلزم اور استاد ہیں۔ علم صرف و نحو کی کتب درسی موجود ہیں، جس نے چاہا، اس نے استاد سے ان کتب کو پڑھ لیا ہے۔ فارسی کے جو فرہنگ ان حضرات نے لکھے ہیں، مطالبہ مندرجہ کس اصول پر منضبط کیے ہیں اور اس کا علم کس استاد سے حاصل کیا ہے؟ آخر مقاصد صرف و نحو عربی بھی تو صرف مطالعہ کتب سے نہیں نکلتے ہیں۔ پہلے تعلیم و تعلم ہے، پھر کتب قواعد کے جا بجا حوالے ہیں۔ قواعد فارسی کا رسالہ اہل زبان میں سے کس نے لکھا ہے اور ان ہوس پیشہ فرہنگ لکھنے والوں نے وہ رسالہ کس فاضل عجم سے پڑھا ہے۔

شیدائے ہندی میکروی نے حاجی محمد جان قفسی علیہ الرحمۃ کے ایک شعر پر اعتراض کیا ہے۔ مرزا جلا لانے طبا طبائی علیہ الرحمۃ

نے شیدا کو خط لکھا ہے ۔ سر آغاز خط کا ایک قطعہ ، جس میں 'سحرا' و 'دروا' قافیہ اور برساندہ ، ردیف ہے ۔ شعر اخیر کا مصرع ثانی یاد رہ گیا ہے :

یعنی یہ مہا ذبو مقوی برساندہ

خلاصہ مضمون خط یہ کہ تو صاحب زبان نہیں ہے ۔ زبان دان ہے ۔ یعنی متلذذ اور کاسہ لیس اہل ایران ہے ۔ حاجی محمد جان کے کلام کو سنہ پکڑ ۔ ابھی کس نے کہا ہے کہ اُس سے لڑ ؟ کیا تو نے سنا نہیں جو عرف اور فیضی میں گفتگو ہوئی ہے اور مہ نمن الدولہ شیخ ابوالفضل کے رو برو ہوئی ہے ۔ لغات فارسی اور ترکیب الفاظ میں کلام تھا ۔ مولانا جلال الدین عرفی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور نطق آشنا ہوا ہوں ، اپنے گھر کی بڑھی بوڑھیوں سے لغت فارسی اور ترکیبیں سنتا رہا ہوں ۔ فیضی بولا کہ جو کچھ تم نے اپنے گھر کی بڑھیوں سے سیکھا ہے ، وہ ہم نے خاقانی اور انوری سے اخذ کیا ہے ۔ حضرت عرفی نے فرمایا کہ 'نقصیر معاف ، خاقانی ، انوری کا ماخذ بھی تو منطق گھر کی پھر زالوں کا ہے ۔ ہائے کمز کہان سے لاؤں کہ یہ حال قلو پند کے صاحب کمالوں کا ہے ۔ قیاس مع الفارق کی بہار دیکھو ۔ مجتہد تقدم و سالہ کا اعتبار دیکھو ۔ مانا کہ عرفی تحصیل علوم عربیہ میں اُن سے کم تر ہے ۔ صاحب زبان اور ایرانی ہونے میں برابر ہے ۔ کیا عرفی کیا ازوری کیا خاقانی ، ایک شیرازی ، ایک خاوری ، ایک شروانی ۔ اگر مجھ سے کوئی کہے کہ غالب تیرا بھی مولد ہندوستان ہے ۔ میری طرف سے جواب یہ ہے کہ ہندہ ہندی مولد اور پارسی زبان ہے :

ہر چہ از دستکہ یارس یہ یلغا بردند

قائمال ہم ازاں جملہ زبانم دردند

زبان دانی فارسی میری ازلی دستگاہ اور یہ عطیہ خاص متعجبانہ اللہ ہے ۔ فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے ۔ مشق کا کمال میں نے استاد سے حاصل کیا ہے ۔ ہند کے شاعروں میں اچھے اچھے خوش گو اور معنی مآب ہیں ۔ لیکن یہ کون احسن کہے گا کہ یہ لوگ دعوائے زبان دانی کے باب ہیں ؟ رہے فرہنگ لکھنے والے ، خدا ان کے بیچ

سے نکالے۔ اشعار قلم آگے دھر لیے اور اپنے قیاس کے مطابق چل دیے۔ وہ بھی نہ کوئی ہم قدم، نہ کوئی ہمراہ بلکہ سو بسو ہرا گندہ و تباہ۔ رہتا ہو تو راہ بتائے، استاد ہو تو شعر کے معنی سمجھائے۔ نہ آپ شیرازی نہ استاد اصفہانی، زپے رگ گردن، خبیے دعوائے زہاں دانی میرا یہ قول خاص ہے نہ عام ہے۔ مجموعہ فرہنگ نگاروں کے محقق ہونے میں کلام ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ 'جامع برہان' کا ماخذ فرہنگ رشیدی و جہانگیری ہے۔ عبدالرشید کی کیا شیخی اور میان انبوی کی کیا پیری ہے؟ قطب شاہ و جہانگیر کے عہد میں ہونا اگر منشاء لرتری ہے، تو بے چارہ جعفر زلی بھی فرخ سیری ہے۔"

یہاں غالب نے مدلل اور منطقی انداز میں ادبی مباحث کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور اس میں عام طور پر غاصت جس صورت حال کو پیدا کرتی ہے، اس کا شکوہ کیا ہے۔ اور اس طرح اپنے زمانے کے غیر صحت مندانہ رویے پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے خیال میں 'تاطع برہان' میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کو لوگ سمجھے نہیں اور بغیر سمجھے ہوئے صرف اس وجہ سے اُن پر اعتراضات کی بوجھار کرتے ہیں کہ الہیں 'برہان طالع' کے مؤلف ہند حسین دکنی سے جذباتی لگاؤ ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے فرہنگ نگاروں کے بارے میں جو اصولی باتیں کہی ہیں، وہ بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان خیالات میں دراصل ایک شاعر اور ایک تخلیقی فنکار کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ غالب نے یہاں اپنا اور اپنی فارسی دانی کا ذکر بھی اختصار کے ساتھ کیا ہے لیکن اس میں تعلی نام کو نہیں۔ بلکہ انہوں نے اس سلسلے میں جو کچھ کیا ہے، وہ اظہارِ حقیقت ہے اور اس سے اُن کی باتوں میں وزن پیدا ہوتا ہے۔

غالب فرہنگ نویسوں سے بعض بنیادی اختلافات رکھتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اُن کو درخور اعتنا نہیں سمجھا ہے۔ اُن کے محقق ہونے میں انہیں کلام ہے۔ کیونکہ وہ اپنے قیاس کے مطابق چلتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قیاس کو تحقیق کی بنیاد نہیں سمجھا جا سکتا۔ خاص طور پر ہند حسین

دکنی جامع 'برہان قاطع' کو مرزا رحیم بیگ اور دوسرے لکھنے والوں نے جن دلائل کو پیش کر کے ایک بلند پایہ فرہنگ نویں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اس سے انہوں نے اختلاف کیا ہے۔

اس سلسلے میں آگے چل کر غالب نے فرہنگ نویسوں کے بارے میں ایک بڑے مزے کی بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں :

”ایک لطیفہ لکھتا ہوں۔ اگر خفا نہ ہو جاؤ گے تو حظ اٹھاؤ گے۔

جنی فرہنگیں اور فرہنگ طراز ہیں ، یہ سب کتابیں اور سب جامع
ماخذ پہاڑ ہیں تو بتو اور لباس در لباس ، وہم در وہم اور قیاس در
قیاس ۔ پہاڑ کے جھلکے جس قدر اُتارتے جاؤ گے ، پھلکوں کا ڈھیر
لگ جائے گا ، مغز نہ پاؤ گے۔ فرہنگ لکھنے والوں کے پردے کھولتے
جاؤ ، لباس ہی لباس دیکھو گے ، شخص معدوم۔ فرہنگوں کی ورق گردانی
کرتے رہو ، ورق ہی ورق نظر آئیں گے ، معنی سوہوم۔“

اس لطیفے کا مقصد در اصل اس خیال کی وضاحت ہے کہ لغت لکھنے والوں
کے پاس ایک عام خیال کے مطابق ذہن اور تخیل نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا بھی
ہے تو وہ اُس سے کام نہیں لیتے ، بلکہ لغت نویسی کی نوعیت ہی کچھ ایسی
ہے کہ وہ اُس سے کام لے ہی نہیں سکتے۔ چنانچہ آگے چل کر اس کی وضاحت
اس طرح کرتے ہیں :

”ظرافت پر مدار تعلق نہیں ہے ۔ آپ کے خاطر نشین کرتا ہوں
جو میرے دل نشین ہے۔ فرہنگ نویسوں کا قیاس، معنی لغات میں نہ
سراسر خلط ہے ۔ البتہ کمتر صحیح اور بیشتر خلط ہے ۔ خصوصاً دکنی
تو عجیب جانتا ہے ، لغو ہے ، بوج ہے ، ہاگل ہے ، دیوانہ ہے ،
وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ پائے اصلی کیا ہے اور پائے زائد کیا ۔
حیران ہوں کہ اُس کی جالب داری میں فائدہ کیا ہے ؟ خدا جانتا ہے
کہ میں یک رنگ ہوں ۔ مگر دکنی کے جالب داروں میں چو رنگ
ہوں ۔ مجھے جو چاہو کہو ۔ اوروں سے تم کیوں لڑتے ہو ؟“

۱۔ نامہ غالب (پہلا ایڈیشن) : صفحہ ۴۰۰ ۔ ۵

۲۔ ایضاً : صفحہ ۵

غالب نے یہاں اپنے مؤلف 'برہان قاطع' کے لیے سخت الفاظ ضرور استعمال کیے ہیں لیکن ایسا کر کے انہوں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کی لغت نویسی دوسرے لغت نویسوں کے مقابلے میں ادنیٰ درجے کی ہے اور وہ اُس کے اس انداز سے اختلاف رکھتے ہیں۔ 'نامہ غالب' میں صرف یہی ایک مقام ایسا ہے، جہاں غالب اپنے حدود سے باہر نکل گئے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہیں غصہ آ گیا ہے۔ آگے چل کر جہاں الفاظ کی بحث کی ہے اور 'برہان قاطع' کے مؤلف کی غلطیاں نکالی ہیں، وہاں بھی کچھ اسی قسم کا لب و لہجہ پیدا ہو گیا ہے لیکن۔ اس قسم کے مباحث میں اس صورت حال کا پیدا ہونا ایسا کچھ عجیب نہیں۔

'نامہ غالب' اس اعتبار سے بھی اہم رکھتی ہے کہ اس میں غالب نے اپنی انایت کے باوجود ایک جگہ اپنے سہو کا اعتراف کیا ہے اور اُن سے جو غلطیاں ہوتی ہیں، اُن کو تسلیم کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"سچ ہے غالب آگندہ گوش ہے۔ کسی کی خبریں سنتا۔ اسی آپ کے مقرر کیے ہوئے قاعدے کے مطابق، بہ حلف کہتا ہوں کہ تم نے 'قاطع برہان' و 'دافع ہذیان' و 'لطائف غیبی' کو پرگز نہیں دیکھا 'آویزہ' و 'السوس' کے بیان میں مجھ سے وہ سہو ہوا کہ مجھے اس کا اقرار اور میرا دوست میاں داد خان شرمسار ہے، جو کچھ اس مصنف نے اس باب میں لکھا، وہ قول فیصل اور کافی ہے۔ مانیں یا نہ مانیں لاطرین کو اختیار ہے"

اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ ان تمام اعترافات اور کئے شگونیوں کے باوجود آخر میں دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ اور عشق و محبت، جو اُن کا مسلک ہے، اُس کی وضاحت کی ہے۔ چنانچہ اپنی اس تصنیف کو ان جملوں پر ختم کیا ہے :

"میں اب قطع کلام کرتا ہوں اور آپ کو یہ کمال تعظیم سلام کرتا ہوں۔ پیغمبر کی تحفہ کو مستلم رکھتے ہوئے۔ تم جانو اور سید ابراہ۔ خاقتانی پر بہتان کرتے ہو۔ تم جانو اور وہ میدان معنی کا شاہ سوار۔

مجھ کو جس قدر تم نے لکھا ہے یا کوئی اور لکھ رہا ہے ۔ اگرچہ وہ سب لغو اور جھوٹ ہے ، معقول اور راست نہیں ، لیکن واللہ مجھ کو عرصہٴ محشر میں اس کی باز خواست نہیں :

ز یمن عشق بہ گولین صلح کل کردیم
تو خصم ہاش و زبا دوستی ممانا کن'

غرض 'قاسم' غالب ، 'نہرپان قاطع' اور 'قاطع برہان' کے قضیے سے متعلق غالب کی سب سے اہم تصنیف ہے ۔ اختصار کے باوجود یہ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے ۔ غالب نے اس میں بعض اہم ادبی و لسانی مباحث کو چھوڑا ہے اور اس طرح ان موضوعات سے متعلق اپنے بعض بنیادی خیالات و نظریات کی وضاحت کی ہے ۔ اس کا انداز اور لب و لہجہ عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ ہم آہنگ ہے ۔ لیکن اس کے باوجود غالب کی ذہانت اور ان کی شخصیت کی پہلو دار کونیت نے اس میں جگہ جگہ وہ رنگ و آہنگ بھی پیدا کر دیا ہے ، جو ایک شمشیر جوہر دار میں ہوتا ہے ۔

غالب
کے
اہم نقاد

غالب اردو کے اہم شاعر تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے زمانے میں ان کی اہمیت کو صحیح طور پر محسوس نہیں کیا گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فن کے لیے ایک نئی دنیا پیدا کرنا چاہتے تھے اور جو سامنے الہوں نے اپنے لیے بنائے تھے، ان کی نظاً اس زمانے کے افراد کے لیے نا مانوس تھی اور وہ اس کے ساتھ مطابقت پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ غالب کو ان کے زمانے میں سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی اور ان کی شاعری کی تحسین کا حق ادا نہیں کیا گیا۔ ان کے زمانے کے بعض تذکرہ نگاروں نے ان کی شاعری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ان کی چلو دار شاعری کو سمجھتے تھے بلکہ ان کی شاعری کے اس انداز کو اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، اعظم الدولہ سرور، مرزا قادر بخش حابر اور آگے چل کر محمد حسین آزاد نے اپنے اپنے تذکروں میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے یہ بات باہد ثبوت تک پہنچتی ہے کہ غالب کے فن نے اپنے ہم عصروں کے دلوں میں ایک جگہ بنا لی تھی اور وہ اس کی اندازہ دانی کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے۔ ان تذکروں کا انداز ظاہر ہے کہ روایتی ہے۔ اس لیے ان میں غالب پر بھی جن تنقیدی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ بھی اس خاص انداز میں کیا گیا ہے، جو تذکروں کے ساتھ مخصوص تھا۔ مجموعی طور پر ان تذکروں میں جو تنقیدی رائیں دی گئی ہیں، ان میں اختصار کے ساتھ اسی خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ غالب اپنے زمانے کے اہم شاعر تھے۔ ان کا کلام معنویت سے بھرپور تھا۔ وہ نئے نئے خیالات کو

اپنی شاعری میں پیش کرتے تھے اور ان کے پیش کرنے کا انداز بھی نیا تھا۔ ان کے ہاں تخیل کی فراوانی تھی اور وہ اس تخیل سے اپنی شاعری کو رنگین و پرکار بناتے تھے۔ فارسی شاعری کی روایت کے اثرات ان پر بڑے گہرے ہیں اور انہوں نے اس روایت سے بہت استفادہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تذکروں سے کسی تفصیل یا تجرباتی انداز کی توقع نامناسب ہے کیوں کہ جو حال یہ تذکرے ہیں؛ تنقید کی کتابیں نہیں ہیں۔ پھر بھی ان میں سے شیخہ کو غالب کا ایک اہم نقاد کہا جا سکتا ہے کیوں کہ انہوں نے اختصار کے ساتھ جو کچھ غالب کے بارے میں کہا ہے، اس میں ان کے کلام کی مزاج ذاتی کا صحیح شعور اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ شیخہ نے جو خیالات پیش کیے ہیں، ان کو باقاعدہ تنقید کے تحت نہیں رکھا جا سکتا۔

غالب کے متعلق باقاعدہ تنقید کا آغاز توحالی سے ہوتا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ غالب کے انتقال کے بعد، حالی نے جو مرثیہ لکھا ہے، اس میں بھی بعض اہم تنقیدی اشارے ملتے ہیں اور غالب کی شاعرانہ اور فن کارانہ شخصیت کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ حالی کا یہ مرثیہ تو ان کا ایک شعری کارنامہ ہے، تنقیدی کارنامہ نہیں۔ حالی کا تنقیدی کارنامہ تو 'یادگار غالب' ہے جس میں انہوں نے غالب کی زندگی اور شخصیت کی زندگی سے بہرہ ور اور بڑی ہی دلآویز تصویر کھینچی ہے اور ساتھ ہی ان کی شاعری اور لٹر نگاری دونوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس جائزے میں جو تنقیدی خیالات پیش کیے گئے ہیں، ان کی بنیاد گہرے تنقیدی شعور پر استوار ہے۔

حالی نے اس تنقیدی جائزے میں غالب کے ماحول اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ان کے فن کی اندازہ ذاتی کی ہے۔ حالی کی تنقید کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ غالب اپنے حالات کی پیداوار تھے۔ ان پر بعض شخصیتوں نے گہرا اثر ڈالا تھا جیسی سبب ہے کہ ان کے جہاں ابتدائی زمانے میں فارسی کا اثر نمایاں ہوا اور مشکل پسندی ان کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت بن گئی۔ اس سلسلے میں حالی نے ملا عبدالصمد کا ذکر کیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ غالب نے ابتدا میں فارسی کے گہرے اثرات قبول کیے ہیں اور اس سلسلے میں عبدالصمد

کی شخصیت نے غالب پر نمایاں اثر ڈالا ہے۔ بہر حالات کے زیر اثر غالب نے اپنا راستہ الگ بنانے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں یہی فارسی کا سہارا لیا۔ ان سے قبل اودو شاعری کی روایت میں سادگی کو معیار تصور کیا جاتا تھا۔ غالب اس راستے سے ہٹے اور انہوں نے سادگی کی بجائے مشکل ہندی کو اپنا معیار بنا لیا۔ حالی نے غالب کے اس انداز کو کچھ پسند نہیں کیا، بلکہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ ناموائست اور اجنبیت جو ان کے کلام میں ظاہر ہوئی، اس کو مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن پھر اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ ”ان کے اس قسم کے اشعار کو مہمل کہو یا بے معنی لیکن اس میں شک نہیں کہ مرزا نے نایت جانکبھی پور جگر کاوی سے سر انہام دیے ہوں گے“ اس صورت حال کے عوامل اور محرکات کا ذکر کرتے ہوئے حالی نے اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ غالب کا بہن اور عنوان شباب کا زمانہ کچھ اس طرح گذرا کہ ان کے ہاں آزادی، جنت ہندی اور مطلق العنانی کے رجحانات پیدا ہو گئے اور اس کی جھلک ان کے فن میں بھی نمایاں ہوئی۔ حالی نے لکھا ہے : ”آغاز شباب میں جب سر پر کوئی مری نہ ہو تو دولت و آسودگی کے سوا کوئی چیز غائب برانداز نہیں ہو سکتی۔ مرزا کی نوجوانی کے ساتھ اس آسودگی نے وہ کام کیا، جو آگ بارود کے ساتھ کرتی ہے۔ جس آزادی اور مطلق العنانی میں مرزا کی جوانی گذری ہے، اس کی کیفیت کا خود انہیں کے الفاظ سے اندازہ ہو سکتا ہے۔“ دراصل حالی اس قسم کے بیانات سے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ غالب کی شخصیت کا یہ رنگ ان کی زندگی اور فن دونوں میں ہمیشہ کسی نہ کسی زاویے سے اثر انداز ہونا رہا اور اس نے وقت کے ساتھ ساتھ مختلف صورتیں اختیار کیں۔ ان میں سے ایک صورت جسے مشکل ہندی، آزاد روی اور مطلق العنانی بھی تھی، جس کے زیر اثر انہوں نے ایک نیا راستہ بنانے کی کوشش کی اور اپنے فن کو اس پر کلن کرنے کی ارادہ کیا۔

حالی نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ غالب کا یہ انداز اپنے زمانے میں اس وجہ سے مقبول نہ ہو سکا کہ اس وقت میر، سودا، درد، جرات اور مصحفی وغیرہ کے شعری انداز کو عام طور پر پسند کیا جاتا تھا اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں سادگی اور سلاست تھی اور اسی

سلامت اور سادگی کو لوگ معیار تصور کرتے تھے۔ اس لیے خیال اور نئی باریکی کی تہوں تک پہنچنا ان کے لیے مشکل تھا۔ ان حالات میں جب غالب نے اپنی نئی فکر کو نئی طرز میں پیش کیا تو یہ دونوں پہلو اسے لوگوں کے لیے اجنبی اور نامانوس ثابت ہوا۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے ابتدائی زمانے میں مقبولیت حاصل نہ کرسکے، لیکن حالی کے تنقیدی شعور نے غالب کے اس انداز میں جدت اور ایچ کی جھلک دیکھی ہے۔ لکھتے ہیں :

”مرزا کے ابتدائی کلام کو مجھل اور بے معنی کہو یا اس کو اردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو لیکن اس میں شک نہیں کہ اس سے ان کی اور بھٹائی اور غیر معمولی ایچ کا خاطر خواہ سراغ ملتا ہے اور یہ ان کی ٹیڑھی ترجمانی چالیں ان کی بلند فطرت اور غیر معمولی قابلیت و استعداد پر شہادت دیتی ہیں۔ معمولی قابلیت و استعداد کی معراج یہ ہے کہ جس ہنگامندی پر اگلی ٹیڑیوں کا گلا چلتا جاتا ہے، اس پر آنکھیں بند کر کے کلمے کے بیچے بیچے ہو لیں۔ لیکن ایک بے ادھر ادھر آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ برعکس اس کے جن کی طبیعت میں اور بھٹائی اور غیر معمولی ایچ کا مادہ ہوتا ہے، وہ اپنے میں ایک ایسی چیز ہاتے ہیں، جو اگلوں کی پیروی پر ان کو مجبور نہیں ہونے دیتی۔ مرزا کی طبیعت اسی قسم کی واقع ہوئی تھی۔ وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ لاک چڑھاتے تھے۔“

حالی کی یہ بات تنقیدی اعتبار سے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کیوں کہ غالب کی شخصیت کو سامنے رکھا جائے تو ان کی اس ایچ اور جدت کی جہت سے مثالیں اس زندگی کے واقعات میں مل جاتی ہیں۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو کی جھلک ان کے فن میں بھی نظر آتی ہے۔ حالی نے اس کا صحیح تجزیہ کیا ہے۔

اس سلسلے میں حالی نے اپنے اس تنقیدی نقطہ نظر کی وضاحت بھی کی ہے، جس نے انہیں جدید شاعری کی تنقید کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ ان کے خیال میں غالب نے یہ نئی روش اس وجہ سے بھی اختیار کی کہ برائی روش میں اب ان لوگوں کے لیے کوئی ایسی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی، جو نئی زندگی کی پیداوار تھی اور جن کے سامنے تاریخی حالات نے زندگی کے نئے امکانات کے چراغ روشن کر دیے تھے۔ حالی لکھتے ہیں :

”جب میں و سودا اور ان کے متبعین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھنے دیکھنے ہی اُکٹا جاتا ہے اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں ہمیں ایک دوسرا آدمی دکھائی دیتا ہے اور جس طرح کہ ایک خشتی کے سیاح سفیر میں یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے ، اس طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے ۔“ اس کیفیت کو حالی نے کلام غالب کے مختلف مضامین اور ان کے پیش کرنے کے انداز میں دیکھا ہے اور مثالیں دے کر ان کی وضاحت کی ہے ۔ غالب نے اخلاقی معاملات ، انسانی فطرت ، انسان کی بڑائی ، عشق و عاشقی اور تصوف وغیرہ پر جو اشعار کہے ہیں ، ان کو سامنے رکھ کر حالی اپنے اس تنقیدی خیال کو صحیح ثابت کرتے ہیں ۔

حالی کے خیال میں غالب کے کلام کی دوسری اہم خصوصیت وہ ہے جس کو ہم آج کی تنقیدی اصطلاح میں رمزیت ، ایمائیت یا لطیف اہام کہتے ہیں اور جس کو موجودہ دور میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے ۔ حالی کے تنقیدی شعور نے غالب کی شاعری کے اس پہلو کو اس طرح واضح کیا ہے کہ ان کی شاعری کے انداز کی صحیح کیفیت آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے ۔ اس سلسلے میں حالی لکھتے ہیں : ”مرزا نے استعارہ و کنایہ اور تلمیح و تشبیہ کی طرف بہت کم توجہ کی ہے ۔ رختے میں بھی نسبتاً اپنے فارسی کلام سے کم استعمال نہیں کیا اور شعراء نے استعارے کو صرف محاورات اردو میں بلا شبہ استعمال کیا ہے ، لیکن استعارے کی قصد سے نہیں بلکہ محاورہ بندی کے شوق میں استعارے بلا قصد ان کے قلم سے ٹپک پڑے ۔“ اور پھر حالی نے اپنے اس تنقیدی خیال کو بہت سی مثالوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ۔

غالب کے کلام کی تیسری خصوصیت حالی کی نظر میں شوخی اور ظرائف ہے ۔ یہ شوخی اور ظرائف واقعی غالب کی غزل کی بہت نمایاں خصوصیت ہے ۔ اس کی وجہ سے اُن کے کلام میں چاندنی کی مسکراہٹ کا سماں نظر آتا ہے اور شکستگی اور شادابی کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے ۔ اگرچہ یہ صورت حال غزل کی صحیح کیفیت کے منافی ہے ۔ کیوں کہ عام طور پر اردو غزل کی روایت میں العیہ اور حزیہ الدعا کو

تغزل کے لیے ضروری قرار دیا جاتا ہے ، لیکن غالب نے اس روایت سے انحراف کیا اور اپنی شوخی اور ظرافت سے اس میں نئی زندگی پیدا کی ۔
حالی لکھتے ہیں ”کیا نظم میں اور کیا نثر میں باوجود صمیمیت و متانت کے شوخی و ظرافت ہے جس سے غالب کا کلام پہچانا جاتا ہے ۔“ حالی نے اس پر تفصیلی بحث نہیں کی ۔ صرف اس کی طرف اشارہ کیا ہے ۔

حالی نے غالب کے کلام کی جوتھی خصوصیت کے تحت اس بات کو واضح کیا ہے کہ غالب کے کلام میں ہمہ در ہمہ معنویت موجود ہے اور وہ اشاروں اور کنایوں میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بڑی ہی بلیغ باتیں کرتے ہیں ۔ بظاہر اس میں ایک معنویت نظر آتی ہے ، لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو اس کی ہمہ میں معنویت کا دوسرا پہلو بھی نظر آتا ہے ۔ حالی نے اس کو ماہد الامتیاز کہا ہے اور لکھا ہے کہ ”ان کے اکثر اشعار کا بیان پہلو دار ہے اور بادی النظر میں اس سے کچھ اور معنی واضح ہوتے ہیں لیکن غور کرنے کے بعد اس میں ایک دوسرے معنی انتہائی لطیف پیدا ہوتے ہیں، جن سے وہ لوگ جو ظاہری معنوں پر کفایت کر لیتے ہیں ، لطف نہیں اُٹھاتے“ حالی کا یہ تنقیدی خیال اپنی جگہ بالکل درست ہے اور انہوں نے غالب کے کلام سے جو مثالیں اس خیال کو واضح کرنے کے لیے پیش کی ہیں، وہ ان کے تنقیدی خیال کو پوری طرح واضح کر دیتی ہیں۔ پھر حالی نے فارسی شاعری کی روایت کو سامنے رکھ کر غالب کی شاعری کے ایسے پہلوؤں کا پوری طرح تجزیہ کیا ہے ۔ اس تجزیے سے کلام غالب کے بہت سے نئے پہلو آنکھوں کے سامنے آتے ہیں ۔

اس میں شبہ نہیں کہ حالی کی تنقید غالب کا انداز بڑی حد تک تشریحی ہے اور انہوں نے مختلف تنقیدی خیالات کے تحت غالب کے اشعار کا مطلب اس طرح لکھا ہے کہ اس میں کلام غالب کی تشریح کا ما انداز پیدا ہو جاتا ہے ۔ لیکن حالی ایسا کرنے کے لیے مجبور تھے ۔ کیوں کہ تنقید لکھنے وقت ان کے پیش نظر یہ خیال تھا کہ غالب کے اس کلام کو جو رمز و ایما کا حامل ، پہلو دار اور کسی حد تک مبہم ہے، اس کی توضیح و تشریح کی جائے تاکہ اس کے شعری محاسن پوری طرح واضح ہو سکیں ۔ حالی اس میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں اور انہوں نے اس تشریح و توضیح

کے پردے میں غالب کے متعلق جو تنقیدی باتیں کہی ہیں ، وہ اپنے اندر گہرائی رکھتی ہیں ۔

حالی کی انداز اور تنقید ، اس اعتبار سے نئی ہے کہ اس میں کلام غالب کے بعض ایسے پہلوؤں کا سراغ لگایا گیا ہے ، جو ان کے فن میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ حالی نے شخصی اور اجتماعی حالات کو عوامل و محرکات قرار دے کر، غالب کی شاعری کے ان پہلوؤں کی وضاحت کی ہے ۔ اسی لیے ان کے اس انداز تنقید میں گہرائی کا احساس ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ غالب کے کلام پر ان کی تنقید آج بھی اہمیت رکھتی ہے ۔

حالی کے بعد اردو تنقید میں ایک رومانی رجحان کی ابتدا ہوئی ہے ۔ دراصل یہ رومانی رجحان سرسید کی اس ادبی تحریک کا رد عمل تھا، جس میں افادیت کو خاص طور پر اہمیت دی گئی تھی ۔ حالی اس افادی رجحان کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ اسی لیے جو تنقید انہوں نے غالب کے کلام پر کی ہے، اس میں بھی جگہ جگہ اس افادی رجحان کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ۔ لیکن ان کے بعد غالب کی تنقید میں بعض ایسے لوگ بھی سامنے آئے ہیں، جو اس رومانی رجحان کے ٹھٹھٹھ کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہیں ، جو اس افادی رجحان کے رد عمل کے طور پر پیدا ہوا تھا ۔

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری اس رجحان کے سب سے بڑے علم بردار ہیں اور ان کی کتاب ’محاسن کلام غالب‘ ان کے اس تنقیدی نقطہ نظر کی صحیح طور پر عکاسی کرتی ہے ۔ بجنوری نے اپنے اس تنقیدی مطالعے کا آغاز ہی اس طرح کیا ہے :

”ہندوستان کی انسانی کتابیں دو ہیں ، مقدس وید اور دیوان غالب ۔ لوح سے نکت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے ، جو یہاں حاضر نہیں ۔ کون سا نغمہ ہے ، جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا پوشیدہ نہیں ہے ؟“
ان چند جملوں سے ان کی اس کتاب کا مجموعی انداز بوری طرح نمایاں ہو جاتا ہے ۔ آگے چل کر انہوں نے اس کتاب میں اس خیال کی تفسیر پیش کی ہے اور مختلف زاویوں سے کلام غالب کی اہمیت کا اندازہ لگایا ہے ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں : ”غالب نے بزم ہستی میں جو فانوس خیال روشن کیا ہے ، کون سا ہلکا تصویر ہے ، جو اس کاغذی پرہیز پر منازل زیست قطع کرنا ہوا نظر

نہیں آتا ؟“ بنوری در حقیقت اس کتاب میں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ غالب کا کلام انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے اور اس کی بے شمار چھٹی ہوئی حقیقتوں کی نقاب کشائی اس کا خاص میدان ہے ۔ اس سلسلے میں انہوں نے غالب کا مقابلہ الہادی شاعر گوئٹے سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ ”دنیا میں اگر کسی شاعر سے غالب کا مقابلہ ہو سکتا ہے ، تو وہ شعراء الہادیہ کا سر تاج گوئٹے ہے ۔ غالب اور گوئٹے دونوں کی حشمت انسانی تصور کی آخری حدود کا پتہ دیتی ہے ۔ شاعری کا دونوں پر خاتمہ ہو گیا ہے ۔ عمیق اور جدید خیالات ، حقیقت اور مجاز ، قدرت اور حیات کی کثرت ، ان کے دماغوں میں وحدت میں منتقل ہو کر وجود پاتی ہے ۔ دونوں اقلیم سخن کے شہنشاہ ہیں ۔ تہذیب ، تمدن ، تعلیم و تربیت ، فطرت کوئی زندگی کا ایسا پہلو نہیں ، جس پر دونوں کا اثر نہیں پڑا ہو ۔“ بنوری نے ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر غالب کی شخصیت اور شاعری کا بہت اچھا جائزہ لیا ہے ۔ اس جائزے میں زیادہ زور اس بات پر ہے کہ غالب زندگی کے شاعر ہیں اور انہوں نے اس کے مختلف پہلوؤں پر بڑی ہی لکری گہرائی اور جانیانی نزاکت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے ۔ بنوری کا مزاج خود بھی فلسفیانہ تھا اس لیے غالب کی شاعری کے فلسفیانہ پہلوؤں پر ان کی نظر بہت گہری پڑی ۔ اور ان کا یہ تنقیدی جائزہ در حقیقت کلام غالب کی ایک فلسفیانہ تحلیل ہے ۔ اس سلسلے میں انہوں نے گوئٹے کے علاوہ بعض دوسرے مغربی شاعروں اور مفکروں سے ان کا مقابلہ اور موازنہ کیا ہے ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ : ”غالب کا فلسفہ سبنوزا ، ہیگل ، برکلی اور نٹشے سے ملتا ہے ۔“ ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ : ”مرزا غالب کا فلسفہ حیات ابن رشد سے مساوی ہے ۔ اندلسی فلسفی نے بیان کیا ہے کہ مادہ ہمیشہ پیولا کا محتاج ہے ۔ بے صورت مادے کا تصور ناممکن ہے ۔“ غالب کے ہاں بھی انہوں نے یہی صورت دیکھی ہے ۔ اس کے علاوہ ڈارون ، برگسان ، ہیگل ، کانٹ اور بعض دوسرے مغربی فلسفیوں سے بھی انہوں نے غالب کے فلسفے کا مقابلہ کیا ہے ۔ ان کے تنقیدی مطالعے کا یہ حصہ ، جس میں ان فلسفیوں سے غالب کا مقابلہ کیا گیا ہے ، بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ کیوں کہ ان میں وہ معلومات کا خزانہ ہی فراہم نہیں کرتے ، اس معلومات کو غالب کے فکر و فلسفہ کے ساتھ اس طرح ملاتے ہیں کہ اس کے صحیح حد و خال آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں ۔ یہی بنوری کا سب سے بڑا تنقیدی کارنامہ ہے ۔

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے غالب کی شاعری کے انسانی اور تہذیبی پہلوؤں پر خاص طور پر توجہ کی ہے اور اہی قدروں کو ان کی شاعری میں تلاش کیا ہے، جو مرد و معاشرہ دونوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی ہیں۔ ان پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے غالب کے تصوف کو خاص طور پر اپنے پیش نظر رکھا ہے، اس کا بڑا ہی عالمانہ تجزیہ کیا ہے اور یہ نتائج نکالے ہیں کہ غالب کے تصوف سے دلچسپی در حقیقت انسانی زندگی کو سمجھنے اور اس کو برتنے اور بسر کرنے کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ یہاں بھی بینوری نے غالب کو ایک فلسفی ثابت کیا ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ غالب ایک صوفی صافی ہے کہیں زیادہ۔ تصوف کے فلسفی ہیں۔ بینوری لکھتے ہیں: ”خالق غالب کے دل کا ایک آئینہ ہے، جس میں مظہر الہی اور مناظر قدرت کا جلوہ موجود ہے۔ اس کی زبان ترجمان حقیقت ہے، اس کے ہر کار تختل کا دائرہ امکان سے ہم کنار ہے۔ عالم کون و فساد میں ایک ذرے کی جنبش بھی، اس کے حلقہٴ غور سے باہر ہے۔ غالب فلسفی ہیں، جو شاعری کا جامہ زیب تن کیے ہوئے ہیں۔“ بینوری نے اس سلسلے میں وحدت الوجود کے تصور پر بڑی دلچسپ بحث کی ہے۔

غالب کی انسان دوستی پر بھی بینوری نے ایک نئے زاویے سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”سرزا غالب کی عبادت گاہ عرش و کرسی کے سامنے میں ہے۔ وہ تسبیح جس پر وہ اسمائے الہی کا وظیفہ پڑھتے ہیں، صد ہزار دائرہ ہے اور وہ دائرے اجرام فنی اور اجسام مادی ہیں۔ کعبہ اور تیغ کلیسا اور کبھی اس رفیع بارگاہ سے یکساں نظر آتی ہیں۔ جہاں عوام و خواص کا مذهب منہی ہو جاتا ہے، سرزا کے منہب کا آغاز ہوتا ہے۔“ اس کا مطلب یہ ہے کہ بینوری نے غالب کے ہاں انسانیت کی آواز سنی ہے اور مختلف عقائد نے انسانوں کے ذہنوں میں جو گہروں سے بنا رکھے ہیں اور جن کی آواز سے اختلافات کا بیج بویا گیا ہے، اس کو صحیح طور پر محسوس کیا ہے اور اس کی روشنی میں غالب کے کلام کی تنقید کی ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، بینوری کا مزاج رومانیت پسندی کی طرف مائل ہے۔ اس رومانیت پسندی نے غالب کی شاعری اور شخصیت کے بعض نئے گوشے ان کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب کیے ہیں۔ کیونکہ غالب خود

ایک رومانی مزاج شاعر ہیں اور ان کو سمجھنے کے لیے ایک رومانی مزاج نقاد کی ضرورت ہے۔ بجنوری کا تخیل کلام غالب کے بعض بالکل نئے پہلوؤں تک پہنچا ہے اور اس نے بعض ایسے نکتوں تک رسائی حاصل کی ہے جن تک کسی اور کا پہنچنا مشکل ہے۔ مثلاً ایک اپنے کی بات بجنوری نے غالب کے بارے میں یہ کہی ہے کہ غالب کو مناظر فطرت سے کہیں زیادہ شہروں کے ہر شور کیفیت اور اس کی رنگا رنگی سے دلچسپی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”غالب کے مشاہدات کنار دریا، دامن کوہ، لب جو سے بہت کم متعلق ہیں۔ مرزا کا جی لب دریا، خاموش سرخزاروں سے زیادہ شہروں کے ہر شور کوچوں میں لگتا ہے۔ جہاں زندگی شعاع منتشر کی طرح ہفت رنگ جلوہ دکھاتی ہے۔“ یہ ایک اہم تنقیدی نکتہ ہے کیونکہ غالب کی ساری شاعری تہذیب و تمدن کی ان رنگینیوں اور تابانیوں کی ترجمانی کرتی ہے، جس کو وہ عزیز رکھتے ہیں۔ ان کی دنیا بڑی حد تک ایک تہذیبی روایت تک محدود معلوم ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس دائرے سے باہر نکل کر زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر نظر نہیں ڈالتے، ایسا نہیں ہے۔ اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو اسی زاویے سے دیکھتے ہیں اور یہی ان کا معیار ہے۔ دراصل بجنوری یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ ایک تہذیبی روایت کی پیداوار تھے اور یہ تہذیبی روایت شہر کے ایوانوں اور شہستانوں ہی میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ غالب نے اس کی صحیح مصوری کی ہے۔ بجنوری کا تنقیدی نقطہ نظر غالب کی شاعری کے جالیاتی پہلوؤں کی طرف بھی جاتی ہے اور وہ اس کی تصویرکاری، کلام کی پہلو دار کیفیت، الفاظ کی حسین تراش اور رمز و ایما کی خصوصیت کا بھی تنقیدی جائزہ دیتے ہیں۔ بجنوری نے اس سلسلے میں غالب کے تخیل کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور ان تمام پہلوؤں کو اس تخیل کے تابع بتایا ہے۔

ظاہر ہے کہ بجنوری کی تنقیدی نظر کلام غالب کے تمام پہلوؤں پر پڑی ہے اور وہ اس کا صحیح جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی تنقید میں ایک عالمانہ انداز ہے لیکن اس عالمانہ انداز کے ساتھ ایک تاثراتی رنگ و آہنگ بھی اس میں نمایاں نظر آتا ہے۔ ان سے کسی مربوط قسم کے تجزیے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس وجہ سے کہ وہ طبیعت کے اعتبار

ہے ایک روسائی - مزاج فناد ہیں - لیکن غنشل کے توسط سے حقائق تک رسائی ان کا اہم تنقیدی کارنامہ ہے - اور اس اعتبار سے ان کا تنقیدی جائزہ تاثراتی اور روسائی ہونے کے باوجود اپنے اندر گہرائی رکھتا ہے -

حالی اور بجنوری نے غالب کے تنقیدی مطالعے کا ایک ماحول پیدا کر دیا ، جس کے نتیجے میں غالب کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہاؤں کو سمجھنے کی ایک نیا پیدا ہوئی - حالی اور بجنوری نے غالب کی تنقیدی تحسین اور تعارف کے چلو کو خاص طور پر اپنے پیش نظر رکھا تھا اور غالباً یہ اس صورت حال کا فطری ردعمل تھا جو غالب کو اپنے زمانے میں پیش آئی تھی - یعنی غالب کے تنقیدی مطالعے کی طرف جیسی توجہ ہونی چاہیے تھی ، وہ ان کے زمانے میں نہیں کی گئی تھی - اس خلاف کو حالی اور بجنوری نے پر کیا - اور ان کی چلودار شخصیت اور وسیع اور ہمہ گیر شاعری کا جائزہ لیا - اس مقصد سے کہ ان کی چلودار شخصیت اور شاعری کی اہمیت کا اندازہ ہو -

لیکن حالی اور بجنوری نے جس انداز میں غالب کی شخصیت اور شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا ، اس کا ردعمل بھی ہوا اور بعض مغربی معلم یا تہ ایسے بھی سامنے آئے جنہوں نے مغربی اصول تنقید کی روشنی میں ان کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی - اس میں شبہ نہیں کہ اس ردعمل میں مغرب کی بڑائی اور برتری کا وہ احساس یقیناً موجود تھا ، جو ایک زمانے میں پہاڑی زندگی میں داخل ہو گیا تھا - خود حالی اور خاص طور پر بجنوری کے ہاں اس کے اثرات ملتے ہیں - لیکن بجنوری نے مغرب کو سامنے رکھ کر غالب کی عظمت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے بعد ڈاکٹر عبداللطیف نے غالب کا جو مطالعہ پیش کیا ہے ، اس میں سختی سے مغربی تنقید کے اصولوں کو سامنے رکھ کر غالب کی شخصیت اور شاعری کا جائزہ لیا ہے اور تعریف و تحسین کی بجائے ان کی شخصیت اور شاعری کو دیکھنے کی کوشش کی ہے - اس سلسلے میں ان کی تنقید میں کبھی کبھی بھڑکی سی انتہا پسندی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور غالب کا تنقیدی جائزہ پوری طرح مکمل نہیں ہو پاتا - لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ڈاکٹر عبداللطیف نے جو مختصر سی کتاب غالب کے بارے میں لکھی ہے ، وہ ان کی دقت نظر پر دلالت

کرتی ہے اور اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شعر و شاعری کو سمجھنے کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور اس کے بنیادی اصولوں کو سامنے رکھ کر اپنے شاعروں کا جائزہ لینے کی صلاحیت ان کے اندر بدرجہ اتم موجود ہے۔

ڈاکٹر لطیف نے اپنی کتاب ”غالب“ میں حالی اور پشنوری کی تقلید کا ذکر کر کے، غالب کے مطالعے کی طرف توجہ کی اور کلام غالب اور اس کے تاریخی پس منظر، غالب کے مطالعے کے بنیادی مسائل، غالب کا نظریہٴ حیات، غالب کی شاعرانہ عظمت اور غالب کی شاعری کے ایسے اہم موضوعات پر بہت اچھی بحث کی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کہیں کہیں ان کا لہجہ سخت ہو جانا ہے اور اس کے نتیجے میں غالب کی بعض خوبیاں پوری طرح واضح نہیں ہوتیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اس لہجے کی وجہ سے غالب کی شاعری کے وہ پہلو جو درحقیقت ان کو اہم بناتے ہیں، وہ پس منظر میں جا پڑتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر لطیف کا بنیادی خیال یہ ہے کہ غالب کی شاعری میں احساس اور جذبے سے زیادہ ذہن اور شعور ملتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے لیکن جس طرح انہوں نے اس موضوع پر بحث کی ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذہن و شعور شاید شاعری کے لیے ضروری نہیں۔ غالب ان کے نزدیک اسی وجہ سے اہم شاعری نہیں ہیں کہ انہوں نے غیر ضروری چیزوں کو اپنی شاعری کی بنیاد بنایا۔ لیکن ڈاکٹر لطیف اس حقیقت کو قراؤش کر دیتے ہیں کہ شاعری ذہن و شعور ہی سے عنایت بنتی ہے۔ غالب کا کمال یہی ہے کہ انہوں نے اس ذہن و شعور کو اپنے ان تجربات کے سانچے میں ڈھالا ہے، جو صحیح شاعری کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ غالب کے ہاں فکری پہلو نمایاں ہے اور وہ انسانی زندگی کے بنیادی معاملات و مسائل کو فکری زاویہٴ نظر سے اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں۔ انسان، اس کے مختلف جذبات، حیات و کائنات اور اس کا پورا نظام ان کی شاعری کے خاص موضوعات ہیں۔ ان سب کو پیش کرنے میں ان کے ہاں فکری اور فلسفیانہ پہلو یقیناً غالب ہیں لیکن یہ تمام موضوعات غالب کے ہاں ان کے شاعرانہ تجربے کا جزو معلوم ہوتے ہیں، اور اسی میں ان کی بڑائی ہے۔

ڈاکٹر لطیف نے غالب کی نجی زندگی، ان کے معاشرق اور تہذیب

ماحول ، اس زمانے کے مختلف واقعات و حادثات کو خاص طور پر اپنے پیش نظر رکھا ہے ۔ اس طرح ان کا یہ تنقیدی جائزہ سماجی اور عمرانی حیثیت اختیار کر لیتا ہے ۔ لیکن ان کی طبیعت کی انتہا پسندی ، ان کے اس جائزے کو پوری طرح سماجی اور عمرانی تنقید کا اچھا نمونہ نہیں بناتی ۔

کلام غالب کو ڈاکٹر لطیف نے تین حصوں میں تقسیم کر کے دیکھا ہے ۔ ایک تو ان کے کلام کا وہ حصہ ہے ، جو ان کے خیال میں ذہنی سبق کا نتیجہ ہے اور جس میں وہی بلند پروازیاں ہیں جو نغزل گو شاعروں کے ہاں عام طور پر پائی جاتی ہیں ۔ دوسرا وہ حصہ ہے ، جن میں بیشتر اشعار غالب کے احساسات کے ترجمان ہیں ، لیکن جو ڈاکٹر عبداللطیف کے خیال میں شاعر کے ذہن کے لیے ہم محسوس تھے۔ ان اشعار میں غالب کا مخصوص نظریہٴ حیات نظر آتا ہے ۔ لیکن یہاں بھی ڈاکٹر لطیف نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ وہ روایتی الفاظ اور ترکیبوں کے پردے میں اپنے خیالات و نظریات کی وضاحت کرتے ہیں ۔ تیسرے حصے میں ایسے اشعار ہیں ، جن میں شاعر کے تجربے مکمل ہیں اور وہ پوری طرح محسوس کر کے بعض موضوعات کو پیش کرتے ہیں ۔ اس تیسرے حصے میں صنعت گری نہیں ہے اور اس میں گہرے شخصی اثرات کا رنگ و آہنگ نظر آتا ہے ۔

ڈاکٹر لطیف نے غالب کے کلام کے ان تینوں چلوؤں کو تنقیدی عمل کے سلسلے میں اپنے پیش نظر رکھا ہے ۔ اس کے بعد ڈاکٹر لطیف نے غالب کی شاعری کے فلسفیانہ چلو پر بحث کی ہے اور بعض الفاظ کو نقل کر کے ایک ایسے لہجے میں تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے کہ اس سے خود ان کے بنیادی خیال کی نفی ہو جاتی ہے۔ اور وہ بنیادی خیال یہ ہے کہ غالب کی شاعری میں ذہن و شعور ملتا ہے اور فلسفیانہ رنگ و آہنگ ان کے ہاں بہت نمایاں ہے ۔ مثلاً ان کا یہ لہجہ ”ذیل کے اشعار بہت سے معصوم دماغوں میں ہیجان پیدا کرتے ہیں ۔ پھر ایک شور اٹھے گا کہ یہاں نہ صرف فلسفہ بلکہ ایک عظیم فلسفہ موجود ہے ، جو فلسفے کی تاریخ میں اب تک کسی پر روشن نہیں ہوا تھا ۔ لیکن کیا واقعی ان اشعار میں فلسفہ یا کوئی نئی چیز ہے یا پھر ان کا یہ فکر بتلانے اس شعر میں کون سا فلسفہ ہے“ یا پھر یہ انداز کہ ”کہا اس میں کوئی نئی بات ہائی جاتی ہے؟“ حالانکہ جن اشعار کو سامنے

رکھ کر انھوں نے اس قسم کے قمرے لکھے ہیں ان میں گہرے فلسفیانہ لکھنے
موجود ہیں مثلاً یہ اشعار :

ہے ہرے سرحد ادراک سے اپنا سجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ بنا کہتے ہیں

منظر ایک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکان اپنا

جز نام نہیں صورت عالم بھلے منظور
جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگ سلیاں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

ڈاکٹر لطیف کا خیال یہ ہے کہ غالب کو وہ ہم آہنگی کبھی حاصل
نہیں ہوئی ، جو شاعرانہ تجربے کی بنیاد ہے اور جو عظیم شاعر کے لیے ضروری
ہے ۔ انھوں نے بعض مثالوں کو سامنے رکھ کر اس پر بحث کی ہے ۔ لیکن
ان کے ان خیالات سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا ۔ کیونکہ ان کے اندر تضاد
ہے ۔ ایک طرف تو وہ غالب کو ذہن و شعور کا شاعر کہتے ہیں اور یہ
لکھتے ہیں کہ غالب نے عظمت کبھی حاصل نہیں کی ۔ اس کے لیے خود
غالب ہی مورد الزام ہے ۔ عظمت اس میں موجود تھی لیکن اس نے اپنی
خود سری اور زندگی کے تنگ زاویہٴ نظر سے اس عظمت کو کچھ ڈالا ۔
اس کی بے اطمینانی خود اس بات کی مظہر ہے کہ وہ دنیا کو سمجھنے ،
زندگی کو برتنے اور کائنات کی محدود چیزوں کو تازے کی قابلیت میں
رکتا تھا ۔ ان خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور غالب کی
شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ایسی باتیں
کہی جاسکتی ہیں ، جن سے غالب کی عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور
جن سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ وہ زندگی کو سمجھنے اور کائنات کو دیکھنے
کا گہرا شعور رکھتے تھے ۔ اور یہ کہ انھوں نے اپنے آپ کو صرف اپنی
ذات تک محدود نہیں کیا تھا بلکہ اپنے آپ سے باہر نکلی کر زندگی اور
کائنات کے مختلف مظاہر کو دیکھنے کی کوشش میں کی تھی ۔ ڈاکٹر لطیف

نے یہ نتیجہ نکالا بھی ہے کہ غالب نے ایک منتشر زاویے کے سانے میں منتشر زندگی بسر کی اور ہمارے لیے ایسی شاعری چھوڑی، جو خود ہم آہنگی سے معرا ہے جس کا شمار منابیر عالم میں نہیں ہو سکتا۔ اس خیال کو خود وقت نے غلط ثابت کر دیا ہے۔ غالب کا شمار اس وقت، ایک شاعر کی حیثیت سے، منابیر عالم میں ہوتا ہے اور ہر زاویہ خیال رکھنے والا نقاد اس بات پر متفق ہے کہ ان کی شاعری ہم آہنگی سے معرا نہیں ہے۔ اس میں گہرا احساس اور جذبہ پایا جاتا ہے اور ذہن و فکر کی بھی بہت اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی شاعری نئی اعتبار سے ایک نہایت ہی حسین نگار خالہ ہے اور ان کا فن ان کے موضوع کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

حالی، مجنوری اور لطیف کی تنقیدوں سے غالب کے تنقیدی مطالعے کا ایک ماحول پیدا ہوا اور کئی اہم نقاد اردو تنقید میں ایسے سامنے آئے جنہوں نے غالب کی شاعری اور ان کے فن کے اہم پہلوؤں کو نئے زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں شیخ ہد اکرام خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب 'غالب نامہ' جو ہمد میں 'آثار غالب'، 'ارمغان غالب' اور 'محکم فرزانہ' کے نام سے بھی شائع ہوئی اگرچہ پوری طرح تنقیدی کتاب نہیں ہے لیکن اس میں جگہ جگہ تنقید کے بعض اچھے نمونے نظر آتے ہیں۔ اکرام صاحب کا رجحان اس کتاب میں تحقیق کی طرف بھی معلوم ہوتا ہے، اور انہوں نے تحقیق اور تنقید دونوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے اس انداز تنقید سے غالب کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور ان کے تنقیدی مطالعے کے لیے نئے امکانات سامنے آتے ہیں۔

اکرام صاحب نے غالب کی شاعری کا جائزہ لیا ہے اور اس سلسلے میں ان کے تغزل اور عنقیہ کیفیت پر اچھی بحث کی ہے۔ وہ غالب کو نفسیات محبت کا شاعر قرار دیتے ہیں اور اس نفسیات محبت کی نرجانی میں جو مختلف مقامات آتے ہیں، ان کو سامنے رکھ کر غالب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے غالب کی نجی زندگی اور ذاتی معاملات کا بھی جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ اس سے ان کے بنیادی غلط نظر اور انداز تنقید دونوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ دراصل وہ

اسی پس منظر میں غالب کی شاعری اور اس کے بنیادی خد و خال کو دیکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کے سامنے بعض ایسی تصویریں آتی ہیں، جو غالب کے دوسرے نقادوں کے سامنے نہیں آئیں۔ مثلاً غالب کی محبت اور غالب کی عشقہ شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں: ”غالب کی جوانی جس طرح حسن یروسی میں بسر ہوئی ہے، اس کا اندازہ کئی شہادتوں سے ہو سکتا ہے“ اور پھر مثالیں دے کر اس واقعے کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ”صحیح سند محبت نہ و فور جذبات ہے نہ فقط دل لگی بلکہ اس میں دونوں چیزیں ہوتی ہیں۔ غالب کی سلیم الخیالی کی داد دینی چاہیے کہ ان کی محبت میں دونوں اجزاء موجود ہیں۔“ روایتی طرز کی رومالوی شاعری بھی ہے اور محبت کو ایک سمجھنے کے حق میں جو موثر اظہار خیال انھوں نے حاتم علی سہر کے خط میں کیا ہے، اس کی مثال بھی اردو ادب میں نہیں ملتی لیکن بار بار خیال ہے کہ ان کا بنیادی نقطہ نظر رومالوی تھا اور دل لگی کے مضامین ان کے کلام میں اسی لیے آتے ہیں کہ ان کے متوازن تحت الشعور کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ و فور جذبات سے حسن تناسب جاتا رہے۔“ اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اکرام صاحب نے غالب کی شاعری کو نفسیاتی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ”غالب کی سلیم الخیالی قابل داد ہے لیکن معاشرے کے جو آئین تھے، ان کے تحت ایک ذکی الحس شاعر کے لیے صبر و قرار حاصل کرنا آسان نہیں تھا۔ بدقسمتی سے اپنے گھر میں انھیں وہ دل بستگی میسر نہیں تھی، جو ایک سے وابستہ کر کے دوسری تمام الجہنوں سے نجات دے دیتی۔ انھوں نے جو گہری محبت کی، اس کا سلسلہ موت نے منقطع کر دیا۔ اب معاشرہ جو کچھ انھیں پیش کرتا تھا، وہ یا تو روایتی شاعرانہ مشرق رومانیت تھی یا محض دل لگی۔ غالب کی زندگی میں یہ دونوں چیزیں موجود تھیں اور دونوں میں ذہنی کشمکش کا سامنا تھا۔ اب ان کی محبت ایک طوفان تھی۔ جس سے وہ پہلی فرصت میں گلو خلاصی کرانا چاہتے تھے۔ یہ کشمکش تھی جس کی وجہ سے انھیں نوازش خانہ کی صورت میں بھی بے قراری رہنی تھی۔“ اس بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اکرام صاحب کا رجحان تقلید کے نفسیاتی دبستان کی طرف ہے اور

انہوں نے غالب کی عشقہ شاعری کو دیکھتے ہوئے اس زاویہٴ نظر کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔

اکرام صاحب نے مجموعی طور پر غالب کا بہت اچھا تنقیدی مطالعہ اپنی کتاب میں پیش کیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض جگہ اس مطالعے کی کڑیاں بہت مربوط نظر نہیں آتیں لیکن جیسے جیسے اُنہوں نے، جو تنقیدی خیالات غالب کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر ظاہر کیے ہیں، وہ مطالعہٴ غالب کے سلسلے میں بعض نئے راستوں کو بنانے اور نئی منزلوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ۵۰ء تک کا زمانہ ایسا ہے، جب غالب کے تنقیدی مطالعے میں اعتدال اور توازن پیدا ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال اکرام صاحب کی تنقید بھی ہے، جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اکرام صاحب کی توجہ تمام تر تنقید کی طرف نہیں ہے۔ وہ تحقیق کی طرف بھی اپنا رجحان ظاہر کرتے ہیں اور غالب پر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا مقصد بھی بنیادی طور پر تحقیق ہے۔ اس تحقیق کو بنیاد بنا کر انہوں نے غالب کی زندگی، شخصیت اور کلام پر بحث کی ہے۔ ضعیفی طور پر اس میں تنقیدی پہلو بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ اکرام صاحب کے ساتھ ساتھ اسی زمانے میں ایسے لکھنے والوں نے بھی غالب پر تنقیدی مضامین لکھے، جن کا میدان بنیادی طور پر تنقید تھا۔ ان میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر حمید احمد خان، پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر احتشام حسین، خورشید الاسلام ممتاز حسین، آفتاب احمد خان اور محمد حسن وغیرہ کے نام سر فہرست ہیں، ان لکھنے والوں کے ہاں غالب کا مطالعہ مختلف تنقیدی زاویہٴ نظر سے ہوا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر ان سب نے غالب کے تنقیدی مطالعے کو بہت آگے بڑھایا ہے اور اس میں نئے امکانات کو تلاش کیا ہے۔

رشید صاحب نے کئی مضمون غالب کے بارے میں لکھے ہیں اور اس میں ان کا مخصوص تنقیدی اسلوب پر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ رشید صاحب کے ہاں تنقید کے تاثراتی، تاریخی اور تہذیبی رجحانات کا ایک نہایت ہی حسین امتزاج موجود ہے۔ غالب کے مطالعے میں بھی ان کا یہی انداز تنقید اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ اور اس انداز سے، اس میں شبہ نہیں

کہ غالب کو سمجھنے کا ایک نیا راستہ ملتا ہے ۔ رشید صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں : ”عو ہے اگر بوحیا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا ہے تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا ۔ غالب ، اردو اور تاج محل ۔ ہندوستان کی تہذیبی پیداوار ہیں اور ہندوستان کے سوا کہیں اور ظہور نہیں پا سکتے تھے ۔ ان تینوں میں ہندوستان کے صوری اور معنوی امتیازات چھلکتے ہیں“ ۔ ظاہر ہے کہ اس بیان میں تاثراتی انداز بھی ہے ۔ تاریخی اور تہذیبی شعور بھی ۔ رشید صاحب نے ان چند جملوں میں غالب کو ایک تہذیب کا نرجان اور ایک تہذیب کی جہانیاں اقدار کا عکاس ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے مخصوص تنقیدی اسلوب سے اس کو پوری طرح ثابت کر دکھایا ہے ۔

اس میں شبہ نہیں کہ رشید صاحب کا انداز تنقید بڑی حد تک تاثراتی ہے لیکن ان کا تہذیبی اور معاشرتی شعور انہیں کہیں کہیں ایسی باتیں کرنے پر بھی مجبور کرتا ہے، جن میں تجزیاتی رنگ و آہنگ کی جھلک بھی نظر آ جاتی ہے ۔ مثلاً لکھتے ہیں :

”وہ ”فارسی“ کے بڑے دلدادہ تھے ۔ فارسی کے اپنے ذوق و زبان پر بھروسہ اور فخر کرتے تھے ۔ لیکن ان کا مزاج جتنا گورانی تھا اتنا ایرانی نہ تھا ۔ جس طرح ان کی شاعری مسلم ہے ۔ اسی طرح ان کی ”سہگری“ بھی مسلم ہے ۔ ان کی شاعری کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات آسانی سے دریافت کی جا سکے گی کہ شاعری میں ان کا موضوع کچھ ہی ہوا ان کا لہجہ اور بیور مہابیانہ ہوتا تھا ۔ اکثر باغیانہ ! یہی نہیں کہ وہ ہار نہیں مانتے نہ خدا سے ، نہ حریفوں سے ، نہ زمانے سے بلکہ ہمیشہ ان سے نبرد آزما ہونے پر آمادہ رہتے تھے ۔ ان میں سے کہیں ہار مانتے بھی تھے تو کچھ اسی طرح کہ جیت غالب ہی کی معلوم ہوتی تھی ! اب یہاں ان کے اردو فارسی کے کلام کی کون اوراق گردانی کرے اور ثبوت میں بے شمار اشعار نقل کرے ۔ البتہ غالب کے طالب علم کے لیے یہ ایک اچھا اور مفید مشغلہ ہوگا ۔

”غالب کو بدل سے عقیدت تھی ۔ غالب کے کلام میں ایسے اشعار کافی تعداد میں مل جائیں گے، جہاں یہ معلوم ہوگا کہ انہوں نے

یہ دل کو سامنے رکھ کر یا یہ دل سے متاثر ہو کر شعر کہتے ہیں ۔
یہ دل غالب سے زیادہ مشکل پسند ہیں ۔ لیکن میرے نزدیک
غالب ، یہ دل سے یوں ممتاز ہیں کہ وہ یہ دل کی مانند اپنی تخیل یا
فکر میں گھوٹے نہیں جاتے ۔ غالب کہیں ہوں ، ان کا ناؤں زمین
ہی پر رہتا ہے ۔ کسی حال میں وہ ہم سے جدا ہونا یا جدا رہنا
گوارا نہیں کرتے ۔ غالب کی ارضیت میں ماورائیت اور ماورائیت
میں ارضیت ملتی ہے ، جس سے ان کے کلام میں دل آویزی اور رفعت
پیدا ہو گئی ہے ۔ یہ دل نے شاعری کے سب سے موٹے اصول کو نظر
انداز کر دیا کہ شاعری حقیقت کی آسان اور دل کش ترجمانی ہے
نہ یہ کہ آسان اور دل کش کو بھی درد سر بنا کر پستی کیا
جائے ۔“

ان اقتبالات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ رشید صاحب کا رجحان
تاثرائی ہونے کے باوجود تجزیے کی طرف ہے ، اس تجربے میں وہ معاشرت ،
تہذیب ، تاریخ ، ادب و شعر کے مختلف رجحانات ، ان سب کو اپنے بیش نظر
رکھتے ہیں اور ان کی روشنی میں غالب کی شخصیت اور شاعری کا
جائزہ دیتے ہیں ۔ اگرچہ ان کے اس تجربے میں تفصیل نہیں ہے لیکن بہر حال
وہ اس اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ غالب کا ایک تجزیاتی مطالعہ
ہے ۔

رشید صاحب کے ساتھ ساتھ پروفیسر آل احمد سرور نے بھی غالب پر
چند بہت اچھے تنقیدی مطالعے لکھے ہیں ۔ سرور صاحب پر رشید صاحب
کے اسلوب اور انداز تنقید دونوں کے اثرات موجود ہیں لیکن جہاں تک
تنقید کا تعلق ہے ، سرور صاحب کے ہاں رشید صاحب کے مقابلے میں زیادہ
باقاعدگی اور زیادہ گہرائی اور بھڑے میں تفصیل کا ہتہ چلتا ہے ۔ اس کا
سبب شاید یہ ہے کہ سرور صاحب بنیادی طور پر تنقید ہی کو اپنا میدان
سمجھتے ہیں ۔ اس لیے تنقیدی معاملات کی طرف انہوں نے زیادہ باقاعدگی
سے توجہ کی ہے ۔ ان کی تنقید میں تاثراتی انداز نہیں ہے ۔ البتہ اسلوب میں
ایک رنگینی اور ہرکاری ہے ، جو ان کے رومانی مزاج کو ظاہر کرتی ہے ۔
اس سے سرور صاحب کی تنقید میں بڑا ہی فن کارانہ انداز پیدا ہو گیا ہے
اور وہ ہر جگہ بہت ہی دل نشیں اور دل آویز نظر آتی ہے ۔ اس کو بڑھ کر

ایک مسرت کا احساس بھی ہوتا ہے اور ساتھ ہی تنقیدی حقائق بھی دل نشیں ہوتے ہیں۔ سرور صاحب اردو میں واحد نقاد ہیں جو تنقید میں رس اور رعنائی پیدا کرنے میں پیش پیش رہے ہیں۔ غالب پر جو تنقیدیں انہوں نے لکھی ہیں، ان میں بھی وہی رس اور رعنائی کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔

لیکن سرور صاحب کا یہ انداز تنقید در حقیقت ان کے گہرے تہذیبی شعور کی پیداوار ہے۔ انہوں نے غالب کو بھی اسی تہذیبی پس منظر میں دیکھا ہے اور ان کی شاعری کو اس تہذیب کی مختلف صورتوں اور کیفیتوں کا آئینہ دار ثابت کیا ہے۔ ان کے مترجمہ ذیل تنقیدی خیالات غالب کے تنقیدی مطالعے میں ہمیشہ اہم تصور کیے جائیں گے :

”ابتدائی دور کو چھوڑ کر، جب ان کی زود رنجی ان کی بے نیازی پر اکثر فتح پا جاتی ہے، غالب کے ہاں زندگی کا ایک طرح کا فلسفیانہ احساس ملتا ہے، جس میں رنج و راحت دونوں کے لیے گنجائش ہی نہیں بلکہ طلب بھی ملتی ہے، جیسے وہ اس کے قائل ہوں کہ ہنگامے ہی سے گھر کی رونق کے تمام پہلو ظہور پاتے ہیں اور زندگی کے ثبوت ہم پہنچاتے ہیں۔ نیز یہ کہ زندگی سے ایزار یا پریشان ہونا اتنی ہی بہت خیالی اور دوں ہستی ہے، جتنا کہ اس پر ہنس سکتے اور ہنگامے میں جمعیت خاطر دیکھ سکتے اور پالنے کی صلاحیت پیدا کرنا، ایک اعلیٰ اور قابل عمل نظریہٴ حیات ہے۔ یہی احساس ہے، جس نے رد و قبح، کرخنگی اور دل شکستگی کی تنگ و تاریک اور کھٹاک لگیوں سے نکال کر انہیں ان کی شاعری کے فلسفیانہ توازن اور بے نیازانہ خوش طبعی کی شاہراہ پر لا ڈالا ہے۔“

اس اقتباس سے سرور صاحب کی انداز تنقید کی پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے۔ ان کی تنقید میں تجزیے کا عنصر غالب ہے اور تجربہ کرتے ہوئے ان کی نظر ان عوامل اور محرکات کی تہ تک پہنچتی ہے، جو غالب کی شخصیت اور شاعری کو بنانے میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ سرور صاحب کے تنقیدی انداز میں ایک شگفتگی اور شادابی نظر آتی ہے، جو ان کے تخلیقی اور فن کارانہ مزاج کا نتیجہ ہے۔ سرور صاحب غالب کے بلند پایہ نقاد ہیں کیوں کہ ان کے مزاج کو سمجھنے میں جس

تخلیقی مزاج کا ہونا ضروری ہے ، وہ خصوصیت سرور صاحب کے مزاج میں بدرجہ اتم ہائی جاتی ہے اور ان کے مضامین اسی وجہ سے اردو تنقید میں غالب کے بہترین تنقیدی مطالعے تسلیم کیے جاتے ہیں ۔

سرور صاحب کے ساتھ ساتھ بعض ایسے نقاد بھی غالب کے مطالعے میں پیش پیش نظر آئے ہیں، جن کا زاویہٴ نظر ترقی پسندانہ ہے ۔ ان نقادوں میں سب سے زیادہ نمایاں نام پروفیسر سید احتشام حسین کا ہے ۔

احتشام صاحب نے غالب کے بارے میں بعض بڑے ہی اہم تنقیدی مضامین لکھے ہیں اور ان مضامین میں غالب کی شخصیت کے عوامل اور ان کی شاعری اور فن کے محرکات کو عمولیٰ زاویہٴ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے ۔ ان کے مضامین میں 'غالب کی بت شکنی' اور 'غالب کا تفکر' اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ ان مضامین میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ غالب اپنے زمانے کی بیداوار اور ایک عظیم تہذیبی روایت کے علم بردار ہونے کے باوجود اپنے زمانے کے باغی تھے اور یہ بغاوت ان کے فکر اور فن دونوں میں نمایاں نظر آتی ہے ۔ احتشام صاحب نے غالب کے مطالعے میں اس پورے تہذیبی ، معاشرتی اور معاشی پس منظر کو اپنے سامنے رکھا ہے ، جو غالب کے زمانے میں موجود تھا اور ان کو انہی تمام حالات کی بیداوار ثابت کیا ہے ۔ غالب کے مطالعے کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"غالب کے مطالعے کے سلسلے میں چند نظریاتی مباحث پر غور کرنا نہ صرف مفید ہوگا بلکہ ضروری بھی ہے کیوں کہ غالب اسیویں صدی کے اس ہندوستان میں پیدا ہوئے ، جو مخصوص روایات کا حامل تھا ۔ خاص طور پر اس طبقاتی نظام رکھتا تھا ، تاریخ ، مذہب اور فلسفے میں پوری طرح اس زمانے کی جھلک نہ تھی ، جو اس وقت کے معاشی اور معاشرتی انحطاط نے پیدا کی تھی ۔ بلکہ کچھ عقیدے روایت بن کر طرز فکر پر اثر انداز ہو رہے تھے ۔ یہ عقیدے اس زوال اور انحطاط کے زمانے میں پیدا نہیں ہوئے تھے ، جو غالب کا تھا بلکہ دوسرے تاریخی حالات اور مختلف نظام معاشرت نے انہیں جنم دیا تھا ۔ صدیوں نے ان میں طرح طرح کے خیالات و افکار کی آمیزش کی تھی ۔ خلف مذہبی اور فلسفیانہ بصورت ایک دوسرے میں پیوست ہوئے تھے ،

رد و قلع کی بہت سی منزلیں آئی تھیں اور کوئی ایسا نظریہ حیات اس وقت موجود نہیں تھا ، جو کسی ایک مذہب ، طبقہ ، گروہ یا مکتب خیال سے وابستہ کیا جا سکے ۔ ان حالات میں ایک روایت پرست شاعر یا ادیب کے لئے تو یہ ممکن ہے کہ وہ کسی مخصوص عقیدے کا سہارا لے کر اپنا رشتہ اس سے جوڑے اور بدلتی ہوئی زندگی سے پیدا ہونے والے سوالات سے منہ موڑ کر گذر جائے ۔ لیکن غالب کے سے شاعر کے لئے یہ خیال درست نہ ہو گا ۔ ان کے شعور کا مطالعہ اسی وجہ سے پیچیدگی پیدا کرتا ہے اور آسانی سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ چونکہ جاگیردار یا فوجی جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور مسلمان تھے ، اس لئے ان کے انکار و خیالات وہی ہوں گے ، جو اس گروہ اور مذہب سے تعلق رکھنے والوں کے ہوا کرتے ہیں ۔ تنقید اور تجزیہ کا یہ میکانیکی طریقہ صحیح نتائج تک پہنچانی نہیں کر سکتا ۔“

اس اثباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ احتشام صاحب غالب کو عمرانی بلکہ مارکسی زاویہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے غالب کا مطالعہ صرف انفرادی نفسیات کی روشنی میں کیا ہے ، ان سے احتشام صاحب نے اختلاف کیا ہے ۔ کیونکہ ان کے خیال میں :
 ”نفسیات خود خارجی عوامل کا نتیجہ ہے اور زبردست سے زبردست انفرادیت بھی مثبت یا منفی شکل میں ایک مابجی بنیاد رکھتی ہے ۔ نفسیاتی کیفیت خارجی حالات سے باہر کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتی ۔ اس لئے ہم اکرام کا غالب کی ساری تھریک اور کامیابی کو محض احساس کبہتری کا نتیجہ قرار دیتا ، نہ تو غالب کے شعور کا صحیح تجزیہ ہے اور نہ اصول تنقید ہی کے لحاظ سے درست ہے ۔“

احتشام صاحب نے غالب کی زندگی کے تمام واقعات کو سامنے رکھ کر تجزیاتی انداز میں ان کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کا سراغ لگایا ہے اور بعض ایسے حقائق کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے ، جو ایک صحیح مارکسی نقاد ہی کر سکتا ہے ۔

پروفیسر حمید احمد خان نے غالب کی بھی زندگی ، شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بعض بہت ہی قابل قدر مباحث لکھے ہیں ۔ ان

مضامین سے غالب کی شخصیت اور شاعری کے بعض نئے پہلوؤں کی نشان دہی ہوتی ہے۔ انہوں نے بعض ایسے لوگوں سے جنہوں نے غالب کو دیکھا تھا، کچھ ایسی معلومات فراہم کی ہیں اور ان معلومات سے استفادہ کر کے ان کی شخصیت کا مطالعہ اس طرح کیا ہے کہ اس سے غالب کو سمجھنے کے بعض نئے راستے ملتے ہیں۔ غالب کی شاعری میں حسن اور عشق کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور ان کے بہت سے خیالات و تصورات انہیں کے گرد گھومتے ہیں۔ حمید احمد خان صاحب نے ان دونوں پہلوؤں پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور ان کے عوامل اور محرکات کا سراغ لگایا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے برعنائم کے مسلمانوں کی تہذیبی روایت کے ذوقِ جہاں اور فکری پہلوؤں کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے اور انہی کی روشنی میں غالب کے تصورات حسن و عشق کو دیکھنے کی کوشش کی ہے لکھتے ہیں:

”غالب کے کلام میں اجتہاد کے چلو بہ چلو روایت کی پاسداری سے جو شغف ہے، وہ عشقیہ شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ غزل کے عاشق مجنوں سے لے کر پروانے تک اور روایتی معشوق لیلیٰ سے لے کر شمعِ محفل تک، سبھی یہاں موجود ہیں۔ ان اشعار کا پس منظر مغلیہ دور کی وہ معاشرت ہے، جو غالب کے معاصرین کے کلام میں بھی جھلکتی ہے۔ اس سے استفسار کہ غالب کے کلام میں اس سے زیادہ وسعت اور وضاحت مہیا ہوئی ہے لیکن یہ درجے کا فرق ہے، کیفیت کا نہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ معاشرتی پس منظر کے لحاظ سے غالب اور اس کے ہم عصر شعراء میں ایک بنیادی اشتراک ہے۔ اس مشترک کیفیت کے ہوتے ہوئے بھی، غالب کی شاعری میں حسن و عشق کا ایک الگ مقام ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ شاعر کی اپنی شخصیت اور اس کی شخصیت کے عکس نے حصہ ”کلام کو بھی ایک دوسری سطح پر پہنچا دیا ہے۔“

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ حمید احمد خان صاحب غالب کی شاعری کو ایک تہذیبی پس منظر میں دیکھتے ہیں اور ان کو اس روایت کا علم بردار سمجھتے ہیں، جو اس برعظیم کے مسلمانوں کی عظیم تہذیبی روایت

تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے غالب کو ایسے ماحول میں بھی دیکھا ہے، جو اسیویں صدی کی دلی میں موجود تھا۔ اس ماحول میں جو اجتہاد کی کیفیت تھی، اس کی جھلک انہیں غالب کی اس انفرادیت میں بھی نظر آتی ہے جو ان کا طرۂ امتیاز ہے۔

حمید احمد خاں صاحب نے غالب کے تنقیدی مطالعے میں اردو کے بعض دوسرے شاعروں کو بھی اپنے سامنے رکھا ہے۔ مثلاً میر حسن، جرأت یا ذوق وغیرہ کو سامنے رکھ کر انہوں نے غالب کے تصورات حسن و عشق پر تنقیدی بحث کی ہے اور اس طرح غالب کی انفرادیت کے نقوش کو زیادہ ابھارا ہے۔ اس کے علاوہ غالب کی زندگی کے نجی حالات اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ذہنی رجحانات اور جذباتی میلانات کو بھی انہوں نے غالب کے تنقیدی مطالعے کی بنیاد بنایا ہے اور ان کی فارسی اور اردو شاعری دونوں کو سامنے رکھ کر اپنے بنیادی تنقیدی خیالات کی وضاحت کی ہے۔ ان تمام بحثوں میں حمید احمد خاں صاحب اپنی تنقیدی بصیرت کا اظہار کرتے ہیں اور جگہ جگہ ان کے ہاں انسانی نفسیات کو سمجھنے اور اس کی روشنی میں شعر و شاعری کو دیکھنے کا رجحان ملتا ہے لیکن انسانی نفسیات کی باتیں کرتے ہوئے وہ صرف اپنے آپ کو نفسیات تک ہی محدود نہیں رکھتے بلکہ اس نفسیات کو بھی ایک تہذیبی روایات اور ماحول کے اثرات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید زیادہ متوازن اور جان دار نظر آتی ہے اور اس سے غالب کی شاعری کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔
(نامام)

مطالعہء غالب
کے
سوسال

گزشتہ سو سال میں غالب کی شخصیت اور شاعری کا تنقیدی مطالعہ مختلف لکھنے والوں نے مختلف زاویہ ہائے نظر سے ، مختلف انداز میں کیا ہے ، اور مختلف نتائج نکالے ہیں ۔ چنانچہ مختلف لکھنے والوں کے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں تاکہ یہ اندازہ ہو کہ گزشتہ ایک صدی میں اس تنقیدی مطالعے نے کیا کیا صورتیں اختیار کی ہیں ۔ اس میں کون کون سے رجحانات پیدا ہوئے ہیں اور اس نے کسی کسی طرح غالب کی شخصیت اور شاعری کے خد و خال کو نمایاں کر کے پیش کیا ہے ۔

ان اقتباسات کے متعلق کوئی بات اپنی طرف سے جان کر نہیں کہی گئی ہے ۔ کیونکہ ان کو پیش کرنے کا مقصد تنقید نہیں ہے ، صرف ان تنقیدی خیالات کو یک جا کرنا ہے ، جو غالب کے متعلق مختلف لکھنے والوں نے مختلف اوقات میں پیش کئے ہیں ۔ اس خیال سے کہ گزشتہ سو سال میں غالب کا جو تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے ، اس کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے آ سکے ۔

”امید قنصل ، امید اللہ خاں نام ، عرف میرزا نوشہ۔“

آیا و اجداد کا وطن سمرقند تھا ۔ مستقر الخلائک اکبر آباد میں پیدا ہوئے ۔ قابل ، پارس اور درد مند جوان ہیں ۔ بسر اوقات ہمیشہ خوش معاشی سے رہی ہے ۔ خاطر میں ریختہ گوئی کا ذوق ممکن ہے ۔ غمبائے عشق بھاز سینے میں موجود اور تربیت یافتہ ’ غم کدہ نیاز ۔ فن سخن سنجی میں میرزا عبدالقادر بیدل علیہ الرحمۃ کے محاوروں کا اتباع کرتے ہیں

اور رختہ محاورات فارسی میں سوزوں کرتے ہیں۔ بالجملہ اپنی طرز کے سوجد ہیں اور راقم کے ساتھ یک جہتی کا رابطہ مستحکم رکھتے ہیں۔ ان کے اکثر اشعار نازک مضامین کے ساتھ زمین سنگلاخ میں سوزوں ہوئے ہیں۔ بیش از بیش خیال بندی کا رویہ بیش بہا خاطر ہوتا ہے۔^{۴۴}

نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور: عمدۃ مستخبہ تذکرہ سرور اردو ترجمہ ۱۸۴۱ء

سرا خوشہ کے نام سے مشہور ہیں۔ بڑے معزز خاندان اور برائے ونیسوں کے گھرانے سے ہیں۔ اکبر آباد آپ کے قیام سے سر بلند تھا۔ اب دارالسلطنت شاہجہان آباد آپ کے قیام کی بدولت رشک اصفہان و شیراز ہے۔ چمن معانی کے طوطی بلند پرواز، اور گلشن رنگین بیانی کے بلبل نغمہ برداز۔ آپ کی بند خیالی کے مقابلے میں بلند آسمان ہستی زمین ہے اور ان کی گہرائی فکر کے سامنے فارون کرسی نشین معلوم ہوتا ہے۔ ان کا شاہین غزل سوائے عفا کے کسی کا شکر نہیں کرتا اور لرس طبیعت میدان فلک کے علاوہ جولانی نہیں دکھاتا۔ اگر آج کل قیمتی سرمائے کی تلاش مقصود ہو تو ان ہی کی دکان میں ملے گا۔ ایک مدت سے دائرۂ شعر و شاعری میں قدم ہے۔ شروع شروع میں اپنی دشوار پسند طبیعت کی بنا پر سراز عبدالقادر بیدل کے رنگ میں دقت آفرینیاں کیں۔ آخر میں آکر یہ رنگ چھوڑا اور دوسرا پسندیدہ رخ اختیار کیا۔ اپنے دیوان کو بعد تکمیل و ترتیب کے نظر انداز کر دیا اور اس میں سے بہت سے اشعار کو نکال دیا اور نہوڑا حصہ انتخاب کیا ہے۔ بہت عرصے سے رختہ کی طرف توجہ نہیں کی ہے۔ فارسی زبان میں بہت قدرت رکھتے ہیں۔ ان کا مراتب بڑے استادوں سے کم نہیں ہے۔ ان کی غزل مثل نظیری ہوتی ہے اور ان کا قصیدہ مثل عرق کے قصیدے کے بہت دل پسند ہوتا ہے۔ شعر کے مضامین کو پورے طور پر سمجھتے ہیں اور تمام نکات اور لطافتوں کی تہ کو پہنچ جاتے ہیں اور یہ وہ فضیلت ہے۔ جو صرف چند اہل سخن کو حاصل ہے۔ اگر نکتہ رس ہو تو یہ بات سمجھو گے کہ اگرچہ اچھا کہنے والے کہیافت ہیں لیکن شعر فہمی کا ملکہ رکھنے والے اس سے بھی کم ہیں۔ کیا کہنا اس شخص کا جس

کو یہ دونوں باتیں حاصل ہوں۔ مگر ایسے لوگ کم دکھائی دیتے ہیں۔ اگرچہ ان سے ملاقات صرف کبھی کبھی ہوتی ہے، لیکن حقیقی تعلق مستحکم ہے۔“

(نواب ہند مصطفیٰ خان شیفتہ کلشن بے خار اردو ترجمہ)

— — —

”اسد تخلص، اسم شریف ان کا نواب اسد اللہ خان چہادر معروف بہ مرزا نوشہ خاندان ضخیم اور رئیسائے قدیم، اکبر آباد نیکہ بنیاد کے مدت سے وارد شاہ جہان آباد خجستہ نہاد کے ہیں۔ ادیب لیب اس مرتبے کے ہیں کہ محبان ابن وائل مقابل اوج بلند خیالی ان کے حسیض جہل کا مبتلا، مشہور سخن فہم و سخن دان۔ اس بابہ پر مثنوی و کعب باوجود بلند۔ ان کی کے مانند بھون گھٹنوں چلنے والوں کے۔ ان کے حضور اشعار عارفانہ اور مضامین آزادانہ جملت وہ دیوان نظیری، رجز بے باکانہ اور نثر بے پروایانہ اس کی رشک وہ عبارت ظہوری۔ خوان ہنما اس کے سے انوری ایک ادنیٰ زلمہ رہا، خاقانی بھاروب کشی مستعد بسر و ہائے فیض سے کیوں کر لوگ فیض کو نہ چمچے جب کہ وہ اس کے ایک ادنیٰ شاگرد سے فیض کو پہنچا۔ صاحب دیوان و تصانیف ہے۔ مگر مدت سے فکر رختہ گوئی زبان اردو کا ترک کیا۔ مگر ایک دیوان جھوٹا سا اریب ہانچ جزو کے تصانیف نواب ممدوح سے نظر عاجز سے گزرا۔ اسی سے یہ چند اشعار بطور یادگار مندرج کلمتہ ہذا کے کہے گئے۔ مگر چونکہ نواب ممدوح حالت صبا سے آج تک شوق زبان فارسی کا رکھتے ہیں اور اشعار فارسی میں غالب تخلص لکھتے ہیں۔ چنانکہ ایک دیوان چالیس جزو کا زبان مذکور میں شاعر ممدوح کا قالب طبع میں آ چکا ہے۔ اس لیے اب فکر اشعار اردو کا نہیں کرتے۔“

(مواوی کریم الدین: کلمتہ نازنین: ۸۳۵ ع)

— — —

یہ (مراد دیوان غالب) فکر کے فلسفی خاندان کی سروقہ حسینہ ہے، جو سر بلند کر کے اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔ لا اباہانہ الدار میں غرام کرنے والی ایک پردہ دار ہے، جس نے چہرے سے مفتح اٹھا دیا ہے اور پردہ دری کے انداز میں دامن کمر تک لے آئی ہے۔ یہ

یوسف ثانی ہے اور حور نژاد معانی اس میں دوش بدوش دکھائی دیتے ہیں ۔
 یہ ایسا نرگس زاو ہے ، جس کے جلوے کو دیکھ کر لوگ ہولے ہولے ہاتھ اور
 حیرت زدہ ہو جاتے ہیں ۔ یا آب اسے دور تک بھیلا ہوا ایک نفیس ریشمی
 کپڑا سمجھیں ، موتیوں سے مزین ، جسے آسمان پر ستارے آگے ہونے ہوں ۔
 ایسا محل ہے ، جو ملک بھر کے شہروں کے لیے رونی کا موجب ہے اور
 جو چین کے سینکڑوں نکار خانوں کی شان و شوکت کو ملامت کرنے
 والا ہے ، یا اسے روشن چراغ کہا جائے ، جس کے ارد گرد ذہین اور طباع
 لوگ پروانوں کی طرح طواف کرتے ہیں ۔ ہاں یہ آسمان سے اترا ہوا پہلے
 ہے ، جو غرزانوں کے لیے حرز بازو کا کام دیتا ہے ۔ اب آب کہہ آئیں گے
 یہ حضرت میکئیل جیسا پاک سیرت مومل ہے ، جس نے ایک فراخ فرش
 بیجا دیا ہے اور شعر و سخن کے گرسنہ چنموں کو صلائے عام دی ہے ۔
 بیت اللہ کی طرح ایک مقدس معبد ہے ، جس کی کابضہ فہم درست کے ہاتھ میں
 دے دی گئی ہے اور اس کے دروازے نے مزدلفہ کے احرام بندوں کے
 دل کو کشادگی عطا کی ہے ۔ یا اسے منات خیال کیجئے ، جو ژنار بندان خیال
 اور جبین سانی کرنے والوں کے لیے ایک صنم کدہ ہے ۔ ہاں یا بھر یہ
 ارتک ہے ، جو بدیع و غریب نقوش کی نمائش کر رہا ہے ، جسے دیکھ کر
 مانی و اورنگ اظہار عجز کے طور پر اپنی پشت دست زمین پر رگڑتے ہیں ۔
 ان اوراق کے ایک ایک صفحہ کو وہ مقدس بڑھنے والا برہمن سمجھتے ۔
 اس کتاب کا ہر ورق ایک موند ہے ۔ ایک جہاں نما آئینہ خانہ ، ایک مصفا
 مقام ، جس میں مریم کردار پردہ نشیں غیموں میں بٹھلے ہوئے ہیں ۔ اس میں
 ایسے شوخ چشم بھی ہیں ، جو شاہدان بازاری سے بھی زیادہ پردہ دری کرتے
 ہیں ۔ جہاں نبی دست بھی ملیں گے ، جو قونگر دل ہیں اور ایسے آزاد فطرت
 لوگ بھی نظر آئیں گے ، جو پا درگل ہیں ۔ اپنے آپ پر شیدا عناق طیت ،
 حسن دل رکھنے والے سادہ پیکر ، زہرہ زن ، ہاروت ہشہ ماہ جبین ، بابل میں
 مسکن رکھنے والے ، سر تا پا گویا آمود ہریو ، یہ سب جہاں دکھائی دیتے
 ہیں ۔ جہاں آپ کو قنزم انعام سمندر (آتشیں کیڑے) بھی ملیں گے اور آگ سے
 بھرا ہوا سینہ رکھنے والے ٹھنک بھی ۔ بڑے بڑے سفید مغز محبوب ، جن کا مغز
 پختہ ہے تو پوست لطیف ۔ مست بادہ انعام ، از خود رفتہ لیکن دامن شکایتی
 ہاتھ میں لیے ہوئے ۔ ہندی صنم مگر ہارسوں کی غرابو رکھنے والے ،

دہلی نژاد لیکن اسمہاں والوں کی طرح ہر فرد ۔ ہاں ہاں امید و بیم کی کیفیت دل میں نے کمر میں کہتا ہوں کہ جو کچھ میں نے پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ بالیقین اُردو زبان کے اُس منتخب اُردو دیوان کے متعلق ہے، جو اعجاز مسیحائی رکھنے والی کلک کا پاکیزہ ترشح ہے اور اس قلم کو چلانے والا عقل کے لیے نوازوے عدل ہے اور بصیرت کے لیے اضطراب ہے، جس سے وہ اجرام فلکی کے احکام معلوم کرتی ہے۔ اے جوہر آئینہ آفرینش، معیار نقد گرامتائی اور بلند ہائیک کے فردبان کا معراج کہے تو جا ہے۔ و الواقعہ یہ شاعر کرامی منزات قلمرو معنی بروزی پر مصروف ہے، سختوری کی ولایت کا فرماں روا ہے، نو آئین نگاری کے جہان کا مالک ہے۔ نازہ گفتاری کے جہان کا سالار، سخن گستری کے وجود کو حیات نو بخشنے والا، دیدہ وری کی آنکھ کو بیانی بخشنے والا، جس کی وجہ سے قلم کی شان و شوکت بلند ہوئی اور دولت کے خانوادے کا چراغ روشن ہوا۔ وہ آیت اللہ جس نے دوسرے شاعروں کی شہرت کو منسوخ کر دیا۔ ہاں ہاں وہی جو سرخیل انجمن نکتہ دانان ہے۔“

سرمید احمد خاں : آثار الصادقہ : ۸۴۷ ع (اُردو ترجمہ)

غالب تخلص۔ شہر نیستان سختوری، ہمیشہ معنی بروزی، یکم ناز عرصہ کمال، پگندہ کشور افضال، سیاح زمین سخن دانائے فوائد فن، زبدہ کملائے جہان، مرزا آمد اللہ خان معروف بہ میرزا نوسہ سلمہ الرحمن۔ سخن حنچ بے مثل و نظیر اور صاحب طرز دل پذیر ہے۔ خاصہ گوہر بار ہے اقلیم سخن میں لوائے جہانگیری بلند کیا ہے اور ہوسف معنی کو اس پجوم بے کمیزی میں زلیخا منشان مصر سخن کی نظر میں اوجہ بند کیا ہے۔ فضائل اگر اس قدوۃ افاض کی ذات پر تکیہ نہ کرتے، فضیلت نہ رکھتے اور کہلات اگر اسی زبدہ کملا سے مدد نہ لیتے، عالم کی تکمیل کا سبب نہ ہوتے۔ سپاہی رقوم اس کی رنگینی معنی سے ہم شکل طاؤس، صفحہ قرطاس اس کے فروغ مضامین سے ہم رنگ فانوس۔ برق طلوع اگر اس کی تجلی معنی کے مقابل ہوتی، سرمہ ہو جاتی۔ شعاع این اگر اس کے شعاع فکر کے سامنے آتی، فروغ نہ پاتی۔ ایوان سخن اس کے فکر معموری سے آسمان کے ساتھ ہم رفعت، بنائے کلام اسی کی طبعیت کی مدد سے نافہ

کے ساتھ ہم متانت - وصف یزم میں رفتار قلم رقص ناپید کے برابر ، بیان یزم میں سریر خامہ نعرۂ شیر سے ہمسر - فکر اگرچہ حوصلہ بہمت کے لائق جہد کرے ، مضامین لامکان مرحلہ مقصود کے دو برو دیدہ دور سے تنگ تر نظر آئے - خیال اگر اندازۂ قدرت کے موافق بلندی پر جائے ، خزانہ تخت العرش کو اس جائے کاہ رفیع سے گنج قارون سے بہت تر ہو جائے - سخن کی فراوانی اور ہجوم معانی اور متانت تراکیب اور رشاقۂ اسالیب اور شوخی اشارات اور جسی عبارات - کہ اجمال کی رعایت سے آفتاب کو لباس ذرہ میں جلوہ دینا اور کہ تفصیل کے اقتضا سے ہم کو نہال کی صورت میں نشو و نما بخشنا - جدائی کو فصل اور ملاقات کو وصل کے قیل سے ٹھہرا کر مباحث سخن میں بلاغت کے ساتھ ادا اور حسن و زوائد سے یزم کلام میں مثل صحبت زیادہ اجتناب کرنا - اور اسی طرح اور باتیں جو لوازم سخن اور مقتضیات فن سے ہیں ، جیسے اس ناظم کشور کمال میں مناسبت ہوتی ہیں ، کم کسی میں دیکھی گئیں - ایات رختہ ، ہارت رختہ ، دقائے فارسی جواہر قدسی کا رختہ - ہر چند اشعار رختہ حد حصر سے خارج اور اندازۂ شہار سے انزوں تھے - لیکن از بس کہ کمر بار اور دہان دلداز کا مضمون زوب اشعار ہوتا ہے ، انہیں مضامین کی رعایت سے اختصار کو پسند کیا اور چند بیتیں دلبروں کے لب کے مانند قطعہ انتخاب کے خال سے مزین کر کے ایک دیوان مختصر مرتب کیا - اور مجموعہ فارسی کا نو دیوان عشر سے بھی زیادہ اور پر غوغا اور ایات بلند خدا سے مملو اور مشحون ہے -

(مرزا قادر بخش صابر : گلستان سخن : ۱۸۵۵ء)

فخر عرق و غیرت طالب میرزا نوشہ اسد اللہ خان الحطاطیہ
 بہ نجم الدولہ، دبیر الحکومت نظام جنگ بھادر - اتراسباب کی نسل سے تھے -
 اکبر آباد میں مولد تھا اور دہلی مسکن - لفظ "محریب" تاریخ ولادت ہے -
 وفات ۱۲۸۵ھ میں واقع ہوئی - "ہنج آہنگ" ، "دستبوی" ، "سہر نیم روز" اور
 "قاطع برہان" ان کی تالیفات میں سے ہیں - فارسی زبان میں بھی ایک دیوان
 رکھتے ہیں - ایات کا مجموعہ ۴۲۴ ہے - اول اول مرزا بیدل کی روش
 اختیار کی - آخر الامر بڑا پستیدہ انداز ایجاد کیا - اپنے دیوان رختہ میں

ہے بہت سے اشعار نکال دیے ہیں اور قلیل تعداد میں انتخاب کر لیے ہیں ۔ چلے اسد تخلص کرتے تھے ، جو غزلیات کے بعض مضمون میں اب بھی موجود ہے ۔ عیاس سال ان کی مدت متقی ہے ۔ فارسی گوئی میں ان کا ہا یہ اصول شعراء سے کم نہیں اور ریختہ کی حالت بھی یہ ہے کہ اگر ان کا کوئی ہم مرتبہ ہے تو لائیں ۔ اگر حقیقتہً نظم کے لیے نوبہار ہیں تو عرصہٴ نثر میں بھی مردکار ہیں ۔ جمیع اصناف سخن پر جو قدرت انہیں حاصل ہے ، بیان سے باہر ہے ۔ کیا ہر شخص نہیں چاہتا کہ بعض مضمون اپنی توجہ صرف غزل کی طرف معطوف رکھتے ہیں اور غزل کے بغیر اور کچھ نہیں کہہ سکتے اور بعض کا راس الہال تو صرف قصیدہ ہوتا ہے اور قصیدے کے علاوہ اور کسی صنف سخن میں ان کی کوئی چیز قابل توجہ نہیں ہوتی ۔ علوی ہذا القیاس لیکن غالب ایسا مسحور ہے کہ اگر زمین غزل کہہ دیکھا جائے تو اسے اس نے آسمان پر پہنچا دیا اور اگر مثنوی کا میدان ہے تو اس کا ہا۔ مال شدہ ۔ قصیدے میں وہ غزل کے ہم ہا یہ ہیں اور ان کی غزل نظیری کی طرح گراں بہہ ہے ۔ اور یہ بات بڑی تعجب انگیز ہے کہ جس وادی میں قدم رکھتے تھے ، سرعت تمام سے اسے طے کر لیتے تھے اور اس کے باوجود فروغ مضامین ، جذباتی ترکیب ، شوکت الفاظ ، رنگینی معنی ، متانت بیان اور شستگی زبان کے اوصاف جو کم تر شعراء کو بالقوہ میسر تھے ، انہیں بالفضل عطا ہوئے تھے ۔ دوسرے شعراء کے سلسلے میں جو مبالغہ کہا جا سکتا ہے ۔ وہ غالب کے معاملے میں حقیقت ہے ۔ انصاف ہمیشہ بالائے طاعت ہوا کرتا ہے ۔ اگر الفصل للمعقبین کے مطابق میں اسے اسانڈہ قدیم کے ہم مرتبہ کہتا تو دیوانہ بھی نہیں کہ ان سے اسے بہت تر کہوں ۔ غالب کمال سخنوری کے ساتھ ، کمال سخن فہمی بھی رکھتے تھے اور جیسا کہ چاہتے شعر سے خوب لطف حاصل کرتے تھے ۔ حضرت شیخہ لکھتے ہیں : ” وہ مضامین شعری کو کما حقہ سمجھتے تھے اور شعر کے تمام نکات اور لطائف تک رسائی حاصل کر لیتے تھے “ اور یہ ایسی فضیلت ہے جو صرف بعض اہل سخن کے لیے مخصوص ہے ۔

(ذید نور الحسن خان : طور کلیم : ۱۸۷۸ ع ، اردو ترجمہ)

اسد اللہ خان مرزا نوشہ خلف مرزا عبداللہ بیگ خان عرف مرزا دولہا : قوم ان کی ایک ہے ۔ اقوام ترک جد اعلیٰ ان کے ماوراء النہر سے ہندوستان

میں آئے اور نواب نجف خاں کے عہد میں منصب دار شاہی رہے۔ جب ریاست مغلیہ پریم ہوئی، ملازم مہاراجہ جسور ہوئے اور بود د ہاش شہر آگرہ میں اختیار کی۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں ان کے والد ماجد غلام حسین خاں کمیدان توطن شہر آگرہ کے جہاں منسوب ہوئے اور مرزا نوشہ وہیں پیدا ہوئے اور تا سن نمور وہیں مشغول تحصیل کتب درسیہ عربی و فارسی رہے۔ ابتدا میں شیخ معظم نامی ایک معلم سے کچھ تعلیم پائی، پھر ایک ایرانی آتش پرست سیاح سے، جس کا نام آتش پرستی میں اُورمزد اور بعد قبول اسلام عبدالصمد تھا، ملوث ہوا۔ دو برس وہ ان کے مکان پر مقیم رہا اور زبان فارسی سکھائی۔ جب سن گمیز کو پہنچے مرزا اللہ بخش خاں معروف دہلوی کے جہاں منسوب ہوئے اور شہر دہلی میں توطن اختیار کیا۔ معلومات ان کی زبان فارسی میں کالشمی فی رابعۃ النہار آشکار ہے، نثر و نظم اردو کی چار دانگ ہندوستان میں پکار ہے۔ تالیفات و تصنیفات کے نام یہاں لکھے جاتے ہیں: فارسی میں کلیات جس میں غزلیں و دیف وار ہیں اور قطعات اور قصائد اور رباعیات اور مثنویاں سب قسم کے اشعار ہیں۔ 'قادر نامہ' جو خانی باری کی طرز پر سوزوں کیا ہے۔ 'سہر نیم روز' اور 'نام نیم ماہ' یہ نثر میں دو تاریخیں ہیں۔ تاریخ اول میں شاہ تیمور سے پہلوں تک حال لکھا ہے اور تاریخ ثانی میں عہد جلال الدین اکبر بادشاہ سے جہاد شاہ کے عہد تک احوال ضبط کیا ہے۔ 'مستنبو' جس میں غنر کے واقعات ہیں۔ 'قاطع برہان' جس میں 'برہان قاطع' کی بعض لغات پر غنشات ہیں۔ 'پنج آہنگ' اس میں فارسی زبان کی مشآت ہیں۔ اردو میں ایک دیوان اور 'اردوئے معلیٰ' اور 'عود ہندی' ان دونوں میں اردو زبان کے خطوط ہیں۔ العاصل مرزا صاحب کی طباطبائی اور ذکابٹ ان کے نتائج افکار سے پیدا ہے۔ بات سے بات پیدا کرنا تمام کلام سے ہوتا ہے۔

(منشی امیر احمد امیر مینائی: انتخاب یاد کار: ۱۸۷۹ء)

مرزا صاحب کو اصلی شوق فارسی کی نظم و نثر کا تھا اور اسی کمال کو اپنا فخر سمجھتے تھے، لیکن چونکہ تصانیف ان کی اردو میں بھی چھپی ہیں اور جس طرح امرا و روسائے اکبر آباد میں علو خاندان سے نامی اور میرزائے فارسی ہیں، اسی طرح 'اردوئے معلیٰ' کے مالک ہیں۔ اس لیے واجب ہوا کہ ان کا ذکر اس تذکرے میں ضرور کیا جائے۔

اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے مضامین و معانی کے پیشے کے شیر تھے۔ دو ہائیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ اول، کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کا شیوہ خاص تھا، دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے انہیں طبعی تعلق تھا، اس لیے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں، لیکن جو شعر صاف صاف نکل گئے ہیں، وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے۔

ان کے خطوں کی طرز عبارت بھی ایک خاص قسم کی ہے کہ ظرافت کے چٹکلے اور لطافت کی شوخیاں اس میں خوب ادا ہو سکتی ہیں۔ یہ انہی کا ایجاد تھا کہ آپ مزا لے لیا اور اوروں کو لطف دے گئے، دوسرے کا کام نہیں۔ اگر کوئی چاہے کہ ایک تاریخی حال یا اخلاق خیال یا علمی مطالب یا دنیا کے معاملات خاص میں سراسلے لکھے تو اس انداز میں ممکن نہیں۔

(مولانا محمد حسین آزاد: آب حیات: ۱۸۸۰ء)

یہ وہ خوش مذاق شخص گزرا ہے، جس نے ہندوستان کی فارسی شاعری اور اردو نثر کو تہذیب کا خلعت عطا کیا۔ میرے نزدیک ہندوستان کے کلام فارسی پر ولایتی فارسی کا یقین چار شخصوں کے کلام پر ہوا۔ اول اسیر خسرو، دوم حسن دہلوی، سوم مرزا یزدان، چہارم غالب۔ اگرچہ ناصر علی سرہندی اور مرزا جان جاناں مظہر اور غنی کشمیری اور غنیمت اور خان آرزو اور آزاد بلگرامی اور میر انصاری بلگرامی اور امام بخش صاحبانی اور شاہ الفت حسین فریاد یہ سب کے سب خوش گو اور شاعر بے بدل تھے مگر جامعہ ایجاد، جو خداداد ہے انہیں چاروں کی راست قاست پر راست آیا اور ان چاروں کے سوا جن کے نام نامی لکھے گئے ہیں، ان پر بھی فقر گفتاری کا غامکہ ہوا۔ گو ان کے سوا اور بھی شعرائے فارسی ہندوستان میں ہوئے ہیں مگر ان لوگوں کی غویوں کو نہیں پاتے اور یہ لوگ ان چاروں کی شہرت ایجاد نہیں حاصل کر سکتے۔ یہ تو خدا کی دین ہے۔

ہندوستان کی فارسی شاعری کا کہ شمس الدین فقیر دہلوی کے وقت سے ایک طرز خاص سلامت اسیر شروع ہوا تھا، رنگ ہی بدل دیا اور بڑی

ہمت کر کے فارسی کو بھر ولایت کی کمری پر بٹھایا۔ ان کے کلام سے ظاہر ہے۔

اُردو نظم بھی ایک طور خاص کی کہی۔ اس میں بھی ایجاد خاص ہے۔ آخر میر تقی کا رنگ بالکل اتار لیا۔ اوائل میں حضرت نے ناسخ کی ایجاد پر توجہ فرمائی اور فارسی گوئی کی عبارت سے اس کو بلند کر دیا یعنی نہ ناسخ کی ضرورت نہ دہلی کی۔ دف ہندی کے ساتھ ترکیب و بندش فارسی زیادہ کر دی یہاں تک کہ سوائے فعل کے کوئی لفظ ہندی اکثر شعروں میں نہیں آیا۔

اُردو نثر میں بوری واقعہ نگاری کا ایجاد انہیں کا ہے، ورنہ اس سے پہلے مرصع اور مسجع غیر واقع نثر لکھی جاتی تھی۔ 'اُردوئے معلیٰ' انہیں جواہر بھرے خطوط کا مخزن ہے، جس میں اس نئی ایجاد کا رنگ ہے۔ (سید فرزند احمد صلیب بلگرامی : تذکرہ جلوہ خضر : ۱۸۸۳ء)

مرزا نے کل رعنا کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں نے اول اُردو زبان میں شعر کہنا شروع کیا تھا، اس لیے ہم بھی پہلے اُن کے اُردو دیوان کا ذکر کرتے ہیں۔ جس روش پر مرزا نے ابتدا میں اُردو شعر کہنا شروع کیا تھا، طبع نظر اس کے کہ اس زمانے کا کلام خود ہمارے پاس موجود ہے، اُس روش کا اندازہ اس حکایت سے بخوبی ہوتا ہے۔ خود مرزا کی زبانی سنا گیا ہے کہ میر تقی نے جو مرزا کے ہم وطن تھے، اُن کے لڑکپن کے اشعار من کر یہ کہا تھا : ”کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اُس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ سہل بکتے لکھے گا۔“

مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر ملا عبدالصمد کی تعلیم کے سبب فارسی کا رنگ ابتدا ہی میں مرزا کے بول چال اور اُن کی قوت متخیلہ پر چڑھ گیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر ذکی الطبع لڑکے ابتداء میں سیدھے مادے اشعار کی نسبت مشکل اور پیچیدہ اشعار کو جو بغیر غور و فکر کے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے، زیادہ شوق سے دیکھنے اور پڑھنے ہیں، مرزا نے لڑکپن میں بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا، چنانچہ جو

روض مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختراع کی تھی، اسی روض ہر مرزا نے اردو میں چلنا اختیار کیا تھا، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں :

طرز بیدل میں رشتہ لکھنا

احمد اللہ خان قیاس ہے

مرزا کے حق میں جو پیش گوئی میر تقی نے کی تھی، اس کی دونوں شقیں ان کے حق میں پوری ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ مرزا اول اول ایسے رشتے پر پڑ لیے تھے کہ اگر استقامت طبع اور سلامت ذہن اور بعض صحیح مذاق دوستوں کی روک ٹوک اور لکتہ چیں ہم عصروں کی خردہ گیری اور طعن و طعریض سد راہ نہ ہوتی تو وہ شدہ شدہ منزل مقصود سے بہت دور جا پڑتے۔ سنا گیا ہے کہ اہل دہلی شاعروں میں، جہاں مرزا بھی ہوتے تھے، نعرہضاً ایسی غزلیں لکھ کر لاتے تھے، جو الفاظ و ترکیبوں کے لحاظ سے نوعیت پر شوکت و شان دار معلوم ہوتی تھیں، مگر معنی نادر، گویا مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے۔

مرزا نے اس قسم کی لکتہ چینیوں پر اردو اور فارسی دیوان میں جا بجا اشارہ کیا ہے۔ اردو میں ایک جگہ کہتے ہیں :

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر غیب میں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

ایک اور اردو غزل کا مطلع ہے :

گر خاموشی سے فائدہ اٹھائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی حال ہے

مرزا کے ابتدائی کلام کو سہل و آسان سمجھو یا اس کو اردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو، مگر اس میں شک نہیں کہ اس سے ان کی ارجنٹائی اور غیر معمولی اہج کا خاطر خواہ سراغ ملتا ہے اور یہی ان کی تڑھی ترجمانی چالیں ان کی بلند فطرت اور غیر معمولی قابلیت و استعداد پر شہادت دیتی ہیں۔ معمولی قابلیت و استعداد کے لوگوں کی معراج یہ ہے کہ جس ہنگ ذلتی پر انکی بوڑھوں کا کلمہ چلا جاتا ہے، اسی پر آنکھیں بند کر کے کلمے کے بیچھے بیچھے ہو لیں اور ایک سے ادھر ادھر آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں۔ جو ہنر یا ہنہ اختیار کریں اس میں انکوں کی چال ڈھال ہے

سر مو تجاوز نہ کریں اور ان کے نقی لدم پر قدم رکھنے چلے جائیں ۔ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے ایسا نہیں کرتے ، بلکہ دوسرے رستے پر چلنا ان کی قدرت سے باہر ہوتا ہے ۔

برخلاف اس کے جن کی طبیعت میں ارجحیت اور غیر معمولی اہج کا مادہ ہوتا ہے ، وہ اپنے میں ایک ایسی چیز پالتے ہیں ، جو اگلوں کی نیروی پر ان کو مجبور نہیں ہونے دیتی ۔ ان کو قوم کی شاہ راہ کے سوا بہت سی راہیں ہر طرف کھلی نظر آتی ہیں ۔ وہ جس عام روش پر اپنے ہم فنوں کو چلتا دیکھتے ہیں ، اس پر چلنے سے ان کی طبیعت ابا کرتی ہے ۔ یہ ممکن ہے کہ جو طریق غیر مسلوک وہ اختیار کریں ، وہ منزل مقصود تک پہنچانے والا نہ ہو ، مگر یہ ممکن نہیں کہ جب تک وہ دائیں بائیں چل پھر کر طبیعت کی جولانیاں نہ دیکھ لیں اور تھک کر چور نہ ہو جائیں ، عام راہ گیروں کی طرح آنکھیں بند کر کے شارع عام پر بڑ جائیں ۔

مرزا کی طبیعت اسی قسم کی واقع ہوئی تھی ۔ وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک چڑھاتے تھے ۔ وہ خست شرکا کے سبب خود شاعری سے نفرت ظاہر کرتے تھے ، غائبانہ خیالات اور محاورات سے جہاں تک ہو سکتا تھا ، اجتناب کرتے تھے ۔

مرزا کے اردو کلام میں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ، غزل کے سوا کوئی صنف شہار کے قابل نہیں ہے ۔ مرزا کی موجودہ غزلیات گو بہ مقابلہ بعض شعراء کے تعداد میں کسی ہی قلیل ہوں ، لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں ، وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے دیوان کے انتخابی اشعار سے کم نہیں ہیں اور جس قدر بلند اور عالی خیال مرزا کے ریختہ میں سے نکلیں گے ، اس قدر کسی ریختہ کے کلام میں نکلنے کی توقع نہیں ہے ؛ البتہ ہم کو مرزا کے عمدہ اشعار کے جانچنے کے لیے ایک جداگانہ معیار مقرر کرنا پڑے گا ۔ اسید ہے کہ اہل الصاف تسلیم کریں گے ۔

میر و سودا اور ان کے مقلدین نے اپنی غزل کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے کہ جو عاشقانہ مضامین صدیوں اور قرونوں سے اولاً فارسی اور اس کے بعد اردو غزل میں ہندھتے چلے آئے ہیں ، وہی مضامین بہ تبدیل الفاظ اور بہ تغیر اسالیب بیان عامہ ، اہل زبان کی معمولی بول چال اور

روز سرہ میں ادا کیے جائیں ، چنانچہ میرے لیے کر ذوق ، تک جتنے مشہور غزل گو مرزا کے سوا اہل زبان میں گزرتے ہیں ، ان کی غزل میں ایسے مضامین بہت ہی کم لکھیں گے ، جو اس حدود دائرے سے خارج ہوں ۔ ان کی بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو مضمون پہلے متعدد طور پر بندہ چکا ہے ، وہیں مضمون ایسے بلیغ اسلوب میں ادا کیا جائے کہ تمام اگلی بندشوں سے سبقت لے جائے ۔ برخلاف اس کے مرزا نے اپنی غزل کی عبارت دوسری بنیاد پر قائم کی ہے ۔ ان کی غزل میں زیادہ تر ایسے اجنبیے مضامین پائے جاتے ہیں ، جن کو اور شعراء کی فکر نے بالکل مس نہیں کیا اور معمولی مضامین اسے طریقے میں ادا کیے گئے ہیں ، جو سب سے نرالا ہے اور ان میں ایسی نزاکتیں رکھی گئی ہیں ، جن سے اکثر اساتذہ ناکلام خالی معلوم ہوتا ہے ۔

خلاصہ یہ ہے کہ اور لوگوں نے اول سے آخر تک قوم کی شاہ راہ سے سر مو انحراف نہیں کیا اور جس چال سے کہ اکالوں نے طے کی تھی ، اسی چال سے تمام راستہ طے کیا ہے ۔ مرزا نے اول شاہ راہ کا رخ چھوڑ دوسرے رخ چلنا اختیار کیا اور جب راہ کی مشکلات نے مجبور کیا تو ان کو بھی آخر اسی رخ پر چلنا پڑا ، مگر جس لیک پر قافلہ جا رہا تھا ، اس کے سوا ایک اور لیک اسی کے متوازی اپنے لیے نکالی اور جس چال پر اور لوگ چل رہے تھے ، اس حال کو چھوڑ کر دوسری چال اختیار کی ! چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب میر و سودا اور ان کے مقلدین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اکتا جاتا ہے اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالنے ہیں ، تو اس میں ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے ، اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے ۔“

(مولانا الطاف حسین حالی : یادگار غالب : ۱۸۹۶ء)

”غالب فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے نام آور شاعر ہیں ۔ ان کی فارسی کی غزل سرائی کی نسبت اظہار خیالات ہو چکا ہے ۔ اب ان کی اردو

کی غزل سرائی کی کیفیت عرض کرنے کو ہے۔ غالب اُن شاعروں میں ہیں، جو ہر صنف شاعری سے مناسبت رکھتے تھے مگر یہاں اُن کی اردو کی غزل سرائی زہرِ بخت ہے۔ حضرت نے ذوق، مومن، ناسخ، آتش اُن استادوں کے زمانے دیکھے اور اُن سب اساتذہ کے بعد رحلت فرمائی۔ ذوق سے شاعرانہ سلیقہ بھی ظہور میں آیا، مگر مومن سے کیا طور حضرت کا رہا، فقیر کو نہیں معلوم۔ ناسخ سے لطف مراسلات حاصل تھا۔ آتش کے ساتھ موافقت یا مخالفت کی کوئی بات علمِ راقم میں نہیں ہے۔ اردو کی غزل سرائی کے اعتبار سے مرزا نوشہ بہت قابلِ توجہ شاعر ہیں۔ اپنی غزل سرائی کی نسبت حضرت فرماتے تھے کہ: "غزل گوئی کی ابتدا نہیں کہ ناسخ مرحوم کا دیوان دہلی میں چلے پہل پہنچا۔ شیخ کی سخن سنجی کی تمام شہر میں دھوم مچ گئی، میں نے اور مومن نے اُن کا متبع ہونا چاہا۔ ہم لوگوں نے شیخ مرحوم کے رنگ میں متقی کلام کرنا شروع کیا، مگر شیخ کا رنگ ہم لوگوں میں نہ آیا۔ مومن متقی کے بعد ویسے ہو گئے جیسا کہ اُن کا رنگ دیکھا جاتا ہے اور ہم میر کے رنگ میں در آئے۔" اس جگہ پر یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ مومن اور غالب کے عجز اور تنبیح کا سبب اور کچھ نہ تھا، الا یہ کہ دونوں شاعران نامی افتادِ طبیعت سے داخلی شاعری کے برہنے کی قابلیت رکھتے تھے۔ پس ناسخ کی شاعری جو محض خارجی رنگ رکھتی ہے، کیوں کہ اُن کی غلطی صلاحیت کے ساتھ سوانی ہڑتی۔ بہر حال غالب کا یہ فرمانا کہ ہم میر کے رنگ میں در آئے، واقعات کے بہت بعید نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کی غزل سرائی میں میر کی جھلک نمایاں ہے۔ لاریب وارداتِ قلبیہ اور امورِ ذہنیہ کے مضامین غالب قریب قریب میر صاحب کی پر قابیری کے ساتھ باندھ جاتے ہیں۔ مگر حالت یہ ہے کہ اُن کے مختصر دیوان میں بہت کم شعر ہیں، جو میر صاحب کی سادگی، کلام کا لطف دکھاتے ہیں۔ زیادہ حصہ اُن کے کلام کا استعارات سے بھرا ہوا ہے۔ اضافتوں کی وہ بھرمار ہے کہ بعض وقت جی گھبرا اُٹھتا ہے کہ الہی اضافتوں کا سلسلہ کب ختم ہو گا۔ الفاظِ فارسی کی وہ کثرت دیکھی جاتی ہے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے شعرا زیرِ نظر ہیں یا فارسی کے۔ ان باتوں کے علاوہ کبھی کبھی اخلاقی مضامین کا وہ عالم دکھائی دیتا ہے کہ ادراک اپنے فعل میں قاصر ہونے لگتا ہے۔ بلاشبہ اُن کے ایسے

کلام کوئی لطف غزلت نہیں رکھتے۔ اگر اُن کے دیوان کا کوئی انتخاب جدید کیا جائے تو لازم ہے کہ ایسے ایسے مغلّی اشعار خارج از دیوان کر دیے جائیں۔ لیکن ان معائب سے گزر کر اگر اس یکتائے روزگار کے کلام کو انصاف کی نگاہ سے دیکھیں تو پھر حسن کی کوئی انتہا بھی نظر نہیں آتی۔ واقعی جو سوز، گداز، حسرت، درد، پریشانی، نشتریت، بلند پروازی، نازک خیالی، سکنت، متانت، جلال، تہذیب، شوخی غالب کے کلام میں ہے، بااستثنائے درد و میر کسی استاد کے کلام میں نہیں پائی ہے۔ نشتریت تو ایسے غضب کی ہے کہ میر صاحب کے کلام میں بھی اس سے زیادہ نہ ہو گی۔ پر تاثیر کا کیا کہنا، دل بے اختیار چلا اٹھتا ہے کہ غزل سرائی اسے کہتے ہیں۔ شوخی کا وہ عالم ہے کہ طبیعت بے چین ہوتی جاتی ہے۔ عالی مذاق روح کو عالم بالا کی سیر دکھاتی ہے۔ واردات قلبیہ کے مشاہد کی خوبی جذباتی معاملات کے تماشے پیش نظر کر دیتی ہے اور مختصر یہ ہے کہ حضرت کے کمالات گوناگوں کا وہی قائل نہ ہو گا، جسے قلبی نعمتوں سے فطرت نے محروم رکھا ہے۔“

(سید امداد اسلم اثر : کاشف الحقائق معروف بہ جارستان سخن : ۱۸۹۷ء)

”... غالب کی غیر معمولی شاعری بلاشبہ اس سے زیادہ شہرت کی حق دار ہے، جو اسے اب تک نصیب ہو چکی ہے اور یورپ کو بھی یہ جاننا باقی ہے کہ کچھ عرصہ پہلے ۱۸۶۹ء میں ایک ایسے شخص نے انتقال کیا، جس کے قصیدے انوری اور حافظی کے ہم پلہ ہیں۔ جس کی غزلیں عرفی اور طالب کی غزلوں سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ جس کی رباعیاں عمر خیام کی رباعیوں کے برابر رکھنے کے قابل ہیں اور جس کی نثر ابوالفضل اور ظہوری کی نثر سے زیادہ شان دار ہے۔“

آخر بارے شاعر (غالب) کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟ اس کی نثر اور شاعری، خودنوشت سوانح عمری کے اسے انکڑے ہیں، جن سے ہمیں اس کی زندگی کے بارے میں بصیرت حاصل ہوتی ہے، جو سراسر ہیراری اور شدید کشمکش کی زندگی تھی۔ جہاں تک اس کے معاصرین کا تعلق ہے، ان کی زندگی تکلیف دہ ہے اعتنائی کی زندگی تھی اور جہاں تک اس کے دوستوں کا تعلق ہے، ان کی امداد میں کم التفاتی کا جذبہ کار فرما تھا۔ غالب لازماً

خود شناسی کا شاعر ہے۔ وہ زندگی اور زندگی کے جملہ پہلوؤں کا گیت گاتا ہے۔ وہ ہادۂ ارغوانی اور جام کے گیت گاتا ہے۔ وہ اپنے دل کو اپنے قارئین کے سامنے چہر کر رکھ دیتا ہے۔ اور خود اپنی زندگی کی تلخیوں، اپنی قسمت کی گوتاہیوں، اپنی مرگب نما اسیدوں (جو کبھی پوری نہیں ہوتیں)، اپنی عذاب میں ڈالنے والی فلاکتوں، اپنی ناکام کوششوں، اپنے شبہات، جن میں کبھی کبھی خدا تعالیٰ کی نیکی اور انصاف پسندی کے مسرت بخش اعتقاد کی جھلک نمایاں ہو جاتی ہے، اپنی شاعری کے لافانی ہونے پر ناقابل تسخیر اعتقاد کے نغمے گاتا ہے۔ الغرض اس کی نثر اور شاعری اس کے مختلف اور تغیر پذیر حالات کی یاد دہانیاں ہیں۔ اس میں کبھی ہر مسرت توقع کی کیفیت پائی جاتی ہے اور کبھی ایسی نیرنگی کی، جس کی تہاہ نہیں ملتی۔

غالب اعلیٰ درجے کا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجہ کا نثر نویس بھی ہے۔ وہ ہمارے دور کا سب سے بڑا نثر نگار ہے، اتنا بڑا کہ اس کا کوئی مد مقابل نہیں۔ اس کی دل فریب لطافت، اس کی مسرت بخش سادگی، اس کی لکھ سنہجی اور ظرافت، اس کی دل کش روانی، اس کا ہلکا پھلکا انداز بیان، اس کی بے ساختگی اور دل ربائی، یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ ان سے سبقت لے جانے والا تو کیا حریف بھی پیدا نہیں ہوا۔ یہ مبالغہ آسیر تعریف نہیں ہے بلکہ وہ ممتاز رائے ہے، جو اس کے ممتاز سوانح نگار حالی بانی بھی نے قائم کی ہے۔ اس کے علاوہ غالب کے کلام کا ایک اور پہلو ہے جس پر ہم چار اظہار خیال کر سکتے ہیں۔ اس کے خیالات نہایت بلند، دقیق اور نازک ہیں اور وہ اتنے ہی خودرو ہیں، جتنے کہ وہ الفاظ حسین ہیں، جن میں ان کو ادا کیا گیا ہے۔ اس کے اردو اور فارسی دیوان ادبی جواہرات ہیں، دودھیا پنھر، باقوت و مانی اور نیلم، سب ایک مرکب کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں۔“

(صلاح الدین خدابخش: Ghalib: An Appreciation: (۱۹۱۰ء) اردو ترجمہ از ضیاء الدین احمد برنی، ماہ نو، کراچی: فروری ۱۹۵۷ء)

”فلسفہ کے نام سے گھبراہٹ نہیں۔ فلسفہ موٹے موٹے قسائیس لغات کا معمہ ثقیل و سفلی اصطلاحات کا نام نہیں، فلسفہ نام ہے، خود شناسی

کا ، ژینہ ہے خدا شناسی کا ۔ ہم کون ہیں ؟ کیا ہیں ؟ ہمارے گرد و پیش کیا ہے ؟ ہمارے جذبات کیا ہیں ؟ عادات و اطوار کیا ہیں ؟ خدا کیا ہے ؟ ماسوا کیا ہے ؟ بس یہی روزمرہ کے مسئلے ہیں ، جن سے ہم کو ، آپ کو ، سب کو دو چار ہونا پڑتا ہے ، کبھی جان کر ، اور کبھی لگانے ۔ انہیں عقلی اصول پر ایک خاص نظام کے ماتحت ترتیب دے لیجئے اور لیجئے آپ فلسفی ہو گئے ۔ پھر غالب غریب ، کانس اور ہیگل کے کینڈے کے تو انسان تھے یہی نہیں ۔ ایک خوش باش ، زندہ دل ، خوش فکر ، طبیعت دار آدمی ۔ باتیں کرنے تو ذرا گہری ، نظر سطح کی نہیں ، عشق کی عادی ۔ چہلکنے پر بڑ کر ہنسل جانے والی نہیں ، مغز تک پہنچ جانے کی خوگر ۔ سوجھ بوجھ غضب کی ۔ اپنے ان حکیمانہ ٹھہریوں اور عارفانہ مشاہدوں کو ادا کرنے ، تو کبھی پیاری نثر میں ، کبھی دل آویز نظم میں ۔ کبھی شعر کا ساز باہ میں اٹھایا لیتے ، کبھی نثر کے مائیکروفون کو منہ لگا لیتے ۔ شہرت شاعری کی زیادہ ہو گئی ، ورنہ تھلیق کی زبان سے روایت یہ سننے میں آتی ہے کہ نظم و نثر دواؤں کے ماہر تھے ، مالک تھے ، بادشاہ تھے ۔ نثر لکھنے بیٹھے تو قلم میں یہ قدرت کہ جب چاہا روٹوں کو ہنسا دیا ۔ جب چاہا ہنستوں کو رلا دیا ۔ شعر کہنے پر آئے تو زبان میں یہ اثر کہ سننے والوں کو لٹا دیا ، سر جھائے دلوں کو کھلا دیا ! فطرت بشری کے راز دار ہی جو ٹھہرے اور حکمت و معرفت کے شیدائی ۔ معنویت کے بول لطافت و ظرافت کے سروں میں الایتے ۔ ابھی آہ کا رنگہ جہا دیا ، ابھی واہ کا نقش بٹھا دیا ۔ یہی ان کی حکمت ، یہی ان کا فلسفہ ، یہی ان کی شاعری کا پیام ، یہی ان کی زندگی کا کارنامہ ۔“

(مولانا عبدالعاجد دریا آبادی : ادیب ، الہ آباد : ۱۹۶۳ء)

”ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ، مقدس وید اور دیوان غالب ۔ لوح سے کمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں ، لیکن کیا ہے ، جو چہاں حاضر نہیں ، کون سا نغمہ ہے ، جو اس کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے ۔ شاعری کو اکثر شعرا نے اپنی اپنی حد نگاہ کے مطابق حقیقت اور مجاز ، جذبہ اور وجدان ، ذہن اور تخیل کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے ، مگر یہ تقسیم خود ان کی نا رسی کی دلیل ہے ۔ شاعری انکشاف حیات

ہے، جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں، شاعری بھی اپنے اظہار میں لا تعین ہے۔

جال الہی پر شے میں رونما ہوتا ہے۔ آفرینی کی قدرت جو صفات باری میں ہے، شاعر کو بھی ارزائی کی گئی ہے۔ جہاں ملائکہ کارخانہ ایزدی میں پوشیدہ حسن آفرینی میں مصروف ہیں، شاعر یہ کام علی الاعلان کرتا ہے۔

اس لحاظ سے مرزا کو ایک رب النوع تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔ غالب نے ہزم ہستی میں جو فائوس خیال روشن کیا ہے، کون سا ”یکو مصویر“ ہے، جو اس کے ”کاغذی پیراہن“ پر منازل زمست قطع کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔

۰۰۰ مرزا غالب کے الفاظ لعل و جوہر سے بھی گراں ہیں۔ مرزا غالب اس بات سے خوب واقف ہیں کہ مترادفات کو محض مؤلفات لغت نے طلبہ کی سہولت کی غرض سے وضع کر لیا ہے، ورنہ ایک معنی کے دو الفاظ کسی زبان میں نہیں ہیں۔ توام مجھے کتنے ہی ہم صورت ہوں، ان کو ایک دوسرے کی عارضی غیر حاضری میں بھی ایک سمجھنا فاش غلطی ہے۔ مرزا الفاظ کے نازک سے نازک فرق کو خوب جانتے ہیں۔ وہ ادیبان فرانس کی طرح عقیدہ (Most Proper) کے پابند اور قایل ہیں۔ دیوان کے مطالعے سے معلوم ہو گا کہ مرزا نے ایک لفظ جہاں تک ہو سکا ہے، دوبارہ استعمال نہیں کیا۔ اس کی وجہ محبان والی کی طرح یہ نہیں ہے کہ وہ کسی لفظ کی تکرار نہیں کرتے بلکہ یہ ہے کہ وہ کسی خیال کا اعادہ نہیں کرتے۔

جہاں مرزا نے الفاظ میں نادر اور شستہ تصرفات سے کام لیا ہے، وہیں تشبیہات اور استعارات میں یہی عام پابندی سے گریز کیا ہے۔ تشبیہات اور استعارات کی بنیاد قیاس پر قائم ہے۔ تشبیہ یا استعارے کا پہلا کام معنی آفرینی ہے۔ کسی امر کو کتنا ہی واضح بیان کیا جائے، ذہن مفہوم کے پائے سے قاصر رہتا ہے لیکن ایک مشابہ مثال کام دے جاتی ہے۔ بہت سے دشوار اور غریب اشعار حل نہیں ہوئے لیکن ایک مقابل شعر فوراً مضمون کو آئینہ بنا دیتا ہے۔ تشبیہ یا استعارے کا دوسرا

کام حسن آفرینی ہے۔ تشبیہات اور استعارات تصویر نظام کے ہر قلموں الوان ہیں، جن کی آمیزش بغیر تصویر اکثر تکمیل حیات کو نہیں پہنچتی اور بے رنگ رہ جاتی ہے۔ تشبیہ یا استعارے کا تیسرا کام اختصار اور بلاغت پیدا کرنا ہے۔ جو بات دو لفظوں میں ادا ہو جاتی ہے، دوسری طرح دو سطروں میں بیان نہیں ہو سکتی۔

مرزا غالب کی چشم بینا قدرت کو تمام نقاط نگاہ سے دیکھتی ہے اور ہر نظر میں ایک نیا جلوہ پاتی ہے۔ جو شعرا قدرت کے ترجمان ہیں، ان میں سے اکثر سعدی اور وردزورتھ (Wordsworth) کی طرح قدرت سے مماثلتے چار و خزاں، باغ و راغ، کہسار و آشار مراد لیتے ہیں۔ غالب کے مشاہدات کنار دریا، دامن کوہ، لب جو سے بہت کم متعلق ہیں۔ مرزا کا جی لب دریا، خاموش مرغزاروں سے زیادہ شہروں کے ہر شور و کوچوں میں لگتا ہے، جہاں زندگی شعاع مستر کی طرح ہفت رنگ جلوہ دکھاتی ہے۔ مرزا کے نزدیک دلی کی گلیوں کی رونق یا ویرانی، خوش وقتی یا اندرگی، شورش یا خاموشی خود ان کے اپنے احساسات کی خارجی تصویر ہیں۔ جو صورتیں اندر ادھر رواں دواں نظر آتی ہیں، وہ مرزا کے نزدیک ان کے اپنے خیالات کے مجسمات ہیں۔ ان کو الفا کے لیے سرو و چنار کو شب ساء، لب آب، صحبت یار میں یا ساغر و بے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اگر کسی ہنتی ہوئی عبارت پر نصب شدہ جر قبل کا اپنی حلقہ بھی رسی میں اوہڑاں دیکھتے ہیں تو ان کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سیرخ اپنا چنگل آسان سے تارے توڑنے کے لیے دراڑ کر رہا ہے۔ جن مظاہر قدرت کو مرزا دیکھتے ہیں اور شعرا یا تو ان کو عام خیال کر کے ان پر غور ہی نہیں کرتے یا ان میں اس درجہ شعریت نہیں پاتے کہ ان کی کیفیت کو اپنے کلام میں بیان کریں اور اگر کرتے ہیں تو کلیات نہیں ہوتے۔“

(ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری : مقدمہ دیوان غالب جدید المعروف بہ نسخہ حمیدہ مرتبہ مفتی محمد انوار الحق : ۱۹۱۹ء)

”کلام غالب کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہو گا کہ اس کا اصلی رنگ ذہنی اور دماغی ہے۔ زندگی بھر شاعری یہ آرزو رہی کہ

وہ فکر و اظہار میں اچھوتا معلوم ہو اور ایک لحاظ سے اس کا یہ منہدہ پورا بھی ہوا ، لیکن اس سے اس کی شاعری ماری گئی ۔ اس کے اردو کلام میں شاعری سے زیادہ فن بلکہ صنعت گری نمایاں ہے اور احساس سے زیادہ فکر و تخیل یا خیال آرائی کے آثار پائے جاتے ہیں ۔ جہاں احساس کے نشان پائے بھی جاتے ہیں ، وہاں عقل کا رنگ چڑھانے کی محسوس کوشش ظاہر ہوتی جاتی ہے ۔ حال کی اردو نظموں نے غالب کو عجیب و غریب قوتوں سے مالا مال کر دیا ۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے شاعرانہ لطف کی خاطر وہ تمام کائنات کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے ۔

”لوح سے موت تک مشکل سے سو صلحے ہیں لیکن کہا ہے ، جو یہاں حاضر نہیں ہے ۔ کون سا نغمہ ہے ، جو اس ساز زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے ۔“

یہ چیز رہ رہ کر نضا میں گونجتی رہتی ہے ۔

رہا دیوان سو اس کی کہانی سیدھی سادی ہے ۔ ہر زمانے میں غزل گو شعرا نے تیغ و برہمن کی پہچان اڑائی ، صوفیوں اور فلسفیوں کی شان اختیار کی ، فلک پر شکایتوں کے تیر برمائے ، اپنی شاعرانہ برتری کے گیت گائے ، عاصی کا حوانگ بھرا ، ساغر کے دور چلائے اور اسی قسم کے بہت سے محاضے کیے ۔ غالب نے اس ہمال راستے سے کچھ زیادہ کنارہ کشی نہیں کی ۔ وہی برائے موضوع اس کو اپنی شاعرانہ جولانی کے لیے ہاتھ آئے ۔ البتہ ان پر اس نے عقل کے نئے پردے ڈال دیے ۔ اگر اس نے کوئی نئی زمین تلاش بھی کی ، تو وہ پاس و حرماں کی زمین تھی ۔ نئی زمین تلاش کرنے سے ہماری یہ مراد ہے کہ حرماں نصیبی کے برائے موضوع نے اس کی اندرونی اطمینانی سے ایک شعری رنگ اختیار کر لیا ۔ یہ وہ مقام ہے ، جہاں وہ الگ کھڑا ہوا نظر آتا ہے اور ابک ایسے شخص کی تصویر پیش کرتا ہے ، جو زندگی کے مادی پہلو سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے ، لیکن حالات اور دنیاوی خواہشات پر مسلط ہونے والی دیویاں اس کی راہ میں حائل ہیں ۔

کلام غالب تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ پہلا حصہ ان اشعار پر مشتمل ہو سکتا ہے ، جو رسمی طرز میں علانیہ ذہنی مشق کا نتیجہ ہیں ۔ یہی وہ بلند پروازیاں ہیں ، جو غزل گوئی کا میدان جیتنے کی

خاطر شاعر نے دکھائی اور جن کا ذکر حالی نے 'یادگار غالب' میں کیا ہے۔ یہاں شاعر غزل گوئی کے وہی پرانے ڈگر سے گزرتا نظر آتا ہے۔ وہ کبھی پھبتیاں اڑانے میں مصروف ہے، تو کبھی عاشق کے روپ میں جلوہ گر ہے۔ کبھی صوفی بنتا ہے اور کبھی فلسفی۔ غرض کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ لیکن چونکہ وہ جدت طرازی پر تلا ہوا ہے، اس لیے اپنے ہر رسمی پہلوئے سخن پر عقلی قبا اوڑھا دیتا ہے۔

کلام غالب کی مثنویات کی سب سے بڑی وجہ اس کا حیرت انگیز تنوع، جسے ڈاکٹر عبدالرحمن نے نہایت نفیس طریقے سے بیان کیا ہے: "الوح سے تحت تک مشکل سے سو صفحے ہیں۔ لیکن کیا ہے، جو یہاں حاضر نہیں۔ کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں۔" مرزا کی شاعری بیشتر عشق و محبت کا بیان ہے۔ لیکن منطقی آئے تو اس کے لیے یہاں دلائل و براہین ہیں۔ شگفتہ طبع لوگوں کے لیے شوخی اور ظرافت اور انسانی فطرت کی داستان سنا ہو تو یہاں وہ اپنے کی باتیں ملیں گی، جن کا لطف جوں جوں چشم بصیرت کھلتی جاتے گی، بڑھتا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ دیوان غالب میں ہر شطرس اپنی تصویر دیکھتا ہے اور لطف اٹھاتا ہے۔

لیکن ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس ساڑ میں نفسوں کی فراوانی اور ہر نغمے کی دل آویزی کی وجہ یہ ہے کہ کلام غالب سنی سنائی باتوں کا بیان نہیں، بلکہ قلب غالب کے مشاہدات کا آئینہ ہے۔ اس رباب پر دست قدرت نے ایک ایک کر کے سارے سر بجائے ہیں اور دیوان غالب انہی سروں کی صدا نے باز گشت ہے:

زخمہ ہر تار رگ جان میزغم

کسی چہ داند یا چہ دستاں میزغم

(شیخ محمد اکرام: غالب نامہ: ۱۹۳۶ء)

غالب کے اردو اور فارسی کلام میں حسن و عشق کو ایک نمایاں جگہ حاصل ہے۔ تعداد کے لحاظ سے پورے کلام میں اس مضمون کے اشعار آدھے تو نہیں مگر ایک تہائی کے قریب ضرور ہوں گے۔ ان اشعار میں وہی تنوع، جدت طرازی اور ذکاوت آئینی نظر آتی ہے، جو دیوان اور کلیات

کے دوسرے مضامین کا امتیاز خاص ہے۔ اگر مرزا غالب اپنے کلام کا صرف یہی حصہ چھوڑ جائے تو بھی اُن کا شمار دنیا کے بڑے شاعروں میں ہوتا۔ ان اشعار میں محض رنگا رنگ طلبات کے بندہ دروازے ہی نہیں کھلتے، ان میں شاعری کی ایک نئی دنیا کا انکشاف ہے۔ اس دنیا کی آب و ہوا ہر طبیعت کو سازگار نہیں ہے اور نہ ہو سکتی تھی، لیکن اس کی وسعت اور بوقلمونی کا یہ عالم ہے کہ ہر موقع کی مناسبت سے دل کشا مناظر بکثرت ملتے ہیں۔ انسانی لطرت کے نامحدود پہلو جذبہٴ عشق کے ماتحت جس جس طرح سنورے، بکڑے، پگھلتے اور ڈھلتے ہیں، اُس کی ترجمانی میں شاعر نے اپنا تمام جوش تخیل اور پورا زور قلم صرف کیا ہے۔

غالب کے کلام میں اجتماع کے پہلو بہ پہلو روایت کی پاس داری ہے جو شغف ہے، وہ عشقیہ شاعری میں بھی قائم نظر آتا ہے۔ غزل کے روایتی عاشق، معنوں سے لے کر پروانے تک اور روایتی معشوق، لیلیٰ سے لے کر شمع محفل تک، سبھی یہاں موجود ہیں۔ ان اشعار کا پس منظر مغلیہ دور کی وہی معاشرت ہے، جو غالب کے معاصرین کے کلام میں بھی جھلکتی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے بیان میں اسے زیادہ وسعت، شدت اور وضاحت میسر ہوئی ہے۔ لیکن یہ درجے کا فرق ہے، کیفیت کا نہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ معاشرتی پس منظر کے لحاظ سے غالب اور اُس کے ہم عصر شعرا میں ایک بنیادی اشتراک ہے۔ اس مشترک کیفیت کے ہونے ہونے بھی غالب کی شاعری میں حسن و عسل کا ایک الگ مقام ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ شاعر کی اپنی شخصیت کی یکسانی نے اس حصہٴ کلام کو بھی ایک بالکل دوسری سطح پر پہنچا دیا ہے۔

غالب کا پاتھ انسانیت کی قبض پر ہے اور یہ قبض آج بھی اُسی طرح چلتی ہے، جس طرح سو برس، پانچ سو برس، ایک ہزار برس چلتی تھی۔ عشق لگیوں سے نکل کر محل سراؤں میں پہنچ جائے تو صرف اس کا خول بدل جاتا ہے، مغز نہیں بدلتا۔ غالب کی شاعری میں عشق کا جو ڈراما ہمیں ملتا ہے، اُس کا پس منظر چھوٹے چھوٹے اشاروں، چھپے چھپے کنایوں کی روشنی میں بتدریج واضح ہونے لگتا ہے اور بالآخر گزری ہوئی صدیوں کا وہ ناموجود ماحول اس طرح زندہ ہو جاتا ہے کہ مغلیہ ہندوستان کی زندگی کے عیش و نشاط اور لطافت و کثافت کا پورا ڈراما ہمارے سامنے

آ جانا ہے ۔ شاعری تاریخ نہیں ہوتی لیکن غالب کا کلام اسلامی ہندوستان کی سماجی اور روحانی تاریخ کا خلاصہ ہے ۔ جس کا جی چاہے آج بھی غالب کے اشعار کے بین السطور میں اس پرانی زندگی کو ایک بار پھر زندہ دیکھ لے ۔ ہا ایں ہمہ ایک بنیادی حقیقت کبھی نہیں بھولنی چاہیے اور وہ یہ کہ گو غالب کی شاعری میں عہد مغلیہ کے رسم و رواج نے انسان کا چہرہ اپنے مخصوص آب و رنگ سے چمکیا ہے لیکن ان اشعار میں اس چہرے کا پیدائشی نور آج بھی اسی طرح قائم ہے ، جس طرح ایک سو برس پہلے تھا ۔“

(پروفیسر محمد احمد خاں : بہایوں ، لاہور : جنوری ، فروری ۱۹۵۶ء)

”معمو ہے اگر یہ ہوجھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا : غالب، اردو اور تاج محل ۔ یہ ہندوستان کی تہذیبی پیدوار ہیں اور سوا ہندوستان کے کہیں اور ظہور نہیں پا سکتے تھے ۔ ان تینوں میں ہندوستان کی صوری اور معنوی استیلازات جھلکتے ہیں ۔ غالب نے طویل عمریائی اور اس زمانے میں طویل عمر پائی، جو دم بہ دم منہدم اور متغیر ہو رہا تھا ۔ وہ میر نہ تھے کہ عہد کے حادثات اور خود اپنے حادثات سے تمام عمر جاگیر نہ ہوتے ۔ وہ ذوق نہ تھے کہ شاعری کے ڈھرے سے جدا نہ ہو سکے ۔ وہ مومن نہ تھے کہ حباب بر نقش بناتے رہے ۔ وہ ظفر نہ تھے کہ سلطنت ہاتھ سے نہ جاتی تو شاید شاعری میں کوئی جگہ پیدا نہ کر سکے ۔ ظاہر ہے ، غالب صرف شاعر نہ رہے ہوں گے، بہت کچھ اور بھی رہے ہوں گے ۔

وہ ہر چیز کے بڑے دلدادہ تھے ، فارسی کے اپنے ذوق و زبان پر بھروسہ اور بغیر کرتے تھے ۔ آگرہ سے دلی آئے تو دلی کے شاعروں اور زبان دانوں سے ٹکر ہوئی ۔ کلکتہ پہنچے تو فارسی دانوں سے ہرغاش چھڑی سیاسی داروگہر کی زد میں آئے ۔ خاندان کے نزاعی مقدمات میں الجھے رہے ۔ ایک سلسلے میں جیل خانے کی مصیبت اور رسوائی جھیلی ۔ کلکتہ میں مغرب سے آنے والی طرح طرح کی ہوائیں سے سابقہ رہا ۔ غدر میں لٹے ، تنگ دستی نے سرتے دم تک ساتھ نہ چھوڑا ۔ انگریزوں کی غدسات میں معروضات پیش کیے اور قصیدے گزرائے ، والیان ریاست کے حضور میں گڑ گڑائے ، ان قدروں کو مسبار ہوتے دیکھا ، جن کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے ، لیکن نہ وہ میر بنے ، نہ غانی ، نہ ہاس چنگیزی وہ تمام حوادث کو :

مرے درہائے بے تابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی
کہہ کر ہنول حالی حیوانِ ظریف (متمِ ظریف) بی رہے ۔ متمِ ظریف ہونا
اور رہنا آشیاز ہے ، جو غالب کے زمانے میں غالب کے سوا اور کہیں نظر
نہیں آتا ۔

غالب نے غزل کو تہذیب کا درجہ دیا ۔ جس سے آج ہمارے اچھے ۔
اچھے شاعر کو مفر نہیں ۔ غزل اب اتنی صنفِ کلام نہ رہی جتنی وہ اردو
کی تاثیر اور تفریر بن گئی ہے ۔ غالب نے قلم و لہر دونوں کو دلیری بھی
دی اور دلیری بھی ۔ غزل کی تقدیر غالب ہی نے شعبی کی اور اس کو
ایک ایسی لہذا دی ، جہاں اردو کے تمام ممکنات شعری و شاعری کو
برگ و بار لانے کے سامان اور سہولتیں فراہم ہیں ۔ “

(پروفیسر رشید احمد صدیقی : کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلاؤں کہا
(علی گڑھ سیکڑن غالب مجس : ۱۹۴۶)

میں اردو میں غالب کی شخصیت کو جلی بہرپور اور جاندار
ادبی شخصیت کہنا ہوں ، جس کا ہر پہلو ہمارے اچھے دلچسپی اور لطف
کا سامان رکھتا ہے ۔ اُن کی روایت انہیں تجربات و کیفیات کی
نئی نئی لہذاؤں میں لے جاتی ہے ۔ اور اُن کا تنقیدی شعور اس میں کلاسیکل
ضبط و نظام پیدا کر دیتا ہے ۔ اُن کی انانیت میں انفرادیت کی پہاریں ہیں ۔
اور برنارڈ شا کی انانیت کی طرح کیف و انبساط کا سامان ۔ اُن کی شاعری
میں نگر کا گہرا سرمایہ ہے ، جو شاعرانہ لطافتوں کے ساتھ سمویا گیا ہے ۔
وہ ادب کی روایات سے یکسر باخبر نہ ہونے ہوئے بھی ان کے بابت نہیں
ہیں ۔ وہ زندگی کے تجربات میں کوئی وحدت تو نہ پیدا کر سکے ، کوئی
فلسفہ زندگی تو پیش نہ کر سکے ، مگر ان کا فلسفیانہ اور حکیمانہ مزاج ہمیں
زندگی کو سمجھنے اور اس کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے ۔ وہ ادب
کو ہمارے جہاں پہلی مرتبہ زندگی میں ایک بڑا مقام دیتے ہیں اور اس طرح
زندگی کی ایک اہم خدمت انجام دیتے ہیں ۔ وہ گہرے اور ہلکے ، ہر قسم
کے نقش تیار کر سکتے ہیں ۔ ان میں دیو زادوں کی وسعت خیال اور جوہریوں
کی سس مینا کاری دونوں مل جاتے ہیں ۔ ان کی شاعری ، ہمیں زندگی میں
آسودگی ، اطمینان و سکون ، قنوطیت ، انفعالت کی طرف نہیں لے جاتی ۔

ایک لطیف ذہنی خلش ، ایک بے چینی ، ایک قہمی ، ایک آزاد اندازِ نظر کی طرف مائل کرتی ہے۔ ان خطوط میں ہمیں فنِ کاری کی وہ چرأت و صداقت ماتی ہے ، جو اپنے سامنے سے ہر حجاب کو اتارنے کے لیے تیار رہتی ہے۔ جو ایسی ہی نظر آنا چاہتی ہے ، جیسی وہ ہے۔

بیسویں صدی کی اردو نثر و نظم میں غالب کے اشعار سے کیسے کیسے نقش و نگار بنائے گئے ہیں ، اُن کے اجمال کی کیسی کیسی تفصیلات ملتی ہیں ، نثر و نظم دونوں میں گہرائی کے لیے لوگ اب بھی غالب کے کس قدر متون احسان ہیں ، اس کے متعلق زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں غالب اب بھی ہمارے شریکِ غالب ہیں۔

(آل احمد سرور : علی گڑھ میگزین ، غالب نمبر : ۱۹۳۹ء)

”ادب و شعر میں مرزا کی رفعت و برتری اب کسی شرح کا محتاج نہیں رہی۔ جامعیت ان کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔ بے غالبہ بیالغہ ہندوستان نے اسیر خسرو کے بعد ان جیسا جامع شخص پیدا نہیں کیا۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے یگانہ شاعر تھے۔ حافظ اور نظیری کی طرح محض غزل اور قصیدے ہی میں نہیں بلکہ تمام اصنافِ سخن میں ان کی رفعت مرتبت سب کے نزدیک مسلم ہے۔ غزل ، قصیدہ ، رباعی ، مثنوی ، ترکیبِ بند ، ترجیع بند ، قطعہ ، مرثیہ ، نوحہ وغیرہ کوئی صنفِ نظم نہیں ، جس میں ان کا پایہ یکساں بلند اور مختلف اصناف کے مشاہیر اصائدہ کے برابر نہ ہو۔ اردو نظم میں اگرچہ ان کا کلام ٹھوڑا ہے لیکن جتنا ہے ہر لحاظ سے اردو زبان کا گراں بہا ترین سرمایہ ہے۔ بھر مرزا فارسی نثر کے یگانہ ادیب تھے۔ فارسی کالیات نثر میں ہر رنگ اور ہر انداز کی نثریں موجود ہیں۔ ابوالفضل کا سرمایہ شہرت صرف نثر نگاری تھا۔ مرزا نثر میں اس سے بچھے نہیں اور نثر نگاری ان کے کئیالاتِ فطری کی بہارِ آفرینی کا محض ایک گوشہ ہے۔ اردو نثر میں ان کے صرف مکالمے ہیں یا چند تقریظیں اور دیباچے۔ لیکن حسنِ کلام ، لطفِ بیان ، روانی و انسجام ، بے ساختگی اور دل آویزی میں نثر کا ایسا جلیل الشان مجموعہ نہیں مل سکتا۔

(مولانا غلام رسول مہر : خطوطِ غالب : ۱۹۵۱ء)

”جب بھی غالب کی شاعری کا ذکر آتا ہے تو ہماری نظر سب سے پہلے یا تو ان کے کلام کی آفاقیت پر جاتی ہے ، جہاں وہ پوری انسانیت کے ترجمان ہیں یا پھر ان کے کلام کے ایسے حصوں پر ، جہاں انہوں نے انسان کے عصری جذبات کی ترجمانی کی ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ غالب کی وسیع النظری اور نفسیاتی ژرف بینی دونوں ہی لائق حد تحسین و داد ہیں اور ان کی بنائے دوام کے خامن ۔ لیکن تاوتلکہ ہم ان کے کلام کی تاریخی اہمیت کو نہ جائیں ، یا یہ کہ انہوں ایک مخصوص تاریخی تہذیبی ماحول میں لکھ کر نہ دیکھیں ، اس کا خطرہ باقی رہتا ہے کہ کہیں ہماری وہ تحسین ، تحسین لائنس بن کر نہ رہ جائے کیوں کہ کسی بھی شاعر کے کلام کی عمومیت اور آفاقیت اپنی قوم اور تاریخ زندہ اور ہم عصر تاریخ سے بے نیاز ہونے میں نہیں بلکہ اس سے دست و گریباں ہونے ، اس کی کشمکش کو سمجھنے اور پھر اسے عالمی تہذیب کے ارتقائی رجحانات سے نسبت دینے میں ہے ۔“

(ممتاز حسین : غالب ایک تہذیبی قوت)



”محض نفسیاتی مطالعہ غالب کے شعور کی بنیادوں تک پہنچنے میں پوری طرح مدد نہیں دیتا ، اس سے اس وقت مدد مل سکتی ہے، جب غالب کے ماحول کا مطالعہ صحیح ہو۔ ان خارجی عوامل کا صحیح یا تقریباً صحیح تجزیہ کر لیا گیا ہو ، جو نجس ہمسد ذہن کے انفرادی ، اجتماعی اور طبقاتی شعور کی تشکیل کرتے ہیں۔“

۔۔۔ غالب نے نظم و نثر میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی معلومات محض کتابی نہیں تھیں ، بلکہ اپنی ذہانت اور ذاتی تجربہ کی وجہ سے وہ تصورات سے آگے جانا جانتے تھے ۔ نئی باتوں کو سمجھنا اور نئی اہمنوں سے دلچسپی لینا جانتے تھے ۔ چنانچہ جب ان کی آخری عمر میں دہلی - سواتی قائم ہوئی تو اپنی ضعیفی اور معنوری کے باوجود، انہوں نے اس سے دلچسپی لی اور کوشش کی کہ لاہور کی اہمنوں کے متعلق معلومات فراہم کریں ۔ وہ اخبارات پڑھنے اور دنیا کی خبروں سے باخبر رہنا جانتے تھے ۔ اسی وجہ سے وہ اس بات سے واقف تھے کہ اگر

ہے عمل کی زندگی ختم ہو جائے تو کچھ نہ کچھ ہو رہے گا۔ دنیا امکانات سے بھری ہوئی ہے۔“

(پروفیسر سید احتشام حسین : غالب کا تفکر ، تنقید اور عمل تنقید : ۱۹۵۵)

”اردو میں غالب کی آواز پہلی آواز ہے ، جو دل و دماغ دونوں کو غائب کرتی ہے ، چونکاؤ ہے ، غالب کے اشعار احساس اور نیکو دونوں کو چھیڑتے ہیں اور دونوں کو آسودہ کرتے ہیں۔ غالب کو اردو کا پہلا مفکر شاعر کہنا غلط نہ ہوگا۔ اس کے کلام کے مطالعے سے ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کی زندگی میں جذبات یا جذباتی سپردگی ہی سب کچھ نہیں۔ بلکہ ہم کو بہت کے ساتھ اپنے کام خارجی حادثات و حالات اور ذہنی کوائف و واردات کا جائزہ لینا چاہیے اور ان کی اصلیت پر عارفانہ عبور حاصل کرنا چاہیے۔“

(پروفیسر بھنوں گورکھ پوری : دیوان غالب اور ادور غزل : ۱۹۵۶)

”مرزا (غالب) کی مقبولیت زیادہ تر ریختہ کے مرہون بنت ہے۔ اس کلام کی مقدار بہت کم ہے۔ لیکن کسی شاعر کا مرتبہ مقدار کلام سے معین نہیں ہوتا۔ بلکہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کے منتخب اشعار کس درجے کے ہیں۔ اس دیوان میں کثرت سے تبدیلیت کے رنگ کے معانی اشعار موجود ہیں اور کثرت سے ایسے اشعار بھی ہیں ، جو روایتی عاشقانہ شاعری اور اور قافیہ پدائی کے سوا کوئی اور حیثیت نہیں رکھتے۔ لیکن جا بجا نایاب سوتی بکھرے ہوئے ہیں ، جن کو جمع کیا جائے تو انکار و تاثرات کا ایک گنجینہ بن جاتا ہے۔“

یہ کہنا مشکل ہے کہ غالب کا کوئی خاص فلسفہ بھی تھا۔ ہاں یہ دیکھ سکتے ہیں کہ کسی قسم کے فلسفیانہ انکار کا اس کے کلام میں غلبہ نظر آتا ہے۔ اس نے خود کوئی خاص فلسفہ پیدا نہیں کیا۔ البتہ جو فلسفیانہ نظریات دنیا میں موجود تھے اور جن سے وہ آشنا تھا ، ان میں سے توحید وجودی یا وحدت وجود کا فلسفہ اس کو کسی قدر قرین قیاس اور دل نشین

معلوم ہوتا ہے کہ اردو اور فارسی کلام میں اس نے اس ایک رنگ کے مضمون کو سو ڈھنگ سے باندھا ہے۔“

(ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم : افکار غالب : ۱۹۵۶ء)

”غالب کی غزل میں ایک عیش دوست مگر سخت کوشش امیر زادے کی تصویر ہمیں ملتی ہے، جسے زندگی سے محبت ہے۔ یہ امیر زادہ عیش دوست ہونے کے باوجود خوش مذاق بھی ہے۔ مگر اس کوچے میں وہ اعلیٰ پسند ہے اور عظمت کا دلدادہ ہے۔ رند مشرب ہے مگر وضع و دستور کو قد کی حد تک نباہتا جاپتا ہے۔ اس کی ہر بات میں ذہانت اور ذہن کی شوخی پائی جاتی ہے۔ وہ زندگی سے گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ زندگی کا جو رخ ہو، اس سے گہرا سفیر رکھتا ہے۔ خوشی سے بھی اور غم سے بھی۔ کیونکہ دونوں زندگی کے دو رخ ہیں۔“

(ڈاکٹر سید عبدالقادر : ۱۹۵۸ء)

”اردو شاعری کی تاریخ میں غالب کو جو مقام حاصل ہے، اس کی عظمتوں کا اعتراف کرنا اور اس کی شاعری کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا ہمارے گزشتہ تقریباً پون صدی کے تنقیدی شعور کی ایک مسلسل کوشش رہی ہے۔ برائے دور کے شعرا میں، غالب وہ تنہا شاعر ہے، جو اس تمام عرصے میں ہمارے نقادوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے اور وہ اسے عموماً اردو کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے رہے ہیں۔ اردو تنقید کا جدید ترین دور شاید اس رائے سے اتفاق نہیں کرے گا کہ وہ ہمیں خود غالب کے الفاظ میں یہ یاد کرائے کی کوشش میں ہے :

کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی نہا

بلکہ اسے یہ اصرار بھی ہو گا کہ میر غالب سے بڑا شاعر ہے۔ لی الحال اس بحث سے قطع نظر کبھی اصل بات مجھے صرف یہ کہنی ہے کہ غالب ہماری ادبی تاریخ میں سب سے زیادہ زندہ شاعر ہے اور اس سے شاید میر کے پرستاروں کو بھی انکار نہ ہو گا۔ میر کے علاوہ سودا، درد، آتش، سومن، الماس، اقبال یہ سب اردو کے بڑے شاعر سمجھے جاتے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی اس صورت میں زندہ نہیں ہے، جس صورت میں غالب غالب ہمارے دل و دماغ اور ادبی شعور پر آج بھی حاوی ہے اور ہمارے ادب و شعر

میں کئی لحاظ سے جیسا جاگزا نظر آتا ہے ، غالب ہماری ادبی تاریخ میں "ایک نئے دور اور ایک نئی روایت کا خالق اور پیشوا ہے ۔ اس کے بعد ہمارے ہاں مختلف سیاسی ، سماجی اور فکری اثرات کے طاقت جو ادبی شعور پیدا ہوا ہے ، اس کی ترجمان اور تعبیر میں غالب ایک بڑے اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر آج یہ شعور مختلف رنگ بدلتا ہوا کیا ہے کیا ہو گیا ہے ، مگر وہ امتیازی خصوصیات ، جو اردو شاعری میں غالب کے ساتھ ظہور میں آئی تھیں ، آج بھی قائم ہیں بلکہ نئی نئی ادبی تحریکات کی پشت پناہ ہیں ۔"

(آفتاب احمد : اردو شاعری میں غالب کی اہمیت : ۱۹۵۸ء)

"غالب کا آرٹ روائتی سہی لیکن اپنی حدود کے اندر اپنی آپ مثال ہے ۔ میر کے آرٹ میں گہرائی ہے اور شاید جہاں تک گہرائی کا تعلق ہے کوئی دوسرا شاعر میر سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے ۔ غالب کے آرٹ میں گہرائی نہیں اس میں وسعت ہے ، تنوع ہے ۔ ایسی وسعت ، جس کا گہاں بھی شاید میر کو نہ تھا ۔ یوں کہنے کو میر کے ضخیم دیوانوں میں بھی ہر طرح کے اشعار ملتے ہیں ۔ یہ ظاہر تنوع ہے ، وسعت ہے لیکن میر کے کامیاب شعروں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ میر کی دنیا محدود قسم کی ہے ، جس میں انتہاء گہرائی ہے لیکن وسعت کچھ زیادہ نہیں۔ یہی وسعت غالب کے آرٹ کی نمایاں خوبی ہے۔ غالب کا حلقہٴ دام خیال بہت وسیع ہے ۔ اس جال میں سبھی کچھ سمٹ آئے ہیں ، اس لیے وہ تنگی نہیں ، جو میر کے اشعار میں ملتی ہے ۔

غالب کے آرٹ کا اصلی کارنامہ یہ ہے کہ اس میں غزل خصوصاً شعر مفرد کی تنگی کو وسعت میں تبدیل کرنے کی کامیاب کوشش کی ۔ دو مصرعوں کی کیا بساط ہے ، اس میں گنجائش بہت کم ہے ، کسی چیز کو ہورے طور پر بیان کرنا نا ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے ، غالب نے اس مشکل کو آسان کرنے میں دوسرے شاعروں کے مقابلے میں زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ غالب کا قول ہے کہ ہر کام کا آسان ہونا دشوار ہے۔ اسی طرح ایک شعر کا نظم بن جانا دشوار ہی نہیں نا ممکن صا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ آدمی کا انسان ہونا میسر ہو یا نہ ہو ، غالب کے اشعار کو نظمیت میسر ہے ۔

غالب کو شش کرتے ہیں کہ ایک شعر میں مختلف خیالات ، جذبات یا ایک ہی خیال ایک جذبے کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹ لالیں۔ اس ارادے میں جامعیت کے ساتھ تو کساہی ممکن نہیں لیکن وہ ایک ترکیب استعمال کرتے ہیں، جس سے مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ چند خیالات تو پوری طرح ایک شعر میں نظم نہیں ہو سکتے لیکن غالب ایک بات کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دوسری باتوں کی طرف توجہ جا پڑتی ہے اور شعر بڑھ کر ذہن ان باتوں کی جستجو میں لگ جاتا ہے۔ گویا محرمستان خیال کا دروازہ کھل جاتا ہے اور غالب کا شعر اس دروازے کی کلید ہے۔ اگر آپ دریا کے کنارے کھڑے ہو کر دریا کا نظارہ کیجیے تو ممکن ہے دریا کی سطح پر آپ کو بالکل سکون نظر آئے، پھر ہتھکا لکڑا اٹھا کر پھینک مارے تو سطح دریا پر ایک لہر نمودار ہو گی ، یہ لہر دوسری لہروں کو بیدار کرے گی، لہروں کا دائرہ بڑھتا جائے گا، ایک بھنور کی سی کیفیت نمایاں ہوگی اور لہریں پھیلنے پھیلنے نظروں سے غائب ہو جائیں گی۔ غالب کے انعار دریائے۔ نحتال میں اسی قسم کی لہریں پیدا کرتے ہیں۔“

(کلیم الدین احمد : غالب کا آرٹ : ۱۹۵۸ء)

”غالب سے پہلے اردو شاعری کے پاس جذبات تھے ، احساسات تھیں ، زبان و بیان کے کرشمے تھے۔ لیکن وہ حسین و شوخ ذہانت نہیں تھی جو بیکر الفاظ میں روح پھونک دیتی ہے۔ یہ میرزا کا عطیہ ہے اور اس پر اردو جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ وہ اپنے قدیم سرمائے سے واقف تھے۔ لیکن اس کی ہر رسم اور قید کے پابند نہیں تھے۔ اسی لیے اُن کی شاعری افسون و افسانہ نہیں ہے۔ اس میں نفس گرم کی آمیزش ہے ، خون جگر کی نمود ہے۔ اُنہوں نے ہمیں نئے نئے خیالات دیے ، ان کے ادا کرنے کا ایک نیا اسلوب دیا اور سوچنے کے لیے حکیمانہ انداز اور جانچنے کے لیے تنقیدی شعور۔ اس میں مغل قلم کی شکستگی ہے، اس کا پر معنی اختصار ہے، اس کا ترکانہ بانگ نہیں ہے۔ یہ اسلوب حال اور مستقبل دونوں کے لیے اہم ہے۔“

(لاکٹر خواجہ احمد ناروی : ۱۹۵۹ء)

”غالب کی فن کاری میں ہمیں جدت و سوز ، تخیل کی پرواز ، ادراک کی قوت وجدان کا حسن ، امید و ناامیدی کی کشمکش ، درد و گداز ، مزاح و طنز اور جدت کی تازہ خیالی و تازہ کاری کے جلوے ملتے ہیں ۔ اس کے یہاں واقفیت کا حسن بھی ہے اور مثالیت کا جہاں بھی ۔ وہ ایک طرف اگر مصوری اور ٹھوس پت گری کرتا ہے ، تو دوسری جانب اشارت اور ایمائیت سے بھی کام لیتا ہے ۔ غالب کی شاعری کے کامیاب حصے میں لطافت ، گہرائی ، بلندی اور وسعت پائی جاتی ہے ۔ ان سب خصوصیات کی ترکیب سے غالب کے فن کی انفرادیت کی تشکیل ہوتی ہے ۔ غالب کی ازلی تشنگی ، خودی کے احترام کا جذبہ ، اس کی روح بغاوت و ممانعت انقلاب اور اس کی بھرپور شوخی اس کے آئینہ انفرادیت کو جلا دیتی ہے ۔ تن اور شخصیت کا رشتہ اتنا سادہ نہیں ۔ فنی شخصیت اور سماجی شخصیت میں یکسانیت بھی ہو سکتی ہے اور مخالفت بھی ۔ کبھی فن میں زندگی کی حسرتیں ، کوتاہیاں اپنا انتقام بھی لیتی ہیں ۔ آرٹ کبھی تو آرٹسٹ کی سماجی شخصیت کا ارتقا اور تکملہ ہوتا ہے اور کبھی حرجانہ ، چور دروازہ یا فن کار کی زندگی کے ترازو کا دوسرا ہلا ۔ غالب کی سماجی شخصیت سے ہم اس کی فنی شخصیت کو جا بہ جا مختلف پا سکتے ہیں ۔ علم النفس کے ذریعے اس کی توجیہ بھی کی جا سکتی ہے ۔“

(پروفیسر اختر اورینٹل : غالب کی فن کاری : ۱۵۹ء)

”غالب کی شاعری اپنے وقتی اہام ، دقت بیان اور قواعد زبان کے نادر استعمال کی وجہ سے چونکاتی اور متحیر کرتی ہے ۔ غالب کی مشکل پسندی ، براؤٹنگ اور ٹی ۔ ایس ۔ ایلٹ کی طرح ہے جس پر قابو پا کر ہمیں ایک قسم کی ذہنی مسرت حاصل ہوتی ہے ۔ جس طرح ہمیں ان شاعروں کی باریک بینیوں ، فکر اور تخیل تک رسائی حاصل کر کے ایک ذہنی طہائیت اور خوشی محسوس ہوتی ہے ، بالکل اسی طرح غالب کے تخیل کی اچانک پروازوں ، یا ان کی مضمون آفرینوں اور متبادلہ آرائیوں کی تفہیم سے بھی حاصل ہوتی ہے ، شاید ہی کسی شاعر کی فکر کو ان بلندیوں اور جذبے کی ان گہرائیوں تک رسائی حاصل ہوئی ہو جو غالب کی دسترس میں تھیں ۔ انہوں نے جس باریک بینی اور تجزیاتی ادراک سے شعر کہے ہیں ، اس تک

خیال کی رسائی محال ہے۔ اس کا تعلق، بعد الطبیعیات کی قلمرو سے ہے۔ وہ اپنی ذہنی تحقیق پسندی کے ساتھ ساتھ انسانی تجربے کے صوفیانہ، مادی اور فلسفیانہ پہلوؤں سے وہ ایک خیالی عمل پزیری اور تالیف میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اوروں کے مقابلے میں وہ زیادہ مشکل شاعر ہیں اور اسی لیے ان کے ہم عصروں نے انہیں سہل اور مبہم گو کہہ کر مطعون کیا۔ لیکن بالآخر وقت کے تدبیر اور ان کے جدید قارئین کی عام ذہنی ترقی اور ورزش خیالی نے غالب کے اس دعوے کو درست ثابت کر دیا، جو انہوں نے خود اپنی شاعری کے بارے میں کہا تھا کہ: ”نکھ کوئی شاعر فکر یا انداز بیان کی عظمت کے اعتبار سے ان کا ہم سر نہیں ہے۔“

(پروفیسر احمد علی ۱۹۶۶ء)

”غالب ہلاشبہ اس دور کے سب سے بڑے غزل گو ہیں، وہ اپنے اردو مجموعے کو بے رنگ قرار دیتے ہیں اور اپنے پرستاروں کو اپنے فارسی کلام کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا مختصر اردو دیوان اردو شاعری کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جس میں چلی مرتبہ غزل کے عام ہلکے پھلکے مضامین یا تصوف کے متعارف مسائل اور موضوعات کی جگہ دقت خیال اور فکر انگیز مضامین کی دعوت دی گئی ہے۔“

غالب اصطلاحی معنوں میں فلسفی یا مفکر یا حکیم نہ تھے لیکن ان کی افتاد طبع اور اسلوب بیان دونوں میں فلسفے کی دقت نظر، تحلیل و تجزیہ اور اسی کے مناسب اسلوب بیان ملتا ہے۔ بھر زندگی کے بارے میں ان کا خاص طرح کا مزاج اور ایک خاص رجحان اور افتاد طبع ہے جسے ان کا فلسفہ کہہ سکتے ہیں۔ ان کے تحلیل کی بلند پروازی محض شاعرانہ نہیں حکیمانہ بھی ہے۔“

(ڈاکٹر ابوالیث صدیقی ۱۹۶۶ء)

”غالب اردو شاعری میں ایک نادر مظہر ہیں۔ ان کی انفرادیت اور عظمت اتنے متضاد پہلوؤں میں اجاگر ہوئی ہے کہ ان سب کا احاطہ کسی

ایک شخص کے لیے ایک مضمون کی حدود بساط میں کرنا مشکل ہے۔ فکر و سخن کی محفل میں ان کا مقام اور منصب سب سے الگ ہی نہیں، سب سے نمایاں اور بلند بھی ہے۔ غالب کی شاعری کا موضوع ان کے شدید ذاتی تاثرات میں ان کی امتیازی خصوصیت ان کا تفکر ہے، یعنی ان تاثرات پر ان کے بے چین اور عمیق ذہن کا رد عمل۔ غالب کا تہربہ حقیقی اور غیر متفعل معلوم ہوتا ہے اور اس میں گونا گوں کیفیات کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ اس تجربے کی تجسیم کے دوران ان کی شخصیت کے تمام ہر اسرار گوشوں میں نقوذ باہمی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ غالب کے یہاں تفکر ان تمام تجربوں کا اظہار ہے، جو ذہن اور روح کی گہرائیوں میں جذب ہو کر ابھرے ہیں۔ اس فکر کی قدر و قیمت کا تعین ان تجربات کے تجزیے پر منحصر ہے۔ حسرت بھی اچھے اور دابظیر شاعر ہیں۔ ان کے یہاں بھی جذبات کی بوقلمونی اور فراوانی ملتی ہے مگر برلز (Burns) کی طرح وہ خالص تجربے سے آگے نہیں بڑھتے۔ ان کی شاعری صرف احساسات کو آہنگ عطا کرتی اور انہیں آسودگی بخشنی ہے اور اس اعتبار سے کیٹس (Keats) کی نہایت ابتدائی دور کی شاعری ہی شک پہنچ کر رہ جاتی ہے۔ غالب کے یہاں رنگا رنگی اور فراوانی سے زیادہ لغت، پیچیدگی اور تنوع اہم ہیں۔ ان کے یہاں جذبات کی شدت اور ذہن کی برق رفتاری بہ یک وقت ملتی ہیں۔ ان کی شاعری میں تعقل کا عنصر تمام دوسرے عناصر پر فوقیت رکھتا ہے۔“

(املوب احمد انصاری : ادب اور تنقید : ۱۹۶۸ء)

غالب اردو شاعری میں ایک نئی داخلیت کا تصور لے کر داخل ہوئے۔ یہ داخلیت نہ میر کی طرح محدود تھی، نہ میر درد کی طرح متصوفانہ۔ اس کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ مجلسی بلکہ کائناتی شعور بھی اس کے لیے اجنبی نہیں۔ اپنی شخصیت اور صداقت کو بھولے بغیر غالب نے شاعری میں فکر و کردار کو راہ دی۔ ان کے نزدیک خیال و جذبہ کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں۔ فکر و تاثر، احساس اور ادراک ایک ہی کل کے مختلف اجزاء ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفیانہ آہنگ کے باوجود غالب شاعری کے حسن اور جمالیاتی نکھار سے غافل نہیں رہتے۔

(ڈاکٹر محمد محسن : نروغ اردو، لکھنؤ، غالب ممبر : دسمبر، ۱۹۶۸ء)

کتابیات

تصانیف غالب (اردو)

دیوان غالب

- طبع اول ، مطبع سید العطایع دہلی ، ۱۸۳۱ع
 طبع دوم ، مطبع دارالسلام ، دہلی ، ۱۸۳۷ع
 طبع سوم ، مطبع احمدی ، دہلی ، ۱۸۶۱ع
 طبع چہارم ، مطبع نظامی ، کانپور ، ۱۸۶۲ع
 طبع پنجم ، مطبع مفید خلایق ، آگرہ ، ۱۸۶۳ع

چند قابل ذکر اشاعتیں :

- ۱۔ دیوان غالب جدید ، نسخہٴ حمیدیت ، مفید عام اشیم پریس، آگرہ، ۱۹۲۱ع
- ۲۔ دیوان غالب ، ڈاکٹر ذاکر حسین ، برلن ، جرمنی ، ۱۹۲۵ع
- ۳۔ مرقع غالب ، عبدالرحمان چغتائی ، لاہور ، ۱۹۲۸ع
- ۴۔ نقش چغتائی ، لاہور ، ۱۹۳۵ع
- ۵۔ دیوان غالب ، تاج ایڈیشن ، لاہور ، ۱۹۳۸ع
- ۶۔ دیوان غالب ، مالک رام ، آزاد کتاب گھر ، دہلی ، ۱۹۵۷ع
- ۷۔ دیوان غالب ، نسخہٴ عرشی، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ ،

۱۹۵۸ع

- ۸۔ دیوان غالب ہندی ، علی سردار جعفری ، ہندوستانی بک ٹرسٹ،

بمبئی ، ۱۹۵۸ع

- ۹۔ دیوان غالب، (عکسی) غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز

لاہور ، ۱۹۶۷ع

- ۱۰۔ دیوان غالب ، صدی ایڈیشن ، اردو سرگز ، لاہور ، ۱۹۶۹ع

- ۱۱۔ دیوان غالب ، معصوم ، صادقین ، ادارہ یادگار غالب ، گجراتی ،

۱۹۶۹ع

- ۱۔ دیوان غالب ، مولانا حامد علی خان ، مجلس یادگار غالب ،
پنجاب یونیورسٹی ، لاہور ، ۱۹۶۹ء

خطوط

- ۱۔ عود ہندی ، طبع اول ، مطبع مجتبیٰ ، میرٹھ ، ۱۸۶۸ء
عود ہندی ، طبع اول ، مطبع قرآنی ، دہلی ، ۱۸۷۸ء
عود ہندی ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، کان پور ، ۱۸۷۸ء
عود ہندی ، طبع اول ، مدرسۃ العلوم ، علی گڑھ ، ۱۹۱۰ء
عود ہندی ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، کان پور ، ۱۹۱۳ء
عود ہندی ، طبع اول ، مطبع مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ ، ۱۹۲۷ء
عود ہندی ، طبع اول ، مجلس ترقی ادب ، لاہور ، ۱۹۶۵ء
- ۲۔ اردوئے معلیٰ ، طبع اول ، اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۶۹ء
اردوئے معلیٰ ، طبع اول ، مطبع اردو کالج ، کلکتہ ، ۱۸۸۳ء
اردوئے معلیٰ ، طبع اول ، مطبع اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۹۱ء
اردوئے معلیٰ ، طبع اول ، مطبع مجتبیٰ ، دہلی ، ۱۸۹۹ء
اردوئے معلیٰ ، طبع اول ، مطبع فاروق ، دہلی ، ۱۹۱۰ء
اردوئے معلیٰ ، طبع اول ، مطبع گرمی ، لاہور ، ۱۹۲۲ء
اردوئے معلیٰ ، طبع اول ، رفاہ عام اسٹیم پریس ، لاہور ، ۱۹۲۷ء
اردوئے معلیٰ ، طبع اول ، مجلس ترقی ادب ، لاہور ، ۱۹۶۹ء
- ۳۔ ادبی خطوط غالب ، مرزا محمد عسکری ، لکھنؤ ، ۱۹۲۹ء
- ۴۔ مکتب غالب ، استاذ علی خان عرشی ، مطبع قیہ ، بمبئی ،
۱۹۳۷ء
- ۵۔ خطوط غالب (۱) مہیش پرشاد ، ہندستانی اکیڈمی ، الہ آباد ،
۱۹۳۱ء
- ۶۔ نادرات غالب ، آفاق حسین دہلوی ، کراچی ، ۱۹۳۹ء
- ۷۔ خطوط غالب ، مولانا غلام رسول مہر ، ۱۹۵۱ء
- ۸۔ انتخاب خطوط غالب ، ڈاکٹر عبادت بریلوی/مشفق انصاری ،
کراچی ، ۱۹۵۲ء

- ۹۔ خطوط غالب ، مالک رام ، علی گڑھ ، ۱۹۶۳ ع
 ۱۰۔ خطوط غالب (مکمل) غلام رسول مہر ، لاہور ، ۱۹۶۶ ع

تصانیف غالب (فارسی)

- ۱۔ دیوان فارسی ، طبع اول ، مطبع دارالسلام ، دہلی ، ۱۹۳۵ ع
 ۲۔ کلیات غالب ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، لکھنؤ ، ۱۸۶۳ ع
 کلیات غالب ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، لکھنؤ ، ۱۸۷۲ ع
 کلیات غالب ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، لکھنؤ ، ۱۸۹۳ ع
 کلیات غالب ، طبع اول ، شیخ مبارک علی اینڈ سنز ، لاہور ،
 ۱۹۶۵ ع
 کلیات غالب ، طبع اول ، مجلس ترقی ادب ، لاہور ، ۱۹۶۷ ع
 کلیات غالب ، طبع اول ، مجلس یادگار غالب ، لاہور ، ۱۹۶۹ ع
 ۳۔ سید جبین ، طبع اول مطبع عہدی ، دہلی ، ۱۸۵۷ ع
 سید چین ، طبع دوم ، مکتبہ جامعہ ، دہلی ، ۱۹۳۸ ع
 سید چین ، طبع جدید ، مجلس یادگار غالب ، لاہور ، ۱۹۶۹ ع
 ۴۔ باغ دو در ، طبع اول ، اورینٹل کالج میگزین ، لاہور ، اگست
 ۱۹۶۰-۶۱ ع
 باغ دو در ، طبع دوم : پنجاب یونیورسٹی لاہور ، جولائی ، ۱۹۶۸ ع
 ۵۔ مثنوی دعا صباح ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، لکھنؤ ، ۱۸۶۸ ع
 ۶۔ مثنوی البرکھ راز ، مطبع اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۶۳ ع
 ۷۔ پنج آہنگ ، طبع اول ، مطبع سلطانی ، دہلی ، ۱۸۳۹ ع
 پنج آہنگ ، طبع دوم ، مطبع دارالسلام ، دہلی ، ۱۸۵۳ ع
 پنج آہنگ ، طبع جدید ، مجلس یادگار غالب ، لاہور ، ۱۹۶۹ ع
 ۸۔ مہر نیمروز ، طبع اول ، مطبع فطر المطابع ، دہلی ، ۱۸۵۳ ع
 مہر نیمروز ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، لکھنؤ ، ۱۹۱۵ ع
 مہر نیمروز ، طبع اول ، شیخ مبارک علی اینڈ سنز ، لاہور ،
 ۱۹۲۵ ع
 مہر نیمروز ، طبع اول ، مجلس یادگار غالب ، لاہور ، ۱۹۶۹ ع

۹- دستیو ، طبع اول ، مطبع مفید خلائی ، آگرہ ، ۱۸۵۸ع
 دستیو ، طبع دوم ، مطبع انجیری سوسائٹی ، روہیل کھنڈ ، بریلی ،
 ۱۸۶۵ع

دستیو ، طبع سوم ، روہیل کھنڈ ، بریلی ، ۱۸۷۱ع
 دستیو ، طبع جدید ، مجلس یادگار غالب ، لاہور ، ۱۹۶۹ع
 ۱- کلیات نثر غالب ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، لکھنؤ ، ۱۸۶۸ع
 ۱۱- نکات و رقعات غالب ، طبع اول ، مطبع سراجی ، دہلی ، ۱۸۶۷ع
 ۱۲- قادر نامہ غالب ، طبع اول ، مطبع سلطانی ، دہلی ، ۱۸۵۶ع
 قادر نامہ غالب ، طبع دوم ، مجلس پریس ، دہلی ، ۱۸۶۳ع
 قادر نامہ غالب ، طبع سوم ، مطبع مداری لال ، لاہور ، ۱۸۷۳ع
 قادر نامہ غالب ، طبع جدید ، مکتبہ نیا راہی ، کراچی ، ۱۹۵۹ع

۱۳- قاطع برہان ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، لکھنؤ ، ۱۸۶۲ع
 ۱۴- لطائف غیبی ، طبع اول ، اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۶۳ع
 ۱۵- درفش کاویانی ، طبع اول ، اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۶۵ع
 ۱۶- نامہ غالب ، طبع اول ، مطبع ہمدی ، دہلی ، ۱۸۶۵ع
 ۱۷- سوالات عبدالکرم ، طبع اول ، اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۶۵ع
 ۱۸- قطعہ غالب ، طبع اول ، اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۹۶۶ع
 ۱۹- تیغ تیز ، طبع اول ، اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۶۷ع
 ۲۰- انتخاب غالب ، امتیاز علی خان عرش ، رام پور ، ۱۹۳۲ع
 ۲۱- متفرقات غالب ، مسعود حسن رضوی ادیب ، ہندوستانی پریس ،
 رام پور ، ۱۹۳۷ع

۲۲- مائر غالب ، قاضی عبدالودود ، علی گڑھ میگزین ، ۱۹۳۸-۳۹ع
 ۲۳- غالب کی نادر تحریریں ، ڈاکٹر خلیق الہم ، مکتبہ شاہراہ ، دہلی ،
 ۱۹۶۱ع

۲۴- مجموعہ نثر غالب اردو ، خلیل الرحمان داؤدی ، مجلس ترقی ادب ،
 لاہور ، ۱۹۶۷ع

غالب پر اہم تصانیف :

۱- یادگار غالب ، حالی ، ناسی پریس ، کلکتہ پور ، ۱۸۹۷ع

- ۴۔ حیات غالب ، سید محمد مرزا موج ، ننگرستان پریس لکھنؤ ، ۱۸۹۹ع
- ۵۔ غالب نام آورم ، نادم ستیاپوری ، سرفراز پریس ، لکھنؤ ، ۱۹۰۰ع
- ۶۔ مقام غالب ، محمد موسوی خان کلیم ، اذکار نئی تحریریں ، پشاور ، ۱۹۲۵ع
- ۷۔ غالب ، ڈاکٹر سید عبداللطیف ، جام باغ ، حیدر آباد دکن ، ۱۹۲۸ع
- ۸۔ مومن و غالب ، معجز سمسوانی ، نظامی پریس ، فیض آباد ، ۱۹۳۱ع
- ۹۔ غالب شکن ، یگانہ چنگیزی ، آرسی پریس ، آگرہ ، ۱۹۳۵ع
- ۱۰۔ غالب نامہ ، طبع اول ، شیخ محمد اکرام ، سرکشتالی پریس لاہور ، ۱۹۳۶ع
- ۱۱۔ قتیل اور غالب ، سید امداد علی اتوری ، مکتبہ جامعہ ، دہلی ، ۱۹۳۹ع
- ۱۲۔ سرگزشت غالب ، ڈاکٹر محی الدین قادری زور ، مکتبہ ابراہیمہ ، حیدر آباد ، ۱۹۳۹ع
- ۱۳۔ اشک و رشک غالب ، سید ظہیر الدین احمد دہلوی ، ایجوکیشنل پریس ، علی گڑھ ، ۱۹۴۱ع
- ۱۴۔ غالب ، طبع چہارم مولانا غلام رسول سہر ، شیخ مبارک علی ، لاہور ، ۱۹۴۳ع
- ۱۵۔ فرہنگ غالب ، امتیاز علی خان عرشی ، آزاد کتاب گھر ، دہلی ، ۱۹۴۵ع
- ۱۶۔ احوال غالب ، ڈاکٹر مختار الدین آرزو ، انجمن ترقی ادب ، ہند ، علی گڑھ ، ۱۹۵۲ع
- ۱۷۔ انکار غالب ، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحمیم ، مکتبہ معین الادب ، لاہور ، ۱۹۵۳ع
- ۱۸۔ نقد غالب ، ڈاکٹر مختار الدین آرزو ، انجمن ، علی گڑھ ، ۱۹۵۵ع
- ۱۹۔ تلامذہ غالب ، سرگزشت تصنیف و تالیف ، نکودہ ، ۱۹۵۷ع
- ۲۰۔ محاسن کلام غالب ، طبع ہنجم ، بینوری ، انجمن ترقی اردو ، ہند ، علی گڑھ ، ۱۹۵۸ع

- ۱۔ غالب ، ڈاکٹر خورشیدالاسلام ، انجمن ، ہند ، علی گڑھ ، ۱۹۶۰ ع
- ۲۔ فکر غالب ، برتھوی چندر ، پیام وطن پریس ، دہلی ، ۱۹۶۰ ع
- ۳۔ غالب ، فکر و فن ، ڈاکٹر شوکت سبزواری ، طبع جدید ، انجمن ، ترقی اردو پاکستان کراچی ، ۱۹۶۱ ع
- ۴۔ ذکر غالب ، طبع چہارم ، سالک رام مکتبہ جامعہ دہلی ، ۱۹۶۴ ع
- ۵۔ غالب شناسی (۱) ڈاکٹر ظ۔ انصاری ، سائتھ لرسٹ بمبئی ، ۱۹۶۵ ع
- ۶۔ غالب کے کلام میں الحاق عناصر ، نادم سینا پوری ،
ادارۃ فروغ اردو لکھنؤ ، ۱۹۶۵ ع
- ۷۔ مرزا غالب کی شوخیان ، عبدالباری آسی ، مکتبہ "دین و ادب" ،
۱۹۶۵ ع
- ۸۔ جہان غالب ، کوثر چاند پوری ، مکتبہ "کائنات" لاہور ، ۱۹۶۶ ع
- ۹۔ تجزیہ کلام غالب ، سید رفیع الدین بلخی ، اکیڈمی آف ایجوکیشنل
ریسرچ ، کراچی ، ۱۹۶۶ ع
- ۱۰۔ غالب شاعر امروز و فردا ، ڈاکٹر فرمان فتح پوری ، کتابیات ،
لاہور ، ۱۹۶۶ ع
- ۱۱۔ فلسفہ کلام غالب ، طبع جدید ، ڈاکٹر شوکت سبزواری ، انجمن ،
کراچی ، ۱۹۶۶ ع
- ۱۲۔ حکیم فرزانہ شیخ محمد اکرم - فیروز سنر ، لاہور ، ۱۹۵۵ ع
- ۱۳۔ مقام غالب ، عبدالصمد صارم ، ادارۃ علمیہ دہلی رام روڈ ، لاہور ،
۱۹۶۸ ع

شرحیں :

- ۱۔ شوکت میرٹھی ، حل کلیات اردو غالب ، شوکت المطابع ،
میرٹھ ، ۱۸۹۹ ع
- ۲۔ حسرت موہانی ، شرح دیوان غالب ، مطبوعہ علی گڑھ ، ۱۹۰۶ ع
- ۳۔ سہا مجددی ، مطالب الغالب ، شیخ مبارک علی ، لاہور ، سن
- ۴۔ سید خود دہلوی ، مرآۃ الغالب ، محبوب المطابع دہلی ، ۱۹۲۴ ع
- ۵۔ عبدالباری آسی ، مکمل شرح کلام غالب ، صدیق بک ڈپو ،
لکھنؤ ، ۱۹۳۱ ع
- ۶۔ آغا محمد باقر ، بیان غالب ، شیخ مبارک علی ، لاہور ، ۱۹۳۹ ع
- ۷۔ جوش ملیحانی ، شرح دیوان غالب ، قصر اردو ، دہلی ، ۱۹۵۰ ع
- ۸۔ اثر لکھنوی ، مطالعہ غالب ، دانش محل ، لکھنؤ ، ۱۹۵۲ ع

۹۔ ڈاکٹر قاضی سعید الدین ، مطالب الغالب ، پبلشرز یونائیٹڈ ،

لاہور ، ۱۹۵۲ء ع

۱۰۔ عبدالحکیم نشتر ، روح غالب ، تاج بک ڈپو ، لاہور ، ۱۹۵۳ء ع

۱۱۔ نظم طباطبائی ، شرح دیوان غالب ، طبع چہارم ، انوار المطابع ، لکھنؤ

۱۲۔ یوسف سلیم چشتی ، شرح دیوان غالب ، عشرت پبلشنگ ہاؤس ،

لاہور ، ۱۹۵۹ء ع

۱۳۔ وجاہت علی سندیلوی ، نشاط غالب ، انوار بک ڈپو ، لکھنؤ ،

۱۹۶۱ء ع

۱۴۔ نیاز فتح پوری ، مشکلات غالب ، ادارۃ نثار ، کراچی ، ۱۹۶۲ء ع

۱۵۔ شادان بلگرامی ، روح المطالب ، شیخ مبارک علی ، لاہور ، ۱۹۶۷ء ع

۱۶۔ غلام رسول مہر ، نوائے سروش ، شیخ غلام علی اینڈ سنز ،

لاہور ، ۱۹۶۹ء ع

۱۷۔ صفی غلام مصطفیٰ تبسم ، روح غالب ، گاؤپ پبلشرز ،

لاہور ، ۱۹۶۹ء ع

مقالات :

۱۔ سر سید احمد خان ، غالب اور ان کے معاصرین ، آثار الصنادید ،

طبع اول ، ۱۸۳۶ء ع

۲۔ مرزا قربان علی بیگ سالک ، غالب مرحوم ، اودھ اخبار لکھنؤ ،

۱۶ مارچ ، ۱۸۶۶ء ع

۳۔ حسرت موہانی ، کلام غالب ، اودھے معلیٰ ، علی گڑھ ،

یکم نومبر ، ۱۹۲۳ء ع

۴۔ مرزا یاسر لکھنوی ، غالب کی شاعری پر تنقید ، خیال ، پابوڑ ، ۱۹۱۵ء ع

۵۔ ہاشمی فرید آبادی ، غالب کا فلسفہ ، اردو ، اورنگ آباد

اکتوبر ، ۱۹۲۵ء ع

۶۔ عابد علی عابد ، غالب کی فارسی شاعری ، جامعہ ، دہلی ،

ستمبر تا دسمبر ، ۱۹۳۲

۷۔ سید وقار عظیم ، غالب کے خطوط اور ان کی احباب پرستی ،

ساقی ، دہلی ، جنوری ، ۱۹۳۳ء ع

- ۸۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ، غالب کا تصور حسن و عشق ، ادبی دنیا ، لاہور ، جنوری ، ۱۹۳۶ع
- ۹۔ عبداللہ آروی، غالب کی اخلاق کمزوریوں، نگار، لکھنؤ، مارچ، ۱۹۳۹ع
- ۱۰۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ، غالب کی قدر ، بہاؤں ، لاہور ، اکتوبر، ۱۹۳۹ع
- ۱۱۔ جاں نثار اختر ، غالب کا مسلک ، علی گڑھ میگزین ، مارچ ، ۱۹۴۱ع
- ۱۲۔ آل احمد سرور ، اردو ، دہلی ، اپریل ، ۱۹۴۱ع
- ۱۳۔ اختر اورینٹی ، غالب کا فن اور اس کا نفسیاتی پس منظر ، اردو ، دہلی ، جولائی، ۱۹۴۱ع
- ۱۴۔ حفیظ سید، غالب کی شاعری میں واقعات کا پہلو، زمانہ ، کانپور، مارچ ، ۱۹۴۵ع
- ۱۵۔ فراق گورکھپوری ، غالب کی شاعری میں محبوب کا تصور ، زمانہ ، کانپور ، اپریل ، ۱۹۴۵ع
- ۱۶۔ آفتاب احمد ، غالب کی عشق شاعری ، دہلی، فروری، ۱۹۴۶ع
- ۱۷۔ حمید احمد خان ، غالب کی خالکی زندگی کی ایک جھلک ، آج کل ، دہلی ، ۱۵ فروری، ۱۹۴۷ع
- ۱۸۔ آل احمد سرور ، غالب کی عظمت ، علی گڑھ میگزین، غالب نہیں، ۱۹۴۹ع
- ۱۹۔ حمید احمد خان ، مکاتیب غالب ، ادبی دنیا ، دسمبر، ۱۹۴۹ع
- ۲۰۔ حمید احمد خان ، غالب کی شاعری میں حسن و عشق ، بہاؤں ، جنوری فروری ، ۱۹۴۹ع
- ۲۱۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری ، غالب کی شخصیت ، نگار ، لکھنؤ ، غالب نہیں ، ۱۹۴۹ع
- ۲۲۔ امتیاز علی خان عرشی ، غالب کی شعر گوئی اور ان کے دواوین ، علی گڑھ میگزین ، ۱۹۴۹ع
- ۲۳۔ پروفیسر عبدالقادر سرور ، غالب کی اخلاق شاعری ، نوائے ادب، بمبئی ، جنوری ، ۱۹۵۰ع

- ۲۳۔ حمید احمد خان، غالب کا کلکتہ، ماہ لو، کراچی، فروری، ۱۹۵۰ء
- ۲۴۔ ارتضیٰ حسین، غالب کی طنزیات، نیا دور، کراچی، اپریل، ۱۹۵۰ء
- ۲۵۔ احتشام حسین، غالب کا تفکر، اردو ادب، علی گڑھ، جولائی، ۱۹۵۰ء
- ۲۶۔ دلشاد کلانجروی، غالب کے خطوط، بایوں، لاہور، ستمبر، ۱۹۵۰ء
- ۲۸۔ ممتاز حسین، غالب کا نظریہ شعر، نقوش، لاہور، دسمبر، ۱۹۵۰ء
- ۲۹۔ امپیش پرشاد، غالب کے ایام میں نظام ڈاک، نوائے ادب، بمبئی، جنوری، ۱۹۵۱ء
- ۳۰۔ آل احمد سرور، غالب کا ذہنی ارتقاء، اردو ادب، علی گڑھ، جولائی اگست، ۱۹۵۲ء
- ۳۱۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری، غالب محقق کی حیثیت سے، اردو ادب، علی گڑھ، جولائی اگست، ۱۹۵۲ء
- ۳۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کلام غالب میں استفہام، نگار، لکھنؤ، مئی، ۱۹۵۲ء
- ۳۳۔ پنٹل وناثریہ کیفی، غالب اور اردو خطوط نویسی، آج کل، دہلی، ستمبر، ۱۹۵۲ء
- ۳۴۔ نفیر احمد، غالب اور ظہوری، اردو ادب، علی گڑھ، جولائی، ۱۹۵۲ء
- ۳۵۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو، مرزا غالب کی تصویریں، احوال غالب، علی گڑھ، جون، ۱۹۵۳ء
- ۳۶۔ غلام رسول سہر، مرزا غالب نقاد کی حیثیت سے، نگار، لکھنؤ، اپریل، ۱۹۵۳ء
- ۳۷۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان، غالب کے جہاں تخیل اور جذبے کی ہم آویزی، ماہ نو، کراچی، مئی، ۱۹۵۳ء
- ۳۸۔ محمد حسن عسکری، میر و غالب اور تاریخی حقیقتیں، اردو ادب، علی گڑھ، اکتوبر، ۱۹۵۳ء
- ۳۹۔ ڈاکٹر مختار الدین آرزو، غالب کی تاریخ گوئی، ادبی دنیا، لاہور، مارچ، ۱۹۵۵ء

۴۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، نقش ہائے رنگ و رنگ ، ماہ نو، کراچی ،

نومبر، ۱۹۵۵ع

۵۔ آل احمد سرور ، غالب اپنی شخصیت کے آئینے میں ، ادب لطیف ،

لاہور ، جولائی ، ۱۹۵۵ع

۶۔ اسلوب احمد انصاری ، غالب کی شاعری کے بنیادی عناصر ،

مآلنامہ ادب لطیف ، لاہور ، ۱۹۵۵ع

۷۔ رشید احمد صدیقی ، غالب صاحب طرز انشا پرداز ، فروغ اردو

لکھنؤ ، جون ، ۱۹۵۵ع

۸۔ آفتاب زیری علیگ ، غالب ایک مطالعہ ، فروغ اردو ، لکھنؤ ،

جون ، ۱۹۵۵ع

۹۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ، غالب اور اقبال ، نگار ، لکھنؤ ، دسمبر ،

۱۹۵۵ع

۱۰۔ حامد حسن قادری ، انکار غالب ، اردو ، کراچی ، اکتوبر ، ۱۹۵۵ع

۱۱۔ ڈاکٹر سید عہد اللہ ، غالب پیش رو اقبال ، ماہ نو ، کراچی ،

اگست ، ۱۹۵۵ع

۱۲۔ آفتاب احمد ، غالب کے اردو قصیدے ، نیا دور ، لکھنؤ ، جون ،

۱۹۵۶ع

۱۳۔ احتشام حسین ، ذوق و غالب ، فروغ اردو ، لکھنؤ ،

جنوری فروری ، ۱۹۵۶ع

۱۴۔ اختر اورینوی ، غالب کی فن کاری ، نقد غالب ، علی گڑھ ،

۱۹۵۶ع

۱۵۔ ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی ، غالب اور عصر جدید ، نقد غالب ،

علی گڑھ ، ۱۹۵۶ع

۱۶۔ رشید احمد صدیقی ، کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائی کیا ، نقد غالب ،

علی گڑھ ، ۱۹۵۶ع

۱۷۔ فاضی عبدالودود ، غالب بحیثیت محقق ، نقد غالب ، علی گڑھ ،

۱۹۵۶ع

۱۸۔ مالک رام ، مرزا غالب ، نقد غالب ، علی گڑھ ، ۱۹۵۶ع

- ۵۵۔ ڈاکٹر محمد حسن ، غالب کے چند اہم نقاد ، آج کل ، دہلی ،
 ۱۹۵۶ع
- ۵۶۔ ڈاکٹر سید عبدالقد ، غالب معتقد میر ، نقد غالب ، علی گڑھ ،
 ۱۹۵۶ع
- ۵۷۔ آل احمد سرور ، غالب اور اس کے نقاد ، جامعہ ، دہلی ، دسمبر ،
 ۱۹۵۷ع
- ۵۸۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ، کلام غالب کا طنزیہ پہلو ، نگار ، لکھنؤ ،
 اکتوبر ، ۱۹۵۷ع
- ۵۹۔ ڈاکٹر محمد حسن ، ہندوستانی شاعری میں غالب کا مرتبہ ، تحریک ،
 دہلی ، اگست ، ۱۹۵۷ع
- ۶۰۔ علی محمد شعلہ ، غالب کی شاعری ، نقوش ، لاہور ، جون ، ۱۹۵۸ع
- ۶۱۔ ڈاکٹر مسیح الزمان ، غالب ، آج کل ، دہلی ، فروری ، ۱۹۵۸ع
- ۶۲۔ ڈاکٹر عبدالستار ، غالب کا تصور غم ، علی گڑھ سیکڑین ،
 ۱۹۵۹ع
- ۶۳۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر ، غالب کا فلسفہ ، نگار ، لکھنؤ ، جون ، ۱۹۵۹ع
- ۶۴۔ ڈاکٹر تارا چند ، غالب کے بیان میں تصوف اور فلسفہٴ وجدان کا
 استخراج ، جالستان ، دہلی ، جون ، ۱۹۶۰ع
- ۶۵۔ ڈاکٹر خلیق الہم ، غالب کی قیام گاہیں ، اردو سے معلیٰ ، دہلی ،
 فروری ، ۱۹۶۰ع
- ۶۶۔ مالک رام ، کل رعنا ، نگار ، لکھنؤ ، جولائی ، ۱۹۶۰ع
- ۶۷۔ پروفیسر مسیح اللہ قریشی ، غالب کی افسردگی ، لالہ ، صحرا ،
 جاول نگر ، دسمبر ، ۱۹۶۱ع
- ۶۸۔ نیاز فتح پوری ، غالب کی شاعرانہ خصوصیات ، نگار ، لکھنؤ ،
 جنوری فروری ، ۱۹۶۱ع
- ۶۹۔ ڈاکٹر سید معین الدین ، غالب کا نظریہٴ حیات ، تحریک ، دہلی
 اپریل مئی ، ۱۹۶۱ع
- ۷۰۔ حمیدہ سلطان ، غالب کا تصور عشق ، ماہ نو ، کراچی ، فروری ،
 ۱۹۶۲ع

- ۷۱۔ ڈاکٹر عبدالغنی شادانی ، غالب کا اسلوب نگارش (پنج آہنگ)
صحیفہ ، لاہور ، جنوری ، ۱۹۶۳ع
- ۷۲۔ مالک رام ، غالب کے فارسی قصیدے ، نقوش ، لاہور ، مارچ ،
۱۹۶۳ع
- ۷۳۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی ، ۱۸۵۷ع کا ہنگامہ اور خطوط غالب،
آئینہ ادب ، دہلی ، ۱۹۶۳ع
- ۷۴۔ عبدالحق ، موازنہ اقبال و غالب ، قلم نظر ، پشہ ،
۱۹۶۵ع
- ۷۵۔ آغا افتخار حسین ، یورپ میں غالب کا مطالعہ، افکار، غالب نمبر
کراچی ، ۱۹۶۶ع
- ۷۶۔ پروفیسر احمد علی ، غالب ایک مابعد الطبیعیاتی شاعر، افکار ،
غالب نمبر کراچی ، ۱۹۶۶ع
- ملک اسماعیل حسن خان ، غالب کے اردو قصائد ، نقوش ، اکتوبر،
۱۹۶۶ع
- ۷۸۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام ، غالب کا محبوب ابتدائی دور میں مشمولہ
تنقیدیں ، انجمن ، ہند ، ۱۹۶۶ع
- ۷۹۔ پروفیسر محمد محبوب ، مرزا غالب ، علی گڑھ میگزین، ۶۷-۶۶ع
- ۸۰۔ سجاد باقر رضوی ، غالب اور جدید ذہن ، مشمولہ تہذیب و تخلیق
لاہور ، ۱۹۶۶ع
- ۸۱۔ ڈاکٹر ظہ انصاری ، مرزا غالب کی مشوہان ، گفتگو ، بمبئی ،
جنوری ، ۱۹۶۷ع
- ۸۲۔ ڈاکٹر احسن فاروقی ، حیوان ظریف۔ غالب، تخلیق تنقید ، کراچی ،
۱۹۶۸ع
- ۸۳۔ ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی ، یک عمر ناز شوخی عنوان اٹھائے
علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۱۹۶۹ع
- ۸۴۔ آل احمد سرور ، غالب اور جدید ذہن ، علی گڑھ میگزین غالب نمبر
۱۹۶۹ع

- ۸۵۔ ڈاکٹر سید محمود ، مقدمہ دیوان غالب ، نظامی ایڈیشن ہدایوں
- ۸۶۔ ڈاکٹر عندلیب شاداقی ، غالب کا اسلوب نگارش (پنج آہنگ) صحیفہ لاہور ، جنوری ۱۹۶۶ء
- ۸۷۔ خواجہ فاروق ، غالب کی عظمت ، مشمولہ کلاسیکی ادب ، دہلی ،
- ۸۸۔ سید معین الرحمان ، غالب کے بعد ان پر پہلا مضمون ، نقوش ، لاہور ، فروری ۱۹۶۶ء
- ۸۹۔ سید معین الرحمان ، غالب کی معدوم الصنیعات ، العلم ، کراچی ، غالب نمبر ، ۱۹۶۶ء
- ۹۰۔ پروفیسر سید وقار عظیم ، غالب کا تنقیدی مزاج ، نقوش ، لاہور، فروری ، ۱۹۶۶ء
- ۹۱۔ ڈاکٹر محمد عقیل ، غالب اور ستویں ، نقوش لاہور، فروری، ۱۹۶۶ء
- ۹۲۔ ڈاکٹر سید ناظر حسن زیدی، غالب کا تہذیبی اور معاشرتی پس منظر۔ پنجاب یونیورسٹی ریسرچ جرنل ، غالب نمبر ، فروری ، ۱۹۶۶ء
- ۹۳۔ سید محمد حسین رضوی، غالب کی صحیح تاریخ پیدائش، اردو، کراچی، جنوری مارچ ، ۱۹۶۶ء
- ۹۴۔ ڈاکٹر ناظر حسن ۔ غالب اپنے اشعار کے آئینے میں، راوی، لاہور فروری ۱۹۶۶ء
- ۹۵۔ اختر اقبال کمال ، غالب
- ۹۶۔ محمد حسن ، غالب ۔ نئی داخلیت کی آواز

اشاريہ

الف

- آب حیات ، ۳۶۰ -
آثارالصنائید ، ۳۵۷ -
آثار غالب ، ۱۱ -
آزاد محمد حسین ، ۱۳۶ ، ۳۶۰ -
آزودہ مفتی صدو الدین ، ۱۱۳ -
۱۳۳ ، ۳۷۷ -
آفاق حسین ، ۱۸۰ ، ۳۸۳ -
آل احمد سرور ، ۳۳۵ ، ۳۷۷ -
آنند رام مخلص ، ۸۱ -
ابر گوہر بار ، ۱۸۶ -
ابوالقاسم خان ، ۱۹۵ -
ابواللیث صدیقی ، ۳۸۳ -
ابوسعید مرزا ، ۱۳۳ -
احتشام حسین ، پروفیسر ، ۳۳۷ ، ۳۷۹ -
احسن اللہ خان حکیم ، ۹ ، ۳۶ -
۱۳۶ ، ۳۱۳ -
احمد بخش خان نواب ، ۵۳ ، ۲۷۳ -
احمد علی پروفیسر ، ۳۸۳ -
احمد علی مولوی ، ۱۰ ، ۳۱۳ -
احمد شاہ ابدالی ، ۸۱ -
احمد فاروق خواجہ ، ۳۸۲ -
احوال غالب ، ۳۲ -
اختر اورینوی ، ۳۸۳ -
ارجن سنگھ گرو ، ۸۲ -
اردو سے معلیٰ ، ۱۶۹ ، ۱۶۹ ، ۳۱ -
۳۸۶ -
اسپرنگر ، ڈاکٹر ، ۱۳۵ -
اسٹرانگ ، سنٹر ، ۳۷۵ -
اسیر ، جلال ، ۶ -
اعظم خان ، ۱۰۳ -
اعظم الدولہ سرور ، ۳۵۳ -
الہامی عشق ، ۱۳ -
الہی بخش مفتی ، ۱۱۳ -
الہی بخش خان معروف ، ۶ ، ۱۳ ، ۳۲ -
القاب و آداب غلط ، ۳۸۹ -
امام بخش عیسیٰ ، ۱۳۶ -
امان ، خواجہ ، ۵۳ -
امتیاز علی خان عرشی ، ۶ ، ۳۰ ، ۳۱ ، ۹۹۲ -
امداد امام اثر ، ۳۶۷ -
امراء بیکم ، ۳۷۹ -
امیر النساء ، ۳۲ -
امیر خان ، نواب ، ۱۱۸ -
امیر میٹھی ، ۳۶۰ -
امین الدین خان ، ۵۳ -
انتخاب غالب ، ۱۹۲ -
انتخاب یادگار ، ۳۶۰ -
انوری ، ۳۲۰ -

جام جہاں نما ، ۱۹۵ -

جلوۂ خضر ، ۳۶۲ -

جہاندار شاہ ، ۹۲ -

جہانگیر مرزا ، ۱۰۱ -

جہون بیگ ، ۲۲ -

ج

جراخ دہر ، ۳۰۲ -

چورامن جاٹ ، ۸۳ -

چوک سعد اللہ خان ، ۱۰۳ -

چھج مل ، ۱۸۵ -

چھوٹی خانم ، ۵ -

چین سنگھ ، ۲۷۳ -

ح

حاجی خان ، ۲۱ -

حالی مولانا ، ۳۴ ، ۵۱ ، ۵۲ -

۳۶۵ -

حبیب اللہ خان ، ۳۱۲ -

حسن علی خان ، ۳۳ -

حکیم فرزانه ، ۳۳۱ -

حمید احمد خان ہرولیسر ، ۳۲ -

۱۶۳ ، ۳۳۸ ، ۳۳۹ ، ۳۷۳ -

خ

خاقانی ، ۳۲۰ -

خطوط غالب ، ۱۷۷ ، ۳۷۷ -

خطوط غالب سہر ، ۱۸۲ -

خلیق احمد نقاسی ، ۸۵ -

خلیق احمد نقاسی ، ۸۵ -

خواجہ حاجی خان ، ۲۱ -

خوب چند ، ۲۷۲ -

ب

بابر مرزا ، ۱۰۱ -

باغ دودر ، ۱۹۶ ، ۱۹۸ -

باقر علی خان ، ۳۳ -

بتروس ، مسٹر ، ۱۳۵ -

عبدالرحمن یثوری ، ۳۷۱ ، ۳۷۳ -

بختاور سنگھ ، ۳۸ -

برہان قاطع ، ۵۱ ، ۵۳ ، ۳۱۰ -

۳۱۱ -

بزم آخر ، ۱۰۲ -

بشیر حسین زیدی ، ۱۷۶ -

بلوان سنگھ ، ۲۹ -

بنارس ، ۳۰۲ ، ۳۰۳ -

بہادر شاہ ، ۵۰ ، ۱۰۱ ، ۱۳۹ -

۱۳۱ -

بیداد ، میر جدی ، ۱۳۵ -

بیدل ، ۶ -

ت

تارا چند ، ڈاکٹر ، ۸۲ -

ترسم خان ، ۳ -

تفتہ ، ہر گوبال ، ۳۸۵ -

تبغ بہادر گرو ، ۸۲ -

تبغ تیز ، ۳۱۱ -

پ

پنج آہنگ ، ۱۸۷ -

پیارے لال آشوب ، ۱۸۳ -

ج

جاٹ قوم کا مرقع ، ۸۳ -

جارج گمنگھام ، ۱۰۰ -

عبادت علی ، ۳۱۰ -

سکھ قوم ، ۶۲ -

سلاطین قلعہ ، ۱۰۰ -

صغریٰ ، ۳۰ -

سوالات عبدالکرم ، ۳۱۱ -

سورج مل جاٹ ، ۸۳ -

سید احمد ، ۱۵ ، ۱۱۳ ، ۱۱۸ -

۱۲۷ ، ۳۷۷ -

شاہ

شاہ اسماعیل ، ۱۱۷ -

شاہ عبدالغنی ، ۱۱۷ ، ۱۳۳ -

شاہ عبدالعزیز ، ۱۱۳ -

شاہ عبدالقادر ، ۱۱۳ ، ۱۱۶ -

۱۲۶ ، ۱۳۱ -

شاہ غلام علی ، ۱۱۳ -

شاہ رفیع الدین ، ۱۱۳ ، ۱۱۶ -

۱۲۶ -

شاہ محمد اسحاق ، ۱۱۳ -

شاہ ولی اللہ ، ۸۱ ، ۱۰۶ -

شمشیر تیز تر ، ۱۳۱ -

شوکت بخاری ، ۶ -

شہنشاہ ، ۳۶ ، ۱۲۶ ، ۱۳۰ ، ۳۵۵ -

شیو دھیان سنگھ ، ۲۵ ، ۳۷۷ -

شیو نرائن ، ۹ ، ۱۶۵ -

ص

صدر الدین آزرہ ، ۱۱۳ ، ۱۳۲ -

۳۷۷ -

صغیر جنگ ، ۸۵ -

صغیر بلگرامی ، ۳۶۲ -

ط

طابع ہڈیان ، ۳۱۱ -

طوفان کلویاتی ، ۵۲ ، ۱۹۰ -

طوگہ قلی خان ، ۱۰۳ -

طشہو ، ۶۱ ، ۱۸۸ -

طعائے صباح ، ۱۹۳ -

طکئی محمد حسین ، ۳۲۲ -

طیوان غالب ، ۱۵۵ تا ۱۵۸ -

ظ

ظکا اللہ مولوی ، ۱۳۶ -

ظکر غالب ، ۱۱ -

ظوق ، ۳۶ ، ۱۱۳ -

ز

زاس ڈاکٹر ، ۹ -

زام چندر ، ۱۳۶ -

زحم بیگ ، ۳۰۹ ، ۳۱۳ -

زہید احمد ، ۳۳ ، ۳۷۶ -

زہیت سنگھ ، ۸۲ -

زوس ، ڈاکٹر ، ۹ -

زیشکین ، ۲۰ -

ژ

ژین العابدین عارف ، ۳۳ ، ۳۶ -

۱۳۱ -

ح

حاطع نربان ، ۳۱۰ -

حیدرپور ، ۱۸۶ -

حراج الدین احمد ، ۱۹۵ -

سر سید احمد خان ، ۱۲۰ ، ۱۳۷ -

- صلاح الدین خدا بخش ، ۳۶۸ -
 صبیحی، اسام بخش ، ۱۳۶ ، ۳۷۷ -
 ضی
 ضیاء الدین احمد خان ، ۱۰ ، ۳۹ ،
 ۱۳۰ -

ضیاء الدین برقی ، ۳۶۸ -

ط

طور کلیم ، ۳۵۹ -

ظ

ظہیر دہلوی ، ۳۶ ، ۱۳۱ -

ع

عارف ، ۳۳ ، ۳۶ ، ۱۳۱ -

عبدالحق چودھری ، ۶ ، ۳۳ ،

۳۳ -

عبدالحمیم خلیفہ ، ۳۸۰ -

عبدالحمی ، ۱۱۳ ، ۱۶۵ -

عبدالصمد ، ۶ ، ۳۳ ، ۳۴ ، ۳۷۹ -

عبدالرحمن بخٹوری ، ۳۳۳ ، ۳۳۶ -

عبدالکریم ، ۳۱۱ -

عبدالله خان ، ۳ ، ۲۳ ، ۲۶ -

عبدالعزیز فاکٹر ، ۳۳۸ -

عبدالباقر ذریا آبادی ، ۳۶۹ -

عبدالودود قاضی ، ۳۵ -

عبدالله سید ، ۳۸۰ -

عجالہ ، قاضی ، ۱۳۹ -

عمری ، امتیاز علی خان ، ۶ ، ۱۰ ،

۱۳۱ ، ۱۹۲ -

عمدہ منتخبہ ، ۳۵۳ -

عرق شیرازی ، ۳۲۰ -

عقلمت آدم ، ۲۰۷ -

علاء الدین ، ۳۱ ، ۲۷۶ -

عود ہندی ، ۱۶۳ ، ۳۸۳ -

عیش آغا جان ، ۱۳۱ -

غ

غالب اور :-

آفاق شاعری ، ۲۱۵ ، ۲۱۷ ، ۲۱۸ -

آگ اور اس کے متعلقات ، ۳۵۲ ،

۳۵۳ -

اجتاعی شعور ، ۲۵۵ -

اجتہاد شعری ، ۳۶۹ ، ۳۷۳ -

ازدواجی زندگی ، ۲۸ ، ۳۳ ، ۲۸۱ ،

۲۸۲ -

اسیری ، ۸ ، ۳۸۰ -

الہامی انداز ، ۳۳۹ ، ۳۷۱ -

انگریزی حکومت ، ۸۷ -

اولاد ، ۳۳ -

بچن ، ۱۳ ، ۲۹ -

بڑھاپا ، ۶۶ ، ۶۷ -

پنشن ، ۶۹ ، ۵۴ ، ۳۸۱ -

چلو داری ، ۳ ، ۲۹۳ -

تراکیم فارسی ، ۳۳۶ -

تعلیم و تربیت ، ۵ ، ۳۷ ، ۳۸ -

تصوف ، ۲۲۷ -

تصویر کاری ، ۳۳۵ ، ۳۳۶ ، ۳۵۷ ،

۳۶۲ -

تنقید ، ۳۴۲ ، ۳۴۸ ، ۳۵۳ -

- گلہستہ، قازنین، ۴۵۵ -
گل رعنا، ۱۹۱ -
گلستان سخن، ۴۵۸ -
گلشن بے خار، ۴۵۵ -

ل

- لال کنور، ۹۲ -
لطائف عجیب، ۳۱۱، ۳۱۶ -
لکھنؤ، ۵۵، ۱۳، ۷ -
لیک جنرل، ۲۰، ۲۵، ۸۷ -

م

- مالک رام، ۱۱ -
مجنون گورکھپوری، ۴۷۹ -
محرق قاطع، ۴۱۰ -
مہد اسین مولوی، ۴۱۰ -
مہد اکرام، ۴۴۱، ۴۷۳ -
مہد حسن، ۴۸۵ -
مستفرقات غالب، ۱۹۴ -
متھرا داس، ۲۷۹ -
مہامن کلام غالب، ۴۳۳ -
محبوب علی میر، ۱۱۴ -
مہد نصیر ریخ، ۱۳۳، ۱۳۴ -
مہد شاہ، ۹۲ -
محمود خان، ۴۸ -
مظہر العجائب، ۲۰ -
مہعلیم، مولوی، ۳۱، ۳۳، ۳۵ -
مرزا خان کوٹوال، ۴۹ -
معین الملک میر منو، ۴ -
مکاتیب غالب، ۱۷۳ -
ممتاز حسین، ۴۷۸ -
ممتاز علی خان، ۱۵۹، ۱۶۵ -
مملوک علی، ۱۴۵ -
مومن، ۴۶، ۵۱، ۱۱۳، ۱۴۰ -

ن

- نہض الدین، ۱۳۳ -
نہض، ۶۹، ۴۸، ۱۱۳، ۱۲۹ -
۱۳۲، ۳۷۷ -
نیاض الدین، ۱۰۲ -
نیض الحسن کوٹوال، ۹ -

ق

- قادر بخش صابر، ۴۵۸ -
قادر نامہ، ۱۸۴ -
قاطع القاطع، ۴۱۰ -
قاطع بریان، ۱۸۹، ۳۱۱ -
قطب الدین، ۲۱، ۱۳۲ -
قطب الدین، یاطن، ۴۶ -
قمر الدین راقم، ۲۰ -
قورقان بیگ، ۱۳ -

ک

- کائف الحقائق، ۴۶۷ -
کاجے میان، ۴۹۱ -
کانبوز، ۷، ۱۳ -
کرامت علی، ۱۳۲ -
کرم الدین، ۱۳۶، ۴۵۵ -
کایم الدین احمد، ۴۸۲ -
کلب علی خان، ۴۹۱ -
کلکتہ، ۷، ۵۴، ۳۰۲، ۳۸۰ -
کلیات نثر، ۱۸۹ -
کو بروک، ۲۶۵ -

کی

- کرو ارجن سنگھ، ۸۲ -
کرو تیج بہادر، ۸۲ -
کرو گوہند سنگھ، ۸۲ -
کرو نانک، ۸۲ -

- موبد برهان، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴ -
 سهر غلام رسول، ۳۵۷ -
 سهر نیم روز، ۹، ۱۸۷ -
 سهریش برشاده، ۱۷۸، ۳۸۳ -
 میان داد خان سیاح، ۳۳، ۱۳، ۱۴، ۱۵ -
 شیر مجدی، ۱۳۵ -
 شیر سندی، ۱۳۰ -

ن

- نادران غالب، ۱۸۰، ۳۸۳ -
 ناصخ، ۱۹۵ -
 ناصر نامه فراق، ۱۱۴ -
 ناصر حسین مرزا، ۵۰ -
 نامه غالب، ۳۱۰ -
 نالک، ۸۲ -
 نبی بخش حقیر، ۳۸۳ -
 نجف علی، ۳۱۱ -
 نقیر احمد مولوی، ۱۳۶ -
 نسخه حمیدیه، ۱۰۸ -
 نصر الله بیگ، ۵، ۳۱، ۳۰، ۳۸، ۳۹ -
 نصیر شاه، ۴۹ -
 نصیرالدین کالجه، ۴۹، ۱۳۳ -
 نکات و رقعات غالب، ۱۸۳ -
 نور الحسن، ۱۲۹، ۳۵۹ -
 نیر، ۴۶، ۱۳۰ -

و

- واجد علی، شاه، ۲۷۵ -
 ویلزلی، ۸۸ -

ز

- زرمزد (عبدالصمد)، ۴، ۳۳، ۳۴ -
 زکریا، ۳۷۹، ۳۶۰ -
 زرگوپال، تفت، ۳۸۵ -
 زنگنه دل آشوب، ۱۱۱ -

ی

- یادگار غالب، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴ -
 یوسف، ۳۶۰ -
 یوسف بیگ خان، ۲۳، ۳۸۱ -
 یوسف علی خان، قاضم، ۱۰ -



To
DEAR FRIENDS AND COLLEAGUES

★ Professor Philips

★ Professor Brough	★ Professor Clarke
★ Professor Wright	★ Professor Lewis
★ Colonel Dr. Moyse-Bartlett	★ Mr. Brackee
★ Mr. Pearson	★ Mr. Gatehouse
★ Miss Smith	★ Mrs. Garland

And

★ Ralph Russell

of

The School of Oriental and African Studies

Who

With their affection and love made my stay at the
School of Oriental and African Studies, University of
London, the best and happiest period of my life.

EBADAT BRELVI